The Golden Phoenix

SEVEN CONTEMPORARY KOREAN SHORT STORIES

سنہری ققنس

کوریا کے سات جدید افسانے

انگریزی میں ترجمہ: سوہ جی مون   انگریزی سے ترجمہ: سجاد کریم انجم

مشعل

Mashalbooks.com

فہرست

کوریا میں افسانہ نگاری کا سیاق وسباق

......شوجی مون 5

سنہری قفس

......ژی مُن یول 18

بوسیدہ گھر میں رہنے والی لڑکی

......یُن ہُو مایونگ 62

میرے آبائی گاؤں میں غروب آفتاب

......ژی مُن گو 119

دیواری تصویر

......کم یونگ ہائیونگ 158

تیرہ خوشبوؤں والا پھول

......چوائی یُن 188

یادگار چوک

......اوچونگ ہُوئی 245

بارش کی جھڑی

......یُن ہیونگ جل 315

MashalBooks.com

تعارف

کوریا میں افسانہ نگاری کا سیاق وسباق

سوہ جی مون

کوریا کے لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ پانچ ہزار سالہ تاریخ کے مالک ہیں، جس کا آغاز 2333 قبل مسیح میں پہلی ریاست کے قیام سے ہوا۔ وہ اپنے طویل ماضی کو اکثر ''پانچ ہزار سالہ روشن تاریخ'' کا نام دیتے ہیں۔ایک بڑی طاقت (چین) کا ایک چھوٹا پڑوسی ہونے کے ناطےاور متعدد جنگجو قبائلی قوموں، جن کی تقدیر تیزی سے تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے، کی وجہ سے کوریا کی طویل تاریخ البتہ آزار کا شکار بنتی رہی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ حیرت کا باعث ہے کہ اتنی مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنے والی قوم نے اس قدر ترقی یافتہ ثقافت اپنالی ہے جو قانون، حکومت، فلاسفی، تعلیم، ادب، تعمیرات، موسیقی اور رسم ورواج کے حوالوں سے پہچانی جاتی ہے۔

کوریا کی ادبی تخلیقات کورین اور چینی دونوں زبانوں اور طرز تحریر میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ مقامی کورین زبان میں شعراء نے ''سجو، Sijo'' کی صنف متعارف کرائی ہے۔ سجو کو مختصر نظم کے چھوٹے چمکدار ہیرے کہہ لیجئے، جس میں محبت کے شفقت بھرے نفیس جذبات، دنیا شناسی کی حکمت یا کسی بھی طرح کے احساسات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پھر کاسا 'Kasa' کی صنف ہے جو کوریا کی زبان میں بھی لکھی جاتی ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہوتی ہے جس میں فلسفیانہ اسرار ورموز بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔چینی زبان میں مرتب کی جانے والی نظم خوش ذوق اہل ادب لکھتے ہیں اور اسے نہایت نفاست کے ساتھ رومانوی اور بڑی شائستگی کے ساتھ فلسفیانہ، دقیق طرز سے طنز آمیز بنایا جاتا ہے اور کبھی کبھی اسے فتنہ پردازی کی حد تک شیطانی اور طنزیہ بھی بنایا جاتا ہے۔

MashalBooks.com

نثر نگاری کو بھی دو ہی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، وہ افسانے جو کورین رسم الخط میں لکھے گئے اور وہ افسانے جن کے اظہار کے طور پر چینی رسم الخط کا انتخاب کیا گیا۔ کوریا کی زبان میں لکھے ہوئے زیادہ تر مواد پر کسی مصنف کا نام نہیں ہے۔ غالباً یہ شہ پارے اپنے حالات سے غیر مطمئن ان معززین نے لکھے ہیں جو اپنی شناخت ظاہر نہیں کرنا چاہتے، دونوں وجوہ کی بناء پر نثر نگاری کو ان کے وقار سے کم تر سمجھا جاتا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ ایسے کام پر اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے سخت تنقید کی جاتی تھی۔ عام طبقے سے تعلق رکھنے والا مصنف اس لئے بھی اپنی شناخت چھپاتا تھا کہ اسے ان پیچیدگیوں اور مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے جو کتاب میں شامل گستاخانہ پیراگرافوں کی وجہ سے پیش آسکتی تھیں۔ اگرچہ یہ افسانے ناقابل یقین حد تک عالمانہ طریقے سے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ لکھے گئے ہیں، پھر بھی ان میں ناشائستہ ظرافت، تضحیک آمیز طنز اور زندگی کا ذوق وشوق ملتا ہے، وسعت لئے ہوئے بھی اور دقیق بھی۔ بہت سی بعید از امکان لیکن دلچسپ جرأت مندانہ کہانیاں بھی لکھی گئیں جن میں سے بہت سی خاتون جرنیلوں کے بارے میں ہیں جو ملک کو تباہی سے بچاتی ہیں اور اپنے شوہروں کو سبق سکھاتی ہیں جنہوں نے انہیں نظر کیا یا پھر ان کی صلاحیتوں کا کم اندازہ لگایا۔

چینی زبان میں کی گئی نثر نگاری میں واضح طور پر پیچیدہ پلاٹ اور دانشورانہ ناصحانہ باتیں کثرت سے ملتی ہیں۔ چینی روایات میں ماورائے حقیقت کہانیوں کی بھی بہتات ہے جن میں بھوتوں کے قصے اور لومڑیوں کی کہانیاں بھی شامل ہیں۔

کوریا کی لوک کہانیوں اور قصوں کی صورت میں زبانی طور پر بیان کئے گئے ادب کا ایک خاصہ ان میں عجیب وغریب بھوتوں، چھلاووں اور مزاحیہ شیروں کے کردار ہیں۔ کوریا کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بھوتوں کو آسانی سے مشتعل کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ وہ تمام انسانی کمزوریوں کے بھی عادی ہوتے ہیں لہٰذا انہیں کہانیوں میں کردار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک روایتی بھوتوں کی کہانی میں ایک انسان پہلے تو بھوت کے ساتھ تعلق پیدا کرتا ہے اور پھر اسے استعمال میں لاکر یہ بتاتا ہے کہ وہ باقی سب سے زیادہ دہشت زدہ کرسکتا ہے اور اگر چاہے تو ڈھیر ساری رقم بھی لاسکتا ہے اور پھر وہ اسے اکساتے ہیں، آمادہ کرتے ہیں حتیٰ کہ مشتعل بھی کرتے ہیں۔ بھوت پھر انسانوں کا تقاضا پورا کرنے کیلئے ٹنوں کے حساب سے دولت اکٹھی کردیتا ہے۔ شیروں اور چیتوں کو اس کے برعکس ان کی

MashalBooks.com

اچھی طبیعت کی وجہ سے دوست بنایا جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بھوتوں کی طرح بعض چیتے بھی لالچی اور آسانی سے بہکاوے میں آجانے والے ہوتے ہیں۔ایک ہوشیار عورت یا مرد دونوں میں سے کسی بھی صورتحال سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ایک روایتی کہانی میں انسان شیر کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اسے کھائے گا نہیں بلکہ اس کی مدد اور حمایت بھی کرے گا۔ یہ کہانیاں اور قصے اشارہ ہیں کہ کوریا کے لوگوں نے اپنے خیالات میں شیروں اور بھوتوں کو رام کر کے اپنا دوست اور بہی خواہ بنالیا ہے۔ایسی کثیر مثالیں موجود ہیں یہ ثابت کرنے کیلئے کہ مستقل مشکلات اور مصائب کے باوجود کوریا کے عوام میں زندگی کا وافر ذوق وشوق، ایجادات کے حوالے سے زرخیزی اور شناور رجائیت پائی جاتی ہے۔

یہ بیش قدر ادبی روایات بدقسمتی سے اس وقت نظرانداز کر دی گئیں جب بیسویں صدی کے آغاز میں مغرب سے متاثر مصنفین نے ''جدید ادب'' کا آغاز کیا۔ یہ اس وقت ہوا جب چوسون حکمرانوں کی بدعنوانیوں کے خلاف ملک کے پس ماندہ اور بے بس ہونے کی حالت کے حوالے سے شدید ردعمل ظاہر کیا جا رہا تھا۔ جدید ادب کے بانی ادب کو روشن خیالی کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کے خواہاں تھے اور تقریباً پوری ہی صدی کے دوران جاری رہنے والے تاریک اور غم زدہ برسوں کے دوران زندہ دلی، ظرافت اور خوش طبعی کو کہیں جگہ نہ مل سکی۔ یہ ناقابل شکست ادبی ذوق اور بامقصد عمل کیلئے خد کو وقف کرنے کا نتیجہ ہے کہ کوریا کے مصنفین ایسی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکے جیسی اِس مجموعے میں شامل افسانوں کے مصنفین نے کی ہیں۔ 80 کی دہائی میں فوجی آمریت کے خاتمے کے بعد البتہ کورین ادب نئی سرگرمی سے ابھر رہا ہے، اس میں نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں اور یہ بے محابا اظہار ذات کے مزے لے رہا ہے۔ چوای یُن معاصر مصنفین میں سے ایک ہے جس نے بڑی تندہی سے دور جدید سے پہلے کے کورین ادب کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔اپنے افسانے ''تیرہ خوشبوؤں والا پھول'' میں چوای، جو کہ سنجیدہ اور زندہ دل مصنفہ ہے، نے علامتی انداز میں معاصر ادبی ماحول اور جمہوریت کی نااستواریت پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا ہے۔

کورین فنون لطیفہ کی دیگر شکلیں ، خطاطی ، پینٹنگ اور موسیقی۔ جہاں ایک طرف ارفع آئیڈیل ازم اور شاندار نفاست کی تجسیم کرتی ہیں تو دوسری طرف زندگی کیلئے ذوق وشوق اور خوش طبعی سے پیار کو بھی واضح کرتی ہیں۔کورین دانشور، آرٹسٹ کی خواہش کہ اسے اپنے کردار کو بلند مرتبہ عطا کرنا

ہے تا کہ اپنے فن میں خاص اور غیر مبہم ترفع پیدا کی جا سکے، اس کتاب کی ٹائٹل سٹوری میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ کہانی اعلیٰ ادبی قبیلے کے ایک فرد نے لکھی ہے۔ لیکن کوریا آرٹ ہمیشہ اس طرح کی ارفع خواتین تک محدود نہیں رہتا اور عام سادا لوگوں کے بھی سمجھ میں آ جاتا ہے اور نازک مزاج صاحب نظر لوگوں کے ذوق پر بھی پورا اترتا ہے۔

کورین لوگ کہتے ہیں کہ وہ موت (Mot) اور ہنگ (Hung) کے لوگ ہیں۔ اب یہ دو ایسے الفاظ ہیں جن کے متبادل انگریزی زبان میں نہیں ملتے البتہ انہیں جوش وجذبے اور شادمانی سے قریب قریب قرار دیا جا سکتا ہے۔ کورین لوگ اب بھی یہی سوچنا اور تصور کرنا پسند کرتے ہیں کہ وہ موت اور ہنگ کے لوگ ہیں لیکن حالیہ برسوں میں وہ اپنے قومی کردار کو واضح کرنے کیلئے لفظ ''ہاں' Han' استعمال کرنے لگے ہیں۔

ہاں Han کا نظریہ موت اور ہنگ سے کافی متضاد ہے۔ موت اور ہنگ وہ کچھ ہے جو کورین لوگوں نے تمام تر مصائب کے باوجود بچائے رکھا۔ ہاں ان کی طویل تاریخ کے زمانوں میں متضاد اور شدید آزار کا بقیہ حصہ ہے جو انہوں نے برداشت کیا اور سہا۔ ہاں Han مصائب اور غیر واجب تکالیف کے احساس سے جنم لینے والے جذبات کا نام ہے جن کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی مخصوص بدمعاملہ یا حقوق غصب کرنے والے شخص کے حوالے سے کبیدہ خاطری میں کافی شدت اختیار کر لیتا ہے البتہ یہ اس شخص سے بدلہ یا انتقام لینے سے خود بخود ختم نہیں ہو جاتا ہے اس کے برعکس یہ کسی شخص کی اپنی بدقسمتی میں تکلیف دہ اضافے اور زیادہ تر انسانوں کی شیطانی خطا کاریوں اور احساس سے عاری انجام کے ہاتھوں میں جذبہ رحم پر مبنی مجبوری کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح اس میں اپنے مصائب پر جی جلانے اور تلخی دونوں صورتیں موجود ہوتی ہیں اور اس کو مستعد طور پر درست کرنے کی بجائے اس کے علاج کے لیے تطہیر شدہ مخرج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چہ جدید دور کے کورین عوام کی توانائی اور جوش وجذبے سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جا سکتا کہ کورین لوگوں کو اپنے ماضی کی باقیات میں تلخی کے اس عنصر کو دل میں لیے رکھنا چاہیے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ درمیانی عمر کے زیادہ کورین لوگ ابھی تک انہی باتوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں حتیٰ کہ نوجوان نسل کا ایک حصہ بھی اس سوچ کا حامل ہے۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ کورین لوگوں میں ہاں کا جذبہ غربت کی وجہ سے پیدا ہوا' غربت بطور غربت ہاں پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتی۔ کوریا میں غربت باعث ندامت نہیں ہے۔ چینی فلسفی کنفیوشس کے نظریے کے مطابق غریب ہونا باعث عزت ہے کہ اس سے ان لوگوں میں لالچ پیدا نہیں ہوتا جو اس کو بغیر کسی شکوہ یا شکایت کے برداشت کرتے ہیں۔ البتہ اگر غربت حد سے بڑھی ہوئی ہو اتنی زیادہ کہ یہ خوراک کی کمی یا علاج معالجے کی سہولتیں میسر نہ آنے کی وجہ سے جسمانی خرابی کا باعث بن جائے یا جسمانی آزار کے ذریعہ کسی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے یا کسی امیر اور طاقتور کی طرف سے زخم ملے یا کوئی چیز یا عمل آزار کا باعث بنے تو اس سے ہاں کے جذبات ابھر سکتے ہیں اور قائم رہ سکتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ انسان کے ہاتھوں ہونے والی بے انصافی کی وجہ سے کسی انسان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے ہاں پیدا ہوتا ہے علاوہ ازیں بلا وجہ پہنچنے والے زخم بھی ہاں کا باعث بن سکتے ہیں اگر ان کی وجہ سے کسی کے منصوبوں یا امیدوں پر پانی پھر جائے۔

غربت اور ابتلا کورین لوگوں کے لیے نادر چیز نہیں ہے خاص طور پر جدید دور سے پہلے کے زمانے اور قرون وسطیٰ کے کورین عوام کے لیے یہ بالکل انوکھی چیز نہیں تھی لیکن کورین لوگوں میں بین الاقوامی معاملات کے بارے میں آگہی کی کمی تھی اور انہوں نے جن مصائب کا سامنا کیا وہ اتنے تھے کہ ان کے دلوں میں لامحدود ابتلا اور نہ ختم ہونے والے خوف کے بیج بو دیئے۔

عہد عتیق سے کورین لوگوں کی بڑی تعداد غریب اور آلام و افکار سے زیر بار تھی' اس سے بھی بڑھ کر خانہ جنگی اور غیر ملکی حملوں نے کردار ادا کیا جن کی وجہ سے لاتعداد زندگیاں ضائع ہوگئیں اور عام معاشرتی زندگی کی بنیادیں تک ہل گئیں۔ سولھویں صدی کے دوران کوریا پر جاپان حملے نے اس ملک کو تباہی و بربادی کی داستان بنا دیا اور جاپانیوں کے یہاں سے رخصت ہونے تک لاتعداد افراد عام اور شہری اور فوجی دونوں اپنی جانیں گنوا چکے تھے۔

کوریا کے لوگوں نے منگولوں اور تاتاریوں کے ہاتھوں شکست کھائی اور وہ محکوم بنا لیے گئے۔ منگول اور تاتاری چین کو فتح کرنے کے بعد کوریا آئے تھے کورین بادشاہ نے رسمی طور پر تیرھویں صدی عیسوی کے دوران یوان اور سترھویں صدی عیسوی میں کیوانگ کے سامنے ہتھیار ڈالے اور اس طرح امن قائم رکھنے کی بڑی قیمت ادا کی۔ کئی بار اطاعت گزار بنائے جانے کے عمل نے کوریا کے عوام کے قومی وقار

کو مجروح کیا اور بہت سے مسائل پیدا کیے لیکن اس سارے عرصے میں کوریا کے لوگوں نے اپنی خودمختاری کا بخوبی تحفظ کیا اور اس قابل ہوئے کہ ایک نادر اور اعلیٰ ترقی یافتہ ثقافت وضع کر سکیں۔

علاوہ ازیں کورین لوگوں نے نئے رسوم اور رواج وضع کرنے اور پوری تفصیل کے ساتھ ان کو منانے کا ڈھنگ بھی سیکھ لیا۔ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ کوریا کے اپنے لوگوں نے کتنی تکلیف دہ زندگیاں گزاریں تو روایات رسوم اور تہواروں کے منانے کے حوالے سے ان کا احترام بڑھ جاتا ہے کہ وہ کیسے زندہ دل لوگ ہیں، یہ رسوم و رواج اور تہوار کوریا کے عوام کے کردار کے استحکام اور کورین جذبے کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن کوریا کے عوام کے اس جذبے کو جو صدمہ سہنے کے بعد جلد بحال ہونے کی صلاحیت سے مالا مال تھا اس وقت سخت نقصان پہنچا جب بیسویں صدی کی شروعات میں جاپان نے کوریا کو اپنے تسلط میں لے لیا اور 35 برس تک اپنی نوآبادی بنائے رکھا۔ بہت سی مغربی طاقتوں، چین روس اور جاپان نے کوریا پر قبضہ کرنے کے لیے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن جاپان نے اس جنگ میں فتح پائی، ایسے تاریخی تجربے کے بعد کوریا کے رہنے والوں میں ہاں کا جذبہ پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔

جاپان نے کوریا پر قبضے کے لیے غیر قانونی ذرائع استعمال کیے کوریا کے عوام کو بے رحمانہ دباؤ اور تسلط میں رکھا اور کوریا کے عوام اور زمینوں کا بے اصولی پر مبنی استحصال کیا یہی ظلم و جبر اور استحصال احتجاجی تحریکوں کی بنیاد پر قائم صبر کے ساتھ مصائب کا سامنا کرنے کی روایت کے باعث اور کچھ روحانیت سے رابطہ رکھنے کا مدعی ہونے اور بدھ ازم اور کنفیوشس ازم سے متاثر ہونے کی وجہ سے بہت سے کورین نے ان کے تسلط کے خلاف دیوانہ وار تگ و دو کرنے کی بجائے ان کے ظلم و ستم اور زیادتیوں کو برداشت کر لیا۔ کوریا کے عوام کا پہلا مذہب شمان ازم یہ سکھاتا ہے کہ انسان اور قدرت کے ساتھ لڑنے اور انہیں اپنا مطیع بنانے کی بجائے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو خوش کر کے اور ان کی آشیرواد حاصل کر کے انسان اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ کوریا کے عوام کی زندگی میں بدھ ازم دوسرے نمبر پر آتا ہے جو کسی حد تک شمان ازم کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور کسی حد تک اس نے شمان ازم کی جگہ بھی لے لی ہے، بدھ ازم سکھاتا ہے کہ کسی فرد کی زندگی میں آنے والی مشکلات اور مصائب اس کے پہلے کسی جنم کے کرم یا اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے بدھ ازم دوسروں کے حقوق کے لیے لڑنے کی بات تو کرتا ہے لیکن اپنے حقوق کے لیے کسی کے لڑنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

چوسون سلسلۂ شاہان کے ابتدائی دور میں بدھ ازم کی جگہ کنفیوشس ازم کو ریاستی مذہب اور نظریہ قرار دے دیا گیا۔ کنفیوشس ازم تو لڑنے اور مزاحمت کرنے کا جذبہ پروان چڑھانے کی اجازت بھی نہیں دیتا بلکہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ممتاز اور منتخب طبقہ عوام کی روحانی، اخلاقی اور مادی بہبود کے لیے کام کرتے ہوئے خود نظمی اور خود ضبطی کا خاص خیال رکھے لیکن کنفیوشس ازم میں عوام کو ایک ریوڑ سے تشبیہہ دی گئی ہے جو اعلیٰ طبقے کی قائم کردہ حکومت سے فائدے اور مراعات تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن جن پر اعتبار اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خود حکومت کریں، اس طرح کنفیوشس کا نظریہ امراء کی اہل علم کو نوازنے کا حامی تو ہے لیکن اس وقت نچلے طبقے کے لوگوں کو کس قسم کا کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتا۔ جب اہل علم اور اہل ادب بدعنوانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کمزور عوام کے محافظین کی بجائے انہی کا یعنی عوام کا استحصال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ان پر ظلم کرنے لگتے ہیں۔ اس فلاسفی جو سماجی تنظیم کے درجہ بدرجہ اختیار واقتدار کے نظام پر قائم کی گئی ہے کے تحت اگر کوئی بہتری آئی بھی ہے تو حکمران طبقے کی عقل مندی اور مثبت جذبے کے باعث۔ عوام کے حق خود ارادیت کو ناممکن تصور کیا جاتا تھا یا کم از کم بہت خطرناک گردانا جاتا تھا چنانچہ جب جب بادشاہ اور ان کے وزیر عقل مند آئے وہ فیض رساں رہے اور عوام کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہے۔ اس کے برعکس جب کبھی بے وقوف اور گاؤدی برسر اقتدار آتے رہے اور ان کے وزیر بدعنوانی کرتے رہے عوام بھی مشکلات مصائب اور مسائل میں گھرے رہے۔ جب بھی عوام حد سے زیادہ کمزور اور لاچار ہوتے ہیں صاحب اقتدار امراء کو ترغیب ملتی ہے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کریں۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران بیوروکریسی کی بدعنوانی اور ارتکاز قوت واقتدار انتہائی حد تک زوال پذیر ہو گیا جب محض چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ ان کے شاہی رشتے دار اختیارات کو بادشاہوں سے زیادہ بروئے کار لاتے تھے جبکہ عام لوگوں کے حقوق کو بری طرح کچل دیا جاتا تھا اور ان سے ان کی جمع پونجی تک چھین لی جاتی تھی۔

کنفیوشس کے تصور کے تحت خاندانی رشتوں کو مضبوط بنایا گیا زرعی طرز زندگی کے تحت کئی ہزاریوں تک جس کو پروان چڑھایا جاتا رہا۔ کنفیوشس ازم بڑوں اور بزرگوں کے لیے احترام کے جذبات رکھتا ہے اور انہی جذبات کے تحت کسی شخص کی وفاداری اور شناخت کا بنیادی ذریعہ اس کا خاندان اور سلسلہ نسب کو قرار دیا گیا۔ اس زمانے میں انفرادیت پسندی کے پنپنے کی بہت کم گنجائش تھی حتیٰ کہ آج

MashalBooks.com

بھی جمہوریت کے لیے شدید کوششوں کے بعد نصف صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود کوریا کے عوام کے لیے انفرادیت پسندی خود پروری کے مترادف ہے۔ خاندان کی ارز بندی اور خاندانی رشتوں پر انحصار ناگزیر طور پر خویش نوازی دوسروں پر انحصار اور اس طرح کے دیگر مسائل کو جنم دیتی ہے اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ خاندانی رشتے اور سلسلہ نسب کے ساتھ وابستگی احساس تحفظ اور دنیا کے مسائل و افکار سے نجات بھی فراہم کرتی ہے چنانچہ زیر نظر کتاب کے افسانے ''میرے آبائی گاؤں میں غروب آفتاب'' میں مصنف کنفیوشس ازم کی انہی اقتدار کو خراج تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں اپنے بوڑھے دادا جان کے ساتھ جس طرح کی وابستگی اور محبت کا اظہار کیا ہے بہت سے کورین لوگ اس سوچ اور جذبوں کے حامل ہیں اگرچہ ان میں بسا اوقات ماضی اور اس کی روایات کے بارے میں منفی تصورات بھی شامل ہوتے ہیں۔

ملک کو جدید بنانے، طبقاتی نظام کے خاتمے اور معاشی و اقتصادی مواقع پیدا ہونے سے صورتحال کافی حد تک تبدیل ہوگئی ہے۔ اب کوریا کے لوگ پہلے سے کہیں زیادہ انفرادیت پسند ہوگئے ہیں اگرچہ اب بھی علاقائی، تعلیمی اور دیگر تعلقات کو پروان چڑھایا جاتا ہے اور اجتماعی ذاتی ترقی کے لیے اس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جدید دور کے کورین عوام اکثر خود کو اپنے سلسلۂ نسب اور دیگر سماجی تعلقات کی طاقت کی وجہ سے خود کو قابل فخر گرداننے کی مقناطیسی صورت حال میں پاتے ہیں جبکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان تعلقات کے باعث پیدا ہونے والی برائیوں کی بالاعلان مذمت بھی کرتے ہیں۔

کئی صدیوں تک دنیا سے الگ تھلگ ریاست رہنے کے بعد گزشتہ صدی کے اواخر میں جبری طور پر اس کو باقی دنیا کے لیے کھول دینے کے عمل نے زیادہ تر کورین عوام کو تکلیف دہ حد تک بدحواس کیے رکھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوران چین کے ذریعے سے مغربی سائنس اور افکار کی بہت محدود درآمد کی جا سکی تھی۔ ولی عہد شویژون (1645-1642) شاہ چونگ جو (1800-1752) اور متعدد دانشور مغرب کی ترقی یافتہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعارف ہوئے اور انہوں نے ملک کو اصلاحات کے ذریعہ جدید بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن ہوا یہ کہ ولی عہد کو ان کے اپنے والد یعنی بادشاہ سلامت نے اس عہدے سے الگ کر دیا کیونکہ بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ انقلابی تبدیلیوں کے مخالفین کی مکمل بیخ کنی کر دی جائے اور ان اصلاحات کو نافذ کیا جائے جس کا خواب ولی عہد نے دیکھا تھا۔ اس

نے دانشوروں کو بھی اختیارات کے مراکز سے باہر نکال دیا۔ پھر انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران اصلاحات کے بیج کو پنپنے کا موقع نہ دیا گیا اور سختی سے اس کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا گیا یہ کام شاہ کے رشتے داروں نے کیا جنھوں نے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ نائب سلطنت شہزادہ ٹائی ودنگن ایک باصلاحیت اصلاح کار لیکن غیر ملکیوں اور اجنبیوں سے شدید نفرت کرنے والا شخص تھا اس نے اپنے بیس سالہ بیٹے کو لاولد چھول جھونگ کا وارث بنا کر تخت و تاج کا مالک بنا دیا اور اس طرح شاہ کے خاندان والوں کا اقتدار اور اختیارات پر سے قبضہ ختم ہو گیا۔ اس کے بیٹے جو 1852 سے 1919ء تک برسر اقتدار رہا نے اپنی پوری کوشش کی کہ مغربی ٹیکنالوجی درآمد کر کے ملک کو مضبوط اور طاقت ور بنائے لیکن وہ تاریخ کے دھارے کا رخ موڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ کوریا جاپان کی بیداری کے چند عشرے بعد خواب غفلت سے جاگا' جاپان نے می جی کے عہد میں اپنے دروازے باقی دنیا کے لیے وا کئے اور اپنی ساری توانائیاں اس کو جدید بنانے پر صرف کر دیں اس کے نتیجے میں کوریا کمزور اور بے یار و مددگار رہ گیا اور جاپان طاقت ور اور ترقی یافتہ بن گیا۔

1910 تا 1945ء کے 35 سالہ دور میں جاپان کی ایک نوآبادی بنے رہنا کورین عوام کے سینے پر آج بھی ایک ناسور کی طرح اذیت کا باعث بنا ہوا ہے حالانکہ اس بات کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ کوریا کے صرف وسائل ہی نہیں ہتھیائے گئے جاپان نے کوریا کی تاریخ کو بھی مسخ کیا اور سب و شتم کا نشانہ بنایا' آزادی کی تحریکوں کو سختی کے ساتھ ختم کر دیا گیا اور کسی بھی قسم کی باغیانہ سرگرمیوں کا قید' تشدد اور پھانسی کی سزاؤں کے ذریعے خاتمہ کر دیا گیا شہریوں کو تذلیل کی گئی اور انہیں بے عزت کیا جاتا رہا۔ نوآبادیاتی حکومت کے آخری دور میں کورین زبان کا استعمال ممنوع قرار پایا اور کوریا کے عوام کو مجبور کیا گیا کہ وہ جاپانی نام رکھیں اور اپنے روایتی نام ترک کر دیں' دوسری جنگ عظیم کے دوران نوآبادیاتی استحصال اس حد تک بڑھ گیا کہ کورین لیبر کا ایک بڑا حصہ جنگی اور بارودی سرنگیں تیار کرنے والی فیکٹریوں میں لگا دیا گیا اور تقریباً دو لاکھ جوان خواتین کو جنسی خدمات کے لیے جاپانیوں کے فوجی کیمپوں میں لے جایا گیا۔

یہ تجربات اور یہ صورتحال کوریا کی ترقی کی رفتار کو کئی دہائیوں تک روکنے کے لیے کافی تھی لیکن کوریا کے عوام کے لیے ابھی اس سے بھی برے حالات رہے تھے' جونہی یہ ملک آزاد ہوا ایک نیا جھگڑا سر

اٹھائے کھڑا تھا۔ جاپانی فوج کے پسپا ہوئے کے بعد سوویت یونین نے کوریا کے شمالی حصے پر اور امریکہ نے اس کے جنوبی حصے پر قبضہ کرلیا۔ اس کے فوراً بعد امریکہ اور سوویت یونین ایک دوسرے کی مخالف شہر طاقتیں بن گئیں اور پورے ملک میں سوویت یونین کی پشت پناہی میں کمیونسٹوں اور امریکہ کی سرپرستی میں آزاد جمہوریت پسندوں کے درمیان کش مکش شروع ہوگئی۔ اس کتاب میں موجود افسانے ''یادگار چوک'' میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح معصوم اور سادہ لوح لوگ اس تگ ودو میں پھنس کر رہ گئے تھے ان میں سے بہت سے تو اپنے تمام اثاثے اور سارے رشتے چھوڑ کر کسی طرح جنوبی حصے میں چلے گئے تھے تاکہ ان تکلیف دہ حالات سے بچ سکیں جو سوویت یونین کے زیر قبضہ اور کمیونسٹوں کے زیر غلبہ حصے میں ان کے منتظر تھے۔

یہ جھگڑا ملک کی دو حصوں میں تقسیم، عوام کی اکثریت کے دہشت زدہ اور خوف زدہ ہونے اور 1950ء میں کوریا کی جنگ پر منتج ہوا۔ اس جنگ کی وجہ سے ہونے والا مادی نقصان نفسیاتی حوالے سے پہنچنے والے زخموں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نظریاتی تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا اور دوست دوست کے پیٹ میں خنجر بھونکتا نظر آیا۔ قبل از تاریخ کے دنوں سے انسانی رشتوں پر انحصار کرنے والا معاشرہ اس صورتحال پر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ کتاب ہذا میں شامل کیے گئے افسانے ''بارش کی جھڑی'' (The Rainy Spell) میں کوریا کی جنگ کی بڑے ہمدردانہ انداز میں زخم رسیدہ خواتین کے جھگڑے کی صورت میں انسانی قیمت ظاہر کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک کا بیٹا ری پبلک آرمی (جنوبی کوریا) جبکہ دوسری کا کمیونسٹ گوریلا گروپ میں شامل ہوتا ہے۔ ان خواتین کا جھگڑا المناک ہے لیکن کہانی کا اختتام تجدید تعلقات کے ساتھ ہوتا ہے' اس حوالے سے کہ ان دونوں کو ایک جیسے نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے یہ امید بھی کی کہ ممکن ہے کہ قومی بحالی کا کوئی امکان پیدا ہو جائے' تاہم پہلے ری پبلک صدر سنگمان ری نے ان زخموں پر پھایا رکھنے کی بجائے کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھنے والوں کو ختم کرنے کی پالیسی اپنائی، شمالی کوریا کے تباہ کن اقدامات اور نعرے بازی نے ایک اور کمیونسٹ حملے کے خطرے کو برقرار رکھا اور لوگوں کے ذہنوں میں موجود اس تصور کو مزید تقویت دی کہ کمیونسٹ جرائم پیشہ یا پھر خوفناک آدمی ہوتے ہیں' سنگمان ری کی حکومت بھی بدعنوان تھی اور جنگ کی تباہ کاریوں سے معاشی بحالی کا عمل بہت سست تھا۔ 1960ء کا طلباء انقلاب ایک نئے دور کا آغاز محسوس ہوا خصوصی طور پر سیاسی

MashalBooks.com

حوالے سے لیکن دبی ہوئی خواہشوں اور مطالبات کے یکدم نمایاں ہو کر سامنے آنے سے ملک تباہی اور بدحالی کے دھانے پر پہنچ گیا اور فوج کو اقتدار اپنے قبضے میں لینے کا موقع مل گیا۔ اگلے سال جنرل پارک جنگ ہی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

پارک جنگ ہی کی فوجی حکومت نے معاشی اور اقتصادی ترقی کے منصوبوں پر تیزی سے کام شروع کیا اور طویل عرصے سے دباؤ اور جبر کی شکار کورین عوام کی توانائی نے اس صورتحال سے پیدا ہونے والے مواقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جس کے نتیجے میں کوریا کی معیشت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگی البتہ یہ ضرور تھا کہ سیاست جبر کی کیفیت میں تھی اور شہریوں کے حقوق محدود کیے جا رہے تھے' پارک جنگ ہی نے اپنے مخالفین کو سختی سے دبایا۔ تنقید کرنے والوں کو قید کر دیا جاتا' تشدد کا نشانہ بنایا جاتا یا ''حادثات'' میں انہیں مار دیا جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پارک نے ہمیشہ کے لیے خود کو ملک کا سربراہ مقرر کر لیا ہے لیکن اٹھارہ سال تک ملک کا مطلق العنان حکمران رہنے والا پارک 1979ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے خوشگوار موسم آیا لیکن ملک میں پائیدار جمہوریت کے قیام کا خواب اس وقت چکنا چور ہو گیا جب مئی 1980ء میں گوانگ جی بغاوت سختی سے دبا دی گئی اور منظر پر ایک فوجی چن ڈوھوان ظاہر ہوا۔

چن کی حکومت سات سال تک رہی اور یہ دور جدید کوریا کا تاریک ترین حصہ تھا' پارک چنگ ہی بھی فوجی آمر تھا تاہم اس نے ملک کو غربت سے نکال کر آسودہ حال بنایا اور تمام کورین عوام وہ بھی جو اسے پسند کرتے تھے' اس حقیقت کا ادراک کرتے ہیں لیکن چن ڈوھوان ایک قتل کے نتیجے میں برسر اقتدار آئے اور اقتدار کے دنوں میں بھی انہوں نے اس سے پارسا ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ کوریا کے عوام اس سے نفرت کرتے تھے اور اس کی آمریت کے تحت زندگی گزارنے پر خود کو گھٹیا اور کم تر تصور کرتے تھے حتیٰ کہ اس کے دور اقتدار میں کسی قسم کی مخالفانہ سرگرمی کا مطلب ہوتا تھا اپنی اور اپنے خاندان والوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دینا چنانچہ گزشتہ صدی کا آٹھواں عشرہ کوریا کے عوام نے خود اپنی بے یارومددگاری' کمزوری و بے بسی اور بزدلی کے شدید احساس کے تحت گزارا۔ اس کتاب میں موجود افسانے ''بوسیدہ گھر میں رہنے والی لڑکی'' کی کہانی روایت کرنے والے کی سستی و کاہلی اور خود اعتمادی کی کمی ان تاریک دنوں میں کوریا کے عوام کے طرز عمل کو ظاہر کرتی ہے حالانکہ اصل زخم تو کوریا کی جنگ کے

زمانے کے ہیں۔ ''نقش دیوار'' میں ایک ایسے پینٹر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو مسلمہ اقدار یا نظام سے انحراف کرنیوالے ایک انسان کی بجائے خود کو ایک تصویریں بنانے والے کے پر پیش کرتا ہے یہ اس اسی کی دھائی کے زمانے کا ذکر ہے جب مزاحمت کا مقصد ختم ہو گیا تو اس نے خود کو اور اپنی زندگی کو بے مقصد محسوس کیا۔

خوش قسمتی سے چن ڈوہان اپنی سات سالہ مدت کے اختتام پر اقتدار سے الگ ہو گئے اگرچہ تمام کورین عوام کو یقین نہیں تھا کہ وہ ایسا کریں گے لیکن جب چن نے اپنے ایک ساتھی کو اپنی جگہ اقتدار سونپنے کی کوشش کی تو ملک بھر میں اس کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ صدر کے براہ راست انتخاب کا نظام بحال کیا جائے چن کو آخر کار یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور جون 1987ء میں کوریا میں فوجی آمریت کا خاتمہ ہو گیا۔

کوریا کے لوگوں کو جن مشکلات اور مسائل کا سامنا ہے وہ تہہ در تہہ اور پیچیدہ ہیں' کنفیوشس کے بنائے ہوئے اصولوں پر مبنی ماضی' ایک مطیع ریاست کے طور پر چین کے ہاتھوں اٹھائی گئی ذلت اور لگے ہوئے زخم' جاپان کی نو آبادی رہنا' آزادی کے بعد نظریاتی تنازع' قومی تقسیم' کوریا کی جنگ اور پھر تین دھائیوں پر مبنی آمریت۔ ان میں سے ہر واقعہ اور ہر معاملہ دردناک یادیں اور عملی مسائل چھوڑ گیا جنہیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسائل حل کرنا اسی لئے مشکل نہیں کہ تاریخی تجربے نے کورین لوگوں کو عامل نہیں بلکہ ظلم سہنے والا بنایا ہے نئے ولولے سے تبدیلی کے لیے کام کرنے کی بجائے برداشت کرنے اور سہنے والا بنایا۔ علاوہ ازیں یہاں قائم ہونیوالی حکومتیں اور برسر اقتدار طاقتیں روایتی طور پر مزاحمت کرنیوالے ادارے نہ تھے بلکہ وفاداری اور احکامات تسلیم کرنے والی چیزیں تھیں۔ حالات کا تقاضا تھا کہ داخل فطرت عادت پر قابو پایا جاتا اور جسمانی طاقت کو اکٹھا اور مضبوط کیا جاتا لیکن ہوا یہ کہ جمہوریت' مساوات انصاف کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا فرض اور شہریوں کے حقوق کے معاملات رفتہ رفتہ کوریا کے عوام کے شعور میں رچ بس گئے اور انہیں مجبور کرنے اور اکسانے لگے کہ وہ اپنے ذمے یہ فرض عائد کریں کہ وہ ان نظریات کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کریں گے۔

مغربی تہذیب کا در آنا ذہنی اور نفسیاتی تذبذب کا ایک اور ذریعہ ثابت ہوا۔ مغرب کی مادہ زدہ تہذیب اور کچھ مغربی نظریات اور اداروں جیسے کہ جمہوریت اور آئینی حکومت نے گہرے اثرات مرتب

MashalBooks.com

کیے لیکن مغربی رسوم اور اسی طرح کی دیگر معاملات اور مغربی پاپ کلچر نے کوریا کے لوگوں کے اخلاق اور اطوار پر منفی اثرات مرتب کیے‘ کورین عوام اب تک دو حصوں میں منقسم ہیں ایک ماضی کی حسین یادوں پر فخر کرتا ہے دوسرا ماضی کے حوالے سے شرم محسوس کرتا ہے‘ بہت سے کورین اب بھی ایک لمحے کو اپنے ورثے کا دفاع کر رہے ہوں گے اور اگلے ہی لمحے ان کی مسترد بھی کر رہے ہوں گے۔ مغربی ثقافت کے حوالے سے بھی ان کا رویہ اسی طرح دوغلا ہے۔ سیاسی مواقع جنہوں نے قومی توانائیوں کو حرکت پذیر کر دیا اور اس سے جنم لینے والی خوشحالی اور اسودگی نے بہت سے اختلافات کو کم کر دیا لیکن پرانے مسائل حل کرتے ہوئے ہوا یہ کہ کچھ نئے مسائل سامنے آنے لگے۔

یہ وہ عوامل اور یہ وہ حالات ہیں جن سے جدید دور کے کورین عوام کو نمٹنا ہے اور جن کے خلاف جدوجہد کرنا ہے تاکہ وہ دوسروں سے الگ اپنی بابت ایک قرین فہم تصور اور بہتر طرز زندگی کی منزل تک پہنچ سکیں۔ سیاسی پیش رفت اور ترقی جمہوری اداروں کا حصول ان مسائل کے حل کے سلسلے میں آسانی اور آسودگی فراہم کرنے کا باعث ہوگا۔ لیکن کچھ ایسے معاملات بھی ہیں جس کے بارے میں ہر کورین باشندہ پرانے طور پر سوچتا کام کرتا اور پھر حل تلاش کرتا ہے۔ یہی وہ تناظر ہے جس میں اس کتاب میں شامل افسانوں کے کرداروں کو رہنا ہے اور اپنی زندگیوں کے بارے میں خود کچھ کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.com

سنہری ققنس

ژی من یول

ژی من یول (پ۔1948ء)70 کی دہائی کے اواخر سے ہی کوریائی ادب کی مقتدر شخصیت ہے۔اس نے بڑے پیمانے پر تنقید نگاروں کی تحسین بھی حاصل کی اور وسیع پیمانے پر شہرت بھی کمائی لیکن وہ ہمیشہ اتنا خوش قسمت نہیں رہا۔درحقیقت وہ لڑکپن اور جوانی میں خوشیوں سے محروم رہا۔اس کا خاندان اشتراکیت سے منحرف ہونے کی وجہ سے شمالی کوریا کی پولیس کی کڑی نگرانی میں رہا۔لہٰذا اسے ہر قدم پر سماجی تعصب اور غربت سے پیدا شدہ مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔اسے مالی اور نفسیاتی مسائل کی بنا پر بار بار سکول سے خارج کیا گیا۔تاہم لڑکپن اور جوانی کے دور میں اس نے بہت زیادہ کتابیں پڑھیں۔اس کا وسیع مطالعہ اور ابتدائی مشکلات بطور ادیب اس کے لیے ایک اثاثہ ثابت ہوئیں۔اس کا تخلیقی جوش اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ آپس میں ملے تو اس نے درجن بھر ناول افسانوں کے کئی مجموعے اور مضامین کے دو مجموعے تخلیق کر ڈالے۔اس کے علاوہ قدیم چینی رومانوی کہانیوں کے دو مجموعے جن میں سے ہر ایک دس جلدوں پر مشتمل تھا اور دیگر کئی مضامین ترجمہ کیے۔زیادہ تر سنجیدہ کوریائی ادیبوں کی مانند ژی (Yi) نے فوجی آمریت کے زیر اثر کوریائی معاشرے میں معاشی عدم مساوات اور سیاسی جبر پر تنقید کی۔لیکن اس کی زیادہ تر دلچسپی کا محور قومی ورثے۔جدید کوریائی قوم کے لیے اس کی اہمیت اور قدیم قومی

ورثے سے اس کا سلوک ہے۔ چنانچہ جدید کوریا نے جس ثقافتی ورثہ کا بار اٹھایا ہوا ہے اسے سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے' سنہری ققنس میں مشرقی ورثے اور اس ورثہ کے جدید اطلاق سے اس کی گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کہانی میں ژی (Yi) نے ایک بوڑھے خطاط اور اس کے ایسے باغی شاگرد جو مشرق روایات کے ساتھ جدید جمالیات کا بھی علمبردار ہے' کے درمیان محبت اور نفرت کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ خداداد صلاحیتوں کا مالک شاگرد اپنے استاد کی غیر معمولی تارک الدنیا اخلاقی اصول پسندی کے خلاف اور حسن وخوبصورتی کے رسمی تصور کے حق میں بغاوت کرتا ہے۔ یہ کشمکش استاد اور شاگرد کے درمیان تکلیف دہ مخالفت پر منتج ہوتی ہے۔ آخر دونوں کی صلح استاد کی اس آخری خواہش پر ہوتی ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے تابوت پر طغرہ لکھے۔ شاگرد تارک الدنیا تو نہیں ہوتا مگر وہ اپنے فن کا اپنے استاد کی طرح والا وشیدا ہوجاتا ہے۔ ژی (Yi) کا روایت کے بارے میں پرمغز ادراک قدیم علاقائی ورثے کا گہرا مطالعہ اور اس کا سنجیدہ اور نیا اسلوب تحریر سب اس کہانی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

کوجوک نیند سے ایسے اٹھا جیسے روشنی کے شدید جھماکے کی زد میں آ گیا ہو۔ اسے لگا جیسے ابھی ایک لمحہ پہلے ہی اس نے قریبی گرجے کی گھنٹی سنی ہو۔ لیکن اب تک اچھی خاصی دھوپ پھیل چکی تھی۔ باریک کاغذ کے روشنی چوکھٹے کے سامنے مشرق کی طرف کھلنے والے سلائڈنگ دروازے کی جالی تک تاریک تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ غالباً اس کے سر کی خفیف جنبش کے سبب اس کے نتھنوں سے ہندوستانی روشنائی کی موہوم سی خوشبو ٹکرائی۔ یہ ضرور تائیوان کی روشنائی میں ملی ہندوستانی روشنائی کی بو ہوگی جو پروفیسر پاک نے اسے تحفتاً پیش کی تھی۔ پروفیسر پاک اپنے تئیں خود کو اس کا شاگرد ظاہر کرتا تھا اور گزشتہ بہار میں جنوب مشرقی ایشیا کے دورے سے لوٹا تھا۔ اس تحفے نے اس کی زندگی میں خوشی لانے

MashalBooks.com

کی بجائے اسے اداس کر دیا تھا کیونکہ کوجوک بیماری کے سبب بستر سے لگ چکا تھا اور اب برش اور روشنائی کے استعمال سے قاصر تھا۔ لہٰذا جب پروفیسر نے اس سے کہا کہ اس نے یہ خاص روشنائی اس کے لیے خریدی ہے تاکہ وہ کم ازکم اس کی مہک سے لطف اندوز ہو سکے تو کوجوک نے اسے بری طرح جھاڑتے ہوئے کہا تھا کیا وہ ابھی سے اسے مردہ سمجھتا ہے ۔ لیکن خوشبو اسے بھلی ضرور لگی ۔ اس کی بیٹی چوسو(Ch`usu) روزانہ صبح اس روشنائی کے پتھر کو رگڑتی تاکہ سارے کمرے کا ماحول واقعی کسی خطاط کے کمرے کا ماحول لگے۔ کوجوک اپنی بیٹی کی اس مروت اور روشنائی کی خوشبو دونوں کو یکساں طور پر سراہتا تھا۔

روشنائی کی خوشبو نے کوجک پر یہ حقیقت آشکار کی کہ چوسو کمرے کا چکر لگا چکی ہے۔ روشنی کے جھماکے کا احساس غالباً اس وقت ہوا تھا جب چوسو نے باہر جانے کے لیے کاغذی دورازہ کھولا تھا ۔کوجوک نے اٹھنے کی کوشش کی ۔ اٹھنا اس کے لیے آسان نہ تھا کیونکہ اس کا تقریباً آدھا دھڑ نیم مفلوج ہو چکا تھا۔ اس نے کسی کو بلانے کا سوچا پھر یہ خیال ترک کر کے کروٹ بدل لی ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے سکون، خاموشی اور اس کی تنہائی میں مخل ہو اس کی صحت اور آرام کے بارے میں الٹے سیدھے سوال کر کے اسے پریشان کرے ۔ چھت پر بنے پلائی وڈ کے نقوش پر نظریں جمائے ہوئے کوجوک نے کتنی مرتبہ یہ سوچا تھا کہ صبح کے وقت جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اپنے پاس کسی کو نہیں پاتا ۔ ہاں اس کے آس پاس کوئی نہیں ہوتا ۔ یہ سب کچھ کئی سال پہلے اس کے بچپن میں شروع ہوا تھا ۔ جب وہ پانچ یا چھ سال کا تھا تو ایک صبح وہ اٹھا اس کی نظر ایک کھڑکی پر پڑی جو کاغذ سے ڈھانپی ہوئی تھی ۔ اس نے باہر مدھم سسکیوں کی آواز سنی ۔ وہ تنہائی کے احساس سے رونے والا تھا کہ اس کی ماں اندر داخل ہوئی اور بے ہوش ہو کر اس کے اوپر گر گئی ۔ اس کی ماں کے جسم پر سفید لبادہ تھا اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے ۔ پھر سات یا آٹھ سال کی عمر میں ایک اور صبح وہ رات کو جب سونے کے لیے لیٹا تھا تو اپنی ماں کے پہلو میں تھا لیکن صبح اٹھتے وقت ماں وہاں نہیں تھی ۔ چند لمحے بعد وہ کمرے میں چھائے سکوت سے ڈر کے باہر بھاگنے کو تھا کہ اس کی نانی اماں اندر داخل ہوئیں اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔

اب اس کا کیا ہوگا؟ وہ بھاگ گئی تجھے چھوڑ کر اور ابھی سوگ کے دن بھی پورے نہیں ہوئے تھے ۔...... اس کے بعد جب وہ اپنے چچا کے ہاں رہنے لگا تو ہر صبح وہ چچا کے مطالعہ کے کمرے میں تنہا جاگتا

MashalBooks.com

۔کمرہ کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔اس کی چچی بیماری کے سبب زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارتی اور اس کا چچا گھر کی بجائے اکثر راتیں گھر سے باہر ہی گذارتا۔......

جب کوجوک اپنے بچپن کے بارے میں سوچتا تو وہ دن یاد کیے بغیر نہ رہ سکتا جب اچانک اسے اس زندگی میں دھکیل دیا گیا تھا۔کتنی دہائیاں پہلے کی بات تھی۔کوجوک اس وقت دس برس کا تھا جب اس کا چچا اسے سوکڈم (Sokdam) کے ویرانے گھر میں لے گیا۔شاید یہ بھی بوڑھی عمر کا خاصہ ہے کہ بھولے بسرے ماضی کی بعض یادیں واضح ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔پچھلی دو دہائیوں کی نسبت اب کوجوک اپنے بوڑھے استاد کو زیادہ واضح طور پر یاد کر سکتا تھا۔جب ان کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس کا استاد صرف چالیس برس کا تھا۔لیکن غربت کے سبب بوڑھا اور خستہ حال دکھائی دیتا تھا۔

''میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔میں یہ بوجھ صرف آپ کو سونپ سکتا ہوں اگر میں ملک سے باہر نہ جا رہا ہوتا تو میں اس لڑکے کو اپنے ساتھ رکھتا اور مقدور بھر اس کی دیکھ بھال کرتا۔'' اس کے چچا نے کہا' جو شنگھائی جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔''میں اپنی بیمار بیوی کے ساتھ ساتھ یہ بوجھ اپنے سسرالی رشتہ داروں پر نہیں لاد سکتا۔براہ کرم مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسے آپ کے حوالے کر دوں۔یہ میرے مرحوم بڑے بھائی کا اکلوتا بیٹا ہے۔......''

سوکڈم جو سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔بولا اچھا تو تم شنگھائی جانے کا سوچ رہے ہو۔کیا تم جانتے ہو وہاں حالات کیسے ہیں۔میں نے سنا ہے کہ اگرچہ عارضی حکومت کے پاس دفتر کا کرایہ دینے جوگی رقم بھی نہیں لیکن ہر وقت ان کے ہاں معمولی معمولی باتوں پر تکرار ہوتی رہتی ہے۔اور پھر تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ ہمارے استاد چوآن گینگ (Ch`un`gang) ابھی تک وہیں ہیں۔

لیکن یہاں بھی کون سی امید باقی ہے تم اسے رکھو گے یا نہیں۔سوکڈم ننھے کوجوک کو کافی دیر غور سے دیکھتا رہا۔پھر ایک آہ بھر کے بولا۔

''میں اسے خوراک اور لباس مہیا کر سکتا ہوں۔لیکن ایک بچے کی دیکھ بھال کے لیے بس یہی کافی نہیں۔''

آپ کا شکریہ سوکڈم۔بس میں یہی چاہتا ہوں۔اس کی تعلیم کی فکر نہ کیجئے۔خدا جانے یہ ملک کب تک رہے گا۔اس لئے تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہے میں نے اسے پڑھنا سکھا دیا ہے۔آج کے دور

میں اتنا بہت ہے'' پھراس کے چچانے اسے مخاطب کیااور کہا۔

''اس بھلے آدمی کوسلام کرو۔ یہ تمہارے استاد سوکڈم ہیں۔ جب تک میں تمہیں واپس لینے نہ آؤں۔انہیں اپنے باپ کی جگہ سمجھو''

لیکن اس کا چچا کبھی نہ لوٹا۔ کئی سال بعد۔ تقریباً 20 سال بعد کوجوک نے سنا کہ اس کا چچا آزادی کے بعد آنے والی عبوری حکومت کا رکن ہے۔ تاہم جب اگلے سال کوجوک اس کی تلاش میں سیول گیا تو وہ اسے نہ ڈھونڈ سکا۔ سوکڈم کوجوک کے چچا کا بچپن کا دوست تھا۔ انہوں نے ایک ہی استاد سے تعلیم پائی تھی۔ اور سوکڈم یونگ نام (Yongnam) موجودہ کیونگ سانگ (Kyongsang) کے علاقے کے عظیم کنفیوشسی عالم کا جانشین تھا۔ اس کا شمار سابقہ یائی (Yi) خاندان کے تین عظیم خطاطوں اور مصوروں میں ہوتا تھا۔ اور یہ سب اس کی نمایاں اور روح کو ہلا دینے والی خطاطی اور مصوری کے سبب تھا۔ لیکن عظیم چوسا (Ch`usa) سوکڈم کے استاد چوآن گینگ نے ہمیشہ جس کی مخالفت کی تھی کہ وہ آرٹسٹ سے زیادہ ایک عالم تھا۔ جب اس کا چچا چلا گیا تو اس کے استاد نے پہلا سوال کیا۔ ''تم نے کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟''

''میں نے بچوں کا قاعدہ پڑھ لیا ہے۔''

''پھر بچوں کی کتاب Minor Learning پڑھو۔ اگر تم نے یہ نہ پڑھی تو تم نہیں جان پاؤ گے کہ دنیا سے کیسے مقابلہ کرنا ہے۔''

بس اتنا ہی ہوا۔ سکول کے کمرے میں آدھی درجن طلباء کے ساتھ اس نے بار بار بچوں کی کتاب پڑھی لیکن استاد نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ پھر جب وہ تیرہ سال کا ہوا تو استاد اسے غیر متوقع طور پر قریبی پرائمری سکول لے گیا۔'' وقت بدل چکا ہے۔ تمہارے لیے کچھ نئی چیزیں سیکھنے میں ابھی دیر نہیں ہوئی۔'' استاد نے صرف یہی وضاحت پیش کی۔ اس طرح کوجوک نے ابتدائی سکول کی تعلیم حاصل کی۔ اس بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ استاد اسے اپنا شاگرد نہیں بنانا چاہتا تھا۔

جب کوجوک نے اپنے استاد کو یاد کیا تو اس کی نظریں دیوار پر لگی اپنے استاد کی خطاطی پر جم گئیں۔ مفلسی کے وقت میں لکھی ہوئی تحریر طویل عرصہ کسی فریم میں نہیں لگائی گئی تھی اس کا کاغذ زرد پڑ چکا تھا اور سرخ روشنائی زردی مائل ہو چکی تھی لیکن استاد کی کارکردگی ابھی تک زندہ اور جاندار تھی۔ اس نے

MashalBooks.com

لکھا تھا۔ ''سنہری قفس سمندر کو چیرتا ہے اور ہاتھی دریا کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔''

سوکڈم کا اکلوتا بیٹا ہیضے سے مر گیا تھا اور سوکڈم نے اس کی جگہ کسی کو اپنا چیلا نہیں بنایا تھا۔ اس لئے اپنے استاد کی وفات کے بعد کوجوک نے ٹوٹے پھوٹے مکان کی دیکھ بھال کی اور اپنے استاد کی خطاطی کے بہت سے نمونے اور قلمی تصویریں ترکے میں پائیں۔ لیکن اپنی طویل آوارہ گردی اور خانہ جنگی کے سبب اس کے پاس اپنے استاد کے کام میں سے اب مٹھی بھر چند چیزیں بچی تھیں۔ بیمار پڑنے کے بعد کوجوک کو افسوس ہوا کہ دوسری دنیا میں جا کر وہ اپنے استاد کو کیا منہ دکھائے گا۔ اسے اپنے استاد کے کام کو نظر انداز کرنے کا احساس جرم بھی تھا۔ تاہم دیوار پر آویزاں خطاطی کا نمونہ اس کے استاد کا ایسا شاہکار تھا جسے وہ نظر انداز کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس خطاطی میں اس کے استاد کا وہ اصول پوشیدہ تھا جس سے وہ دہشت زدہ بھی تھا اور اسے اپنا کر اس میں سبقت بھی لے جانا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ اب جب وہ خطاطی کرنا یا مصوری کرنا ترک کر چکا تھا تو اسے یوں لگتا تھا کہ تحریر کے نمایاں حروف سے اس کے استاد کی خشمگیں آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔

جب وہ ستائیس برس کا تھا تو ایسا ہوا کہ ایک دن اپنی لیاقت کے احساس برتری میں وہ اپنے استاد کو کچھ بتائے بغیر اس کے گھر سے نکل بھاگا۔ کہنے کو وہ اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا مادی ثبوت پیش کرنا چاہتا تھا لیکن حقیقت میں وہ اپنی صلاحیت کی نمائش کے مواقع تلاش کر رہا تھا۔ بعد کے تین ماہ اس کے لیے واقعی پذیرائی کا وقت تھا۔ اس نے چوک پا (Chokpa) میں خطاطی کا اعلیٰ ترین انعام جیتا۔ کنفیوشی مکتب فکر کی اکیڈمیوں نیریانگ Naeryong چانگھا Ch`ongha تسان Tusan اور یانگ نام کے دوسرے علاقوں میں وہ مہمان رہا۔ کئی مرتبہ وہ کروڑ پتیوں کے ہاں رہا اور زمینی فضائی اور آبی نعمتوں سے بھرپور دعوتیں اڑائیں۔ اس کے خیال میں وہ کامیابی کی راہ پر گامزن تھا۔ جب وہ تین ماہ بعد اپنے استاد کے گھر لوٹا تو اس کے ساتھ چاولوں کی ایک بہت بڑی بوری تھی جسے اٹھانے کے لیے اس نے ایک قلی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے استاد نے سرد مہری سے اس کا استقبال کیا۔

سوکڈم نے دروازہ بند کر کے قلی سے کہا اسے نیچے رکھ دو۔ پھر وہ کوجوک کی طرف مڑا۔ ''اپنا برش بیگ اٹھاؤ اور چاولوں کے تھیلے پر رکھ دو۔''

اس کی آواز ایسی تھی کہ احتجاج یا انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ کوجوک نے برش بیگ کاندھے

MashalBooks.com

سے اتار کر چاولوں پر رکھ دیا۔ استاد نے اپنی آستین سے ماچس برآمد کی اور ان سب چیزوں کو آگ لگا دی۔

"استاد محترم۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

سوکڈم کا جواب برف کی مانند سرد تھا۔ "میں نے تمہارے چچا کے کہنے پر تمہاری ذمہ داری لی تھی تاکہ تم میرے گھر میں رہو کھاؤ پیو لیکن اب پھر کبھی مجھے اپنا استاد نہ کہنا۔ میں نے کبھی کسی ایسے اناڑی کو نہیں سکھایا جو صبح سیکھتا ہے اور شام ہوتے ہی اپنی مہارت کی نمائش لگا دیتا ہے۔"

کوجوک کو دو سال تک سخت کفارہ ادا کرنا پڑا۔ جب کہیں جا کے اس کے استاد نے اسے معاف کیا۔ یہ کفارہ اس سے کہیں مشکل تھا جو کچھ اس نے شاگرد بننے کے لیے برداشت کیا تھا۔ یہ خطاطی کا نمونہ جو دیوار پر آویزاں تھا اس کے استاد نے اسی دن اس کے لیے تحریر کیا تھا جس یادگار دن اسے معافی ملی تھی۔ اس کا مطلب تھا۔ برش سے لکھتے ہوئے آپ میں سنہری قفس کا جذبہ ہونا چاہئے جو سمندروں کو چیرتا ہے اور اژدھا کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور کمال میں وہ اس دیومالائی ہاتھی کی قوت کا حامل ہوتا ہے جو گزرتے وقت دریا کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔

پہلی دفعہ جب استاد نے کوجوک کو اپنی شاگردی میں قبول کیا تھا اس کی تلخ یاد بھی کوجوک کے حافظے میں محفوظ تھی۔ غالباً کسی اندیشے کے سبب سوکڈم کا برتاؤ کوجوک کے ساتھ ہمیشہ نپا تلا اور سرد مہری کا ہوتا تھا۔ اس کا سبب یہ بالکل نہ تھا کہ کوجوک اس پر ایک مالی بوجھ تھا۔ عالم ہونے کے باوجود سوکڈم کی زمینی جائیداد بہت تھوڑی تھی اور گھر کا خرچ شاگردوں کے والدین کی طرف سے حاصل ہونے والے چاولوں پر چلتا تھا۔ لیکن اس رویے کی کوئی اور انتہائی گہری وجہ تھی کیونکہ یہ رویہ اس وقت بھی نہ بدلا جب کوجوک جوان ہو کر کھیتوں میں کام کر کے استاد کے خاندان کے لیے ایک مددگار کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کی ضرور کوئی وجہ تھی کہ سوکڈم نے کوجوک کو بچوں کی کتاب کئی سال بار بار پڑھائی پھر اسے تیرہ سال کی عمر میں جدید مضامین پڑھنے سکول بھیجا' بجائے اس کے کہ وہ خطاطی اور مصوری سکھاتا۔

اگر اس کی طرف استاد کا رویہ ناقابل فہم تھا تو استاد کے لیے اس کے اپنے احساسات بھی سمجھ سے بالاتر تھے۔ استاد کی عمر کے آخری لمحات تک کوجوک کو استاد سے ناقابل بیان لگاؤ بھی تھا اور شدید نفرت بھی۔ ذہن کی یہ کیفیت سمجھ میں آنے والی نہ تھی جو اس کے تیرہ برس کی عمر میں سکول داخل ہونے

سے لے کر 16 برس کی عمر میں باضابطہ شاگرد بننے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان دوسالوں میں اس نے اپنے ایک دور کے عزیز کی اس پیشکش کو ٹھکرادیا کہ وہ ہائی سکول میں داخلہ لے کران جدید علوم سے بہرہ ور ہو جو ملک میں چھائے جارہے تھے اور بدلتی دنیا کے لیے ضروری تھے۔ اس نے اپنے استاد کے گھریلو کام کاج کرنے اور کھیتوں کے کام کو ترجیح دی۔ وہ استاد کی بچی کھچی زمین پر بذات خود کھیتی باڑی کرتا اور ایندھن کی لکڑی اکٹھی کرنے کے لیے میلوں مارا مارا پھرتا۔ اردگرد کے لوگ اس کی وفاداری کی تعریف کرتے لیکن اس کے دل میں اپنے استاد کے لیے محبت ونفرت کے ملے جلے جذبات دہک رہے تھے۔ استاد کا طرز زندگی جو بظاہر پرسکون صاف ستھرا اور شفاف دکھائی دیتا تھا جیسے خزاں کی وادی میں کوئی ندی یا جیسے برف سے ڈھکے کھیتوں پر پھیلا سرما کا آسمان' اسے بے نام سی کشش اور انجانے سے اندیشے میں مبتلا رکھتا۔ استاد جب خطاطی کی میز کے سامنے اپنے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ سجائے بیٹھتا۔ یا جب پائیں باغ میں گلاب کی جھاڑی کے نیچے بیٹھا کوہستانی دیوتا کی مانند نسطور بجار ہا ہوتا تو اس کی زندگی قابل احترام لگتی۔ لیکن جب کوجوک اپنے استاد کی مفلسی اس کے انحطاط پذیر گھر جہاں چند طلباء اور کبھی کبھار کچھ بزرگ لوگ آتے جاتے تھے یا پھر کھیتوں سے لوٹتے ہوئے استاد کی بے بس نظروں کا سوچتا تو خیال کرتا کہ اس کے استاد کی قسمت بہت بری ہے۔ وہ ارادہ کرتا کہ ہر قیمت پر ایسے حالات سے چھٹکارا پائے گا۔

تاہم کوجوک کی زندگی کو متاثر کرنے میں استاد کی محبت وعقیدت بالآخر کامیاب ہوئی۔ نئے علوم اور جدید دنیا کی ترغیبات سے اجتناب کرتے ہوئے کوجوک نے چھپ چھپا کر اپنے استاد کے کام کی نقل کرنا شروع کردی۔ وہ بنیادی طرز سیکھنے کے لیے اپنے استاد کی طرف سے پھینکے ہوئے خطاطی کے ٹکڑوں کو بطور نمونہ استعمال کرتا۔ بعض اوقات وہ یہ نمونے اپنے استاد کی دراز سے چرا لیتا۔ جب اس نے ان برسوں کی خفیہ مشق کو یاد کیا تو اس بڑھاپے میں بھی خوف کی لہر اس کے سینے میں دوڑ گئی۔ کاغذ اور برش نہ ہونے کے سبب وہ ان چھوٹے چھوٹے حروف کی مشق اپنے بنائے ہوئے چاک بورڈ پر کرتا تھا۔ اور بڑے حروف کی مشق کے لیے وہ لوگوں کے مقبروں پر رکھی پتھر کی سلوں پر روایتی برش سے لکھتا۔ بعد میں وہ ان حروف کو مٹا دیتا۔ اس نے اپنے لیے کاغذ اور برش پہلی دفعہ لکڑیوں کا ایک گٹھا بیچ کر اپنے استاد سے چوری چھپے خریدے۔

اس نے سنا کہ سوکڈم نے اس کے اس عمل کو اس کی انا پرستی قرار دیا۔ وہ اپنے استاد کے ساتھ

ایک ہی گھر میں رہتا اور دن رات اس کی نظروں کے سامنے ہوتا لیکن اس نے ایک بار بھی استاد سے اس کا چیلا بننے یا اس کی شاگردی میں لیے جانے کو نہیں کہا۔ حتیٰ کہ اس جیسا خطاط یا مصور بننے کے بارے میں بھی کبھی ایک لفظ تک نہیں بولا۔ یہ ضرور اس کی فن کارانہ انا تھی۔ ایک جبلی انا جو ہر جینیس میں ہوتی ہے۔ تب ایک دن ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کے استاد کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے اپنا شاگرد بنا لے یا ہمیشہ کے لیے دھتکار دے۔ استاد اور اس کی بیوی صبح سویرے کہیں چلے گئے تھے اور کوجوک نے اپنے استاد کے مطالعہ کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے عجیب سا جذبہ محسوس کیا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی اب تک کی مشق کو کاغذ پر آزمائے تاکہ معلوم ہو کہ وہ کہاں تک سیکھ پایا ہے۔ اس کا استاد شاعری کے ایک مقابلے میں شرکت کے لیے میلوں دور ایک قصبے میں گیا ہوا تھا اور آج اس کی واپسی متوقع نہ تھی۔

اس نے لکھنے کی میز لگائی اور روشنائی والے پتھر پر روشنائی کی ٹکیا رگڑی۔ اس نے یہ احتیاط کی کہ روشنائی کا کوئی قطرہ پتھر کے کناروں پر نہ لگے۔ جب دوات روشنائی سے بھر گئی تو اس نے سٹیشنری والے خانے سے برش اور عمدہ کاغذ نکالے۔ پہلے اس نے شاعر و خطاط ین چن چنگ کے چوکور طرز تحریر کی کاغذ پر نقل کی۔ چونکہ چوسالائی چوآن خط کو قدیم طرز کی مشق کے لیے اہم سمجھتا تھا اس لیے سوکڈم ہمیشہ اپنے طلباء کو سب سے زیادہ مشق شانگ ہو خط کی کرنے کو کہتا۔ جیسے ہی کوجوک نے اصل کے قریب قریب لکھنے میں کامیابی حاصل کر لی پھر اس نے چن۔ لی کو ین چن چنگ طرز میں نقل کیا۔ اگرچہ اس کوشش میں اسے دانتوں پسینہ آ گیا تاہم وہ سرمستی کی سی کیفیت میں کھو گیا۔

ابھی اس نے وانگ سی چی کی لان تنگ شو کی پہلی سطر ہی لکھی تھی کہ ایک اچانک زوردار چیخ اسے سرمستی کی کیفیت سے باہر لے آئی ''رک جاؤ، تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی۔''

اس کی خوفزدہ نظروں کے سامنے سوکڈم کا سراپا تھا جو تاریک کمرے میں اسے گھور رہا تھا۔ اگرچہ آواز بہت سخت تھی تاہم استاد کے چہرے پر غصے سے زیادہ بے تابی اور قبولیت کا رنگ تھا۔ استاد کے پہلو میں انگوک کھڑا تھا جسے ہفت پہلو جو ہر قابل پکارا جاتا تھا کیونکہ اسے شاعری، خطاطی، نقاشی، کھیلوں، نجوم، طب اور ہیئت میں کمال حاصل تھا۔ انگوک دلچسپی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

کوجوک نے فوراً سارے کمرے میں بکھرے کاغذ سمیٹے۔ سوکڈم اب اسے ڈانٹنے کی بجائے خالی خالی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی بجائے انگوک بولا ''انہیں یہیں رہنے دو۔''

MashalBooks.com

کوجوک نے خودکار انداز میں کاغذوں کا بنڈل رکھا اور کمرے سے نکل آیا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کمرے کے قریب دبے پاؤں جانے اور اندر ہونے والی باتیں سننے سے نہ روک سکا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

اسی دوران کمرہ روشن ہوا۔ طویل وقفے تک کاغذوں کی سرسراہٹ کے سوا اندر سے اور کوئی آواز نہ آئی پھر انگوک نے خاموشی توڑی ''کیا واقعی تم نے اسے کبھی نہیں سکھایا؟''

سوکڈم نے اداسی سے بھری کمزور آواز میں جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے اس نے مجھے دوسروں کو سبق دیتے دیکھا ہو لیکن بلاواسطہ میں نے اسے کبھی نہیں پڑھایا۔

''پھر یہ واقعی حیرت انگیز بات ہے۔ وہ پیدائشی جینیس ہے۔''

سوکڈم کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ''تم اسے اپنا شاگرد کیوں نہیں بنا لیتے۔''

''اگر کسی کا کردار درست نہ ہو تو اس کو تعلیم نہیں دینا چاہیے کیا تمہیں وانگ سی شی کا مشہور اصول یاد نہیں۔'' ''کیا تمہارا مطلب ہے اس لڑکے کا کردار گھٹیا ہے۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس لڑکے کی لیاقت اس کے کردار سے بڑھ کر ہے۔ یہ لڑکا ان لفظوں کو لکھ سکتا ہے جن کے معنی اسے نہیں آتے۔ اور اصول جانے بغیر خطاطی کی مختلف طرز میں نقل کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا پیدائشی فنکار ہے جس کی عظمت کے راستے پر اس کی بے بہا لیاقت پہرے لگائے بیٹھی ہے۔''

''یہ تمہاری شرافت طبع سے بعید ہے کہ اتنے سے بچے کے ساتھ اس قدر درشت رویہ رکھو۔ تم یہ سب خامیاں اپنی تربیت کے ذریعے ختم کیوں نہیں کر دیتے۔''

''یہ آسان نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس لڑکے میں نہ تو احساس کی گہرائی ہے اور نہ ہی عظمت۔''

''یہ لڑکا تمہاری شاگردی میں آنے کے بعد احساسات کی گہرائی اور کردار کی عظمت سے خالی نہیں رہ سکتا۔ میرے خیال میں اسے تربیت دینے سے انکار درست نہیں۔''

''میں نے صرف اس کی خوراک اور لباس کی ذمہ داری لی ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ جدید علوم کے ذریعے یہ خود اپنی دیکھ بھال کے قابل ہو جائے۔''

''تم اتنے بے رحم کیوں ہو۔ تم تو ایک اجنبی کو بھی سکھانے سے انکار نہیں کرتے۔ پھر تم اس

MashalBooks.com

لڑکے پر اتنے نامہربان کیوں ہو جو سات آٹھ سال سے تمہارے ہی گھر کا ایک فرد ہے؟ میں نے سنا ہے پچھلے دو سال سے وہ تمہارے لیے ایک مددگار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔تم اس پر رحم کھا کر اسے اس کی وفاداری کا صلہ دینے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟''

انگوک کی آواز تلخ تھی ضرور اس نے بھی بوڑھے استاد اور اس کے غیر شاگرد لڑکے کے عجیب وغریب رشتے کے بارے میں سن رکھا ہوگا۔

مجھے اس کا الزام مت دو میں سچ بتاؤں خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس لڑکے کو سکھانے سے انکار کیوں کرتا ہوں۔ میں اسے دیکھتا ہوں کہ قسمت کی خرابی نے ہمیں یکجا کر دیا ہے۔'' سوکڈم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس صورت میں اسے میں پڑھاؤں گا۔تم اسے ہر تیسرے دن میری طرف بھیج دیا کرو۔ میرا نہیں خیال کہ اب کوئی وہ دوسرا پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔''

طویل وقفے تک خاموشی چھائی رہی پھر سوکڈم کی مدہم مگر پرعزم آواز ابھری۔''یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اسے سکھانے کی کوشش کروں گا۔''

سوکڈم نے جب کہا کہ قسمت کی خرابی نے ہمیں یکجا کر دیا ہے تو اس کا مطلب کیا تھا؟ پھر اس نے اس کے باوجود اسے اپنا شاگرد بنانے کا فیصلہ کیوں کیا۔ اگلے روز کوجوک سوکڈم کا باقاعدہ شاگرد بن گیا۔ ایسا نہ تھا کہ شاگردی میں لینے کی کوئی تقریب ہوئی ہو یا ایسی کوئی اور بات۔ کوجوک پیٹھ پر تھیلا لادے کھیتوں کو جانے ہی والا تھا جب سوکڈم نے اسے پکارا۔

سوکڈم نے عام سی آواز میں کہا:''اب کھیتوں پر نہ جایا کرو۔''

اور جب کوجوک کھڑا ان لفظوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا تو سوکڈم نے تیز آواز میں کہا۔''یہ سامان نیچے ڈالو اور مطالعہ کے کمرے میں آجاؤ۔''

یہ کوجوک کے لیے سوکڈم کی شاگردی کا افتتاح تھا۔

کوجوک کاغذی دروازے کے کھلنے کی آواز سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔اس نے اپنی آنکھوں پر زور دے کر دیکھا تو اسے ماہیانگ اندر آتی نظر آئی۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر اترتی محسوس ہوئی اور اس کی نگاہیں روشن ہونے لگیں۔ اسے کون سی مصیبت یہاں لے آئی ہے؟ کوجوک نے

ندامت آمیز نظروں سے ماہیا نگ کو دیکھا۔لیکن یہ ماہیا نگ نہیں تھی۔

''بابا آپ جاگ رہے ہیں۔''

یہ چوسو تھی۔اس کے میک اپ سے عاری چہرے پر گہری تشویش تھی۔کوجوک نے پوری قوت سے اٹھنے کی کوشش کی۔ چوسو نے اس کی کوشش کو بھانپ لیا۔تیزی سے اسے اٹھنے میں مدد دی اور اس کی پیٹھ کے پیچھے تکیہ لگا کر اسے دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔کوجوک نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گزشتہ روز کی نسبت آج اسے حرکت کرنے میں زیادہ مشکل پیش آ رہی ہے۔

چوسو نے پوچھا''آپ جوس پئیں گے؟''

جواب دینے کی بجائے اس نے ایک لمحہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر پوچھا''کیا تمہیں اپنی ماں یاد ہے؟''

چوسو نے حیرت سے اسے دیکھا۔اگر چہ اس کی تیسری بیوی کی وفات کے بعد سات سال سے چوسو اس کے ساتھ تھی اور اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی لیکن آج پہلی دفعہ کوجوک نے اس کی ماں کا ذکر کیا تھا۔دراصل چوسو کے آنے سے بہت پہلے وہ ماہیا نگ کا نام لینا ترک کر چکا تھا۔

''میں نے صرف اس کی تصویر دیکھی ہے۔''

بے چاری اور کس طرح اپنی ماں کو جان سکتی تھی۔وہ تو اس کی پیدائش پر ہی اسے نانا نانی کے پاس چھوڑ کر چلی گئی تھی اور دو سال سے پہلے خودکشی کر لی تھی۔

''لیکن کیوں بابا؟''

''ابھی مجھے ایسا لگا جیسے یہ تم نہیں تمہاری ماں ہے۔''چوسو خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ بڑھاپے تک زندہ رہتی لیکن اس نے جلدی دنیا کیوں چھوڑ دی۔''

چوسو نے جب اس کے چہرے پر اداسی دیکھی تو اس کا اپنا چہرہ نرم پڑ گیا جو پہلے ماں کے ذکر سے سخت ہو گیا تھا۔

''کیا میں نارنگی کا جوس لاؤں؟'' غالباً موضوع بدلنے کے لیے چوسو نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے دل سے نکالنے کے لئے جلدی سے کہا۔''اگر چائے ہے تو مجھے لا دو۔''چوسو نے ہوا

کے لیے چند لمحے کھڑکی کھولی اور پھر چلی گئی۔

کس جذبے نے مجھے اتنا پاگل بنا دیا ہے؟ چوسو کی لائی ہوئی چائے پیتے ہوئے کوجوک نے ماہیانگ سے اپنی پہلی ملاقات یاد کی۔ 35 برس کی عمر میں اپنے استاد کے پاس سے وہ دوسری مرتبہ بھاگا تو کوجوک تقریباً 10 سال ادھر ادھر پھرتا رہا۔

اگرچہ چین اور جاپان کی 1938 کی جنگ کے دن تھے لیکن کنفیوشی اکیڈمیاں اور دانشوروں کے حلقے ابھی تک موجود تھے۔ شاعری اور خطاطی کے مقابلے اب بھی ہوتے تھے۔ یا تو سابقہ یائی خاندان کے تین نامور خطاطوں میں سے سوکڈم کے باقاعدہ شاگرد کی پہچان کی وجہ سے یا پھر نیشنل آرٹ مقابلہ جیتنے کے سبب جس میں اس نے سوکڈم کی مخالفت کے باوجود حصہ لیا تھا' اس کا گھومنا سودمند رہا۔ اگرچہ وقت سازگار نہ تھا۔ مہینے میں کم از کم ایک بار وہ کہیں نہ کہیں کسی تقریب میں مہمان ہوتا۔ اور ہر شہر یا قصبے میں کوئی مقامی رئیس اس کی مصوری یا خطاطی کے ایک نمونے کے بدلے اسے ایک ماہ کا زادِ راہ دے دیتا۔ ایک دفعہ پھرتے پھراتے وہ چن جو جا نکلا۔ تقریباً دس دن کے آرام اور عیش کے بعد وہ شہر سے جانے والا ہی تھا کہ ایک رکشہ اس کی سرائے کے سامنے رکا اور اسے اندر بیٹھنے کو کہا گیا۔ ایسا اس کے ساتھ پہلی بار نہ ہوا تھا۔ رکشہ اسے ایک ریستوران لے گیا۔ وہاں ایک کمرے میں کچھ جاپانی اور کورین لوگ انواع و اقسام کی نعمتوں سے لبریز میز کے اردگرد براجمان تھے۔ وہ مقامی دفتروں کے سربراہ تھے اور کوریائی علاقے کی بااثر شخصیات تھے جب مہمان اور میزبان نشے میں دھت ہوئے تو ان کی تفریح کی غرض سے بلائی جانے والی لڑکیوں میں ماہیانگ بھی تھی۔ جب ہر آدمی مخمور ہو گیا تو کوریا ڈویلپمنٹ کمپنی کے ایک افسر نے جو آج کی تقریب کا میزبان لگتا تھا۔ کہا ''کون لڑکی آج رات کے اس معزز مہمان کو خوشگوار خواب مہیا کرے گی؟''

تفریح مہیا کرنے والی لڑکیاں ایک لمحے کو کھلکھلائیں۔ پھر ان میں سے ایک اس کی جانب آئی اور اپنی سرخ اسکرٹ اوپر کو اٹھا دی۔ نیچے ایک طویل شمیض ظاہر ہوئی۔ جو عمدہ ملبری کاغذ کی مانند سفید تھی۔ وہ لڑکی 22 سال کی لگتی تھی۔ وہ نہ تو بہت زیادہ خوبصورت تھی نہ ہی مدہوش کر دینے والی ادائیں رکھتی تھی پھر بھی اس میں نامعلوم سی کشش تھی۔ اپنا برش والا تھیلا کھولتے ہوئے اسے لگا کہ شراب اس کے دماغ میں ہلکورے لے رہی ہے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ماہیا نگ۔ آلو بخارے کی خوشبو۔'' اس لڑکی کی آواز فطری اور صاف تھی۔ وہ گڑ بڑا گیا۔

''پھر مجھے تو آلو بخارے کا درخت پینٹ کرنا چاہیے۔'' اس نے عام سے انداز میں کہنے کی کوشش کی۔ لیکن تصویر بنانے کی کوشش میں اس کے ہاتھ لرزا ٹھے۔ جو درخت اس نے بنایا اسے وہ خود نہ سمجھ سکا کیونکہ لڑکی کی شمیض پر جو درخت اس نے بنایا بالکل اس کے استاد کا بنایا ہوا لگتا تھا۔ یہ ایک جھکا جھکا مڑا تڑا درخت تھا جس پر اکا دکا ان کھلی کلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ لکھا فقرہ بھی اس کے استاد کا تھا۔

''اگرچہ آلو بخارہ تمام عمر سرد رہتا ہے لیکن اپنی خوشبو بیچتا نہیں۔''

بظاہر یہ درخت لڑکی کے نام کے لیے ایک نذرانہ تھا۔ لیکن ایک جھکا ہوا مڑا تڑا درخت اور اس طرح کا فقرہ نوآبادیاتی حکومت میں ایک طوائف کی شمیض کے لیے کس طرح موزوں تھا؟ لیکن اس کو شرمندہ کرنے والی بات بعد میں ہوئی۔

جب وہ اپنی مصوری پر اپنی مہر ثبت کر چکا تو ماہیا نگ نے پوچھا یہ درخت اتنا تنہا اور سرد کیوں ہے۔

''کیا تم نے کبھی چنگ۔ زو۔ زیاؤ کے باغات میں کوئی ایسا آرکڈ دیکھا ہے جس کی جڑیں باہر نہ نکلی ہوں۔'' اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ صرف لڑکی سن سکی۔ پھر اس نے سب لوگوں سے وضاحت کی کہ یہ جنوری کا درخت ہے اس لیے اس طرح ہے۔ لیکن ماہیا نگ اس کا مطلب پا چکی تھی۔ زنگ زیاؤ کے باغات کے آرکڈ کی عریاں جڑیں وطن کی خود مختاری چھن جانے کی علامت تھیں۔

اس رات ماہیا نگ بغیر ہچکچاہٹ کے اس کی آغوش میں آ گئی۔

اس رات کے بعد اس نے ماہیا نگ کے ساتھ چار ماہ گزارے۔ وہ چار ماہ اس کی یادوں میں ہمیشہ کی خوشی کے مجرد خیال کی صورت موجود رہے جیسے بچپن میں پھولوں سے ڈھکی کسی پہاڑی پر چڑھنے کی یاد۔ پھر ان کی رفاقت کے دن ختم ہو گئے۔ وہ کوئی ایسا دانشور نہ تھا جو اپنی خطاطی اور مصوری کے ذریعے ادھر ادھر پھر کر اپنا ملک چھن جانے کی تلخی کم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور نہ ہی ماہیا نگ کوئی

شریف کی سنگ جیسی سفید پوش زمانے کی درباری طوائف تھی جس نے دشمن جرنیل کو گرفت میں لے کر دریا میں چھلانگ لگادی تھی۔ کوجوک ایک آرٹسٹ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ جو اپنے آوارہ گردی کے جذبے کو خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ اور ماہیا نگ ایک ایسی طوائف تھی جس کے کاندھوں پر آٹھ لوگوں کے کھانے پینے کی ذمہ داری تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے بغیر کسی تلخی کے اس طرح جدا ہوئے جیسے پہلے سے طے شدہ ہو۔ ماہیا نگ طوائفوں کے احاطے میں واپس چلی گئی اور وہ چوآن جو میں خطاطی کی نمائش دیکھنے چلا گیا۔ یہ ماہیا نگ سے اس کی آخری ملاقات تھی۔

پھر اگلے سال اسے معلوم ہوا کہ ماہیا نگ نے ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ اس وقت وہ سوراک کے پہاڑوں میں ایک مندر میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے ماہیا نگ کو لکھا کہ بچی کا نام چوسو رکھا جائے۔ چوسو یعنی خزاں کی ندی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر یہ نام رکھ دیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کے ذہن میں بچی کے تنہائی سے بھرے مستقبل کے بارے میں کوئی اندیشہ ہو جب اس نے اس کا نام پہاڑ کے شفاف سرد پانی کے حوالے سے رکھا۔

چند سال بعد اسے ماہیا نگ کی موت کی خبر ملی۔ ماہیا نگ ایک رئیس کی رکھیل بن گئی تھی لیکن بیوی کے ظلم کا سامنا نہ کرسکی اور پانی میں بڑی مقدار میں افیون گھول کر پی لی اور اپنی جان خود لے لی۔ غالبًا وہ بہت ہی سنگدل تھا کہ اسے ماہیا نگ کی موت کی خبر ملی تو اسے کوئی صدمہ نہیں ہوا۔ اس نے ایک لمحے کو صرف یہ سوچا کہ ان کی بیٹی کہاں ہوگی۔

وہ چوسو سے اس وقت ملا جب وہ ہائی سکول میں آئی۔ اس وقت وہ اسی شہر میں رہتا تھا۔ ماہیا نگ کے بھائی نے جس کی اپنی بہن کی وجہ سے زندگی کی ابتدا اچھی ہوئی تھی اپنی بھانجی کی ذمہ داری لے لی۔ اس طرح چوسو نہ تو تنہا تھی نہ بے سہارا۔ کوجوک گاہے بگاہے سکول میں اس سے ملنے جاتا تھا کیونکہ اس عمر میں اس کے دل میں ایک خاندان کی خواہش پیدا ہو چکی تھی۔

حال ہی میں باپ بیٹی نے اکٹھے رہنا شروع کیا تھا۔ سات سال قبل کوجوک کے ساتھ رہنے والی عورت وفات پا گئی تھی تو وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس نے اسی شہر میں سٹوڈیو کھول لیا تھا۔ چوسو کا شوہر ویت نام کی جنگ میں مارا گیا تھا بے چاری اس وقت ابھی 26 سال کی تھی۔

چوسو کا لایا ہوا دلیا کھاتے ہوئے جو کسی جڑی بوٹیوں کے جوشاندے کی مانند بے مزہ تھا کوجوک تھوڑا سا اٹھ کر بیٹھا۔ چوسو نے اس کے ہاتھ سے دلیے کا خالی پیالہ لیتے ہوئے اسے سہارا دیا اور پوچھا " کیا آپ آج بھی باہر جارہے ہیں۔''

جانا تو ہوگا۔''

لیکن کل تو آپ کو کچھ ملا نہیں تھا۔ آپ چوہون کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔''

مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔''

چار ماہ قبل جب وہ ہسپتال سے واپس آیا تھا تو اس وقت سے وہ روزانہ اندرون شہر کی تمام آرٹ گیلریوں کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ اسے جب اور جہاں بھی اپنی پینٹنگز ملتی وہ خرید لیتا۔ شروع میں اس کا کوئی واضح مقصد نہ تھا لیکن اب وہ کسی نتیجے پر پہنچ رہا تھا۔

اس کا تعلق اس کی اپنی موت کے اندیشہ سے تھا۔ اگرچہ اس کے ڈاکٹر چونگ نے اسے مکمل صحت کا یقین دلایا تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ اس کا ہسپتال سے فارغ کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اتنے زیادہ لوگ کیوں پوچھنے آتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دن رات اس کی دیکھ بھال کرنے والی اس کی بیٹی کے چہرے پر خوف کا تاریک سایہ کیوں رہتا ہے۔ اس کا معدہ بھی کسی ایسے عضو کی طرح کام نہیں کر رہا تھا جو مکمل صحت یاب ہونے والا ہو۔ اگرچہ تیز اور شدید درد نہیں تھا لیکن وہ اپنے جسم کو خلیہ خلیہ تباہ ہوتے محسوس کر سکتا تھا۔

''کیا چوہون نے فون کیا تھا۔''

چوہون کوجوک کے ایک شاگرد کا پیار کا نام تھا۔ یہ آخری شاگرد تھا جسے پیار کا نام اس نے دیا تھا۔ چوہون کوجوک کے سٹوڈیو میں رہتا تھا۔ اس نے فون پر بتایا کہ وہ آدھے گھنٹے میں آئے گا۔ لیکن بہتر ہے آپ آج گھر پر ہی رہیں۔

''نہیں مجھے ضرور جانا ہے۔ تیار ہونے میں میری مدد کرو۔'' اس نے سخت نظروں سے چوسو کو دیکھا جو اس کی طرف اصرار کرنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کمرے میں چلنے کی کوشش کی لیکن چند قدم چلنے سے ہی چکر آنے لگے اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ چوسو نے اسے پریشانی نظروں سے دیکھا اور جب وہ بستر پر دوبارہ بیٹھ گیا تو وہ باہر چلی گئی۔ کوجوک نے ایک مرتبہ پھر سوکڈم کی خطاطی

پر نظریں گاڑ دیں۔

کیا واقعی بدقسمتی نے اسے اور سوکڈم کو یکجا کر دیا تھا۔ اسے سوکڈم نے اپنی شاگردی میں قبول تو کر لیا تھا مگر وہ دونوں کھنچے کھنچے رہے۔ سوکڈم سبق دینے میں اتنا کنجوس تھا کہ کوجوک کے دل میں ادھیڑ عمری تک اس کی تلخی برقرار رہی۔ اس نے بنیادی چوکور طرز سے سیکھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ برش اٹھاتا سوکڈم نے اسے چوسا کے خطاطی کے اصول یاد کرنے کا حکم دیا جو یہ تھا کہ برش کو سادہ کاغذ پر آزادانہ حرکت کرنے دو۔ سادہ کاغذ خلا کی مانند ہے۔ یہ خلا قطب شمالی سے قطب جنوبی تک پھیلے نادیدہ مدار میں جکڑا ہوا ہے۔ خطاطی اسی اصول پر کام کرتی ہے۔ حروف برش سے لکھے جاتے ہیں۔ برش کو انگلیاں حرکت دیتی ہیں۔ انگلیوں کو کہنی حرکت دیتی ہے۔ کہنی کو بازو حرکت دیتا ہے اور بازو کو کندھا حرکت میں لاتا ہے۔ اور کہنی بازو اور کندھا سب کو جسم حرکت دیتا ہے۔

کوجوک کو چار سو (400) الفاظ کا طویل اصول شروع سے آخر تک زبانی یاد کرنا پڑا۔ پھر استاد نے اسے ین چن چنگ طرز کی ایک کاپی نقل کرنے کو دی۔''

''اگر تم اسے سو دفعہ نقل کرو گے تو تمہیں لکھنا آ جائے گا۔ اگر تم اسے ہزار دفعہ نقل کرو گے تو لوگ تمہاری تعریف کریں گے اگر 10 ہزار دفعہ نقل کرو گے تو تم اس کے ماہر سمجھے جاؤ گے۔''

یہی سب ہدایات تھیں جو اسے ملیں۔ صرف ایک فرق پڑا تھا کہ اب وہ کھلے عام مشق کر سکتا تھا اور ہر دوسرے دن وہ انگوک کی طرف بھیجا جاتا تاکہ وہ چینی کلاسیکی طرز سیکھ سکے۔ پھر تین سال کے بعد استاد نے اس سے کہا۔ اپنی سانس روکو یہ ہدایات تب دی گئیں جب چوکور حروف کی تین ہزار دفعہ مشق کرنے کے باوجود وہ جس طرح چاہتا تھا نہیں لکھ سکتا تھا اور مایوس سا ہو گیا تھا۔

ڈرائنگ کی مشق بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ آرکڈ کی تصویر کشی سکھاتے ہوئے استاد نے اسے شہزادے ریجنٹ تائیوان کی آرکڈ کی ڈرائنگ کاپی دی اور کہا ''تم کئی سال کے مراقبے کے بغیر بیداری نہیں حاصل کر سکتے۔ اور مشق کے بغیر تم اژدھا نہیں مار سکتے۔ اسی طرح سالہا سال کی انتھک مشق کے بعد ہی تم تصویر کشی کر سکتے ہو۔'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔ بعض اوقات استاد اسے مشق کرتے ہوئے دیکھ لیتا۔ لیکن اس نے کبھی اس کے کام پر کوئی مفصل تبصرہ نہیں کیا۔ پھر جب اس کے آرکڈ حقیقی لگنے لگے تو استاد نے یونہی چلتے چلتے تجویز دی۔ ''اسے بائیں طرف سے بناؤ اور پتھر بنانے کے لیے برش کو سطح کے مخالف

حرکت دو۔''

استاد نے اس کی پراگریس پر کبھی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جب اس کو شاگردی میں آئے دس سال ہونے لگے تو اس کے کام کی تعریف اس کے استاد کے دوست بھی کرنے لگے۔ لیکن ان تعریفوں کے جواب میں اس کے استاد کے الفاظ ہمیشہ یہی ہوتے۔

''ہاں اب یہ مناسب حد تک نقل کر سکتا ہے۔''

27 سال کی عمر میں اس نے اپنے استاد کے گھر سے فرار اختیار کیا۔ یہ یقیناً استاد کی اسی سرد مہری کے خلاف احتجاج تھا۔ لیکن جتنا زیادہ لوگوں کی طرف سے اس کے کام کی تعریف ہوتی اتنا ہی وہ اپنے استاد کے منہ سے تعریف سننے کی حسرت میں مرا جاتا۔ یہی خواہش اسے واپس استاد کے گھر لے گئی۔ جہاں اس نے 2 سال سخت کفارہ ادا کیا۔ بے عزتی جھیلی یہاں تک کہ اسے دوبارہ شاگرد مان لیا گیا۔

دو سال جب اس نے دوبارہ کھیتوں میں کام کیا اور ایندھن کے لیے لکڑیاں اکٹھی کیں تب بھی استاد اس سے اس طرح گریزاں رہتا جیسے کوئی شخص طاعون سے دور رہتا ہے۔ ایک دفعہ جب خواہش سے مغلوب ہو کر اس نے چھپ چھپا کر خطاطی اور مصوری کی مشق کی اور استاد نے اسے پکڑ لیا تو سخت الفاظ میں اسے حکم دیا۔

''فوراً نہاؤ تمہارے پاس سے آنے والی روشنائی کی بو طوائف کے جسم پر لگی خوشبو سے زیادہ ناگوار لگ رہی ہے۔''

استاد کے رویے میں اس وقت بھی تبدیلی نہ آئی جب اسے دوبارہ معاف کر کے استاد کے کمرے میں برش اور روشنائی سے مشق کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے استاد کی آنکھیں زیادہ ناقدانہ اور بے تاب ہو گئی ہوں۔ اس کے برعکس کوجوک کے اندر خود اعتمادی آ گئی تھی۔ وہ نہ صرف استاد کے سرد رویے کا عادی ہو گیا تھا بلکہ اب اس نے استاد کے ساتھ شرارتیں بھی شروع کر دی تھیں۔ وہ ناپسندیدہ حرکتیں کر کے استاد کو غصہ دلاتا اور پھر لطف اندوز ہوتا۔ وہ گروپ نمائشوں میں شرکت کرتا اور جاپانی نو آبادیاتی حکومت کی طرف سے منعقد کیے جانے والے نیشنل آرٹ مقابلے میں شریک بھی ہوتا۔

لیکن ان کی ناخوش گوار مفارقت کا دن قریب آ رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ چیز سامنے آ گئی جو استاد کو بے آرام کر دیتی تھی۔ جس چیز نے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا وہ ان دونوں کے مختلف فنی

اصول تھے۔ سوکڈم جوش وخروش دیانت اور شرافت کو خطاطی کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ جبکہ کوجوک خوبصورتی کو اہمیت دیتا اور خطاطی میں اپنے جذبات کے اظہار اور اپنی رائے کو لائق سمجھتا۔ مصوری کے معاملے میں بھی ان کی آراء میں فرق تھا۔ سوکڈم چیز کی روح کے اظہار پر توجہ دیتا جبکہ کوجوک حقیقت پسندانہ اظہار کو ترجیح دیتا۔ بانس اور آلو بخارے پر استاد اور شاگرد کی بحث اس کشمکش کو واضح کرتی ہے۔ مصور کی حیثیت سے سوکڈم آلو بخارے اور بانس کے پیڑوں کی تصویر کشی کا ماہر مانا جاتا تھا۔ اس کی جوانی میں اس کے بنائے ہوئے بانس اور آلو بخارے کے پیڑ صحت منداور توانا ہوتے تھے۔ لیکن جاپانی نوآبادیاتی تسلط کے بعد اس کے بنائے ہوئے درخت مرجھائے۔ جھکے اور ٹیڑھے میڑھے ہوتے۔ یہاں تک کہ بعد کے سالوں میں بانس کے ایک پودے پر صرف تین پتے اور آلو بخارے کے درخت پر صرف چند کلیاں دکھائی دیتیں۔ کوجوک اس سے بہت ناخوش ہوتا۔ کوجوک احتجاج کرتا۔ ''آپ کے بنائے ہوئے بانس اور آلو بخارے کے درخت اتنے مرجھائے اور خالی خالی کیوں ہوتے ہیں۔''

''ایک غلام ملک میں بانس کا درخت کیسے سرسبز وشاداب ہوسکتا ہے۔ اور نوآبادیاتی ملک کا کون سا مصور یہ حوصلہ رکھتا ہے کہ آلو بخارے کے درخت پر پھول دکھائے؟'' سوکڈم جواب دیتا۔

''چنگ سونان نے آرکڈ کے پودوں کی جڑیں ننگی رکھ کر سنگ کے زوال پر اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ جبکہ چاؤ منگ فو نے اپنے وطن کے فاتح یوآن کے دربار میں نوکری کر لی۔ لیکن میں نے کبھی کسی کو یہ بحث کرتے نہیں سنا کہ فقط چنگ سونان کے آرکڈ معطر ہیں اور چاؤ منگ فو کی خطاطی گھٹیا ہے۔'' کوجوک نے اعتراض کیا۔

''خطاطی اور مصوری روح کی عکاس ہیں۔ آپ اپنی روح اور جذبے کو شکل دینے کے لیے مختلف اشیاء کی شکلیں مستعار لیتے ہیں۔ چیزوں کی ظاہری شباہت کے تابع رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' استاد کی طرف سے جواب ملا۔

''اگر خطاطی اور مصوری محض فن کار کے اپنے دکھ اور تکلیف کے اظہار کے ذرائع ہیں تو پھر یہ فن بالکل بے مصرف اور بے وقعت ہیں۔ اس صورت حال میں کیا کسی بھی شخص کے لیے یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ وہ ساری زندگی سیاہی گھسے اور کاغذ ضائع کرے۔ اگر کسی کے لیے وطن اتنا ہی قیمتی ہے تو کیا اس شخص پر واجب نہیں ہو جاتا کہ وہ انڈر گراونڈ فوج میں شامل ہو کر وطن کے لیے لڑتے ہوئے اپنی جان

MashalBooks.com

دے دے؟ کیا اپنی سٹڈی میں بیٹھ کر اپنے چھنے ہوئے وطن کے ماتم میں بانسوں اور آلو بخاروں کی آڑی ترچھی تصویریں بنانا اپنے آپ سے اور دوسروں سے دھوکا نہیں ہے؟'' کوجوک نے ڈھٹائی سے اپنی بات جاری رکھی۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ چیزوں کی ہو بہو تصویریں بنانے میں آپ فٹ پاتھ پر بیٹھے مصوری کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ ان کی روح ہلکی اور جذبہ گھٹیا ہے اس لیے ان کی تصویریں بھی بازاری ہوتی ہیں جن کا مقدر فرش پر بچھنا ہی ہوتا ہے۔ تم خطاطی اور مصوری کی صحیح روح کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہو لیکن ان کی ارفع روح کے بغیر تمام تصاویر کاغذ پر پھیلی ہوئی سیاہی کے سوا کچھ نہیں۔'' سوکڈم نے جوابی حملہ کیا۔

ان کے اختلافات کا ایک اور واقعہ فن کے اصولوں پر ہونے والی ان کی بحث تھی۔ یہ بحث بھی کوجوک نے شروع کی تھی جب اس کی عمر 30 کی دہائی میں تھی۔ اور جب سوکڈم اپنی بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ کوجوک نے بحث شروع کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''خطاطی اور مصوری فنون ہیں' ضوابط ہیں یا طریقے؟'' ''یہ طریقے ہیں'' سوکڈم نے جواب دیا۔

''تو پھر فن خطاطی اور قوانین خطاطی جیسی اصطلاحات کیوں موجود ہیں۔'' کوجوک نے چیلنج کیا۔

''فن طور طریقے کی خوشبو ہے جبکہ ضوابط اس کا لباس ہیں۔ طور طریقے کے بغیر کوئی فن نہیں ہے۔ نہ کوئی ضوابط۔'' سوکڈم نے وضاحت کی۔

''کیا یہ نہیں کہا جاتا کہ فن کی عمدگی آخر کار انسان کو طور طریقے تک لے آتی ہے۔ کیا فن طریقے تک آنے کا دروازہ نہیں ہے بجائے محض اس کی خوشبو ہونے کے؟'' کوجوک نے اعتراض کیا۔

''فن کار بھی یہی کہتے ہیں۔'' ''ہر چیز ہر وقت طور طریقے کے اندر رہنی چاہیے'' سوکڈم نے زور دیا۔

''تو پھر خطاطی اور مصوری سیکھنے کے لیے پہلا قدم ذہن اور روح کی پاکیزگی ہونا چاہیے۔'' کوجوک نے قائل کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں: اسی لئے وانگ سی چی نے کہا تھا' کہ اگر کوئی اچھے کردار کا مالک نہ ہو تو اسے تعلیم نہیں

دی جانی چاہیۓ' کیا اس بات کا مطلب اب واضح نہیں ہوا؟'' استاد کا جھریوں بھرا چہرہ ان الفاظ سے چمک اٹھا اور اس نے ایک امید سے اپنے شاگرد کا چہرہ پڑھا۔ لیکن کوجوک نے آخری لمحے تک اس کی بات سمجھنے سے انکار کر دیا۔

اگر اعلیٰ دماغ اور روح اس کے لوازمات ہیں تو پھر آپ چھوٹے بچوں کو خطاطی کیسے سکھاتے ہیں؟ اگر اعلیٰ دماغ اور روح ہی اس کے لوازمات ہیں تو یہاں کتنے لوگ ہیں جو موت سے پہلے برش اٹھانے کے اہل ہوتے ہیں؟ کوجوک نے احتجاج کیا۔

اسی لئے پہلے تکنیک سکھائی جاتی ہے اور طور طریقے کے جڑ پکڑنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ ''اگر پہلے مرحلے میں داخل ہو تو وہ فنکار ہے۔ اگر تکنیک اور طریقہ دونوں مل کر اپنی بہترین شکل میں آ جائیں تو انسان ایک ماہر استاد بن جاتا ہے۔'' سوکڈم نے وضاحت کی۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ فن کاری' طور طریقے سے بہتر ہے' لہٰذا تکنیک کی بہتری کو روح کی بہتری کے لیے دبا دینا بالکل ایسے ہی ہے جیسے گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنا۔ کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں؟

اپنے استاد کے تمام اصولوں اور ہدایات پر کوجوک کو یہی اعتراض تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کی ساری زندگی کا خدشہ ایک باقاعدہ مادی شکل میں اس کے سامنے آ رہا ہے استاد کا ردعمل بہت تیز تھا۔

''گھٹیا شخص تمہاری یہ ہمت کہ نظم وضبط اور علمیت میں اپنی کمی کو اپنے غلط استدلال سے چھپانے کی کوشش کرو؟ علم طریق تک جانے کا راستہ ہے۔ لیکن تم نہ کلاسیکی اصولوں پر یقین رکھتے ہو نہ شاعرانہ بندش سے لطف اٹھاتے ہو۔ تم صرف یہ چاہتے ہو کہ اپنی کلائی اور انگلیوں کو بہتر بنا کر ماضی کے اساتذہ کی شاہکار کامیابیوں کی نقل کر سکو۔ یہ رویہ گھٹیا کاریگری سے کس طرح مختلف ہے؟ اور تم ذرا بھی شرمندہ نہیں ہو۔ بلکہ یہ سمجھتے ہو کہ تم ماضی کے اساتذہ پر رائے زنی کر سکتے ہو۔''

پھر ان کی فیصلہ کن جدائی کا لمحہ آیا۔ یہ اس وقت ہوا جب کوجوک کی عمر 35 برس تھی۔ اس وقت کوجوک بہت ساری وجوہات کی بناء پر خستہ حال تھا۔ شاگردی میں نئے سرے سے داخل ہونے کے بعد آٹھ سال پر محیط اس کی تربیت ایک طویل اذیت تھی۔ کیونکہ وہ سارا دن ایک ہی انداز سے بیٹھا رہتا۔ تصویریں بنانے اور لکھنے کی مشق کرتا رہتا۔ گرمیوں میں اس کے کولھوں پر چھالے پڑ جاتے اور سردیوں

میں اس کے جوڑ اتنے اکڑ جاتے کہ اسے کھڑا ہونے میں مشکل پیش آتی۔ خطاطی اور مصوری کے سواوہ کسی بھی چیز کی طرف نہ دیکھتا نہ اس کے بارے میں سنتا۔ بعد میں کوجوک اکثر سوچتا کہ اس کی تربیت کے یہ آٹھ سال اس کے لئے بہت اہم تھے۔ اگر اس کے پہلے دس سال سوکڈم کے درجے تک پہنچنے کی جدوجہد تھی تو بعد والے آٹھ سال سوکڈم کے طریقوں اور اصولوں سے بھی بلند ہونے کی جدوجہد تھی۔

اس کی فنی صلاحیت نفیس تر ہوتی گئی اور اس کا نام پہچانا جانے لگا۔ بعض نقاد اب بھی اس کے اس دور کے کام کو اس کے باقی تمام کام سے بہترین قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ ان فن پاروں کی فہرست اور تخیل ہے۔ اس کے باوجود کوجوک پر تنہائی اور خالی پن کا بوجھ سا تھا۔ اس کی اس تنہائی اور خالی پن کے دو عوامل تھے۔ پہلا عامل اس کا یہ احساس تھا کہ کاغذ اور برش سے پنجہ آزمائی کرتے کرتے اس کی جوانی گزر گئی تھی۔ انگاک نے جو اس کی شادی کروائی تھی اس کے نتیجے میں اس کی بیوی اور دو بچے تھے۔ لیکن شروع سے ہی یہ لوگ اس کے سٹیشنری والے صندوقچے یا میز کی طرح اس کی زندگی کی ضروریات میں سے تھے' اس کی خواہش نہیں تھے۔ اس کی پوری جوانی' امید' محبت اور تمنا خطاطی اور مصوری کے لیے وقف تھیں۔ لیکن اسے احساس تھا کہ اگرچہ اس کی جوانی گزر چکی ہے لیکن وہ ابھی بھی اپنے دھنک رنگ مقصد کی معراج کے قریب تک نہیں پہنچا تھا۔ دوسرا عامل عزت نفس کا مسئلہ تھا۔ جب بھی وہ اپنی تربیت کے بے خود کر دینے والے وقفے سے باہر نکلتا تو وہ اکثر تضحیک آمیز انداز سے اپنے آپ سے سوال کرتا۔ یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کا کوئی مطلب بھی ہے؟ اس انداز میں جس میں کبھی اس نے اپنے استاد سے احتجاج کیا تھا۔ مختلف انداز میں وہ اپنے آپ سے پوچھتا کہ کیا ساری عمر سیاہی گھستے رہنا اور برش گھماتے رہنا ایک انسان کے شایان شان ہے۔ لوگ اپنے وطن کی آزادی کے لئے مر رہے تھے' قید ہو رہے تھے یا لڑتے ہوئے ملک سے فرار ہو رہے تھے۔ کچھ نے صنعتیں لگا رکھی تھیں اور اپنے بھوکے ہمسایوں کا پیٹ بھر رہے تھے۔ کچھ معلم بن گئے تھے۔ اپنے ان پڑھ ہم وطنوں تک علم کی روشنی پہنچا رہے تھے اور نئی دنیا کے جدید علم تک ان کی رسائی بنا رہے تھے۔ لیکن اس نے کیا حاصل کیا تھا؟ وہ اپنے آپ سے پوچھتا۔ اس کی پوری توجہ اپنی ذات پر مرکوز تھی۔ اس کے نزدیک یہ مقصد مکمل ترین مقصد تھا۔ لیکن کیا یہ زندگی کی بے معنویت سے فرار نہیں تھا؟ ایک ایسی زندگی جو صرف اپنی ذات کے لیے گزاری جائے۔ آہ اس نے زندگی صرف اپنے لئے گزاری تھی۔

پھر خزاں کے موسم میں وہ دن آ گیا۔ ان دنوں سوکڈم اپنی بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھا۔ ایک صبح' بیماری کے ایک جھٹکے کے بعد اس نے کاغذ اور برش مانگا۔ کوئی عام کاغذ اور برش نہیں بلکہ ایک بڑا برش اور بڑے سائز کا کاغذ۔ کوجوک جو خود بھی کافی مہینوں سے خطاطی اور مصوری سے الگ تھلگ تھا' اپنے استاد سے ناراض سا ہوا اور اور اس کے لئے سیاہی تیار کرنے کے فوراً بعد اس کی لائبریری سے نکل گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے استاد کی فن کے لیے لگن اس کی اپنی ذات پر بے اعتمادی کی دلیل ہے۔ صحن کے چند چکر کاٹنے کے بعد اس کے تجسس نے اسے اپنے استاد کی سٹڈی میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔

اس نے دیکھا کہ اس کا استاد اپنا برش سیاہی والی تھالی کے کنارے رکھ کر ہانپ رہا تھا۔ بڑا کاغذ فرش پر پڑا تھا۔ اس پر چار حرفی فقرہ کے پہلے تین حرف لکھے ہوئے تھے۔

''دس ہزار بار بھی برش استعمال کریں تو طاقت میں ذرا سا بھی فرق نہ آئے۔''

کہا جاتا ہے کہ سوچی نے اٹھتر سال کی عمر میں تل کے دانہ پر لکھا تھا''ساری دنیا سکون سے ہے۔'' میری عمر ابھی ستر سال بھی نہیں ہے پھر بھی میرے اندر اتنی بھی سکت نہیں کہ میں ایک ہی بار یہ چار حروف لکھ دوں۔ یہ کہتے ہوئے استاد کے چہرے پر ایک ماتمی افسردگی چھا گئی لیکن کوجوک ترس کھانے کی بجائے الٹا غصے میں تھا۔ اسے لگا کہ استاد کے چہرے پر چھائی ماتمی مایوسی اس کی متکبرانہ خود اعتمادی پر ایک پردہ تھی۔

کوجوک نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ چیلنج کیا'

''اگر آپ ایک ہی سانس میں یہ چاروں حروف لکھ بھی لیتے' حتیٰ کہ آپ اگر ان حروف سے دیومالائی ہاتھی اور سنہری قفس کو ابھرتے ہوئے بھی دیکھ لیتے تو کیا ہو جاتا؟

''تمہاری یہ ہمت کہ تم ایسی توہین آمیز بات کرو؟ یہ وہ نکتہ معراج ہے جہاں پہنچنا ہر خطاط کا خواب ہوتا ہے۔ بے شک زندگی میں ایک ہی بار کیوں نہ ہو؟

''لیکن اگر ہم اس منزل پر پہنچ بھی جائیں تو اس کا کیا فائدہ؟''

تمہاری حالت اس شخص جیسی ہے جو تائی پہاڑ پر چڑھنا ابھی شروع بھی نہیں کرتا کہ سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ اس سے آگے مزید بلند چوٹیاں بھی ہوں گی۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پرانے اساتذہ نے جو آفاقی کامیابیاں حاصل کیں وہ فضول اور بے وقعت تھیں؟''

''انہوں نے اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھی دھوکا دیا۔ سیاہی سے کاغذ کو رنگنے میں کیا حسن ہوسکتا ہے؟ یہ طریق کتنا گہرا اور لطیف ہوسکتا ہے۔ طریق (انداز) کی بات کی جائے تو کیا آپ کے خیال میں جانور ذبح کرنے اور ڈاکے ڈالنے کا کوئی طریق نہیں ہے؟ اگر لطافت اور گہرائی کی بات کی جائے تو کیا یہ خصوصیات اینٹیں تھاپنے والوں اور پلمبروں کے کام میں نہیں موجود؟ آپ کہتے ہیں کہ اپنے پیچھے اپنا نام چھوڑ کر جانا چاہیے۔ لیکن موت کے بعد اپنے پیچھے گھومتی ہوئی خالی آواز چھوڑ جانے کا کیا مطلب ہے؟ اور جہاں تک خطاطی اور مصوری کے ورثے کی بات ہے۔ تو جہاں ہوا اور بارش کے آگے پتھر نہیں ٹھہر پاتے وہاں کمزور کاغذ کیا ٹھہریں گے؟ مزید یہ کہ خطاطی اور مصوری آپ کو پرآسائش زندگی نہیں دے سکتے نہ ان کی مدد سے آپ کسی ہمسائے کا پیٹ بھر سکتے ہیں یا تن ڈھانپ سکتے ہیں۔ عظیم اساتذہ نے اپنے سامنے مخصوص مقاصد رکھے جو نہ قابل حصول تھے نہ قابل فہم' یہ کام انہوں نے اپنے مقاصد کی بے معنویت اور خالی پن کو چھپانے اور دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے کیا۔''

کوجوک مزید کچھ نہ کہہ سکا اور اپنی پیشانی میں شدید تکلیف کے باعث آگے گر پڑا۔ استاد نے اپنے سیاہی والے ڈبے کا پتھر کا ڈھکنا اسے دے مارا تھا۔ اپنی پیشانی سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش میں مصروف کوجوک نے اپنے استاد کی ماتم کرتی ہوئی غصیلی آواز سنی۔

''مجھے تمہاری بے کار سی گراوٹ کا پہلے سے ادراک کر لینا چاہئے تھا۔ چلے جاؤ۔ تمہیں بہت پہلے سڑک کنارے بیٹھا پینٹر بن جانا چاہئے تھا۔ جاؤ۔ جب تم اتنی دیر تک اپنے گھٹیا پن کو چھپا سکتے ہو تو مجھے یقین ہے تم اپنی تصویروں کے بدلے چاول آسانی سے حاصل کر لو گے۔''

یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ کوجوک نے اسی دن استاد کا گھر چھوڑ دیا۔ جب بہت سالوں بعد وہ واپس آیا تو استاد پہلے ہی تابوت تک پہنچ چکا تھا۔

کوجوک نے تیس سال پرانی تکلیف کو مبہم سے انداز میں یاد کرتے ہوئے اپنی پیشانی پر انگلیاں پھیریں۔ لیکن اس لمس کے ساتھ ہی استاد کا چہرہ اس کے سامنے آ گیا' اس کے ذہن میں نہ اس خیال سے خوف پیدا ہوا نہ نفرت بلکہ خواہش جاگی۔

''ابو' چوہون آیا ہے۔''

چوسو کی آواز نے اسے سوچوں سے باہر نکال دیا۔ جلد ہی دروازہ کھلا اور چوہون کا گول چہرہ

MashalBooks.com

سامنے آیا۔ چوہون اس کا شاگرد تھا جسے وہ اپنے بیٹے کی طرح چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ صرف یہ تھی کہ چوہون اکیلا کوجوک کا سٹوڈیو بغیر کسی شکایت یا مطالبے کے ایک سال سے چلا رہا تھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خطاطی اور مصوری کے بارے میں اس کا اپنا طرز فکر تھا۔ موجودہ دور کے اکثر نوجوانوں کے برعکس جو ابتدائی مراحل سیکھنے سے پہلے ہی اگلے مرحلے میں پہنچ جانا چاہتے ہیں چوہون نے بنیادی سٹائل پر پورے تین سال صرف کیئے اور پورے سات سال اپنے کام کی مشق میں صرف کرنے کے بعد بھی اس نے جب کوجوک کے دوسرے شاگردوں کے ساتھ مشترکہ نمائش میں حصہ لیا تو اس میں صرف خطاطی کے دو نمونے رکھے۔ اس کی خطاطی میں اگرچہ روانی کی ذرا کمی تھی پھر بھی ایک ایسی طاقت تھی جو کوجوک کو عجیب سے انداز سے اپنی طرف کھینچتی۔ اسے دیکھ کر کوجوک کو اپنے استاد کا انداز یاد آتا جسے کسی دور میں اس نے بڑی شدت سے مسترد کر دیا تھا لیکن بڑھاپے میں آ کر جو اسے اپنی کشش سے بھر دیتا تھا۔

''کیا آج آپ باہر جا رہے ہیں؟ آپ کی بیٹی نے مجھے بتایا آپ کو چلنے میں دشواری ہو رہی ہے۔''

چوہون نے آہستہ سے کہا۔ اگر کوجوک جوان ہوتا تو اس نوجوان کے ہچکچاہٹ بھرے انداز پر شاید غصے میں آ جاتا لیکن اس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ''اسی لیے میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ میں ایک اور فن پارہ حاصل کرنے کوشش کیوں نہ کروں۔ کیا سٹی لائبریری والے تمہارے ہاتھ فروخت کرنے کی بات بھی نہیں کریں گے؟

''نہیں۔ ڈائریکٹر کہہ رہا تھا کہ وہ خطاطی بیچنے یا تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ یہ ان کتابوں کی فہرست میں واضح طور پر درج ہے۔''

''کیا وہ یہ فن پارہ میکی کی خطاطی کے ساتھ بھی نہیں بدلیں گے۔''

''نہیں۔ ڈائریکٹر نے کہا کہ اسے کسی بھی حالت میں وہاں سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔''

''کیا بے وقوف لوگ ہیں! مجھے خود ڈائریکٹر سے بات کرنی پڑے گی۔''

''کیا آپ واقعی باہر جا رہے ہیں۔''

''ہاں اب مزید فضول باتیں چھوڑ، جاؤ ٹیکسی لے آؤ''

چوہون خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر سوالات واضح تھے لیکن اس نے پوچھا

MashalBooks.com

نہیں کہ اس کا استاد اپنے سارے فن پارے کسی مقصد کے تحت جمع کر رہا ہے۔

وہ بہت خوبصورت دن تھا۔ کوجوک اپنے شاگرد کی مدد سے اس گلی میں ٹیکسی سے اترا جس میں دونوں طرف آرٹ گیلریوں کی قطار تھی اور مختلف گیلریوں کا معائنہ کرنے لگا۔ کئی مہینوں سے جاری یہ سفر اب روزمرہ کا معمول تھا۔

''جی جناب' اندر تشریف لائیے پلیز۔ لیکن کل کے بعد کوئی نئی چیز نہیں آئی۔ لگتا ہے ہر کوئی آپ کے کام کو سنبھالے بیٹھا ہے' شاید اس لئے کہ سب کو پتہ ہے اب آپ کی صحت اچھی نہیں ہے'' تقریباً سبھی گیلریوں والے اسی قسم کے الفاظ سے ان کا استقبال کرتے۔

چھٹی گیلری میں جا کر اسے ایک مانوس سی چیز نظر آئی۔ یہ دستی تحریر کے انداز میں بنایا ہوا خطاطی کا نمونہ تھا۔ کیونکہ اس فن پارے پر ko والے دستخط کا مطلب قدیم کی بجائے تنہا تھا۔ یقیناً یہ فن پارہ اس کی آوارہ گردی کے دوسرے دور کی تخلیق تھا۔

''میں اس کے بدلے میں آپ کو انگاک کا بنایا ہوا آرکڈ دے سکتا ہوں۔ یہ چلے گا؟''

گیلری کا مالک خوش ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کوجوک کے جن کاموں پر تنہا ko دستخط تھے ان کو زیادہ اچھے درجے کا کام شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ سب گیلری والے جانتے تھے کہ کوجوک کے ساتھ اس قسم کا کاروباری لین دین ہمیشہ ان کے لیے فائدہ مند رہتا تھا۔

ٹھیک ہے' اگر آپ کو واقعی اس کی اتنی شدید خواہش ہے تو'' گیلری والے نے اس انداز سے کہا جیسے وہ بڑا احسان کر رہا ہو۔

شکریہ' میں آرکڈ شام تک بھجوا دوں گا''

''میں کسی کو آپ کے گھر بھجوا دوں گا۔ نہیں میں خود آ جاؤں گا۔ کیا سہ پہر کا وقت آپ کے لیے ٹھیک رہے گا؟''

''جی''

گیلری کے مالک نے تصویر کو پیک کرنا شروع کر دیا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس ایسے ہی دے دو۔'' کوجوک نے اپنا کمزور ہاتھ آگے بڑھایا۔ جب گیلری والے نے تصویر اس کے ہاتھ میں دی تو وہ صوفے پر بیٹھ کر اس کو کھولنے لگا۔

MashalBooks.com

''سیاہی کا سکہ پتھر کی سل پر گھستے ہوئے مجھے ایک گہری دھند اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ باریک برش کے ساتھ لکھتے ہوئے مجھے ایک باریک سا بادل اڑتا ہوا نظر آتا ہے۔''

وہ نیم دستی تحریر نما خطاطی ہوانگ شان کو کے انداز میں کی ہوئی تھی۔ جس نے کافی عرصے اسے متاثر کئے رکھا تھا۔ یہ خطاطی یہ یقیناً کسی کھانے یا کسی اور چیز کے عوض کی گئی ہوگی کیونکہ برش کے الفاظ صحیح جمے ہوئے نہیں تھے۔ اب اس کی آوارہ گردی کا دور ایک بار پھر اس کے سامنے آگیا۔ اس کے ذہن میں نہ کوئی افسوس تھا نہ پچھتاوا بلکہ خواہش اور آرزو تھی۔

اپنے استاد کا گھر دوسری بار چھوڑنے کے بعد کچھ دیر تک کوجوک کے ذہن میں یہ یقین پختہ رہا کہ اس کے استاد نے اسے باہر پھینک دیا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی خطاطی کے نمونے ہر ایک کے ہاتھ بیچ رہا تھا اور ایک عیش پرست زندگی بسر کر رہا تھا لیکن وہ اپنے آپ سے یہی کہتا رہا کہ وہ ایک بے رحم استاد سے بدلہ لے رہا ہے۔ جب وہ دنیاوی دولت شہرت اور ان تمام آسائشوں کا عادی ہو گیا جو دولت سے خریدی جاسکتی تھیں تو اسے یہ احساس ہوا کہ یہ وہ خود تھا جس نے اپنے استاد کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یہ بھی احساس ہوا کہ جو تعریفیں اور خوشیاں وہ حاصل کر رہا تھا اس کا اس کے مقصد حیات سے کوئی تعلق نہیں تھا اور یہ سب چیزیں اس کی جوانی اور بالغ عمری کے شدید اذیت بھرے دور کا بہت ہی کم معاوضہ تھیں۔ اسے یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ وہ رقم جو اگرچہ اسے بہت احترام سے پیش کی جاتی ہے وہ اصل میں اس ٹپ سے مختلف نہیں جو دل لبھانے والی خواتین کو دی جاتی ہے۔ اور جو زبردست تحسین اسے ملتی ہے وہ بھی سرکس کے مسخروں کے لیے بجنے والی تالیوں سے مختلف نہیں تھی۔ یہ رقم اور تعریف اس کی پیاس بجھانے کی بجائے اس پیاس کو اور بڑھا دیتیں جیسے نمکین پانی کسی پینے والے کی پیاس کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ لیکن یہ وہ خالی پن تھا جو اسے احساس ضیاع اور مایوسی میں جکڑے رکھتا۔ ہلکے درجے کی خوشیاں اس خلا کو مزید بڑھا دیتیں۔ جس کے جواب میں اسے اور شدید جوش و جذبہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کی دبی ہوئی ہوس اس کی آوارہ گردیوں کو طول دیتی۔ اسی دوران اسے پتہ چلا کہ اس کے باپ نے ساری خاندانی دولت عورتوں پر لٹا دی اور اپنی عمر کی تیسری دہائی میں ہی تھک ہار کر مر گیا اور اس کی ماں عدت کا دور گزرنے سے پہلے ہی اپنے اکلوتے بچے کو چھوڑ کر ہمسائے رنڈوے کے ساتھ بھاگ گئی ہے' ہوس اس کے خون میں تھی۔ یہ ہوس نوجوانی میں ایک سخت گیر استاد کی وجہ سے دبی رہی اور جوانی میں اس کے پسندیدہ شعبے میں مہارت حاصل

MashalBooks.com

کرنے کی لگن میں دبی رہی۔ لیکن ایک بار جب یہ ہوس جاگ اٹھی تو اس کے حواس پر سوار ہوگئی اور پھر اسے ایک پارٹی سے دوسری پارٹی اور ایک عورت سے دوسری عورت کے پیچھے دوڑاتی رہی۔

اس کی عیش پرستی اس وقت بھی ماند نہ پڑی جب بحرالکاہل کی جنگ شروع ہوگئی اور پوری قوم تباہی و بربادی کا شکار ہوگئی۔ دنیا میں ہر جگہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو قدرتی آفات میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے ہی اس کے سرپرست تھے' جاپان کے حمایتی کورین' مہذب جاپانی طبقہ' جنگی ساز و سامان بیچنے والے......

پھر ایک اہم موڑ آیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ایک جاپانی حمایت یافتہ جاگیردار کے ہاں مہمان تھا۔ تمام خطاط اور مصور اس جاگیردار کے مہمان بننا پسند کرتے تھا۔ کیونکہ وہ فنون لطیفہ کا اچھا مربی تھا اور اپنے مہمان فنکاروں پر فیاضی کرنے کے لئے اس کے پاس خاصی دولت بھی تھی۔ مزید یہ کہ وہ اپنے ملک کے خلاف کسی گھناؤنے کام میں ملوث نہیں تھا۔ بس وہ جاپانیوں کے تحفظ میں رہنے کا مزہ لے رہا تھا کیونکہ اس کا بیٹا جاپانی گورنر جنرل کے دفتر میں اعلیٰ افسر تھا۔ بہرحال جب کوجوک اس جاگیردار کا مہمان تھا تو ایک دن انگاک ادھر آ نکلا۔ کوجوک اس مہمان کو دیکھ کر خوش ہوا کیونکہ وہ تقریباً چھ سال تک چائنیز کلاسک کا استاد رہا تھا۔ انگاک اس کے استاد سوکڈم کے بھی چند دوستوں میں سے ایک تھا۔ اس کے علاوہ انگاگ نے کوجوک کی شادی بھی کروائی تھی اگرچہ یہ شادی کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ یہ انگاک ہی تھا جس نے اس وقت اسے سمجھا تھا جب وہ سوکڈم کو چھوڑ کے آیا تھا۔ لیکن کوجوک کے بہت گرم جوشی والے سلام کا انگاک نے خاصی سرد مہری سے جواب دیا۔

''آہا' آباؤاجداد' استاد اور خاندان سے ناطہ توڑنے والے عظیم آدمی کو یہ بیچارا بوڑھا کیسے یاد رہ گیا؟'' انگاک نے کوجوک کے عرف کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''تہرا محروم'' لفظ کوجوک اپنی تضحیک میں استعمال کرتا۔ اور پھر وہ میزبان کی منتوں کے باوجود واپس چلا گیا۔ اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے انتہائی سخت الفاظ میں کہا۔ ''سوکڈم قریب المرگ ہے اور یقیناً اسے تمہارے جیسے بدبخت کے واپس آنے کا انتظار ہوگا۔'' انگاک ہمیشہ سے ایک پیار کرنے اور دوستی رکھنے والا آدمی تھا اس لئے اس کے ان الفاظ نے کوجوک کے دل کو چیر کر رکھ دیا۔

کوجوک پہلے ہی بیمار تھا اور اپنی بے مقصد زندگی سے اکتا چکا تھا۔ سفر کی جذباتی خوشی یا دنیا

MashalBooks.com

کی طرف سے ملنے والی دولت وشہرت اس کی اندرونی تنہائی اور خلا کو دور نہیں کر پائی تھی۔اور نہ ہی اس کے گھٹیا رومانوی تعلقات اس کی نظر میں اس کی اپنی بے معنی زندگی کا احساس ختم کر پائے تھے۔اس کی عمر بھی اب چالیس سے کافی اوپر تھی لہٰذا جنسی ہوس بھی ختم ہو چکی تھی۔

اس مختصر ملاقات کے بعد کوجوک ''اوڈے پہاڑ'' چلا گیا جہاں اس کا ایک دوست چرچ کا سربراہ تھا۔وہ اپنے پرانے استاد کے پاس جانے سے پہلے اپنے حواس درست کرنا اور پاک کرنا چاہتا تھا۔ پہاڑ پر تقریباً آدھا سال اس نے پادری کی زندگی گزاری' لیکن آدھے سال کی گوشہ نشینی بھی دنیاوی آلائشوں کو اور اپنے استاد کے خلاف عمر بھر کی ناپسندیدگی کو نہ دھوسکی۔حتیٰ کہ موسم بہار کی آمد پر بھی وہ اپنے آپ کو استاد کے پاس جانے پر راضی نہ کر سکا۔ایک دن' ایک پادری کے ساتھ درختوں کی چھال جمع کرنے کے بعد جب وہ ہال کی دہلیز پر بیٹھا آرام کر رہا تھا تو اس کی نظر دیوار پر بنی ایک پرانی سی تصویر پر پڑی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ بدھ مت کے بارہ بھکشوؤں میں سے ایک کی تصویر ہے' لیکن زیادہ غور سے دیکھنے پر اسے پتہ چلا کہ یہ ایک بہت بڑے پرندے کی تصویر ہے۔جس کا سر عقاب جیسا ہے جسم انسانوں جیسا اور بڑے بڑے سنہری پر

''یہ پرندہ کیسا ہے؟'' کوجوک نے پادری سے پوچھا جو ابھی ابھی وہاں نمودار ہوا تھا۔پادری نے دیوار کی طرف دیکھا اور بولا ''اوہ یہ پرندہ کرورا ہے۔یہ ایک عظیم دیومالائی پرندہ ہے جس کے ماتھے پر چنتامنی ہے۔اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے اور اس کی خوراک اژدھے ہیں۔یہ بحر سومیسن میں رہتا ہے اور مہاتما بدھ کے طریق کے محافظ آٹھ فرشتوں میں سے ایک ہے' اسے کم سی جویا سنہری قفنس کہتے ہیں۔''

اسی لمحے یہ جملہ بجلی کی طرح اس کے دماغ میں لپکا ''سمندر کو چیر کر کھول دیتا ہے۔'' یہ وہ پہلا جملہ تھا جو اس کے استاد نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کہیں اس کا ٹیلنٹ اس کے کردار پر غالب نہ آجائے۔لیکن اس وقت تک قفنس اس کے لئے ایک استعارے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔اس کے لئے یہ پرندہ اس کے استاد کے خطاطی کے اندر پائی جانے والی طاقت کی علامت تھا۔لیکن اب یہ استعارہ ایک پرانی سی تصویر سے نکل کر سامنے زندہ ہو گیا تھا۔اور وہ پرندہ اس کے سامنے حرکت کرنے لگا تھا۔ایک لمحے کے لئے کوجوک کو لگا کہ وہ عظیم قفنس وسیع آسمان پر اڑ رہا ہے' اپنے بڑے بڑے سنہری پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے' سمندر کو چیرتے ہوئے ایک اژدھے کا تعاقب کرتے ہوئے۔کوجوک کی اب سمجھ میں آیا کہ جب

اس کے استاد نے یہ کہا تھا کہ اگر کوئی فن کار زندگی میں بے شک ایک ہی بار اپنی خطاطی یا تصویر سے سنہری قفس کو اڑتے ہوئے دیکھ لے تو اس کی زندگی بامعنی ہو جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اسے کوئی اور پہچان یا قدر ملتی ہے یا نہیں۔ اگلے دن کوجوک نے اپنا سامان باندھا اور پہاڑ سے نیچے اتر آیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے اور وطن کی آزادی سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔ استاد پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ کوجوک اپنے استاد کے گھر پہنچنے کے دن کو پچھتاوے جیسے احساس کے ساتھ یاد کرتا۔ استاد کا گھر جو ہمیشہ اداس اور خالی ہوتا تھا آج استاد کے دوستوں اور شاگردوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن کسی نے کوجوک کا گرم جوشی سے استقبال نہیں کیا۔ صرف انگاک نے سرد لہجے میں اسے کہا'' تابوت کا کپڑا تم لکھ دو یہ استاد کی خواہش تھی۔ اس کے القابات لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف لکھو' سکالر کم سوکڈم کی میت لے جانے والی گاڑی'' پھر چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے کہا۔'' ارے بدبخت تمہیں احساس ہے کہ اس چیز کا کیا مطلب ہے؟ وہ تمہاری خطاطی کو اگلی دنیا میں لے جانا چاہتے ہیں۔ احمق! وہ تمہاری خطاطی سے اس قدر پیار کرتے تھے۔

''اس لمحے کوجوک کی اپنے استاد کے خلاف سالہا سال سے موجود نفرت اس طرح ختم ہوئی کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہا۔ کوجوک کے دل میں اپنے استاد کو ایک بار پھر دیکھنے کی اتنی شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ روک نہ سکا لیکن تابوت کو پہلے ہی کیلوں سے بند کیا جا چکا تھا۔

''سر' کیا ہمیں اب چلنا نہیں چاہئے' چوہون نے شرمیلے سے انداز میں کوجوک سے پوچھا جو اپنی سوچوں میں گم بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ کوجوک اپنے حواس میں واپس آیا اور آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن چار مزید گیلریوں میں چکر لگانے کے بعد کوجوک کو چکر سے آنے لگے اور اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔

کیا ہوا' سر؟' چوہون نے جلدی سے اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آؤ اگلی دکان میں چلتے ہیں'' کوجوک نے کہا لیکن چل نہ سکا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اور اس کی پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا۔ جب وہ اگلی دکان میں داخل ہوئے تو اس کے ہوش وحواس بھی مدھم پڑ چکے تھے۔

''آپ گھر جا کر آرام کیوں نہیں کرتے۔ میرا نہیں خیال کہ ساری گیلریاں گھومنے پر بھی آپ

کی بنی کوئی چیز ملے گی'' گیلری والے نے مشورہ دیا' لیکن کوجوک نے صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے چوہون سے کہا'' تم جا کر باقی گیلریوں میں دیکھ آؤ۔ اگر کچھ ملے تو فوراً یہاں آ جانا'' چوہون پریشانی سے کچھ دیر کوجوک کو دیکھتا رہا پھر باہر چلا گیا۔

''آپ اپنے سارے فن پارے خرید کر کیا کریں گے'' یہ دیکھتے ہوئے کہ کوجوک اب کچھ پر سکون ہو گیا ہے' گیلری کے مالک نے پوچھا۔

سب گیلری مالکوں کے لیے پچھلے سات مہینے سے یہ ایک راز تھا۔ لیکن کوجوک نے اپنا اصل ارادہ کسی کو نہیں بتایا۔ اس دن بھی یہی حال رہا۔

''ہاں ان کا کوئی فائدہ تو ہے ناں''

''تو کیا واقعی آپ اپنے لئے یادگار ہال بنوانا چاہتے ہیں؟ کیوں کہ لوگ یہی کہتے ہیں۔''

''یادگاری ہال؟'' کوجوک اس خیال پر آہستہ سے مسکرایا۔ ایک ناقابل اظہار تنہائی اور خالی پن اس کے دل سے ابھرا۔ اس نے سوچا اگر میں تمہیں بتانا بھی چاہوں تو تم اس بات کو کیسے سمجھ پاؤ گے' یہ کوئی برا خیال نہیں'' کوجوک نے کہا اور موضوع بدل دیا۔

''کیا یہ اصلی چوسا شاہکار ہے؟'' اس نے چوسا کی نقل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نقل ہے۔ ''برش کے ساتھ کی گئی مصوری کی روح اتنی ہی لامحدود ہے جتنا بہتا ہوا دریا۔ خطاطی کا فن اتنا ہی پیارا ہے جتنی پیاری صنوبر کی شاخ۔ کیونکہ یہ الفاظ فولڈنگ سکرین کے صرف ایک حصے کی نمائندگی کرتے تھے' اگر یہ اصلی ہوتا یہ حصہ ایک آزاد سکرول کی طرح نہ اڑ رہا ہوتا۔''

''یہ ایک نوجوان خطاط کی بنائی ہوئی نقل ہے جو انبونگ نام سے کام کرتا ہے۔''

''کام اعلیٰ پائے کا تھا تو میں نے سوچا اسے دکان میں لٹکا لیا جائے۔'' گیلری کے مالک نے سکرول کو اطمینان کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''کافی اچھی ہے'' کوجوک نے سکرول کو اس نظر سے دیکھتے ہوئے کہا جیسے اس میں اصلی فنکار کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چوسا! اس عظیم آدمی نے کیسے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔

اپنے استاد کے گھر دوبارہ آنے کے بعد کوجوک تقریباً دس سال وہاں رہا تھا۔ وہ استاد کی تنہا

MashalBooks.com

بیوہ اوراس کے لے پالک بچے کی دیکھ بھال کرتا رہا۔اس نے اپنی تربیت کے ایک خودساختہ کفارے کے دور کا آغاز کیا۔اس نے ابتداء سے لے کر ایک بار پھر سارے طریقوں کی مشق کرنا شروع کی۔اس نے ابتدائی چائن کے دور کے خطِ تصویر کے نمونوں سے لے کر تمام قابل ذکر نمونے جمع کئے اور قدیم دور سے لے کر جدید دور تک کے تمام سٹائل کا دوبارہ مطالعہ کیا۔کوجوک کے آخری دور کے فن پاروں میں موجود علمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مطالعے نے اسے قدیم اساتذہ کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد دی۔ بیرونی دنیا بہت تہلکہ خیز تھی۔اس کے وطن کی آزادی کے بعد کے حالات شدید خراب تھے اور ملک خانہ جنگی کے گرداب میں گرفتار تھا لیکن کوئی چیز اسے اپنے استاد کی سٹڈی سے باہر نہ نکال سکی۔

اس دور میں اسے چوسا بھی صحیح سمجھ میں آنے لگا۔جس کے ضوابط اس نے اپنے استاد کے حکم پر زبانی یاد کئے تھے۔اپنی خودستائی کے تیسرے دور میں اسے ہر جگہ چوسا کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے نتیجے میں وہ اس سے مکمل سحر زدہ ہو گیا۔یہ سحر کوجوک کے دل میں پیدا ہونے والی اپنے استاد سوکڈم کی نئی پہچان اور محبت کے نتیجے میں سامنے آئی تھی۔اگرچہ سوکڈم نے کبھی واضح الفاظ میں نہیں کہا تھا لیکن وہ چوسا کا آخری باقاعدہ مقلد تھا۔شاید یہی وجہ تھی کہ سوکڈم اس کے بارے میں مزید ہدایات دینے میں بہت محتاط تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے پاس اس عظیم شخص کی تعلیمات میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

لیکن چوسا بھی اسے مستقل اپنے سحر میں نہ رکھ سکا۔کوجوک کا وہ فن کارانہ جذبہ، جس کی وجہ سے سوکڈم اسے اپنا شاگرد بنانے پر تیار نہ تھا اور جسے اس نے دبانے کی بھرپور کوشش کی تھی، ایک بار پھر بیدار ہو گیا لیکن اب کی بار بہت نفیس انداز میں۔اس کی بھرپور تعریف کرنے کے باوجود کوجوک چوسا کا فنی نقطۂ نظر قبول نہ کر سکا۔کوجوک کا خیال یہ تھا کہ فن کو اول و آخر فن ہی ہونا چاہئے جبکہ چوسا کا فلسفہ فن یہ تھا کہ فن اور علمیت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔کوجوک کے خیال میں عبادت کا صحیح فہم جذباتی اور علمی ہمیشہ خطاطی کے فن پاروں میں جھلکتا ہے۔وہ فن کارانہ خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے لیکن یہ اس کی اصل روح اور اس کی بنیاد نہیں ہے۔کوجوک کے خیال میں چوسا کی خطاط اور مصور کے طور پر عظمت اس کی علمیت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ چوسا ایک فن کارانہ جینیس تھا جو اتفاقاً اسکالر اور مفکر بھی تھا۔مزید یہ کہ چوسا کے ضوابط کے پیچھے موجود چنگ سکالرز کی عبارتی تنقید کے اصول کوریائی فلسفے اور فن کارانہ روایت کی ترقی کو روکنے میں بہت بڑا عنصر تھے۔کوجوک کے چوسا سے دور جانے کی یہ ایک اور وجہ تھی۔کوجوک نے آخر کا

رفیصلہ کیا کہ اس کے استاد سوکڈم کی طرح چو سا بھی ایک عظیم آدمی تھا جس کی تعریف اور عزت تو کی جا سکتی ہے لیکن ایک ماڈل کے طور پر اس کا اتباع نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ گیلری کے مالک نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ چوہون تقریباً ایک گھنٹے بعد خالی ہاتھ واپس آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ باقی کی چھ گیلریوں میں گیا تھا اور کسی میں کل سے کوئی نیا فن پارہ نہیں آیا تھا۔

کوجوک نے چوہون سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ سٹی لائبریری تک چلے۔ نوجوان ڈائریکٹر کو قائل کرنا تھا کہ وہ اس کا فن پارہ اسے واپس کر دے، لیکن اس کی ضد اس کے راستے کی رکاوٹ بن گئی۔ وہ اپنی بات پر ڈٹے ہوئے ڈائریکٹر سے گرما گرم بحث کے دوران بے ہوش ہو گیا۔

سہ پہر کے وقت جا کر کوجوک کو ہوش آیا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا اور چند جانے پہچانے چہرے بڑی بے چینی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوجوک نے آہستہ آہستہ سب کی طرف دیکھا۔ چوہون کے جذبات سے عاری چہرے کے علاوہ اس کے دو اور شاگرد تھے۔

چوسو جوان کے ساتھ آنسوؤں بھرا چہرہ لئے بیٹھی تھی۔ اپنی خوفزدہ سی آواز میں بولی۔ ''ابو آپ ٹھیک ہیں؟''

کوجوک نے ہاں میں سر ہلایا اور چاروں طرف دیکھتا رہا۔ چوسو کے ساتھ ایک اور جانا پہچانا چہرہ موجود تھا یہ نانجونگ تھا۔ اس کا پہلا شاگرد جسے اس نے لقب دیا تھا۔ ''بدتمیز'' کوجوک نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ نانجونگ دس سال تک اس کا شاگرد رہا تھا۔ سوکڈم کی موت کے وقت دوسری بار استاد کے گھر واپس آنے سے لے کر اس کے اپنا سٹوڈیو قائم کرنے کے کچھ دیر بعد تک۔ یہ حقیقت تھی کہ ان کی عمر میں دس بارہ سال سے زیادہ فرق نہیں تھا اور نانجونگ اس سے تعلیم لینے سے پہلے بھی تربیت لیتا رہا تھا۔ لیکن وہ بہرحال کوجوک کا ہی شاگرد تھا جسے کوجوک نے کوئی لقب دینے کی عزت افزائی کی تھی۔ تاہم اس بدتمیز شاگرد نے اچانک سٹوڈیو آنا بند کر دیا۔ اور خود اپنا سٹوڈیو کھول لیا۔ کوجوک کو خاصہ دکھ ہوا کہ اس کا شاگرد اسے نظرانداز کر رہا تھا لیکن بعد میں پیش آنے والے حالات کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ نانجونگ یہ کہہ رہا تھا کہ وہ کوجوک کا نہیں سوکڈم کا شاگرد ہے اور یہ کہ کوجوک اس سے سینئر شاگرد تھا۔ جس کے ساتھ مل کر اس نے دس سال تک آرٹ سیکھا۔ کوجوک غصے میں اندھا دھند نانجونگ کے سٹوڈیو پہنچا۔ اگرچہ وہ نانجونگ کی ملامت کے لیے گیا تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نانجونگ کا دعویٰ عوامی سطح

MashalBooks.com

پر پختہ ہو گیا۔

آؤ پیارے بھائی' 'خوش آمدید' نانجونگ نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنے بہت سے شاگردوں کی موجودگی میں اس کا استقبال کیا۔ وہ اپنے ہر فقرے کے آخر میں بھائی کہتا اور اس کے آغاز میں ''جن دنوں ہم دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے'' کے الفاظ استعمال کرتا۔ بعد میں اس نے دوسرے لوگوں کے سامنے اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے الزام میں کوجوک پر مقدمہ بھی کر دیا۔

''ابو یہ صاحب آپ کے لیے بانس سے بنی دو تصویریں لے کر آئے ہیں۔'' چوسو نے اپنے باپ کی آنکھوں میں غصہ دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''میں نے سنا تھا تم اپنے فن پارے جمع کر رہے ہو'' نانجونگ ہکلایا۔ ''میرے پاس صرف یہی تھے۔'' وہ ذرا بھی کینہ پرور نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی عمر 60 سال کے قریب نہیں ہے؟ کوجوک نے اس اس دھوکے باز شاگرد کے چہرے پر جھریاں دیکھیں اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اس کے لئے اس شاگرد کو معاف کرنا اب بھی مشکل تھا۔

''بہت شکریہ۔ تمہیں مزید یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کوجوک نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا:

''خدا حافظ......سر''

نانجونگ بہت اداس چہرہ لئے چلا گیا۔ چند لمحے تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی پھر چوسو نے خاموشی کو توڑا'' چائی سک نے فون کیا تھا۔''

''اس نے بتایا وہ کب آئے گا؟''

وہ آج رات آئے گا۔ کیا میں ین سک سے بھی رابطہ کروں؟

''ہاں کرو۔''

کوجوک نے آہ بھری۔

چائی سک اس کی پہلی بیوی سے اس کا بیٹا تھا۔ اس کی پہلی بیوی سے اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ لیکن کوریا کی جنگ میں بیٹی ماری گئی تھی۔ صرف بیٹا بچا تھا۔ ین سک اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا' آخری بیوی سے۔ چائی سک تنتالیس سال کا تھا اور پسان میں ایک دوکان کا مالک تھا۔ ین سک ابھی

صرف بیس سال کا تھا اور سیول کے ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ کوجوک پیار کرنے والا باپ نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو سب سے چھوٹے بیٹے کا مجرم محسوس کرتا۔ جس کی ماں اس کی تیرہ سال کی عمر میں مرگئی تھی اور اسے اس کی سوتیلی بہن نے پالا تھا۔ لیکن آج کوجوک کی نظروں میں چائی سک کا چہرہ آیا اور اسے شدید شفقت محسوس ہوئی۔ یہ ایک چالیس سال کے تھکے ہوئے دوکاندار کا چہرہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک سولہ سالہ لڑکے کا چہرہ تھا جو کسی بھکاری سے بہتر نہیں تھا جب کوجوک اسے واپس لینے گیا تھا۔ اور اسے اپنی پہلی بیوی کا چہرہ بھی یاد آیا جو اسے کئی دہائیاں ہوئیں یاد نہیں آیا تھا۔ کوجوک نے انگاک کے انتظامات کے تحت بیس سال کی عمر میں شادی کی۔ اس کی بیوی انگاک کی دور کی کزن تھی۔ نہ وہ بہت خوبصورت تھی نہ بدصورت۔ وہ دھیمے انداز کی خاتون تھی اسے نہیں یاد پڑتا کہ اس نے کبھی اس سے تلخ کلامی کی ہو یا اسے پریشان کیا ہو۔ یہ اپنے آغاز سے ہی کوئی خوشگوار شادی نہیں تھی کیونکہ کوجوک کی پوری توجہ خطاطی اور مصوری پر تھی۔ شادی کے بعد کے چند دنوں کے علاوہ کوجوک اپنا پورا دن سوکڈم کے گھر گزارتا۔ گھر پر ہوتے ہوئے بھی کوجوک کے خیالات گھریلو معاملات سے بہت دور ہوتے۔ مزید برآں گھر کے معاملات میں کوجوک کی سب سے بڑی کارکردگی وہ چاول لانا تھی جو اسے کبھی کبھار سوکڈم سے ملتے تھے۔ بیوی رات دن سلائی کرتی پھر بھی انتہائی مشکل سے ہی گزارا ہوتا۔

اس کے باوجود ابتداء کے چند سال ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ جب تک کوجوک سوکڈم کا شاگرد رہا وہ رات کو اپنے ہی گھر میں سوتا تھا۔ دونوں کے دو بچے بھی ہوئے۔ لیکن یہ سب کچھ کوجوک کی آوارہ گردی شروع ہوتے ہی ختم ہوگیا۔ بغیر اطلاع کے گھر چھوڑنے کے بعد' کوجوک دس سال تک ادھر ادھر گھومتا رہا اور اسے شاید ہی کبھی یاد آیا ہو کہ اس کی بیوی اور دو بچے بھی ہیں۔ اس کی بیوی اور بچے اس کے لئے ایک مضحکہ خیز لباس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے جسے پہنے رکھنا اس کی مجبوری تھی' چاہے دکھاوے کے لیے ہی سہی۔ کیونکہ ان کی کوجوک کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی لہٰذا۔ انہیں چھوڑ جانا یا بھلا دینا اس کے لیے بہت آسان تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی آوارہ گردی کے سالوں میں اسے کئی بار تلاش کیا۔ لیکن کوجوک نے ہمیشہ اس کی طرف سردمہری دکھائی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے دیکھنے کے بعد اس کے لئے رحم اور پچھتاوا پیدا ہونے کی بجائے کوجوک میں اپنی گراوٹ اور خودغرضی کا احساس زیادہ زوردار طریقے سے پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار جب وہ اپنی بیٹی کو پیٹھ پر باندھے اس کے پاس آئی تو اس نے

MashalBooks.com

اسے کچھ رقم دی اور ربڑ کے جوتے بھی خرید کر دیئے۔ یہ سب کچھ اس نے ایک باپ اور خاوند کی ذمہ داری سمجھ کر نہیں کیا تھا بلکہ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگوں کی مدد کرنے کے خیال سے کیا تھا۔ اس کی ننھی بیٹی کو بخار تھا اور اس کی بیوی کے پاؤں پھٹے ہوئے ربڑ شوز سے باہر جھانک رہے تھے۔ ان کے درمیان یہ آخری ملاقات تھی۔

کوجوک کے اپنے استاد اور خاندان کو چھوڑنے کے پانچ سال بعد اس کی بیوی اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ اپنے دونوں بچوں کو بھی ساتھ لے گئی۔ یہ وہ سال تھا جب کوجوک ماہیانگ کے ساتھ رہنے لگا۔ اگلے سال اس کی بیوی اوساکا' جاپان چلی گئی جہاں اس کا بھائی رہتا تھا۔ افواہ تھی کہ اس نے وہاں دوبارہ شادی کر لی ہے۔ یہ خبر سچ ہی لگتی تھی کیونکہ وہ اپنے وعدے کے مطابق اپنے بچوں کو کبھی واپس نہ لینے آئی جو وہ اپنے والدین کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بہت سال بعد جب وہ اپنی آوارہ گردی سے واپس اپنے استاد کے گھر آیا تو اس نے بچوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس کا بیٹا سولہ سال کا تھا اور بیٹی گیارہ کی۔

چونکہ کوجوک نے کبھی اپنے آپ کو بیوی کو چھوڑنے اور بچوں کو نظر انداز کرنے کا ملزم نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے اس نے بیوی کو بھی کبھی الزام نہیں دیا کہ وہ اسے یا بچوں کو چھوڑ گئی تھی۔ وہ ساری خواتین جو وقتی طور پر اس کی عاشق رہی تھیں سب کا انجام یہی تھا۔ کوئی خاتون' خواہ وہ ماہیانگ جیسی پیشہ ور ہو' یا بیوی ہو یا وہ خطاط اور مصور خواتین ہوں جو اس کی محبت میں گرفتار ہوئیں اسے لمبے عرصہ تک اپنا اسیر نہ رکھ سکی تھیں۔ اپنے کردار کی وجہ سے تنہائی کوجوک کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔

تو پھر وہ کیا تھا جس سے میں نے ٹوٹ کر' خلوص سے محبت کی ہو؟ وہ کیا تھا جسے پانے کی میں نے ساری زندگی شدید جدوجہد کی ہے؟ کوجوک دکھ سے ملتی جلتی اس سوچ میں ڈوب گیا' اپنے چاروں طرف کمرے کو دیکھتے ہوئے جس میں وہ اور چوہون ہی رہ گئے تھے۔ یقیناً یہ فن خطاطی اور مصوری کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اسے خاندان یا سماجی زندگی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے دولت اور جائیداد سے رغبت نہیں تھی۔ اسے شہرت اور طاقت کی شدید خواہش نہیں تھی۔ اگرچہ اس کی زندگی کے بعض ادوار شدید مصروفیت کے تھے لیکن مجموعی طور پر اس نے بہت سادہ زندگی بسر کی تھی۔ سماجی اصولوں اور اخلاقی روایتوں کے قطع نظر وہ وقتی طور پر طاقتور ترین محرکات کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہا تھا۔ ہاں اس کی شدید ترین اور مستقل تحریک حسن کے لیے رہی تھی۔ اسی لئے اس نے خطاطی اور مصوری کے فن کو پروان چڑھایا تھا۔

MashalBooks.com

لیکن مجھے فن کے لیے اس لگن سے کیا ملا ہے؟ کوجوک نے اپنا مذاق اڑانے والے انداز میں اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا اس سے اب بھی مجھے کچھ مل سکتا ہے؟ اپنی زندگی کے پہلے حصے میں کوجوک دو اختلافی فنکارانہ ضوابطہ کے درمیان مسلسل بٹا رہا تھا۔ مشرق میں شروع سے فن ملکی سیاست کا ایک ہتھیار اور مددگار رہا تھا نہ صرف یہ کہ اسے ملکی سیاست سے نجات نہیں مل سکی تھی بلکہ علیت اور مذہب بھی ہمیشہ اس پر اثر انداز ہوتے رہے تھے۔ اس کے سب سے اہم موضوعات وفاداری اور دیانتداری تھے۔ اور خوبصورتی اور کشش سے زیادہ آرٹ کی تعریف کردار کی بلندی اور علیت کی گہرائی جیسی اصطلاحات سے کی جاتی تھی۔ یقیناً زمانہ قدیم کے مغرب میں بھی آرٹ کا تصور اس سے مختلف نہیں تھا۔ بہت مدت تک آرٹ کو خدا کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے بعد سے 'شہریت کے تصور کے ساتھ' آرٹ باقی اقدار سے آزاد ہو گیا تھا اور اپنی ذات میں مکمل وجود مان لیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں حساسیت اور تخیل اپنے آپ میں فن کارانہ اقدار تسلیم کر لی گئی تھیں۔ بہر حال اپنی جوانی میں کوجوک نے مشرقی تصورِ فن کی حکمرانی دیکھی۔ فن کاروں کو ایک اچھوت سمجھا جاتا تھا۔ اور آرٹ کو ایک کلنک کا ٹیکہ۔ اچھے آرٹ کا اصول سمجھا جاتا تھا کہ وہ علیت کی بنیاد پر ہو اور اس کی کامیابی کا ہمیشہ مذہبی آگاہی کے حصول یا کردار کی بلندی سے موازنہ کیا جاتا تھا۔ آرٹ کے اس روایتی نقطہ نظر کا شاید آخری پکا پیروکار سوکڈم تھا۔

مغربی نقطہ نظر سے کوجوک ایک پیدائشی فنکار تھا۔ لیکن سوکڈم کے نزدیک وہ ایک گھٹیا مسخرے سے بہتر نہیں تھا۔ استاد اور شاگرد کے درمیان کشمکش ہرگز اتنی شدید اور مستقل نہ ہوتی اگر کوجوک کا کردار تھوڑا کمزور ہوتا یا وہ کچھ دیر پہلے پیدا ہوا ہوتا۔ لیکن کوجوک ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ آرٹ کو کوئی ایسی چیز محدود کر دے جو خود آرٹ نہیں ہے۔ اور بدلتا ہوا زمانہ بھی اس کی طرف تھا۔ دونوں کی خوش قسمتی یہ تھی کہ کوجوک اپنے استاد کی لگن کے لیے گہری عقیدت رکھتا تھا اور استاد کو بھی اپنے شاگرد کے کبھی نہ دبنے والے ٹیلنٹ سے محبت تھی۔ اس لئے دونوں میں مصالحت ممکن تھی' چاہے وہ موت کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن جب کوجوک اپنے استاد کی رہائش گاہ پر آیا تو اس کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ دس سال تک اس نے اپنے استاد کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی لیکن آخر کار اسے یہ کوشش ترک کرنا

MashalBooks.com

پڑی۔ چوسا کے لیے اس کی شدید پسندیدگی اور پھر اس سے دوری اس کے اسی عمل کی نشانیاں تھیں۔ اس کے بعد بیس سال اور گزر گئے۔ اس کی مسلسل کوشش اور تلاش جاری رہی۔ لیکن جو وہ چاہتا تھا کیا اسے ملا؟ کوجوک نیند کی آغوش میں چلا گیا جو تقریباً بے ہوشی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد کمرے میں شور کی وجہ سے کوجوک دوبارہ بیدار ہوا۔ ''تکلیف کا ایک اور دورہ ابھی آئے گا۔ کم از کم وہ تو میں روک سکتا ہوں،'' کسی نے کہا اور رضائی کھینچ دی۔ یہ ڈاکٹر چونگ تھا۔ سرنج کی باریک ٹھنڈی سوئی جب اس کی جلد میں چبھی تو پورے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ کمرے میں کافی لوگ تھے۔ کوجوک جبلی طور پر سمجھ گیا کہ کچھ ہو رہا ہے۔

''ابو میں ہوں، چائی سک۔ کیا آپ مجھے ٹھیک سے پہچان رہے ہیں؟'' چائی سک نے ٹیکے کے فوراً بعد اس کا ہاتھ پکڑ کر آنسو بھری آواز میں پوچھا۔ وہ گھر میں کبھی خوش نہیں رہا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب سولہ سال کی عمر میں اس نے اپنے باپ کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ کوجوک کو وہ دن یاد آیا جب چائی سک پہلی بار گھر سے بھاگ گیا تھا۔ یہ وہ دن تھا جب کوجوک نے پہلی بار اسے سیاہی والا پتھر اور برش خرید کر دیا تھا۔ وہ کسی کے بھی بیدار ہونے سے پہلے ہی گھر سے چلا گیا۔ وہ اپنے پیچھے سیاہی والا پتھر پاؤڈر بنا کر، برش کے ٹکڑے کر کے اور بالوں کا گچھا الگ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے بعد سے چائی سک کوجوک کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث ہی رہا۔ وہ کبھی کوجوک کی نامکمل خطاطی یا تصویریں لے کر غائب ہو جاتا اور کبھی گھر سے رقم چرا لیتا۔ فوج سے نکالے جانے کے بعد اس نے ٹرک خریدنے کے لیے رقم مانگی اور پھر غائب ہو گیا۔ پچھلے سے پچھلے سال سے چائی سک دوبارہ اس سے ملنے آنے لگا تھا۔

''ین سک بھی یہاں ہے۔''

چوسو کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ بیچارا۔ وہ ان سب کا گنہگار تھا۔ کیا وہ معمولی سی جائیداد جو وہ ان کے لیے چھوڑ کر جا رہا تھا اس کے لیے کچھ ازالہ کر سکتی ہے؟ کوجوک نے پہلے ہی وصیت میں واضح کر دیا تھا کہ شہر کے مضافات میں موجود باغ چائی سک کو ملے گا۔ ین سک کو اس سٹوڈیو والی عمارت ملے گی اور چوسو کو موجودہ گھر۔ پھر اس نے سوچا کہ اپنی ساری جائیداد بیچ کر جو اس نے آرٹ پرائز شروع کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا تھا شاید بہتر فیصلہ تھا۔ وہ اپنی موت کے بعد اس دنیا سے پیار کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے خلاف رہتے ہوئے اس نے ساری زندگی بسر کی تھی۔

MashalBooks.com

''رونا بند کرو۔ یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے کسی کو خدا فظ کہنے کا'' ایک خاتون کی آواز آئی۔

پھر خاتون نے کوجوک کا ہاتھ پکڑا۔'' کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ اس نے کوجوک سے پوچھا۔ کوجوک نے آہستہ سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ ایک خاتون خطاط اور مصور تھی جو اوکیو کے نام سے جانی جاتی تھی۔ کسی زمانے میں اس نے اس خاتون کو شدت سے چاہا تھا۔ اور وہ دور دور تک اس کی محبوبہ مشہور تھی۔ اب وہ قریبی شہر میں اپنا سٹوڈیو چلاتی تھی اور تقریباً ریٹائرمنٹ کی زندگی گزاری رہی تھی۔

''یقیناً کیوں نہیں'' لیکن یہ الفاظ ادا کرنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ نیند میں چلا گیا۔

سنہری قفقس اپنے ایک میل لمبے پر پھیلائے اڑ رہا تھا۔ وہ سمندر کے اوپر محو پرواز تھا۔ لیکن یہ پرندہ بدروحوں کی فوج کو بھگا دینے والا اور کسی اژدھے کا شکار کرنے والا خوفناک پرندہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ پرندہ ایک روشن اور خوبصورت دنیا میں پہنچنے کے لئے پرواز کر رہا تھا۔ اس کے خوبصورت سر پر تاج چمک رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں سے عنابی رنگ کی پتیاں نکل رہی تھیں۔ کوجوک خود اس کی پشت پر سوار تھا۔ اچانک سنہری قفقس اوپر اٹھا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کوجوک اس کے اوپر سے ایک طرف کو لٹک گیا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی اور پر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے کمرے میں گھڑی کی آواز سنی جو چار بجا رہی تھی۔ درد کی دوا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ اس نے شدید درد کی ٹیس محسوس کی جو پورے بدن سے اٹھتی محسوس ہوتی تھی اور کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس حصے سے نکل رہی ہے۔ لیکن اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پوری طرح بیدار تھی۔

تمام مہمان جا چکے تھے۔ صرف اس کے بیٹے اور چوسو دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ کوجوک نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ غیر متوقع طور پر یہ کام آسان ثابت ہوا۔ اس کی پیٹھ کے ایک حصے میں درد کچھ کم ہو گیا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ ابھی ایک اہم کام تو اسے کرنا ہے۔

''سینگ چول'' اس نے شاگرد کے نام سے پکارا۔ اس کے تین یا چار بار آواز دینے پر چوہون بیدار ہوا۔

''جی سر؟ کیا بات ہے؟'' چوہون نے پوچھا اور جلدی سے آگے بڑھا تاکہ اسے سہارا دے سکے۔ کوجوک نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور کہا'' خطاطی اور مصوری کے جتنے نمونے ہم نے

جمع کئے ہیں سارے لے آؤ۔"

چوہون سے جیسے کہا گیا تھا اس نے ویسا ہی کیا۔ جب ساری چیزیں الماریوں اور سٹیشنری کے ڈبوں میں سے نکالی گئیں تو خاصا بڑا ڈھیر لگ گیا حالانکہ تصویروں کے فریم بھی نہیں تھے۔ کل ملا کے یہ تقریباً دو سو فن پارے بنے۔

ابو یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس کے بیٹے بھی شور سن کر جاگ اٹھے اور پوچھنے لگے۔ کو جوک بیمار اور قریب المرگ شخص نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن اپنے بیٹوں کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے چوہون سے پوچھا" کیا تم اس کمرے میں تھوڑی زیادہ روشنی کر سکتے ہو؟"

" مجھے پتہ ہے گھر میں کوئی لیمپ تو ہے۔ میں ڈھونڈھ کر لاتا ہوں۔" چوہون اپنے استاد سے پوچھے بغیر کہ وہ خطاطی اور مصوری کے فن پاروں اور زیادہ روشنی سے کیا کرنا چاہتا ہے۔ باہر چلا گیا۔ اور لیمپ لے آیا۔ جب کمرے میں روشنی دوگنا ہو گئی تو کو جوک نے چوہون کو دوبارہ حکم دیا۔ " اب ان سب کو سیدھا کرو اور ایک ایک کر کے مجھے دکھاؤ" چوہون نے حکم کی تعمیل کی۔ پہلا فن پارہ پچاس کی دہائی میں یوشی نان کے انداز میں لکھا ہوا خطاطی کا نمونہ تھا۔

" یہ عبارت یوشی نان کی ہے۔ اس میں پانچوں خصوصیات نہیں ہیں جو اس میں ہونی چاہئیں۔ اسے میری بائیں جانب رکھ دو" اگلا فن پارہ آرکڈ کی تصویر تھا۔

" یہ ابھی بھی پرنس ریجنٹ تائیوان کے سائے میں موجود ہے نہ یہ قدرتی آرکڈ ہے اور نہ میرے دل کا آرکڈ۔ اسے میری بائیں جانب رکھ دو۔"

کو جوک ہر چیز کو اس بے رحمی اور سختی سے تنقید کا نشانہ بنا تا رہا جیسے وہ کسی پرانے دشمن کے کام کو دیکھ رہا ہو۔ خطاطی کے نمونوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ برش کی بے یقینی، مطابقت کی کمی یا کسی بھی روایتی انداز کی طاقت پر اپنی رائے دیتا۔ جو چیزیں اس کے اپنے سٹائل میں بنی ہوئی تھیں وہ ان کے مصنوعی پن اور وقار کی کمی پر تنقید کرتا۔ سب کے بارے میں اس نے حکم دیا کہ اس کی بائیں طرف رکھ دی جائیں۔ برش سے بنی تصویروں کے بارے میں یہی ہوا۔ پرانے قوانین اور اپنے اعلیٰ معیار پر پرکھنے کے بعد کوئی بھی چیز اس قابل نہ نکلی کہ اس کی دائیں طرف رکھی جا سکے۔

صبح صادق سے شروع ہونے والی یہ کارروائی دن چڑھے تک جاری رہی۔ ڈاکٹر چونگ بعد

میں بار بار اس بات پر حیرت کا اظہار کرتا رہا کہ یہ ایک ماورائی طاقت تھی جس کا کوجوک نے مظاہرہ کیا۔ جلد ہی کوجوک کا چھوٹا سا کمرہ ملاقاتیوں سے بھر گیا۔ مگر کارروائی اتنی پاکیزہ تھی کہ کسی نے بھی اسے اس تھکا دینے والے کام سے روکنے کی کوشش نہ کی۔ اور کوجوک بھی لگتا تھا چوہون کے سوا ہر کسی کے وجود سے بے خبر تھا۔ دس بجے کے بعد یہ کام ختم ہوا۔ لیکن ایک بھی چیز کوجوک کے دائیں ہاتھ نہیں تھی۔ کوجوک نے لرزیدہ آواز میں پوچھا ''کچھ اور چیزیں نہیں ہیں؟'' حالانکہ باقی سب کے ساتھ اسے خود بھی نظر آ رہا تھا کہ اور کچھ نہیں ہے۔

''نہیں'' چوہون نے سادگی سے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لئے کوجوک کے چہرے پر دکھ چھا گیا۔ اس کا سر جھک گیا اور جسم کمزور سے انداز میں نیچے جھک گیا۔ کئی ملاقاتی چیخے اور اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لیکن اس لمحے بھی کوجوک اپنے آپ ہی کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ''نہیں۔ وہ میرے سامنے نہیں آیا۔ میری۔ میری خواہش تھی کہ میں کم از کم ایک بار ہی اسے اڑتا ہوا دیکھ لوں۔ لیکن وہ اڑا ہی نہیں۔ شاید مجھے شروع سے ہی معلوم تھا کہ میں اسے نہیں دیکھ پاؤں گا۔ شاید اسی لئے میں نے یہ کام آخری وقت تک ملتوی کئے رکھا......''

کوجوک اپنے کام سے کس چیز کو بلند ہوتے دیکھنا چاہتا تھا؟ یہ سنہری ققنس تھا۔ بالکل ویسا ہی ققنس جیسا اس نے صبح خواب میں دیکھا تھا۔ جو ققنس اس کے استاد سوکڈم کی طرف سے اس کی جانب اڑا تھا وہ مظہر تھا وقار اور کردار کی بلندی جیسی مشرقی اقدار کا۔ لیکن وہ پرندہ کوجوک کے ذہن میں آ کر تبدیل ہو گیا تھا۔ اب یہ حسن جمالیات کی تکمیل یا فنکارانہ اکملیت کی علامت بن گیا تھا۔ کوجوک کے فنی اصول، جو اس کی خطاطی اور مصوری میں بھی عیاں تھے اور زبانی طور پر اس کے شاگردوں کو بھی بتائے جاتے تھے دو بنیادی نکات پر مشتمل تھے۔ ایک یہ تھا کہ جہاں روایتی جمالیات میں مصوری کو ہمیشہ تحریر کے طور پر دیکھا جاتا ہے وہ ہر تحریر کو بھی مصوری سمجھتا تھا۔ اگر خطاطی کا کام محض لفظوں کے ذریعے سے اپنے معانی دوسروں تک پہنچانا ہی ہے تو پھر یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے لیے پوری زندگی وقف کی جائے۔ چند مہینوں کی تربیت کے بعد کوئی بھی شخص بڑی کامیابی سے معانی دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ پنسل یا بال پوائنٹ جیسے آلات سے کام کرنا ہو تو چند دن کی مشق ہی کافی ہوتی ہے۔ لہٰذا خطاطی کی اصل اہمیت پیغام پہنچانے کے میڈیم کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ بذات خود ایک باقاعدہ آرٹ کی حیثیت سے ہے۔ اگر خطاطی باقاعدہ

MashalBooks.com

آرٹ نہ ہوتا تو اس چیز کی کوئی وضاحت نہ ملتی کہ خطاطی کو صرف مشرق میں ہی کیوں ترقی ملی جہاں چینی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مغرب میں نہیں؛ جہاں صوتی حروف استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اسے پیغام پہنچانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس لئے اسے اور اس کی قریبی ساتھی مصوری کو کبھی خود مختار اقدار نہیں دی گئیں۔

کوجوک کے فنی اصول کا دوسرا نکتہ تھا حقیقت پسندانہ مصوری اور اظہاریت پسند مصوری میں فرق کرنا۔ حقیقت پسند مصوری چیزوں کو بالکل اصلی اور صحیح انداز میں پیش کرتی ہے۔ جبکہ اظہاریت پسند مصوری میں اشیاء کو مصور کے جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں قسم کی مصوری مغرب کی تجریدی اور غیر تجریدی مصوری سے مطابقت رکھتی ہے۔ کوجوک کا خیال تھا کہ مشرقی مصوری میں یہ دونوں اقسام آپس میں گڈمڈ ہوگئی ہیں۔ اور اس کے خیال میں دونوں قسم کی مصوری میں باقاعدہ تخصیص مصور کی اپنی ترجیح ہے کہ وہ دونوں میں سے کس قسم کو اپناتا ہے۔ لہٰذا کردار کی عظمت اور علمیت کی گہرائی جیسے خیالات صرف اظہاریہ مصوری کا خاصہ ہیں۔ کسی اعلیٰ تر مصوری کے بنیادی لوازمات نہیں ہیں۔

لہٰذا کوجوک کا کراکن قفس ایک ایسا پرندہ تھا جو اس کے فنکارانہ عقائد سے اٹھتے ہوئے فنکارانہ اکملیت تک چلا جائے۔ جب اس کی عمر پوری ہوگئی تو اسے موت کی تیاری کرنا تھی لیکن اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے برش کی ضربوں سے کراکن پرندے کو اٹھتے ہوئے دیکھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چیز اس کی عمر بھر کی جدوجہد کو معنی دے گی اور اس کا اپنی تنہا اور تکلیف دہ زندگی سے سمجھوتہ کروا دے گی۔

کمرے میں موجود کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ کوجوک دوبارہ ہوش میں آئے گا لیکن وہ پانچ منٹ میں ہی دوبارہ جاگ اٹھا۔ پھر لیٹے رہنے کی تمام درخواستوں کو رد کرتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑے تحکمانہ انداز میں چوہون سے کہا۔ ''یہ سب کچھ اٹھا کر سٹور روم کے پاس پھولوں کی کیاری میں لے جاؤ۔'' چوہون؛ جس کا اصول تھا کہ کبھی سوال نہیں کرتا تھا بلکہ جو اسے کہا جائے چپ چاپ کر دیتا تھا؛ بغیر وہاں سے حرکت کئے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ان چیزوں کے ساتھ میں نے ساری عمر اپنے آپ کو اور باقی دنیا کو دھوکا دیا۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلائے رکھا کہ میں کوئی بہت قیمتی کام کر رہا ہوں اور ساری عزت و توقیر اپنا حق سمجھ

MashalBooks.com

کر سمیٹتا رہا۔''

''یہ آپ کا حق تھیں۔'' ''نہیں۔ ہوسکتا ہے دنیا میں کچھ لوگ اس قسم کی تعریف اور عزت کے حقدار ہوں۔ لیکن میں ان میں شامل نہیں ہوں۔'' اس نے توقف کیا۔'' اب تک میری شدید خواہش تھی کہ میں اپنے کام سے بے شک ایک بار ہی سہی کرا کن کو بلند ہوتے ہوئے دیکھوں۔ میرا خیال تھا کہ پھر میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ لیکن اب مجھے شک ہے کہ کرا کن کو بلند ہوتے دیکھ کر بھی میری زندگی کو کوئی معنی مل پاتے۔''

چوہون خاموش تھا۔

''بہر حال۔ جیسا میں کہہ رہا ہوں۔ کرو۔ اگر میں اپنے بعد انہیں چھوڑ گیا تو میں اپنی موت کے بعد بھی دنیا کو دھوکا دوں گا۔''

چوہون خاموشی سے تصویروں والے اور لکھے ہوئے کاغذوں کا پلندہ اٹھائے چلا گیا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اسے اپنے استاد کی بات سمجھ میں آ گئی تھی یا وہ اپنے استاد کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا؟ بہر حال وہاں موجود کسی کی جرات نہ ہوئی کہ چوہون کو روکے' ہر کسی پر کوجوک کی شاہانہ متانت چھائی ہوئی تھی۔

''اسے کھلا رہنے دو۔'' جب کسی نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو کوجوک نے غصے سے حکم دیا۔ پھر ایک صاف اور زوردار آواز میں جو بستر مرگ پر پڑے کسی شخص کی آواز جیسی ہرگز

نہیں تھی اس نے سٹوریج پلیٹ فارم کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے شاگرد کو حکم دیا۔'' یہ سب چیزیں یہاں رکھ دو۔ اس جگہ۔''

نوجوان اب سٹوریج پلیٹ فارم کے پاس پھولوں کی کیاری تک پہنچ چکا تھا۔ جب چوہون نے پورا پلندہ چند مرجھائے ہوئے پودوں کے قریب رکھ دیا تو کوجوک نے اپنا حکم دہرایا۔'' انہیں آگ لگا دو۔''

کمرے میں کھلبلی مچ گئی۔ کسی نے کوجوک سے بات کرنے کی کوشش کی تو کچھ نے چوہون کا بازو پکڑنے کی کوشش کی لیکن سب بے کار۔ کوجوک شاہانہ انداز میں پھر چلایا۔ ''میں نے کہا: انہیں آگ لگا دو۔''

چوہون کے ردعمل نے سب کو چونکا دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے استاد کی طرف خونخوار

نظروں سے گھورا۔ پھر ان لوگوں کو پرے جھٹکتے ہوئے جنہوں نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے' اس نے پورے ڈھیر کو آگ لگادی۔ چوہون کے بعد والے رویے کی روشنی میں جس میں وہ اپنے استاد کو جعلی قرار دیتا' یقیناً اس کی عالمانہ اور سادہ طبیعت نے کوجوک کی ضرورت سے زیادہ خود ملامتی اور ذات کی نفی کے خلاف بغاوت کی تھی۔ کاغذوں کا وہ ڈھیر جلد ہی شعلوں کی نذر ہو گیا۔ ہر شخص کے منہ سے آہیں' کراہیں اور سسکیاں نکل پڑیں۔

کسی کے خیال میں کوجوک کی پوری عمر جل رہی تھی۔ دوسرے کے خیال میں کوجوک کی سچائی جل رہی تھی۔ کسی اور کے خیال میں یہ بڑے نوٹوں کی گڈیاں جل رہی تھیں۔ ایک ایسے ماہر فن کے فن پارے' جن کے کم از کم دو سربراہ مملکت مداح رہے تھے اور جس فن کار نے قومی فنی نمائش پر بڑی اعلیٰ سطح کی سکرینِنگ کمیٹی میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا' ایک ایک کر کے آگ نے جلا دیئے۔

لیکن ان شعلوں میں کوجوک کو سنہری ققنس بلند ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس پرندے کی ہوشربا خوبصورتی اور طاقت سے بھرپور پرواز دیکھی۔ اس شام تقریباً 8 بجے کوجوک اپنے خالق سے جا ملا۔ اس کی عمر بہتر برس تھی۔

☆☆☆

بوسیدہ مکان میں رہنے والی لڑکی

یِن ہومایونگ

یِن ہو مایونگ 1946 Yun Hu-myong ء میں پیدا ہوئے۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعر کے طور پر کیا لیکن افسانہ نگار کے طور پر زیادہ معروف ہوئے۔انہوں نے یون سی یونیورسٹی سے فلاسفی کی تعلیم حاصل کی۔فلاسفی میں ان کی تربیت کی جھلک ان کی شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میں بخوبی محسوس ہوتی ہے۔انہوں نے جو کام کیا ہے اس میں ماضی اور حال کا الحاق،تصورات اور حقیقت کے درمیان تقاطع اور اشتراک کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے کردار معاشرے سے لئے ہوئے ہیں اور اپنے سینے پر پراسرار زخم لئے پھرتے ہیں۔اپنے ہی واہموں کے احساسات سے متاثر یہ لوگ حقیقت کے ساتھ تعلق قائم کرنے،دوسرے لوگوں سے وابستگیاں استوار کرنے اور زندگی کو بامعنی بنانے کی تگ ودو میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اسلیئے ان کا افسانہ شاعرانہ اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔انہوں نے سیاسی جبر اور معاشرتی ناانصافی جیسے موضوعات سے صرف نظر کرتے ہوئے انسان کے داخلی شعور اور وجودی زخموں کو تلاش کرنے اور کھوجنے کو زیادہ مناسب گردانا ہے۔یُن فراوانی سے لکھنے والا ادیب نہیں ہے،ان کی پسندیدہ صنف طویل افسانہ ہے۔

زیرِنظر افسانہ انہوں نے 1982ء میں تحریر کیا۔اس افسانے کا تانا بانا اس صنف میں ان کی دیگر تخلیقات کی نسبت کسی قدر سادہ اور آسان

MashalBooks.com

ہے۔اس میں بچپن کے اس خوف کو موضوع بنایا گیا ہے جو اس کہانی کے ہیرو پر کبھی نہ ختم ہونے والا زخم چھوڑتا ہے اور جس کی وجہ سے سماجی تعلقات خراب ہوتے چلے جاتے ہیں جبکہ کوئی اس خرابی کا ذمہ دار بھی نہیں ہوتا۔خوف اور خرابیوں سے جنم لینے والی یہ بے گانگی پھر آگے بچوں میں بھی منتقل ہوتی ہے۔ جیسے یہ انسان ہونے کی بنیادی شرائط میں سے ایک ہو۔انسانی تعلقات کو قائم رکھنے اور بحال کرنے کے حوالے سے اس کے کرداروں کی کوشش اور پھر ناکامی آج کے ماڈرن لوگوں کے حافظے کے گوشوں کو چھیڑتی اور کچھ یاد دلانے کی کوشش کرتی ہے، جو ایک ہی جیسی مایوسیوں اور ناکامیوں سے بار بار گزر رہے ہیں۔

(1)

میں بیماری سے ابھی پوری طرح تندرست نہیں ہوا تھا لیکن جب مجھے یہ بتایا گیا کہ میں گھر سے باہر جاسکتا ہوں، حتیٰ کہ کھیل بھی سکتا ہوں تو میں سب سے پہلے سہوا کے گھر گیا۔جس دوران میں خسرہ کی بیماری کے باعث بستر پر تھا دنیا کافی تبدیل ہوگئی تھی۔دن کا اجالا ابھی ماند نہیں پڑا تھا لیکن پھر بھی ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔گھر کے باہر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں میں اپنی صحت یابی کے دوران میں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ سنتا رہا تھا لیکن میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ پورا گاؤں اس قدر غم ناک خاموشی میں ڈوب جائے گا۔یہ خاموشی پر امن نہ تھی بلکہ خوف زدہ کر دینے والی تھی، جیسے وہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔بیماری کے دوران بستر پر پڑے رہنے سے میری ٹانگیں متاثر ہوئی تھیں اور کانپ رہی تھیں۔دھوپ کی تمازت اور روشنی سے مجھے چکر آ رہے تھے۔میں اپنے اور سہوا کے گھر کے درمیان لکڑی کے تختوں سے بنی دیوار کی طرف گیا اور ایک شگاف سے اس کے گھر کا جائزہ لیا۔اس کا گھر، جو میرے بیمار پڑنے سے پہلے بھی سناٹے کی چادر میں لپٹا رہتا تھا اب اور بھی زیادہ گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی چھت کے گلتے سڑتے ہوئے حصے سے گہرے نیلے رنگ کے چہرے

والا کوئی بھوت نکل کر دھپ سے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ کم سن سہوا ایسے پراسرار اور بوسیدہ گھر میں رہتی ہے۔

''باہر مت جاؤ! غیر ملک کے آدمیوں نے دیکھ لیا تو وہ تمہیں نہایت تکلیف دہ جگہ پر لے جائیں گے''۔ ماں نے بھیگے ہوئے آلوؤں میں سے پانی نکالتے ہوئے کہا۔ وہ غالباً آلو چھیل کر ان سے کیک بنانے جا رہی تھی۔

یہ سوچ کر کہ اس کی دادی اماں باہر نہیں آئیں گی، میں دیوار میں بنے بڑے سے شگاف میں سے گزر کر سہوا کے گھر کے صحن میں پہنچ گیا۔ یہ شگاف دیوار میں سے لکڑی کے تختے اکھاڑ کر بنایا گیا تھا اور اتنا بڑا تھا کہ بڑے افراد بھی رینگ کر اس کے پار جا سکتے تھے۔ یہ شگاف ایک راستے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ سہوا کی دادی اماں صحن میں موجود نہ تھیں۔ وہ یقیناً اپنی دنیا میں گم اپنی سلائی کی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہی ہوگی۔ معمر خاتون، جس کی سماعت مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی، ہر وقت کچھ نہ کچھ سیتی رہتی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایک زمانے میں وہ بہت مضبوط اور طاقتور ہوتی تھی، اتنی مضبوط کہ دائی کا کام کرتی تھی لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ معمر ہو گئی اور اب وہ اپنا زیادہ تر وقت سینے پرونے میں گزارتی تھی۔ وہ گھر سے کم ہی باہر نکلتی تھی، صرف ہمارے ہاں آتی، وہ بھی صرف اس وقت جب اس کے پاس سینے پرونے کے لئے کچھ نہ ہوتا۔ وہ جب کبھی اپنے سر کو اوپر نیچے ہلاتی ہوئی ہمارے گھر آتی تو میری ماں کپڑوں کی الماری سے ہمارے کچھ استعمال شدہ کپڑے لے کر اس کے گٹھیا والے ہاتھوں میں پکڑا دیتی۔ میری ماں کو کچھ بھی بولنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی کیونکہ معمر خاتون مکمل طور پر بہری ہو چکی تھی۔ ایسے موقع پر بوڑھی عورت دکھاوے کی ہنسی ہنستی اور ایک بار پھر اپنے گھر میں غائب ہو جاتی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کسی جادوگرنی کی طرح دکھائی دیتی۔ سہوا سوئی میں دھاگہ ڈالنے میں ماہر ہو چکی تھی کیونکہ اس کی دادی ماں ہر وقت کچھ نہ کچھ سیتی رہتی تھی حتیٰ کہ اگر وہ قریب ہوتی تو میری ماں بھی سوئی میں دھاگہ ڈالنے کیلئے سہوا سے ہی کہتی تھی۔ سہوا کی دادی ماں کپڑے کے تمام پھٹے ہوئے حصے اور سوراخ حتیٰ کہ جیبوں کے منہ اور بٹنوں کے کاج تک سی دیتی تھی چنانچہ جب وہ کسی کپڑے کو سی کر اپنا کام مکمل کرتی تو وہ کسی طور پہننے کے لائق نہیں رہتا تھا۔

''سہوا، سہوا!'' میں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے حصے سے آواز دی۔ میں بلند آواز میں پکار رہا تھا کیونکہ مجھے یہ خوف نہ تھا کہ اسی کی دادی اماں میری آواز سن لے گی۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی

اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ گرد سے اٹی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہے۔

''تم ٹھیک ہو''

''ہاں''

سہوا خرگوش کے ننھے منے بچے کی طرح اپنی ناک ہوا میں بلند کر کے شوخی سے مسکرائی۔

ہم دونوں نے لکڑی کے تختوں سے بنی دیوار میں بنے شگاف کو پار کیا۔ اب ہم گھر کے صحن میں کھڑے تھے، ہم باہر گلی میں جانا چاہتے تھے۔ سہوا کے گھر کا بڑا دروازہ عرصہ پہلے بڑے بڑے کیل لگا کر مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ماں صحن میں موجود نہ تھی۔ باہر جانے کیلئے گیٹ کھولا تو کواڑ چر چرائے، ہم دونوں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کواڑ چر چرانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اسے آخری دفعہ کھلے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ ہم نے بڑے محتاط انداز میں گیٹ بند کیا اور دبے قدموں سے بڑی سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔

بڑی سڑک سنسان پڑی تھی۔ انسان یا چرند پرند تو دور کی بات وہاں تو کوئی کیڑا مکوڑا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ سال کا وہ عرصہ تھا جب پہاڑوں سے خواتین کے جتھے ہمارے قصبے میں آتے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں ٹوکریاں اٹھا رکھی ہوتی تھیں جن میں مکئی کے پکے ہوئے بڑے بڑے سٹے ہوتے تھے۔ یہاں سال کے موسموں کا اندازہ وہاں آنے والی اجناس اور پھلوں سے لگایا جاتا تھا، جو ابھی تک نہیں پہنچے تھے چنانچہ محسوس یہ ہوتا تھا کہ ترک کر دی گئی اس سفید سڑک پر موسم تھم سا گیا ہے۔

''باقی سارے بچے کہاں ہیں''؟

''وہ ملک کے مختلف حصوں میں جا کر چھپ گئے ہیں، جب جنگ ختم ہو جائے گی تو وہ واپس آ جائیں گے''۔ میں نے سہوا کو کچھ اس انداز سے سمجھانے کی کوشش کی جیسے میں کوئی بوڑھا بزرگ ہوں جو حالات کے بارے میں سارا علم رکھتا ہے اور سہوا کوئی چھوٹی بچی ہے جسے صورتحال کا کچھ علم نہیں۔ لیکن باقی بچوں کے یہاں اس قصبے میں موجود ہونے یا نہ ہونے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ ہمارے ساتھ نہیں کھیلتے تھے اور ہم بھی ان کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ جب باقی بچے گھونگے اور سیپیاں جمع کرنے کیلئے گروہوں میں اکٹھے ہو کر ساحل سمندر پر جاتے تب بھی سہوا اور میں میرے گھر کے پچھلے کائی زدہ دالان میں کھیلنے کو ترجیح دیتے تھے۔

جب میں بستر علالت پر تھا اور میرے اوپر ہر وقت ایک موٹی سی رضائی ہوتی تھی تو میں اکثر سنتا کہ سہوا مجھے پکار رہی ہے۔ وہ دن میں کئی بار مجھے بلاتی تھی۔ میرے کمرے کے باہر برآمدے میں گھومتے ہوئے وہ اکثر کوشش کرتی کہ اسے میری ایک جھلک دکھائی دے جائے۔ باوجود اس کے کہ میرے جسم پر خسرے کے دانے نکلے ہوئے تھے اور میں بخار کی حالت میں ہوتا، میں اگر چاہتا تو اُس سے کچھ باتیں کر سکتا تھا لیکن بوجوہ میں خاموش رہتا اور یہ دکھاوا کرتا کہ میں سخت تکلیف میں ہوں، حالانکہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ ایسے موقعوں پر میری ماں گھر کے کسی کونے سے برآمد ہوتی اور سہوا سے کہتی کہ وہ اپنے گھر چلی جائے۔

''میرا خیال ہے یہ ابھی چند دن اور بستر پر رہے گا، ہمیں اس کو جھینگے کھلانے چاہئیں تاکہ دانے نکلنے کا عمل تیز ہو جائے لیکن آج کل جھینگے ملیں گے کہاں سے؟ تم یقیناً اکیلے کھیل کھیل کر تنگ آ چکی ہو گی، تمہاری دادی امی ٹھیک ہیں؟''

میں جانتا ہوں کہ میری ماں کی ان ساری باتوں کے جواب میں سہوا ''ہاں'' میں سر ہلاتی ہو گی اور پھر میری ماں اسے اپنے پاس بلا کر کالی مرچوں والے نمکین چاول دیتی۔ سہوا عام طور پر اپنا کھانا ہمارے گھر پر کھاتی تھی لہٰذا یہ چاول اور آلو اس کے لئے نہیں بلکہ اس کی دادی ماں کے لئے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی میری ماں سہوا کو پانی میں بھیگا ہوا روئی کا ٹکڑا دیتی اور کہتی ''اس سے اپنی دادی ماں کی آنکھیں صاف کر دینا، تم ایک اچھی لڑکی ہو''۔ سہوا کی ماں گھر سے بھاگ گئی تھی اور غصے میں اس کے باپ نے بھی گھر چھوڑ دیا۔ وہ کان کنی والے ایک گاؤں چلا گیا تھا۔ اب چھوٹی لڑکی اور معمر خاتون کی دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہ تھا۔ میں نے ایک دفعہ بڑے بوڑھوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ سہوا کا باپ کانوں کے قریبی قصبوں میں گھومتا رہتا ہے اور کبھی کبھار اس بچی اور اپنی ماں کی دیکھ بھال کیلئے کچھ رقم بھجوا دیتا ہے۔

سہوا دیوار میں بنے شگاف میں سے گزر کر ہمارے گھر آتی اور مٹی کے اس ڈھیر پر چڑھ جاتی جو ہنگامی پناہ گاہ کے اوپر چھت سی بناتا تھا۔ مٹی کا یہ ڈھیر سہوا کے گھر کے پچھلی طرف جبکہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا چنانچہ وہ جب بھی اس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ کر اسے عبور کرتی تو اس کے لمبے بال ہوا کے جھونکوں سے لہرانے لگتے اور اس کے چہرے پر پھیل جاتے۔ یوں محسوس ہوتا کہ ہوا صرف اسے ستانے کیلئے چلتی ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ تیوڑی چڑھا لیتی جیسے ہوا کی اس حرکت سے ناراض ہو اور پھر اپنے

بالوں کو پیچھے کی طرف سنوار لیتی۔

ہم دونوں اس راستے پر ہو لئے جو مارکیٹ کی طرف جاتا تھا حالانکہ ہم میں سے کسی کا بھی ادھر آنے کا ارادہ نہ تھا اور نہ ہی کسی نے ادھر آنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ہم جب کبھی مارکیٹ جاتے تو اس کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا، آگ پر بھنی ہوئی مچھلی کھانا۔ کھلی آگ پر بھنی ہوئی مچھلی فروخت کرنے والی درمیانی عمر کی عورتیں ہماری واقف تھیں۔ وہ سب کھلی ڈھیلی پینٹیں پہنتی تھیں ٹخنوں کے قریب جن پر الاسٹک کی پٹیاں لگی ہوتی تھیں، ان کی بھنویں غیر ہموار اور کوئلوں پر سے اڑنے والی چنگاریوں سے جلی ہوئی ہوتی تھیں۔

''کیا تم تھوڑی سی مچھلی کھانا پسند کرو گی'' میں اس سے پوچھتا۔ جواب میں سہوا تھوک نگلتی تھی، غالباً مچھلی کا نام سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اس پہاڑی علاقہ میں جالی پر بھنی ہوئی مچھلی لوگوں کا پسندیدہ سنیک ہے، بچے اور بڑے سبھی یہ شوق سے کھاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی مچھلی کے گوشت کے ساتھ ساتھ اس کا سر اور دم بھی ہڑپ کر رہا ہے۔ ہم نے سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہا، ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے والدین اس طرح مچھلی نہیں کھاتے۔

مارکیٹ جاتے ہوئے ایک دوراہا آنے پر ہم سوچ میں پڑ گئے۔ دونوں ہی راستے ہمارے لئے خوف کا باعث تھے۔ بائیں طرف جانے والے راستے پر ایک دفعہ ایک شخص بجلی کے جھٹکے لگنے سے زخمی ہو گیا تھا اور وہ اب وہاں کھڑا ہر گزرنے والے کو خبردار کرتا تھا ''ذرا بچ کے اس میں کرنٹ دوڑ رہا ہے''۔ دائیں طرف جانے والے راستے پر ایک پاگل عورت اپنے ہاتھ گھماتے ہوئے اوپر اور نیچے کی طرف چکر لگاتی رہتی تھی۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ ہم اس مقام پر آ کر ٹھہر جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کوئی مرد یا عورت کسی طرف سے نمودار نہیں ہوتا تھا اور دونوں میں سے کسی ایک راستے پر چل نہیں دیتا تھا۔ جونہی وہ کوئی راستہ اختیار کرتا، ہم بھی تیزی سے اس کے پیچھے ہو لیتے تھے۔ لیکن اس وقت سڑک مکمل طور پر سنسان پڑی تھی لہٰذا کسی کے آنے کا انتظار کرنا فضول تھا۔

''ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟''

''مجھے تو نہیں معلوم''

سہوا نے بائیں طرف جانے والے راستے پر ایک نگاہ ڈالی، جیسے وہاں سے کوئی آواز سننے کی

کوشش کر رہی ہو۔ ''خبردار اس میں کرنٹ دوڑ رہا ہے''۔ پھر اس نے اس راہ گزر کا جائزہ لیا جس پر پاگل عورت ہاتھ پھیلائے چکر لگاتی رہتی تھی۔ غالباً وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ ذہنی طور پر معذور عورت بھاگ کر جا چکی ہے یا کسی ایسی جگہ جا چھپی ہے جہاں دوسرے سارے لوگ غائب ہو گئے تھے۔

''ادھر آؤ'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہم دائیں طرف والے راستے پر ہولئے۔ سارے گھروں کے گیٹ مضبوطی سے بند تھے اور ان میں سے زیادہ تر کراس کی شکل میں لمبے تختوں سے کیلوں کے ساتھ مکمل طور پر بند کر دیئے گئے تھے۔ سہوا میری نسبت زیادہ دھیان کے ساتھ ارد گرد نظریں گھما رہی تھی۔ خالی گاؤں ایک ایسی کتاب کی طرح لگ رہا تھا جس میں الفاظ کی جگہ محض تصویریں چھاپی گئی ہوں۔ دیواروں پر لکھی گئی تحریر کسی خفیہ کوڈ کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ ایک اور دیوار پر بنا ہوا بچے کا چہرہ کسی بھوت کی طرح لگ رہا تھا، جیسے ہمارے خوفزدہ ہونے کی ہنسی اڑا رہا ہو۔ میں نے سہوا کا ہاتھ زیادہ مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہو۔ ہمارے ہاتھ پسینے کی وجہ سے چپچپے ہو رہے تھے۔ اچانک اس ننھے سے بھوت نے اپنا چہرہ غمزدہ بنا لیا اور کہا ''تم کہاں جا رہے ہو، میں یہاں رہتا ہوں، میں اس دیوار پر بالکل تنہا، بالکل اکیلا رہتا ہوں۔ مجھے اس وقت تک یہاں رہنا ہے جب تک میں کسی ایسے فرد کو تلاش نہیں کر لیتا جو میری جگہ لے سکے۔ کیا تم دونوں میں سے کوئی ایک میری جگہ یہاں نہیں رہ سکتا؟'' میں نے اس طرح کی کہانی کہیں سے سن رکھی تھی، کہاں سے سنی یہ یاد نہیں، یقیناً اس شخص سے سنی ہوگی جس کے جسم پر ایک نشان ہے اور جو بچوں کو ایک پیسے کے بدلے میں تصویریں دکھاتا ہے۔ میں نے اس ننھے بھوت کی طرف دیکھ کر سختی سے نفی میں سر ہلایا اور اپنی رفتار تیز کر لی۔ جب ہم اس راستے سے باہر نکل آئے تو سہوا نے سرگوشی کی ''وہ چلی گئی''

''کون؟'' میں نے پوچھا۔ اس ننھے بھوت کا خوف مجھ پر اتنا غالب آ گیا کہ میں اس پاگل عورت کو بھول ہی گیا تھا۔

''پاگل عورت'' اس نے جواب دیا۔

''یہ بہت اچھا ہوا'' میں نے کہا۔

وہ مخبوط الحواس عورت اس راستے سے باہر کبھی نہیں دیکھی گئی تھی چنانچہ اس کا نظر نہ آنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ باقی سب افراد کی طرح وہاں سے فرار ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں اگر وہ پاگل عورت جنگ

سے ڈر کر بھاگ گئی تھی جبکہ ہم پا مردی سے اس کا مقابلہ کر رہے تھے تو پھر اس سے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ اگر واپس آجاتی ہے تو بھی نہیں۔

ہم سڑک کے کنارے پر چلتے رہے۔ ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے اور اتنے چوکنا تھے کہ ہلکی سی آواز پر بھی بھاگ کھڑے ہوں، جیسے ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

''ہم اِدھر کیوں آئے، یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے'' سہوا نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا کہ ہر کوئی دور دراز کے علاقوں میں چھپنے کے لئے جا چکا ہے، میری ماں کہتی ہے کہ اگر ہم کسی کو دیکھیں تو فوراً چھپ جائیں''۔

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ ہمیں دبوچ لے گا اور دہشت ناک جگہوں پر لے جائے گا، دیکھا اسی لئے وہ پاگل عورت بھی کسی جگہ جا چھپی ہے''۔

''اچھا'' سہوا نے سر ہلاتے ہوئے کہا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظریں جھکی جا رہی ہیں اور اس کا چہرہ سوچ بھرا نظر آنے لگا تھا، تنہائی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ ہم دونوں یہ حقیقت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہم جنگ سے فرار اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ مجھے خسرے کی بیماری تھی اور اس کا خاندان پناہ حاصل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا باپ انہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ ہم کافی دیر تک خاموش رہے۔ جب ہم قدم اٹھاتے اور آگے بڑھتے تو ہمیں اپنے پیروں کے نیچے مسلی جانے والی ریت کی آواز آتی اور یوں لگتا کہ اس بھوت نے ہمیں خوفزدہ کرنے کیلئے ایک اور ہتھکنڈا اپنا لیا ہے۔

ہم فائر سٹیشن کے واچ ٹاور سے آگے نکلے تو شاپنگ آرکیڈ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ اس آرکیڈ میں چند جنرل سٹور، ایک ہارڈ ویئر سٹور، ایک کھیلوں کے سامان کا سٹور اور ایک کتابوں کا پیوں کا گودام تھا۔ سہوا ہمیشہ یہی چاہتی تھی کہ گول آنکھوں والی گڑیا حاصل کرے جو ایک جنرل سٹور کی اشیاء کی نمائش والی کھڑکی میں رکھی گئی تھی۔ وہ گڑیا اگر ابھی تک اس کھڑکی میں کسی خریدار کے انتظار میں پڑی ہوئی تھی تو یہ میرے لئے حیرت کا باعث ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑی تکلیف دہ بات ہوگی کہ سبھی چلے گئے اور اسے پیچھے چھوڑ گئے۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ ابھی تک وہاں پڑی ہوگی؟''

MashalBooks.com

میرے اس سوال نے سہوا کو چونکا دیا، وہ حیران تھی، وہ بھی یقیناً وہی سوچ رہی تھی جو کچھ میرے ذہن میں تھا۔

''گڑیا چل نہیں سکتی اس لئے وہ وہیں ہوگی'' سہوا نے فکر مندی کے ساتھ کہا، جیسے خوفزدہ ہو کہ میں اس کے موقف کی مخالفت نہ کردوں۔

''اس دکان کا مالک ہر شے اپنے ساتھ لے جا چکا ہوگا'' میں نے اپنی رائے دی۔

''نہیں'' اس نے جواب دیا۔

میں اس کے اس قدر خفگی بھرے ردعمل پر بہت حیران ہوا لیکن میں بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو، وہ ایک قیمتی گڑیا تھی، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب دکان کا مالک اسے لٹاتا تھا تو اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی تھیں؟''

یہ ایک ایسی گڑیا تھی جس کو لٹایا جائے تو وہ آنکھیں بند کر کے سو جاتی تھی اور جب سیدھا بٹھایا جاتا تو وہ آنکھیں کھول کر جاگ اٹھتی تھی اور دمکتی آنکھوں کے ساتھ آپ کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی تھی۔

اس گڑیا کے قیمتی ہونے کے بارے میں میرے اس موقف سے سہوا پریشان دکھائی دیتی تھی۔ وہ دکانوں کے موٹے دروازوں کو گھورے جا رہی تھی۔ اسی طرح کئی منٹ گزر گئے، پھر وہ میری طرف مڑی اور تیزی سے بولنے لگی ''میرے ابو نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے یہ گڑیا خرید دیں گے۔ وہ اسے میرے لئے خرید لیں گے چاہے یہ کتنی بھی قیمتی ہے کیونکہ وہ بہت زیادہ دولت اکٹھی کر کے واپس آئیں گے۔ میرے ابو زمین کھود کر اس میں سے سونا نکالتے ہیں۔ میرے ابو اپنے وعدے ضرور پورے کرتے ہیں''۔

میں نے بھی سن رکھا تھا کہ سہوا کا والد سونے کی تلاش کا کام کرتا تھا۔ میں کافی عرصہ سے اسی حوالے سے پریشان تھا کہ جب اس کا باپ سونے کے ڈھیر کے ساتھ واپس آئے گا اور سہوا کو بے شمار کھلونے خرید کر دے گا تو پھر وہ میرے ساتھ نہیں کھیلے گی۔ جب میں نے پہلے پہلے یہ سنا کہ سہوا کا باپ سونے کی تلاش کا کام کرتا ہے تو میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ سہوا کی دادی نے زرد رنگ کا لباس پہنا ہوا ہے اور وہ سونے کے دھاگے اور سونے کی ہی سوئی سے سنہرے رنگ کے کپڑے

میں کڑھائی کر رہی ہے اور سہوا کے خاندان میں سے جب کوئی شخص کسی چیز کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونے میں تبدیل ہو جاتی ہے، بالکل اُس کہانی کی طرح جو گہرے نشان والے آدمی نے ہمیں سنائی تھی۔ حتیٰ کہ دادی اماں کی آنکھوں کے کونوں میں جو مادہ جمع ہو جاتا تھا وہ بھی سونے کا تھا۔

''جب تمہارے ابو ڈھیر سارا سونا لے کر آئیں گے تو تم تب بھی میرے ساتھ کھیلو گی؟'' آخر کار میں نے اپنے اندر پائے جانے والے خوف کا اظہار کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سہوا نے اپنی نظریں مجھ پر گاڑ دی ہیں لیکن میں نیچے زمین کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے ساتھ نظریں نہ ملائیں۔ میں اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو'' سہوا نے ردِعمل ظاہر کیا۔

''میں نے کہا کہ کیا تم اس وقت بھی میرے ساتھ اسی طرح کھیلو گی جب آپ لوگوں کے پاس ڈھیر سا سونا آ جائے گا اور آپ لوگ امیر ہو جائیں گے'' میں نے تقریباً ناگواری سے اپنا فقرہ دہرایا۔

''سونے کا کھیل کے ساتھ کیا تعلق، میں سونے کے ساتھ کھیل تو نہیں سکتی''۔

''کیوں نہیں؟''

''بے وقوف! لوگ سونے جیسی دھات کے ساتھ کیسے کھیل سکتے ہیں؟'' سہوا نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں بے وقوف ہوں تو تم احمق ہو'' میں چلایا اور غصے سے اسے پرے دھکیل دیا۔

''بے وقوف''

''احمق''

''بے وقوف، کاٹھ کا الو''

ہم ایک دوسرے پر چلاتے رہے، یہ جانے بغیر کہ ہم کس بات پر اتنا غصے میں تھے۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچا کہ سہوا کو اور زیادہ غصہ کیسے دلایا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ غصے سے ہانپ رہی تھی۔

''بے وقوف! تمہاری ماں تو گھر سے بھاگ گئی تھی''۔ آخر میں نے تیر چھوڑا، جو نشانے پر لگا۔ ایک لمحے کے لئے سہوا نے متذبذب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اطمینان بخش حد تک خود کو

کامیاب محسوس کیا لیکن سہوا جلد ہی اس صدمے سے باہر نکل آئی۔

''نہیں وہ گھر سے بھاگی نہیں تھی، وہ صرف کہیں چلی گئی ہے کیونکہ وہ بیمار تھی''۔

''یہ جھوٹ ہے، وہ گھر سے بھاگ چکی ہے کیونکہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتی''۔

''یہ درست نہیں ہے''۔

''یہ درست ہے اور وہ اتنی دور جا چکی ہے کہ کبھی واپس نہیں آئے گی''۔

''تم کیسے جانتے ہو۔ میری ماں بیمار ہے'' کوئی چیز اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی تھی۔

''میں جانتا ہوں وہ گھر سے بھاگ چکی ہے''۔

''نہیں وہ نہیں گئی، نہیں گئی'' اس کے منہ سے روہانسی آواز نکل رہی تھی لیکن یہ میرے لئے سکون کا باعث اور شیریں تھی جیسے مکئی کے بھٹے پر لگے دودھیا دانے کا میٹھا مزہ ہوتا ہے۔ جب میں نے کچھ دیر تک اس کے ساتھ بات نہ کی تو سسکتے ہوئے وہ دوبارہ اصرار بھرے لہجے میں بولی ''نہیں وہ نہیں گئی''

میں اس وقت تک یہ سوچ کر مطمئن ہو چکا تھا کہ سہوا امیر ہو جانے پر مجھے چھوڑے گی نہیں۔ وہ میرے سامنے کھڑی رو رہی تھی۔ میں نے اس کے آنسوؤں سے تر بتر چہرے کو معذرت خواہانہ انداز میں ہلایا۔

''کیا یہ مارکیٹ والی جگہ نہیں ہے؟''

ہم اپنی منزل تک پہنچ چکے تھے لیکن وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ چونکہ ہم میں سے کسی کے پاس پیسے نہ تھے اس لئے اگر وہاں مچھلی فروخت کرنے والی عورتیں مل جاتیں تو اس سے سبکی ہونا تھی۔ اس حقیقت کے باوجود ہم پریشان تھے۔ سہوا نے ہاتھوں کی ہتھیلی سے آنکھیں صاف کیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ خالی سٹال وہاں موجود تھے لیکن نہ تو چیزیں فروخت کرنے والا کوئی وہاں موجود تھا اور نہ ہی کوئی خریدار نظر آ رہا تھا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے'' سہوا نے ایک خالی سٹال کے قریب پڑے بڑے سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک بھی نہیں'' میں نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس سے اتفاق کیا۔

''تم نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہر کوئی یہاں سے فرار ہو چکا ہے''۔

''لیکن یہاں تو ایک چوہا تک نہیں ہے''۔

''ہاں چوہے موجود ہیں، تھوڑی دیر پہلے ان میں سے ایک مجھے گھورتا رہا اور پھر وہ تیزی سے بھاگ گیا''۔

''تم سچ کہہ رہے ہو''؟

''بالکل سچ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کافی بلیاں موجود ہیں۔ یہاں بلیاں اس لئے موجود ہیں کہ ان کے کھانے کیلئے چوہے موجود ہیں''۔

''لیکن یہ تو بھگوڑی بلیاں ہیں''۔

''یہ سب بلیاں ہیں، بالکل ایک جیسی، سب چوہے کھاتی ہیں''۔

سہوا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ہم نے رات کا اندھیرا چھا جانے کے بعد بھگوڑی بلیوں کو ایک سے دوسرے چھت پر چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ وہ پہلے اپنی پیٹھ محراب کی طرح موڑتیں اور پھر کسی سپرنگ کی طرح اچھلتی ہیں، اگلے ہی لمحے وہ دوسرے چھت پر ہوتی ہیں۔

''ہمیں کہاں جانا چاہیے؟'' میں نے سہوا سے پوچھا۔ میرے لہجے میں فکرمندی کا عنصر نمایاں تھا۔

''میرے خیال میں ہر جگہ ایک ہی صورتحال اور ایک ہی جیسا منظر ہے''۔ سہوا نے آہستہ سے جواب دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمت ہار چکی ہے۔ اس کا زرد چہرہ سنو وائٹ کے چہرے کی طرح سفید تھا۔ اس کے چھوٹے سے جسم پر رکھا ہوا اس کا سر دیکھ کر مجھے اس لڑکی کی یاد آ گئی جسے ایک چیتے نے اغوا کر لیا تھا۔ ایک روز رات گئے سہوا کے ساتھ بیٹھ کر میں نے اپنی ماں سے یہ کہانی سنتے ہوئے کئی بار گھر سے باہر اس بڑے پہاڑ کی طرف دیکھا تھا حالانکہ کھلے دروازے میں سے میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ ایک امیر شخص کی بیٹی یعنی اسی لڑکی کو ایک چیتا اس وقت اٹھا کر جنگل میں لے جاتا ہے جب وہ گھر کے پچھواڑے اپنے بال دھو رہی تھی۔ اس کے رشتے داروں اور محلے کے لوگوں نے ہر جگہ تلاش کیا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس کے والدین اور رشتے دار بہت زیادہ غم زدہ ہو گئے، خاص طور پر اس لئے کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ پھر ایک روز اس کے والد کے ایک ملازم نے پہاڑوں میں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ لیا۔ وہ اس کی طرف دوڑا تا کہ اسے اپنے ساتھ لے جا سکے لیکن قریب جا کر

اسے معلوم ہوا کہ یہ تو صرف اس کا سر ہے جو ایک چٹان پر پڑا ہوا ہے۔اس کے بعد ہر سال اس کی گمشدگی کی برسی کے موقع پر کئی چیتے اس کے گھر آ جاتے تھے اور گھر والوں سے تقاضا کرتے کہ ان کے ساتھ دامادوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ یہ چیتے ساری رات کھاتے پیتے رہتے، رقص کرتے، گانے گاتے اور صرف صبح ہونے پر ہی پہاڑ کی طرف واپس جاتے تھے۔

''گرجا گھر جانے کے بارے میں کیا خیال ہے'' میں نے جلدی سے ایک تجویز پیش کی کیونکہ اب مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ چیتا اسے اٹھا لے جائے گا۔

''گرجا گھر؟''

''ہاں'' وہاں ضرور کوئی نہ کوئی موجود ہوگا، ممکن ہے وہاں کچھ نوجوان گا رہے ہوں''۔

''یہ ٹھیک ہے، میرا خیال ہے وہاں کچھ لوگ ضرور موجود ہوں گے''۔

ہم گرجا گھر کی طرف بڑھے۔ایک دفعہ سہوا اور میں گرجا گھر کے صحن میں ایستادہ سفید رنگ کے مجسمے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔اس وقت ہمارے سر جھکے ہوئے اور آنکھیں بند تھیں کیونکہ کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ اس مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی دعا مانگیں تو وہ پوری ہو سکتی ہے۔اس وقت میں نے یہ دعا کی تھی کہ سہوا اور میں ایک دوسرے کو اور زیادہ پسند کرنے لگیں اور اکٹھے ہر روز کھیلیں۔ مجھے امید تھی کہ سہوا نے بھی یہی تمنا کی ہو گی۔لیکن میری وہ خواہشات پوری نہیں ہوئی تھیں۔

''تم نے کیا دعا مانگی ہے'' میں نے سہوا سے رازداری سے پوچھا لیکن اس نے میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور صرف میری طرف نظریں گاڑے دیکھتی رہی۔اس کے اس ردعمل نے مجھے یقین دلا دیا کہ اس نے بھی وہی کچھ مانگا تھا جو میں نے دعا کی تھی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ میں نے یہ دعا مانگی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو زیادہ پسند کریں اور ہر روز اکٹھے کھیلیں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے کیا دعا مانگی ہے۔

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نے جواب دیا ''میں نے اپنی ماں کے لئے دُعا کی ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے اور میرے ابو گھر واپس آ جائیں''۔

اس کے اس جواب سے یوں لگا جیسے میں برف سے بھرے کسی حوض میں گر گیا ہوں۔

مارکیٹ آنے کی نسبت اب ہم زیادہ تیزی سے چل رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم اس تیز رفتار کا

سبب کیا تھا۔ ہم کیلوں سے بند کر دیئے گئے دروازوں کے پاس سے بس تیزی سے گزرتے جا رہے تھے، جیسے ہم کسی دوڑ میں شامل ہوں اور ہمیں جیتنے کیلئے تیز چلنا ہو۔ اس سفید مجسمے کے سامنے ہم آج ایک بار پھر دعا کرنے جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ سہوا آج پھر یہی دعا کرے گی کہ اس کی ماں صحت یاب ہو جائے اور اس کا والد گھر واپس آ جائے کیونکہ میں نے اپنے ماں باپ سے جو کچھ سن رکھا تھا اس کے برعکس سہوا کا اصرار ہے کہ اس کی ماں گھر سے بھاگی نہیں ہے۔ اگر اسے اس بات کا یقین ہوتا کہ اس کی ماں واقعی گھر سے بھاگ کر کہیں جا چکی ہے تو پھر وہ یقینی طور پر یہ دعا کرتی کہ ہم پہلے سے زیادہ اچھے طریقے سے ایک دوسرے کو پسند کریں اور ہمیشہ اکٹھے ساتھ کھیلتے رہیں۔

گرجا گھر ایک پہاڑی کے اوپر واقع تھا۔ سہوا پہاڑی کے اوپر ایسے چڑھ رہی تھی کہ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ سڑک کے کناروں پر اگے ہوئے درخت یوں دکھائی دیتے تھے جیسے اس نہ ختم ہونے والی خاموشی پر افسردہ ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں درختوں کے گرے ہوئے پتوں کے پیچھے ایک جن کو ڈانس کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ میں سہوا کی نسبت زیادہ تیزی سے چل رہا تھا اس لئے وہ پیچھے رہ گئی۔ اس نے کہا۔

''اتنا تیز نہ چلو، میں بڑی مشکل سے سانس لے پا رہی ہوں''۔

''میں اتنا تیز تو نہیں چل رہا ہوں''

''اگر وہاں بھی کوئی نہ ہوا تو پھر'' سہوا نے فکرمندی سے پوچھا۔ وہ ایسے بول رہی تھی جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے بھی اس چیز کا اندازہ ہو رہا تھا۔ عام حالات میں یہاں کافی آمد و رفت رہتی تھی لیکن اب تک ہمیں کوئی انسان اوپر جاتا یا نیچے آتا دکھائی نہیں دیا تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیں وہاں کوئی بھی نظر نہیں آئے گا۔ پھر بھی میں نے پر امید نظر آنے کی کوشش کی اور کہا ''پادری نے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا''۔

حقیقت میں مجھے اس بات کی فکر نہ تھی کہ پادری وہاں موجود تھا یا نہیں۔ مجھے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ سہوا اس سفید رنگ کے مجسمے کے سامنے کیا کہنے والی ہے۔ اگر سہوا نے اپنی ماں کی صحت یابی کیلئے دعا کی تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ واقعی بہت زیادہ بیمار ہے بصورت دیگر وہ مجسمہ، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سب کی دعا قبول کر لیتا ہے، اسے موقع نہیں دے گا کہ وہ اپنی ماں کی صحت یابی کیلئے لمبی

دعا کر سکے۔

لیکن چرچ میں ایک حیرت ہماری منتظر تھی۔اس سے پہلے کہ ہم عمارت کے اندر جاتے اور یہ معلوم کرتے کہ اندر کوئی ہے یا نہیں، ہم نے دیکھا کہ وہ مجسمہ زمین پر گرا پڑا ہے اور اس کا پورا جسم کیچڑ سے لتھڑا ہوا ہے۔دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہم اس کے قریب گئے اور اس کے چہرے پر نگاہ دوڑائی، وہ چہرہ جسے دیکھنے کیلئے ہمیں اپنے سروں کو کافی پیچھے لے جانا پڑتا تھا۔اس مجسمے کا چہرہ سہوا کے کچھ دیر پہلے والے چہرے کی طرح نظر آ رہا تھا، جب وہ رو رہی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟''

''کتنا افسوسناک ہے'' سہوا نے فکرمندی کے ساتھ کہا۔ مجھے بھی اتنا ہی افسوس تھا چنانچہ میں نے کہا،''وہ سب بھاگ گئے۔اس کو اس حالت میں یہاں چھوڑ کر؟''

''ہم کچھ کر سکتے ہیں''۔

''میرا خیال ہے کہ پادری بھی وہاں موجود نہیں ہے''۔

''کیا ہمیں کوشش کر کے اسے اس کی اصلی جگہ پر کھڑا کر دینا چاہیے''۔سہوا نے ایک تجویز پیش کی۔

میں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ میرا نہیں خیال تھا کہ ہم اسے واپس اس کی اصلی جگہ پر کھڑا کر سکتے تھے چنانچہ میں نے کہا''نہیں، اس لئے کہ پادری نے بھی اسے اسی طرح چھوڑا ہے۔جب چرچ میں کوئی نہیں ہوتا تو غالباً اس مجسمے کو اسی طرح رکھتے ہیں''۔

''لیکن اس کے تو کانوں تک میں کیچڑ بھرا ہوا ہے''

''تو پھر؟''

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم''

ہم ناکامی سے دوچار تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اس مجسمے کو ایستادہ کرتے ہوئے اگر یہ گر کر ٹوٹ گیا تو اس قابل نہیں رہے گا کہ ہماری خواہشات پوری کر سکے۔ہم چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔سنسان صحن میں لیٹا ہوا مجسمہ اداس دکھائی دے رہا تھا جیسے ان لوگوں کی کمی محسوس

کررہا ہو جو اس سے اپنی مرادیں پوری کراتے تھے۔آخرکار سہوا نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ’’یہاں حقیقتاً کوئی نہیں ہے، تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ کب تک واپس آجائیں گے‘‘۔

’’میری تمنا ہے کہ وہ جلدی واپس آجائیں‘‘۔

’’میری بھی یہی خواہش ہے‘‘۔

ہم ادھر ادھر کی باتیں کررہے تھے لیکن اس دوران بھی میں اس مجسمے کے بارے میں مسلسل فکر مند تھا۔سہوا بھی فکرمندی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی تھی۔جب ہماری آوازیں بند ہوتی تھیں تو سنسان گاؤں کی خاموشی پورے ماحول پر چھا جاتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس خاموشی نے بھی اس مجسمے پر سے گزرتے ہوئے غم کا اظہار کیا تھا۔ میں اچانک خوفزدہ ہوگیا۔خوف کی وجہ سے سہوا کے بازؤں پر ابھرے ہوئے اس کے رونگٹے کھڑے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ وہ رونگٹے بھی ہمارے خوف کا مزہ چکھنے کیلئے تیار ہیں۔

’’کیا تم خوفزدہ ہو‘‘میں نے سہوا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

’’ہاں میں خوفزدہ ہوں، آؤ گھر چلیں‘‘

’’ٹھیک ہے، چلتے ہیں‘‘

’’لیکن پہلے تھوڑی سی دعا مانگ لیں‘‘سہوا نے میرے چہرے پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

’’کس سے دعا مانگیں گے؟‘‘ میں نے پوچھا اور پھر اس کے ردعمل کے لئے اسی کی طرف دیکھنے لگا۔

سہوا نے میرا بازو کھینچا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔سہوا اس زمین بوس مجسمے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔سہوا نے آنکھیں جھپکتے ہوئے میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو’’تم نے میرا مطلب سمجھ لیا ہے‘‘؟۔میں نے بھی اپنی پلکیں جھپکائیں۔ہم نے اپنے سر جھکا دیئے اور پھر اپنی خواہشات کے پورا ہونے کیلئے دعا مانگنے لگے۔اس بار میں نے سہوا سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا مانگنا چاہتی ہے۔اپنے طور پر میں نے کچھ دیر پہلے سہوا کی سسکیوں کو یاد کرتے ہوئے وہی دعا کی جو اس نے کی تھی۔گرجا گھر کے بڑے دروازے سے باہر آتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔میری نظر زمین پر گرے ہوئے مجسمے پر پڑی اور میں نے امید کی کہ اسے ایک بار پھر ایستادہ کردیا جائے گا تاکہ وہ ہماری آرزوئیں پوری کرسکے۔

MashalBooks.com

جب میں گھر پہنچا تو ایک بار پھر مجھے تیز بخار ہو گیا اور مجھے دوبارہ بستر پر رہنا پڑا۔ اس سے اگلے ہی روز میری حالت اس قدر بگڑ گئی کہ میری بولنے اور سوچنے کی صلاحیت متاثر ہوئی اس کے باوجود میں اس امر کا ادراک کر سکتا تھا کہ پورے گاؤں پر خاموشی کی چادر تنی ہوئی ہے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ساری دنیا ساکت و جامد ہو چکی ہو۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ صورتحال شاید ہمیشہ کیلئے ایسی ہی رہے اور اگر ایسا ہوا تو سہوا کو ساری عمر اپنی بہری دادی اماں کے ساتھ ہی رہنا پڑے گا اور وہ اسی طرح رہتے ہوئے جوان ہو گی اور اسی حالت میں ایک دن مر جائے گی۔ لیکن اس طرح کی سوچیں زیادہ دیر قائم نہ رہتیں اور میرے بیمار جسم کی بھٹی میں پگھل کر فنا ہو جاتیں۔ میری ماں بڑبڑاتی رہتی کہ وہ کمرے کو گرم نہیں کر سکتی اسی لئے کہ دھواں بڑی دور سے نظر آ جاتا ہے۔ وہ کہتی "اگر تم کل آوارہ گردی نہ کرتے تو بہت جلد ٹھیک ہو جاتے"۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر خوش تھی کہ میں زندہ واپس آ گیا ہوں" میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ اس طرح باہر نہ جایا کرو، تم جانتے نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے؟"

میں واقعی نہیں جانتا تھا کہ ایک ایسے گاؤں میں میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے جہاں واحد زندہ اجسام بلیاں اور چوہے ہیں۔ کمرے میں آگ نہ جلا سکنے کے حوالے سے ماں کا شکوہ صرف تھوڑی دیر کے لئے تھا۔ اگلی صبح کہیں دور سے چلنے والی توپوں کی آواز نے گاؤں پر طاری سکوت کو توڑ دیا۔ دوپہر کے بعد توپوں کی آواز تیز ہو گئی اور ہم سب ہنگامی صورتحال کے لئے کھودی گئی خندق میں چلے گئے۔ خندق کو گرم رکھنے کی سہولت موجود نہ تھی اور میں خوش تھا کہ اب میری ماں اس حوالے سے فکر مند نہیں رہی لیکن مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ گاؤں پر چھائی خاموشی آخر کار ختم ہو گئی ہے لیکن خندق میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ میں اپنی اس خوشی کا اظہار کر سکوں۔ سہوا اور اس کی دادی اماں اب بھی اسی پر اسرار گھر میں موجود تھیں حالانکہ توپوں کی آواز اب قریب سے آ رہی تھی۔ ماں نے کوشش کی تھی کہ انہیں خندق کے اندر لانے پر آمادہ کر سکے لیکن وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ چونکہ سہوا کی دادی اماں سن نہیں سکتی تھی اس لئے وہ اس کے اشاروں کو نہ سمجھ سکی کہ توپوں کے چلنے کی وجہ سے خطرہ بڑھ گیا ہے، اس نے اپنا سینے پرونے کا کام جاری رکھا اور میری ماں سے یہ کہہ دیا کہ وہ گھر ہی میں رہ کر اپنے بیٹے کے واپس آنے کا انتظار کرے گی۔ سہوا نے بھی اپنی دادی اماں کو اکیلا چھوڑنے سے انکار کر دیا، خاص طور پر رات کے وقت وہ اپنی دادی اماں کے بغیر رہنے کو تیار نہ ہوئی۔

MashalBooks.com

خندق کے اندر اچھا خاصہ حبس تھا جس کی وجہ سے ہمارا جی متلانے لگا تھا۔ خندق کے خاک آلود فرش پر بیٹھے ہوئے میری ماں نے خود کلامی کی، ''میری خواہش ہے کہ سہوا کا باپ جلد واپس آ جائے، اس کا کہنا تھا کہ وہ جلد واپس آ جائے گا لیکن لگتا ہے کہ وہ نہیں آئے گا کیونکہ جنگ ابھی تک جاری ہے''۔ توپوں کی آواز خوفناک حد تک قریب سے آ رہی تھی۔ توپوں کی آوازیں سن کر مجھے اس دیو کے دل دہلا دینے والی آوازیں پیدا کرتے قدموں کی یاد آ گئی، جن کے نشانات عدالت کی عمارت کے صحن میں ایک پتھر پر نقش ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دیو جاپانیوں کی طرف سے ہمارے ملک کے مصروف پہاڑوں میں کسی سمت میں اشارہ کرتے ہوئے آہنی کھونٹے گاڑنے سے پہلے پیدا ہوا تھا۔ یہ کھونٹے گاڑنے کا مقصد اقبال مند پہاڑی طاقتوں کا راستہ روکنا تھا جو کوریا میں دانشوروں اور داناؤں کی پرورش کر سکتی تھیں۔ یہ قدم سہوا کے قد سے بڑا تھا۔ اب یہ خوفناک گھن گرج قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد توپوں کے ساتھ ساتھ بندوقوں کی آوازیں آنا بھی شروع ہو گئیں۔ بندوقوں کی آوازیں اتنے تسلسل سے آ رہی تھیں کہ محسوس ہوتا بھٹی میں مکئی کے دانے بھن رہے ہوں۔ آسمان پر چاند نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب ایک مکمل طور پر تاریک رات تھی۔ خندق کے اندر حد درجے تاریکی تھی۔ توپوں کے گولوں کے گرنے سے زمین دہل جاتی تھی اور خندق کی چھت اور دیواروں سے مٹی نیچے فرش پر گرتی تھی، میں نے دیکھا کہ ماں نے چھت کی طرف دیکھ کر صلیب کا نشان بنایا۔ میرے ذہن میں یہ خیال در آیا کہ چونکہ مجسمہ زمین پر گرا پڑا تھا اس لئے ماں کو نیچے فرش کی طرف دیکھ کر یہ نشان بنانا چاہیے۔

ایک لمحہ کے لئے توپوں کے گولوں کی گھن گرج اور بندوقوں کی گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آوازیں پیدا ہوئیں اور پھر فائرنگ دوبارہ شروع ہو گئی لیکن اب فائرنگ کافی قریب سے ہو رہی تھی۔ ہم کھڑکیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سن سکتے تھے۔ ہمیں کہیں سے کسی کے چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ گولیوں کے چلنے سے پیدا ہونے والی شوں شوں کی آواز ایسے تھی جیسے ژالہ باری ہو رہی ہو۔ مجھے خراٹوں جیسی گونج دار آواز بھی آ رہی تھی لیکن چونکہ میں اپنے اوسان کھوتا جا رہا تھا، اس لئے میرا خیال ہے یہ میرے اپنے خراٹوں کی آواز تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ رات کے اندھیرے میں گولہ باری کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔ مکمل طور پر نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے میں نے مایوسی کی حالت میں اٹھائے

MashalBooks.com

گئے قدموں کی آوازیں سنیں جبکہ بندوقیں چلنے کی آوازیں بھی بدستور آ رہی تھیں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری ماں ایک بار پھر صلیب کا نشان بنا رہی ہے۔ پھر میں مکمل طور پر نیند کی وادی میں کھو گیا اور مجھے یہ ہوش نہ رہا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ رات کے مختلف اوقات میں میری نیند ٹوٹتی رہی اور میں ہوش میں آتا رہا۔ ان اوقات میں مجھے یہ پتہ چلتا رہا کہ باہر شدید جنگ جاری تھی۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ بہرحال میں چاہتا بھی یہی تھا کہ ساری رات جاگتا رہوں چنانچہ میں ہوش میں آنے کے ان لمحوں کا شکرگزار ہوں جن سے مجھے پتا چلتا رہا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں خندق کے اندر بالکل اکیلا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا سارا جسم دکھ رہا تھا اور مجھ پر ابھی تک بخار کا اثر باقی تھا۔ دنیا اب تک موت کے سے سناٹے کی زد میں تھی، چنانچہ میں خوف زدہ ہو گیا۔ غالباً دنیا چندروز پہلے والی خاموش اور خالی دنیا بننے جا رہی تھی۔ میں گھسٹتا ہوا خندق کی سیڑھیوں پر چڑھا اور باہر صحن میں نکل آیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سہوا محفوظ ہے یا نہیں۔ خوش قسمتی سے اس کا گھر پہلے کی طرح مضبوطی سے کھڑا تھا۔ آسمان صاف تھا اور میں لوگوں کی سرگوشیوں کی آوازیں سن کر خوشی محسوس کر رہا تھا۔ آخرکار دنیا انسانیت سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ میں سہوا کے گھر کی طرف بڑھا لیکن جونہی میں ایک کونے پر پہنچا میں نے کچھ عجیب دیکھا، ماں بچھواڑے سے ظاہر ہوئی۔ اس نے تنکوں سے بنی ہوئی ایک بوری اٹھا رکھی تھی۔ اس نے وہ بوری ایک تاریک سے وجود پر ڈال دی۔ اسی لمحے میں نے واضح طور پر دیکھ لیا کہ یہ کیا ہے۔

یہ سہوا کا باپ تھا۔ وہ پیٹھ کے بل لیٹا ہوا تھا اور اس کا سر ہمارے گیٹ کی دہلیز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ اس وقت دیکھا تھا جب وہ مجھے الٹا نظر آ رہا تھا۔ میں اس طرح اس کا چہرہ بڑی اچھی طرح پہچانتا ہوں کیونکہ جب وہ مجھے کسی ہوائی جہاز کی طرح دائرے میں گھماتا تھا تو مجھے اس کا چہرہ الٹا نظر آتا تھا اور یہ چہرہ میری یادوں میں کہیں موجود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لمحے میں میں نے پہچان لیا کہ یہ سہوا کا باپ ہے۔ ماں نے اس کا چہرہ تنکوں کی بوری سے اس لئے ڈھانپ دیا تھا کہ سہوا اچانک اسے دیکھ نہ لے۔ وہ وہاں ہمارے صحن میں کئی گھنٹے اسی طرح پڑا رہا۔

سہوا چپکے سے وہاں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ مجھے اس کی وہاں آمد کا پتہ چلتا وہ میرے ساتھ کھڑی حواس باختگی اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سوال کر رہی تھی ''کیا یہ کوئی مرا ہوا

MashalBooks.com

آدمی ہے''؟

میں نے دیکھا کہ وہ مٹی اور گرد سے اٹی ہوئی ہے اور اس نے جو سویٹر پہن رکھا تھا اس پر بھی چوہے کی مینگنیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ مینگنیاں یقیناً توپوں کے چلنے سے پیدا ہونے والی دھمک کے باعث چھت سے گری ہوں گی۔ خوف اور دباؤ کی وجہ سے سہوا کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ پہاڑی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور سہوا کے بال لہرا کر پیچھے چلے گئے اور اس کے سویٹر میں سے چوہے کی مینگنیاں نیچے گریں۔

سہوا نے جو سوال کیا تھا اس کا میں نے تیزی سے جواب دیا کہ بے وقوف لڑکی! ہاں یہ مرا ہوا آدمی ہے۔ میں کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔

''کیوں، میں بے وقوف کیوں ہوں'' سہوا نے تنکوں سے بنی بوری میں لپٹے ہوئے اس جسم پر نظریں جمائے رکھیں اور میرے جواب پر استہزائیہ ردعمل ظاہر کیا اور میں نے بھی اس کا فوری جواب دیا۔

''اس کی وجہ کوئی بھی نہیں ہے، تم اگر بے وقوف ہو تو بس ہو''۔

اس پر سہوا چلا اٹھی ''اگر میں بے وقوف ہوں تو تم کیا ہو''؟

میں نے سوچا کہ اسے سچ بتا دوں۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے یہ بتا دوں کہ تمہارا باپ مر چکا ہے لیکن اس وقت میرا گلا جکڑا گیا اور میں کچھ بھی بول نہ سکا۔ اسی لمحے ماں اندر داخل ہوئی۔ وہ اگر اندر نہ آتی تو پتہ نہیں کمرے کے اندر کیا کچھ ہو جاتا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا ''چلو کمرے میں اور وہیں رہو، تم ابھی بیمار ہو اس لئے تمہیں ابھی بستر میں ہی رہنا چاہیے اور آرام کرنا چاہیے۔ سہوا تم اس کے ساتھ رہو اور جب تک میں واپس نہ آؤں وہاں سے ہلنا نہیں''۔

ہم دونوں نے ہاں میں سر ہلایا۔ اس کے بعد ہم نے لڑائی بھی نہیں کی۔ میرے بیمار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہمیں اکٹھے رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ میں نے الماری سے ایک کپڑا نکالا اور اسے ٹیریس پر پھیلا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا پورا جسم درد سے کانپنے لگا لیکن سہوا کے باپ کا چہرہ میرے ذہن میں اسی طرح قائم رہا۔

''کیا تمہیں بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے، تم بہت زیادہ درد محسوس کر رہے ہو'' سہوا نے فکر مندی سے کہا، میں نے اس کی تائید میں پلکیں جھپکائیں۔ پھر سہوا نے کہا ''میرا خیال ہے لوگ واپس آ گئے ہیں''۔ میں نے پھر پلکیں جھپکائیں۔ پھر میں نے اپنے بائیں جانب اشارہ کیا اور سہوا سے کہا کہ وہ میرے

MashalBooks.com

ساتھ لیٹ جائے۔ سہوا نے پھر کہا ''میرا خیال ہے کہ لوگ جہاں چھپے ہوئے تھے وہاں سے واپس آ گئے ہیں''۔

''ہاں'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن یہ آدمی مر کیوں گیا ہے'' سہوا نے پوچھا۔

''وہ کل رات مرا، وہ بہت جلد واپس آ گیا تھا۔ میں نے ایسے جواب دیا جیسے سب کچھ جانتا ہوں۔ سہوا بھی جانتی تھی کہ کل رات شدید جنگ ہوتی رہی۔

''بے چارہ آدمی'' سہوا نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ بخار کی وجہ سے ابھی تک گرم تھے جبکہ سہوا کے ہاتھ ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ میں نے سہوا کے کانوں میں سرگوشی کی ''میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا اور پھر تمہارے ساتھ کھیلوں گا''۔

سہوا نے چھت کی طرف دیکھا اور پھر نیند بھری نظروں سے کہا ''ہاں اور پھر میرے ابو واپس آ جائیں گے اور میں ان سے کہوں گی کہ وہ کچھ سونا تمہیں بھی دے دیں''۔

''نہیں، نہیں مجھے سونا نہیں چاہیے'' میں نے اسے غنودگی کی حالت میں جواب دیا۔

''پھر تم کیا چاہتے ہو، تم سونا بیچ کر کچھ بھی خرید سکتے ہو''۔

''میں صرف تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں'' میں نے باہر سے آنے والی آواز سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی قابل ذکر آواز سنائی نہ دی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، سہوا بھی خاموش رہی، غالباً وہ سوچوں میں گم تھی۔ پھر میں سو گیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ وقت یقیناً گزر چکا تھا۔ سہوا بھی سو گئی ہو گی، وہ اپنی جگہ سے ہلی جلی نہیں۔ نیم وا آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ میری ماں اندر داخل ہو رہی ہے۔

''سہوا سو رہی ہے'' ماں نے پوچھا۔

''ہاں'' میں نے سرگوشی کی۔ میرا سر چکرایا۔ سہوا کا باپ دوسرے لوگوں کے ساتھ واپس آ گیا تھا لیکن اس حالت میں نہیں جیسے سہوا چاہتی تھی کہ وہ واپس آئے۔

''کتنا برا وقت آ گیا ہے'' ماں نے آہ بھری۔ وہ میرے سر کے پاس بیٹھ گئی اور میری پیشانی پر نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس وقت میری آنکھوں نے وہ چیز دیکھی جو میری ماں نے اپنے دائیں ہاتھ

سے بائیں ہاتھ میں پکڑی۔ میں یک دم ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک گڑیا تھی۔ میں نے ماں کے ہاتھ سے وہ گڑیا پکڑ لی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ جب میں نے اسے ماں کے قدموں کے پاس نیچے لٹایا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے سہوا آنکھیں بند کئے میرے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔

(2)

میرے پاس ایک بچے کے بازو جتنی لمبی ایک شیشے کی گڑیا ہے۔ ہم نے کئی بار گھر بدلا لیکن ہر رہائش میں یہ مجھے غیر متوقع طور پر غیر متوقع جگہوں پر ملتی تھی۔ اس سے میرے اندر عجیب سے جذبات انگیختہ ہو جاتے تھے۔ یہ مجھے مختلف مواقع پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے جیسے جب میں اوزاروں والے ڈبے یا کسی سوٹ کیس میں کسی اوزار کی تلاش کر رہا ہوتا ہوں تو وہاں مجھے یہ گڑیا پڑی ہوئی مل جاتی، گندگی اور گرد سے اٹی ہوئی۔ ایسے موقعوں پر میں اسے کسی کپڑے سے پونچھ کر صاف کرتا لیکن بس اتنا ہی، اس سے زیادہ نہیں، میں بڑی محبت اور بڑے لگاؤ کے ساتھ اس کی دیکھ بھال نہیں کرتا، نہ ہی اسے کسی اہم جگہ پر سجا کر رکھتا۔ میں اسے ہمیشہ وہیں رکھ دیتا جہاں میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔

میں نے ابھی آپ کو بتایا کہ میرے پاس ایک شیشے کی گڑیا ہے لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ اسے غیر قدرتی جسم قرار دیا جائے جو پگھلے ہوئے شیشے سے بنا ہو۔ اس کی غیر ہموار سطح پر زردی مائل سبز رنگ کی لکیریں ہیں اور کچھ جگہوں پر کالے رنگ کے دھبے بھی ہیں۔ آپ صرف اسی صورت میں پہچان سکیں گے کہ یہ ایک گڑیا ہے اگر آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ ایک گڑیا ہے۔ ایک بری طرح مسخ شدہ شکل والی گڑیا، جس کی ایک جھلک مجھے اداس کر دیتی ہے جبکہ اس اداسی کی وجہ کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔

ہم موجودہ گھر میں پچھلے سال آئے تھے اور پہلے چھ ماہ تو میں اس گڑیا کی موجودگی سے مکمل طور پر بے خبر رہا۔ پھر ایک روز غیر متوقع طور پر میں نے اسے دریافت کر لیا، جیسے کہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ اسی مرتبہ یہ مجھے ایسی چیزوں میں پڑی ہوئی ملی جو اَب میں استعمال نہیں کرتا جیسے کہ کتے کو باندھنے کی زنجیر اور پرندوں کو دانے ڈالنے کی پلیٹ وغیرہ۔ یہاں آنے سے پہلے چیزوں کی پیکنگ کرتے ہوئے سوچا کہ مجھے اس گڑیا کو ایسی اشیاء میں ڈال دینا چاہیے جو ضائع کی جاتی ہیں۔ جس لمحے میں نے گڑیا کو ان چیزوں میں پڑے پایا، یہ محسوس کرتے ہوئے اسے اٹھا لیا کہ ایک بہت بڑا نقصان ہونے سے بچ گیا۔ ہم جیسے انقلابات اور جنگ کی تباہ کاریوں کے درمیان زندگی گزارنے والوں کے لئے اس کا کوئی فائدہ مند مصرف

نہ تھا۔ کوئی صورتحال یا کوئی چیز تین عشروں تک برقرار ہے تو پھر یقینی طور پر اس کی خصوصی اہمیت ہوتی ہے۔ درست ہے کہ میں نے اسے محفوظ رکھنے پر کبھی خصوصی توجہ نہیں دی لیکن جب کبھی میں اسے کہیں سے تلاش کر لیتا تو یہ سوچ کر میں خوش نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ میرے ساتھ اتنے طویل عرصے تک رہی ہے۔

میں گڑیا کو غسل خانے میں لے گیا اور دھو کر اسے صاف کیا۔ پھر میں نے اسے نئے تولئے کے ساتھ پونچھ کر سکھایا۔ یہ بالکل بھی نہیں بدلی تھی، وہی ہلکے سبز رنگ کی آنکھیں، وہی کالے دھبے اور وہی جلا ہوا اور جھریوں بھرا بازو۔ اس مرتبہ میں نے گڑیا کو اپنے فائل باکس میں ڈال دیا جہاں میرے اہم کاغذات پڑے رہتے تھے۔ پھر میں نے اس سے کہا، ''میری گڑیا گہری نیند لے لو'' اندھیرا چھا رہا تھا لیکن میں کھڑکی سے باہر بے مقصد گھورے جا رہا تھا، میں نے روشنی بھی نہیں جلائی تھی۔ اچانک اندھیرا بڑھنے پر ایک بے نام سے تعلق کا احساس ماحول پر چھا گیا اور اس نے مجھے بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایک ایسے احساس شرم کے ساتھ، جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، میں نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دے لئے۔ اس جلی ہوئی گڑیا کے بارے میں اور یہ سوچ کر، وہ مجھے کس طرح ملی تھی، میں نے اپنے طور پر مسکرانے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ کر سکا۔ اس گڑیا کے مالک کے چہرے کے نقش میری آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگے۔ اس کے لمبے بال، نیلی انگلیاں، نم آلود ہونٹ مجھے اب تک یاد ہیں۔

مجھے وہ دن اب بھی یاد ہے جب میں اس سے ملنے کے لئے یتیم خانے گیا تھا جہاں مجھے اپنی گڑیا دینے اور اپنا گھر چھوڑنے کے بعد وہ رہائش پذیر تھی۔ یہ بہار کے ابتدائی دن تھے اور اِن دنوں یخ بستہ ہوا تھپیڑے مارتے ہوئی چلتی ہے جیسے اسے موسم بہار کا آنا پسند نہ ہو اور وہ اس کا راستہ روک رہی ہو۔ میں اپنے ہاتھ بغلوں میں دبائے اور خود کو مضبوطی سے بھینچے یتیم خانے کی طرف چلا۔ میں یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی آوارہ بے مقصد ادھر ادھر گھومتا ہے۔ اس عمر میں بھی میں یہ خواہش کر رہا تھا کہ میری زندگی میں اس طرح کا اور کوئی دن نہ ہو۔ جب میں یتیم خانے پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اندر جا سکوں۔ اندر جانے کیلئے میرے پاس کوئی بہانہ نہ تھا۔ میں صرف یہ کر سکتا تھا کہ ایک پتھر پر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر یتیم خانے کے اندر جھانکوں۔ میں وہاں کھڑے ہو کر صرف انتظار کر سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ سہوا وہاں سے پہلے ہی جا چکی ہے۔ میں فکر مند اور بے تاب ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اگر سامنے آ بھی جاتی ہے تو میں اس سے کیا بات چیت کروں گا۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا تا کہ کچھ

مناسب الفاظ کا انتخاب کر سکوں لیکن مجھے ایسے الفاظ نہ مل سکے۔اس کے برعکس ہوا یہ کہ مجھے اپنا سر اندر سے خالی محسوس ہوا۔ میں ٹھنڈ سے کانپنے لگا اور مجھے ٹائیلٹ جانے کی حاجت ہونے لگی۔کافی وقت گزر گیا ،یتیم خانے کی عمارت کے اندر مجھے کوئی ہلچل نظر نہ آئی۔ میں پریشان ہونے لگا کہ کہیں کسی غلط جگہ تو نہیں آ گیا۔ میرا انتظار جتنا بڑھتا جا رہا تھا اتنی ہی میری حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔لیکن میں وہ جگہ چھوڑ بھی نہ سکا۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس آخری موقع ہے اسے یہ بتانے کیلئے کہ میں اس کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہوں۔

پھر میں نے گھنٹی بجنے کی آواز سنی۔ میں نے اوپر اٹھ کر صحن کی طرف دیکھا۔اس عمارت میں سے بچوں کا ایک گروہ برآمد ہوا اور صحن میں ادھر ادھر بکھر گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں خوفزدہ تھا کہ سہوا میری طرف شک بھری نظروں سے دیکھے گی جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔

کیا سہوا اب بھی یہاں موجود ہے؟ یا وہ ایک دوسرے ملک جا چکی ہے جس کا نام امریکہ ہے؟ میری ہتھیلیاں پسینے سے نم ہو گئیں۔ میں اپنی ہتھیلیوں کو پینٹ کے ساتھ صاف کرتا رہا اور اپنی نظریں بچوں پر گاڑے رکھیں۔لڑکے لڑکیوں کے بعد باہر آئے، ایک، دو، تین، چار، پانچ ......لیکن سہوا کہیں نظر نہ آئیں۔ وہ کسی دور دراز منزل کے لئے پہلے ہی جا چکی ہو گی، میں نے سوچا اور پھر میں نے اپنے سینے میں دل کو اچھلتا ہوا محسوس کیا۔

یہ دکھائی دیتا تھا کہ تمام لڑکیاں باہر آ چکی ہیں لیکن سہوا وہاں موجود نہ تھی۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کو غور سے دیکھا لیکن بے فائدہ۔تمام لڑکیوں کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے اور ان سب نے ڈبوں کے ڈیزائن والے سکرٹ پہن رکھے تھے، اوپر رنگ برنگ سویٹر تھے جو سمندر پار سے ریلیف کے سامان کے طور پر آئے تھے، وہ ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے امیروں کے بچے ہوں۔اپنے غم اور اکیلے پن کے احساس کو دبانے کیلئے میں نے یتیم خانے کے صحن کا جائزہ لینا جاری رکھا۔ مجھے وہ پھر بھی نظر نہ آئی۔ میں تیزی سے بڑا کیوں نہیں ہو گیا؟ اگر میں بڑا ہو گیا ہوتا تو میں اسے کبھی جانے نہ دیتا۔ میں یقیناً کچھ ایسا کرتا کہ وہ میرے ساتھ ہی رہتی جیسے شادی وغیرہ۔

میں پچھتایا کہ میں یہاں پہلے کیوں نہیں آ گیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے پہلے آ ہی نہیں سکتا تھا جب تک میرے ماتھے پر بنا ہوا زخم بھر نہ جاتا۔ یہ ایک گہرا زخم تھا اور اس کی شکل کسی کیچوے کی

طرح تھی۔ میرا درخت سے گرنا فوری وجہ تھی کہ سہوا کو میرا گھر چھوڑنا پڑا۔ یقیناً اسے ایک نہ ایک روز جلد یا بدیر ہمارے گھر سے جانا تھا لیکن اس کی روانگی مسلسل ملتوی ہوتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن جب گھر والوں کو یہ پتہ چلا کہ میں اس کے لئے ایک پرندہ پکڑنے کی خاطر درخت پر چڑھا تھا تو پھر اسے فوری طور پر گھر چھوڑنا پڑا۔

''بے وقوف تمہیں کس مقصد کیلئے پرندے کی ضرورت پڑ گئی تھی'' وہ کون سا بے وقوف پرندہ ہے جو تمہارے ہاتھوں پکڑا جائے گا، میرے چچا نے سختی کے ساتھ میری سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں، میں پرندے پکڑ سکتا ہوں'' میں نے احتجاج کیا لیکن اپنے طور پر مجھے خود بھی یقین نہیں تھا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ میں پرندہ سے خوف محسوس کرتا ہوں اور اکثر ایسے خواب دیکھا کرتا کہ کسی پرندے نے چونچ مار کر میں آنکھیں نکال لی ہیں اور ایسی ہی دیگر بہت سی فضول باتوں پرمبنی خواب، میں نے اپنے اس خوف کا اعتراف اپنے چچا سے بھی کیا تھا جنہوں نے فضول قرار دے کر اس خوف کو دور نہیں کیا تھا۔ اس وقت چچا نے کہا تھا'' میرا خیال ہے کہ دوسرے ممالک میں ایسے خوفناک پرندے موجود ہیں''۔

''دوسرے ممالک میں؟ پھر وہ پرندے دوسرے ممالک پہنچے کیسے اور کہاں سے؟''

''کچھ تو دوسرے ممالک سے اور کچھ ہمیشہ سے دوسرے ممالک میں رہ رہے ہیں'' اس مشکل صورتحال کا چچا نے زور سے ہنس کر سامنا کیا اور بات کو ٹال گئے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ہمارے صحن میں آنے والے پرندے چونچ مار کر لوگوں کی آنکھیں نکال لیتے ہیں یا نہیں۔ اس کے کئی سال بعد میں نے ہچکاک کی فلم ''پرندے'' دیکھی اور سوچا کہ پرندوں کے حوالے سے صرف میں نہیں جو اس طرح کی سوچیں سوچتا ہوں۔ بہرحال چچا کے ساتھ اس گفتگو کے چند روز بعد ہی میں درخت سے گر گیا۔ جب چچا نے یہ سوال کیا کہ تم پکڑے جانے والے پرندے کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے تو پہلے پہل تو میں نے زبان بند رکھی کیونکہ مجھے پورا علم نہیں تھا کہ سہوا اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے، کیا وہ واقعی اس پر سواری کرنا چاہتی تھی؟

جب چچا نے دوسری بار زور دے کر مجھ سے وہی سوال کیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اُس وقت تک اس بات کو چھوڑیں گے نہیں جب تک وہ اصل معاملہ جان نہ لیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ ہار مان لیں

MashalBooks.com

گے کیونکہ وہ پرندوں سے پیار کرتے تھے اور ان کی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ پرندوں سے اتنا زیادہ پیار کرتے تھے کہ انہوں نے ایک دفعہ ان کسانوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا تھا جو زہریلی گولیوں کے ذریعے بٹیر پکڑ رہے تھے۔ میں چچا کو ان کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن جب انہوں نے اصرار کیا تو میرے منہ سے صرف یہ نکلا کہ میں اس پر چڑھ کر اڑنا چاہتا تھا۔ پھر میں نے چچا کا ردعمل دیکھا، حسب توقع میرے اس جواب پر وہ حیران رہ گئے۔ وہ بولے۔

''کیا کہا تم نے''؟

''میں اس پر چڑھ کر اڑنا چاہتا تھا'' میں نے ناگواری سے جواب دیا۔

''جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس کا مطلب سمجھتے ہو''؟ چچا نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''ہاں'' میں نے پورے وثوق سے جواب دیا حالانکہ اس بارے میں مجھے بھی پورا یقین نہ تھا۔

چچا نے اپنے سر کو ایسے جھٹکا دیا جیسے کہنا چاہتے ہوں ''یہ بچہ مجھے پریشان کئے دے رہا ہے'' وہ ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے انہیں یقین ہو کہ میرے اندر ایک پرندے پر بیٹھ کر اڑنے کی صلاحیت موجود ہے۔

میرے اس جواب کا ردعمل نہایت سخت ہوا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ میرا پورا خاندان احتیاط کے ساتھ میری نگرانی کر رہا ہے جیسے میری فیملی یہ دیکھنا چاہ رہی ہو کہ میرا اوپر والا خانہ ٹھیک تو ہے؟

اپنے اس جواب پر میں بہت پچھتایا۔ میرا یہ سوچنا بے وقوفی تھا کہ میرے رشتے دار اس طرح کا جواب سن کر مجھ سے سوال کرنا چھوڑ دیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔ آخر کار مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ یہ میں نہیں بلکہ سہوا تھی جو پرندے پر بیٹھ کر اڑنا چاہتی تھی۔

جب سہوا کا گھر اس وقت جل کر ڈھے گیا جب اس کی دادی اماں گھر کے اندر تھی تو وہ ہمارے ساتھ ہمارے چچا کے گھر آ گئی جو ایک دور دراز گاؤں میں واقع ہے۔ بہت سے معاملات میں سہوا مجھ سے بہتر جانتی ہے لیکن پرندوں کے حوالے سے نہیں، اس کے باوجود وہ اصرار کرتی رہی کہ کوئی بھی شخص پرندوں کے اوپر سواری کر سکتا ہے۔

''لوگ پرندوں پر کس طرح سواری کر سکتے ہیں؟ میں نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں، کرنا صرف یہ ہے کہ اس کی پیٹھ کو پکڑ کر بیٹھ جائیں''۔

''اس سے تم پھسل کر نیچے گر جاؤ گی''۔

''میں نہیں گروں گی''۔

''پرندوں کی پشت بڑی پھسلواں ہوتی ہے''

''گائیوں اور گھوڑوں کی بھی اسی طرح ہوتی ہے، بے وقوف''

سہوا اپنا موقف تبدیل کرنے کو تیار نہیں تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ اسے کیسے سیدھا کرنا ہے۔ میں جب بھی یہ کہتا کہ لوگ پرندے پر سواری نہیں کر سکتے تو وہ مجھے بے وقوف قرار دیتی۔ پرندوں کے حوالے سے مجھے کچھ اور خوف بھی لاحق تھے۔ میں نے ایک دفعہ بڑے بوڑھوں کو کہتے سنا کہ ایک عقاب کی طرح کا ایک پرندہ ایک روز ایک بچے کو لے اڑا تھا۔ یہ بات میں سہوا سے چھپانا چاہتا تھا چنانچہ میں اسی موقف پر اصرار کرتا تھا کہ پرندوں کی پیٹھ بڑی پھلسواں ہوتی ہے۔

ان دونوں پرندے بڑے گڑ بڑ کا باعث بنے ہوئے تھے۔ پرندوں کے اتنے بڑے بڑے غول نمودار ہوتے کہ سامنے کے کھیتوں پر چھا جاتے اور چچا کے گھر کے پیچھے واقع جنگل پر ہلا بول دیتے تھے۔ پہلی بار جب پرندوں کے غول کے غول نمودار ہوئے تو بڑے بوڑھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک بڑی مصیبت آنے والی ہے۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ پرندوں نے پہلی بار اس گاؤں کا رخ کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگلے گاؤں میں پچھلے سال پرندوں کی بیٹوں سے پائن کے پرانے درخت سوکھ کر مردہ ہو گئے تھے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ مناسب مقدار میں پرندوں کی بیٹیں اعلیٰ قسم کی کھاد کا کام دیتی ہیں لیکن جب یہ بہت زیادہ ہوں تو درخت تباہ ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کے فضلے میں پایا جانے والا زہر درختوں کے پتوں کو گہرے سبز رنگ کا بنا دیتا ہے اور پھر وہ خشک ہو کر تڑ مرے بن جاتے ہیں۔ گاؤں میں ہر شخص یہی کہتا پایا گیا کہ پرندوں کے فضلے سے درختوں کا اس طرح مرجانا مستقبل کے حوالے سے اچھی نشانی نہیں ہے۔

پرندوں کا اس طرح ہلا بول دینا میرے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوا۔ مجھے کہا گیا کہ جیسے ہی میرے پاس کرنے کیلئے اور کوئی کام نہ ہو تو میں درختوں کے تنوں اور شاخوں پر اکٹھا ہونے والا پرندوں کا فضلہ کھرچ کر صاف کروں اور اسے کھاد کے ڈھیر پر اکٹھا کر دوں۔ میرے لئے یہ کام نہایت ناپسندیدہ تھا، لیکن بہرحال مجھے یہ کرنا پڑا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کچھ پرندوں کی بیٹیں سفید رنگ کی ہیں، میں

نے کسی دوسرے جانور کو اس طرح سفید رنگ کا فضلہ خارج کرتے نہیں دیکھا۔ پھر پرندے یہ کام کیسے کر لیتے ہیں؟

چٹانوں پر گرا ہوا پرندوں کا فضلہ ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے ہلکے اور گہرے رنگوں کے واٹر کلر پلیٹ پر انڈیلے گئے ہوں۔ پرندے ایسی بیٹیں کرنے کا بندوبست کیسے کرتے ہیں؟ میرے خیال میں یہی وہ خصوصیت ہے، جس کی بنا پر پرندے آسمانوں میں رہتے ہیں۔ زمین پر رہنے والے جانور جیسے بکریاں اور خرگوش وغیرہ گہرے رنگ کا فضلہ خارج کرتے ہیں، یہی معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے، ان میں سے کسی نے کبھی سفید رنگ کا فضلہ خارج نہیں کیا۔

بہر حال میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں تنکوں سے بنی ہوئی بالٹی اٹھاؤں، جنگل میں جاؤں، درختوں پر سے پرندوں کی بیٹیں کھرچ کر صاف کروں اور انہیں کھاد کے ڈھیر پر ڈال دوں۔ سفید پائن اور صنوبر کے اس گھنے جنگل میں کچھ سدا بہار بلوط کے درخت سوکھے پتوں کے ساتھ آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ میرے چھوٹے سے ذہن کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جنگل لامحدود اور پر امن ہوتے ہیں۔ درختوں کی اونچی اور بڑی بڑی شاخوں پر بیٹھے پرندے بعض اوقات بڑی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے میری طرف دیکھتے اور کبھی کبھی دھمکی آمیز آواز بھی نکالتے جیسے اپنے ساتھیوں کو کسی غیر شخص کے جنگل میں گھس آنے کے بارے میں خبردار کر رہے ہوں۔

جنگل میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے میری ساری توجہ سہوا کی طرف تھی جو گھر ہی میں روک لی گئی تھی۔ میرے ساتھ نہ آسکنے کی وجہ سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ کیا کوئی میری اس بات پر یقین کرے گا کہ اس دور میں بھی جبکہ میں ایک بچہ تھا میں جدا ہونے کا درد محسوس کر سکتا تھا۔ ایک ایسا درد جو موت سے زیادہ تکلیف دہ تھا؟ وہ کسی پرندے کے اوپر بیٹھ کر تو نہ اڑ سکی لیکن وہ بہت جلد مجھ سے بہت دور جانے والی تھی۔ جب گھر کے بڑوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بہتر یہ ہوگا اسے کسی امریکی خاندان کے حوالے کر دیا جائے تا کہ وہ اسے اپنا لے تو میں حیران و پریشان ہو کر رہ گیا۔ میں اپنی رضائی میں سانس روکے پڑا رہا اور یہ ظاہر کیا میں سو رہا ہوں۔ اگر میں وہ فرد ہوتا جسے کہیں بھیجا جا رہا ہوتو مجھے جتنا افسوس ہوتا اس کے جانے کا میں نے اس سے زیادہ سوگ منایا۔ اس کا باپ کیوں مر گیا اور اس کی ماں کہاں تھی؟ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں اپنے والدین سے یہ کہہ سکتا کہ اسے میرے ساتھ ہی رہنے دیا جائے۔ میں جنگل میں اکیلا ادھر ادھر پھرتا رہا اور

MashalBooks.com

یہ خواہش کرتا رہا کہ میں بھی یتیم ہو جاؤں اور اس کے ساتھ ہی بھیج دیا جاؤں۔

''تم پرندوں کی بیٹیں کھرچنا پسند کرتے ہو''؟۔ کبھی کبھی سہوا مجھ سے حیرت میں ڈوبے ہوئے یہ سوال کرتی۔ ایسے موقعوں پر میں خاموش رہتا اور کسی دوسری طرف رخ کر کے چل پڑتا۔ کوئی بھی میرے ان جذبات کو نہیں جان سکتا کہ میں کس قدر شدت سے چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ سہوا ہمیں چھوڑ کر چلی جائے ہمارے خاندان پر کوئی آفت نازل ہو جائے۔ اتنی بڑی آفت کہ یہ ہمیں تباہ و برباد کر دے، جس طرح پرندوں کی بیٹیں درختوں کو تباہ کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر ہمارے خاندان کے سبھی لوگ ٹھیک رہتے ہیں اور اسے رخصت کر دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہو گا سبھی اس کے جانے پر خوش ہیں۔ ہمارا گھر چھوڑنے سے اسے جو پریشانی ہو رہی تھی اگر میں اسے خفیف ترین طریقے سے بھی کم کرنے کی کوشش کروں تو مجھے اس کے مقابلے میں زیادہ بڑی آفت کا شکار ہو جانا چاہیے۔

یہی دن تھے جب سہوا نے مجھے یہ کہنا شروع کیا کہ میں اسے ایک پرندہ پکڑ دوں۔ ایک روز وہ خاموشی سے میرے پاس آئی اور بولی ''تم ایک پرندہ پکڑ سکتے ہو؟'' جب اس نے سوال کیا تو اس کی آنکھیں کسی انجانی خوشی سے چمک رہی تھیں اور وہ مجھے یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں کہ وہ اس سوال کے جواب میں ''نا'' برداشت نہیں کرے گی۔ میں فوری طور پر اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سہوا یقینی طور پر مجھے چھوڑ کر اڑ جانا چاہتی ہے۔

''مجھے بتاؤ، کیا تم پکڑ سکتے ہو، پکڑ سکتے ہو ناں؟'' سہوا نے اصرار کیا۔ میں شرم سے سرخ اس کے سامنے کھڑا رہا لیکن سہوا نہایت بے تاب ہو رہی تھی۔ اس نے کہا ''اگر تم رات کے وقت ان کے گھونسلے پر تیز روشنی ڈالو گے تو وہ فوراً گھبرا جائیں گے، اس طرح تم انہیں پکڑ سکو گے''۔

سہوا نے مجھ سے جو سوال کیا تھا میرے لئے اس سے فرار ممکن نہ تھا۔ میرے پاس یہ سوال کرنے کی بھی ہمت نہ تھی کہ اگر میں اسے پرندہ پکڑ کر دے دوں تو وہ اس کا کیا کرے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہی کہے گی کہ وہ اس پر بیٹھ کر اڑ جائے گی۔ اپنے خوف کے باوجود میں نے اس کا سوال پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا، وہ پرندوں پر بیٹھ کر اڑ نہیں سکتی۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ یہ بات سمجھ جائے گی تو اسے غم تو ہو گا لیکن یہ غم میرے انکار سے ہونے والی تکلیف سے کم ہو گا۔

اس رات میں اور سہوا چپکے چپکے باہر گئے۔ ہم ایک ایسے درخت کے پاس پہنچے جس پر پرندوں

نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ جنگل میں اس وقت کوئی بھی موجود نہ تھا اس کے باوجود سہوا نے میرے کان میں سرگوشی کی ''تمھیں یقین ہے تم پرندہ پکڑ لو گے؟''

''ہاں'' میں نے جواب دیا۔

خوف کی وجہ سے میں چھوٹے چھوٹے سانس لے رہا تھا۔ اندھیرے میں میں صرف سوئے ہوئے پرندوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سن رہا تھا۔ میرے گلے میں ایک رسی تھی جس کے ساتھ فلیش لائٹ بندھی ہوئی تھی۔ ہمت کر کے میں نے درخت کو پکڑ لیا۔ پتہ نہیں لوگ پرندوں پر کیسے سواری کرتے ہیں؟ میں نے خیال کیا کہ پرندے کی طرح کے عجب سے جانور، جس کا چہرہ انسانوں جیسا تھا، پر سواری کرنا پرندے پر سواری کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہوگا۔ ایسے جانور کی تصویر ایک دفعہ میں نے ایک ٹائل پر کھدی ہوئی دیکھی تھی۔ اس عرصہ میں سہوا بالکل خاموش تھی اور سانس روکے صرف مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں اسے یقیناً درخت پر چڑھنے والے جانور سلاتھ کی طرح نظر آ رہا ہوں گا جو آسٹریلیا کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ میں کسی سلاتھ ہی کی طرح درخت پر بڑے آرام سے چڑھ رہا تھا مبادا درخت ہل نہ جائے اور اس سے خوفزدہ ہو کر پرندے اڑ نہ جائیں۔ میں نے اپنے چڑھوں پر سارا زور دیتے ہوئے اپنے پیروں سے تنے کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ میں کسی بھی لمحے پھسل کر نیچے گر سکتا ہوں۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ سہوا نے نیچے سے سرگوشی کی ''تم تقریباً وہاں پہنچ چکے ہو، یہ بس تھوڑا سا اوپر ہے''۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دے لئے۔ اگر میں اور اوپر جاتا تو درخت کے ہلنے کا خطرہ تھا اس لئے میں بڑی احتیاط سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ ایک قدم اور اوپر......اور اوپر، میں بس گھونسلے کے قریب پہنچنے ہی والا تھا۔ میری پیشانی پسینے سے شرابور ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جس شاخ پر میں کھڑا ہوں بس ٹوٹنے ہی والی ہے۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ مجھے پرسکون رہنا چاہیے۔ میں نے اپنے بازوؤں کو پھیلایا اور ایک بڑی شاخ کو پکڑ کر اپنے آپ کو اوپر اٹھایا۔

''تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو، یہ تمہارے بالکل اوپر ہے'' سہوا کی آواز مجھے ایک میل دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے گھونسلا تلاش کرنے کیلئے اوپر نظر دوڑائی لیکن میرا سر چکرا رہا تھا اور میرے بازو اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ درد اور تکلیف کی وجہ سے میرے گلے سے ایک گہری آواز نکلی،

میں نے اپنے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور اوپر گھونسلے کا جائزہ لیا، اسی لمحے ایک کالے رنگ کا جسم میری آنکھوں سے ٹکرایا اور میرے کانوں نے پھڑ پھڑانے کی اونچی آواز سنی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کسی نے میرے آنکھیں سلگتے انگاروں پر رکھ دی ہیں اور میرے ذہن پر فوراً اس کالے پرندوں کی طرح کے جانور کی تصویر چھا گئی جس کا سر انسانوں کی طرح تھا اور جسے میں نے ایک بار چھت پر لگی ایک ٹائل پر کھدے ہوئے دیکھا تھا۔

''آک''

میرا سر چکرایا اور میں ایک گہرے گڑھے میں جا گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

مجھے اُس وقت ہوش آیا جب مجھے چیلوں کے بیٹ کی بو آئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو پتہ چلا کہ میں اپنے کمرے میں ہوں اور میری ماں میرے پاس بیٹھی ہے۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن ماں نے میرے کندھے کو دبا کر مجھے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ ''بالکل حرکت نہ کرو اور اس طرح پڑے رہو جس طرح لیٹے ہو، تمہیں اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہلنا ہے جب تک کل تمہیں ہسپتال نہیں لے جایا جاتا۔ میں نے اپنی پیشانی میں درد محسوس کیا۔

''یہ بو کیسی ہے'' میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''ہم نے تمہارے زخم پر پھلیوں کا پیسٹ لگایا ہے۔ تم اندھیرے میں درخت پر چڑھ کر کیا کر رہے تھے، اس سے تمہاری جان بھی جا سکتی تھی''۔

میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ لگایا تو مجھے پتہ چلا کہ اس پر پٹی بندھی ہے، ارے ہاں میں درخت پر سے گر گیا تھا۔ پھر مجھے وہ سارا واقعہ یاد آ گیا۔ مجھے افسوس کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی تھی کہ میں کوئی پرندہ پکڑے بغیر درخت پر سے گر گیا تھا، لیکن سب سے زیادہ میں سہوا کے بارے میں فکر مند تھا۔ میری یہ تشویش اس وقت حقیقت کا روپ دھار گئی جب میں نے ہسپتال سے واپس آنے کے ایک دن بعد اسے دیکھا۔ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ اگلے روز اسے کہیں بھیج دیا جائے گا۔

سہوا نے میرے زخمی سر پر بندھی ہوئی پٹی پر طائرانہ نظر ڈالی لیکن سارا دن اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ میں فکر مند رہا، میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں اپنے زخمی ہونے پر اتنا افسردہ نہیں تھا جتنا مجھے اس بات کا خوف تھا کہ سہوا مجھ پر ہنسے گی کہ میں ایک پرندہ بھی نہ پکڑ سکا۔ میں پریشان تھا کہ

اس طرح میرا مذاق اڑاتے ہوئے مجھ سے دور جائے گی۔

میں نے خود کو مجبور اور بزدل محسوس کیا۔ میں جنگل میں گھومتا رہا اور خود کو مجبور کرتا رہا کہ میں ناگزیر کو تسلیم کرلوں لیکن میں ایسا نہ کرسکا۔ میں مسلسل خود کو احمق اور بیوقوف قرار دے رہا تھا، جو ایک پرندہ تک نہ پکڑ سکا۔ اس رات میں گھر سے باہر گیا اور ظاہر یہ کیا کہ میں گھر کے باہر والے حصے کی طرف جا رہا ہوں۔ اچانک مجھے آواز آئی۔ ''ارے ادھر آؤ، یہ سہوا کی آواز تھی جو مجھے بلا رہی تھی۔ میں دبے قدموں سے آواز کی سمت آگے بڑھا۔ سہوا دیوار کا سہارا لے کر کھڑی تھی۔ میرا پورا جسم کانپ کر رہ گیا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔ میں پرندہ پکڑنے کے لئے درخت پر چڑھنے سے پہلے جس قدر پریشان اور تناؤ میں تھا اب اس سے زیادہ ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی ٹانگیں مفلوج محسوس ہو رہی تھیں۔ بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں سے چھن کر آتی چاند کی روشنی اور اس کا رنگ سیسے جیسا بے رنگ نظر آ رہا تھا اور وہ کسی روحانی شخصیت کی طرح لگ رہی تھی۔ لیکن یہ اس کا چہرہ نہ تھا جس کی وجہ سے میں خوفزدہ تھا۔ میں کافی دیر اس کے سامنے اسی طرح خاموش کھڑا رہا کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اس موقع پر کیا کہنا چاہیے۔

''کیا تم بہت بری طرح زخمی ہوئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں'' میں نے نفی میں سر ہلایا حالانکہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ زخم کافی خطرناک ہوسکتا ہے اور یہ کہ اس زخم کا نشان ہمیشہ باقی رہے گا۔

''کیا بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے''؟ اس نے اسی لہجے میں دوسرا سوال کیا۔

''نہیں'' اس بار میں سوچ کر بولا کیونکہ مجھے اس زخم میں کبھی کبھار ہی درد ہوتا تھا۔

اتنی سی گفتگو سے ہی میری سانس پھولنے لگی تھی۔ سہوا کسی اجنبی کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جب اس نے اپنا چہرہ میری طرف گھمایا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں کچھ چمک رہا ہے۔

''میں کل جا رہی ہوں'' اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، جیسے جنگل میں گونجتی ہوئی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ پھر وہ جانی پہچانی حقیقت ایک عجیب خیال بن گیا۔

''کہاں جانا ہے''؟ میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے پوچھا، ''کیا تم جانتی ہو کہ وہ تمہیں کہاں لے جائیں گے؟''

''نہیں'' سہوا نے اپنا سر نیچے جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے سوچا سب کچھ اسے بتا دینا چاہیے جو میں نے اپنے پڑوسی سے سنا تھا کہ وہ امریکہ جا رہی ہے گود لئے جانے یا اختیار کر لئے جانے کے لئے ،لیکن میں اپنے منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔

''میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی'' سہوا نے ایک اور بات بتائی اور پھر ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اور زیادہ گھبرا گیا۔ میں نے زبان سے اپنے خشک ہونٹ تر کرنے چاہیے لیکن زبان تو ہونٹوں سے بھی زیادہ سوکھ چکی تھی۔

''بولتی جاؤ'' میں صرف یہی کہہ سکا۔

''میرے پاس اس کے علاوہ تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے'' اس نے کہا۔

''یہ کیا ہے''؟

سہوا نے وہ چیز میرے سامنے کر دی جو وہ ایک ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ چاند کی روشنی میں یہ چیز جھلملا رہی تھی۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اس چیز کو دیکھا جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ اس پر سے روشنی کی کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔

''اسے لے لو'' وہ بولی۔

سہوا کی لمبی، پتلی انگلیاں میرے ساتھ مس ہوئیں۔ میں اس کے سامنے بت بنا کھڑا تھا۔ پھر مجھے اپنے ہونٹوں پر عجیب سا احساس ہوا۔ یہ احساس ایک سیکنڈ سے زیادہ عرصہ کیلئے نہ تھا۔ سہوا کے ہونٹ میرے لبوں سے زیادہ گرم، نرم اور تر تھے۔ لیکن جب مجھے عجیب سا احساس ہوا تو اس کے ہونٹ نہیں بلکہ اس کا ہاتھ میرے ساتھ مس ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے حواس بحال ہوتے سہوا وہاں سے جا چکی تھی اور صحن پار کر رہی تھی۔ میں کافی دیر تک وہاں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر میں نے یہ دیکھنے کیلئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی کہ میرے سر پر پٹی ٹھیک ہے یا نہیں اور مجھے احساس ہوا میں اپنے ہاتھ میں کچھ تھامے کھڑا ہوں۔ یہ وہی جلے ہوئے شیشے کا لوتھڑا تھا۔ جب سہوا کا گھر جل گیا تو اس نے راکھ کریدی۔ اس کے ہاتھ اپنی گڑیا کا یہ بچا ہوا حصہ آیا اور اس نے وہی سنبھال کر رکھ لیا۔ وہی گڑیا جس کو لٹایا جائے تو وہ خود بخود اپنی آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

اگلے روز سہوا چلی گئی۔ بظاہر وہ ایسے نظر آتی تھی جیسے ایک رات قبل کے واقعے سے مجھ پر ہونے والے اپنے اثرات سے مکمل طور پر بے خبر ہو حتیٰ کہ وہ اس وقت بھی مسکرا رہی تھی جب اس نے مجھے

MashalBooks.com

خدا حافظ کہا۔ میرے چچا کے پیچھے چلتے ہوئے اس کے پاؤں میں مجھے کوئی لغزش بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

پہلے پہلے مجھے اس امر کا خیال تک نہ آیا کہ میں سہوا کو دیکھنے یتیم خانے جاؤں گا لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے سہوا سے ایک بار پھر ملنے کی خواہش میرے دل میں اجاگر ہوتی گئی اور شدت اختیار کرتی گئی۔

یتیم خانے کی گھنٹی کی وہ غمگین جھنجھناہٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ سہوا اس وقت نمودار ہوئی تھی جب گھنٹی دوسری بار بجائی گئی۔ میں مایوس ہو چلا تھا اور واپس آنے کو تیار تھا جب آخر کار وہ میری نظروں میں آ گئی۔ اس کے بال سر کے دونوں اطراف چوٹیوں کی صورت میں باندھے گئے تھے اور اس نے چیک دار سکرٹ پہن رکھا تھا اس کے باوجود پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گیا تھا۔ سہوا نے اسی دیوار کی طرف طائرانہ سی نظر دوڑائی جہاں میں کھڑا تھا اور میرا خیال ہے اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا ہوگا کہ میں وہاں کھڑا ہوں۔ وہ چھلانگ لگا کر دیوار پر چڑھ گئی۔

''تم ادھر کیسے آئے''؟ سہوا نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا کہتے ہیں چنانچہ میں بڑے شرمیلے انداز میں صرف مسکراتا رہا، پھر چند لمحوں بعد میں نے اس سے ایسے سوال کیا جیسے میں بس یہی معاملہ طے کرتے آیا ہوں ''کیا تم اب بھی پرندے پر سوار ہو کر اڑنے کے بارے میں سوچتی ہو''؟

سہوا کافی دیر تک میرے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ اس وقت تناؤ سے آزاد ہو گیا جب اس نے مجھے مسکراتے ہوئے پایا لیکن میں اس کے چہرے پر لحہ بھر کے لئے چھا جانے والے غم کے گہرے سائے کو بھی نظر انداز نہ کر سکا۔ اس صورتحال نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ سہوا کو ہمیشہ سے اس بات کا یقین تھا کہ ایک پرندے پر بیٹھ کر اڑا جا سکتا ہے اور میں اس سے معمول کے ردعمل کی توقع کر رہا تھا۔

''جو کچھ ہوا اُس پر میں شرمندہ ہوں'' اس کی نظریں میری پیشانی پر جیسے گڑ گئی تھیں۔

''ارے نہیں، سب ٹھیک ہے، سارا زخم مندمل ہو چکا ہے'' میں یقیناً اسے اپنے زخم کے بارے میں تھوڑا سا بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے چہرے پر غم کے گہرے بادل چھاتے جا رہے تھے۔

''مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے تمہیں پرندے پکڑنے کے لئے کہا، میں جانتی تھی کہ میں پرندے پر بیٹھ کرنہیں اڑ سکتی، لوگ پرندوں پر کیسے سواری کر سکتے ہیں''؟

میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ وہ اب ایسی باتیں کیوں کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک سرکشی تھی۔ اس میں جو تبدیلی واقع ہوئی تھی میں اسے بالکل نہ سمجھ سکا اور مجھے محسوس ہوا جیسے ساری طاقت جسم سے ختم ہوتی جارہی ہے۔

''ہاں میں جانتی تھی کہ لوگ پرندوں پر سواری نہیں کر سکتے، میرے ابو مر چکے ہیں اور ماں ......'' اس کی آواز اشک آلود تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ اس کے کندھے سسکیوں کے باعث ہچکولے کھا رہے تھے۔ میرے ذہن میں کچھ نہ آیا کہ میں اسے کیا کہوں، حتیٰ کہ میں ایک لفظ بھی تلاش نہ کر سکا جس کے ذریعے میں اس سے ہمدردی جتاتا۔ مجھے اپنے سر میں اچانک شدید درد محسوس ہوا جیسے میرا زخم پھر سے کھل گیا ہو۔ میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی کہ مجھے سہوا سے اس طرح کے الفاظ سننے پڑیں گے۔ وہ اب تک سسکیاں بھر رہی تھی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے اس نے کہا، ''تم بے وقوف ہو، تم کچھ بھی نہیں جانتے''۔ میں اس کے نزدیک ہمیشہ بے وقوف رہا ہوں۔ میں اس وقت بھی بے وقوف تھا جب میں نے یہ کہا تھا کہ لوگ پرندوں پر بیٹھ کر اڑ نہیں سکتے اور میں اس وقت بھی بے وقوف ہی ثابت ہوا تھا جب سہوا نے کہا تھا کہ لوگ پرندوں پر سواری نہیں کر سکتے۔

اسی لمحے ایک درمیانی عمر کا آدمی عمارت سے باہر آیا اور ہم پر چلایا ''یہاں کیا ہو رہا ہے''؟

میں نے فوراً اس پتھر پر سے چھلانگ لگا دی جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا، جب وہ آدمی تیز قدموں سے دیوار کی طرف آیا تو میں نے ڈر کر وہاں سے دوڑ لگا دی۔ میں سن رہا تھا کہ وہ آدمی دیوار کے اندر کی طرف سہوا پر غصے ہو رہا تھا ''تم اتنی چھوٹی ہو کر بھی یہ کھیل کھیل رہی ہو''۔

میں دوڑ پڑا۔ میرا گلا بند ہو گیا اور میرا جسم درخت کی چوٹی پر خوف کی وجہ سے طاری ہونے والی کپکپاہٹ سے زیادہ لرز رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سہوا کو دیکھنے کی تمنا کیوں کی؟ میں اس کے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ کالے رنگ کا پرندہ جسے میں نے درخت پر سے گرنے سے پہلے دیکھا تھا اس وقت میری آنکھوں کے سامنے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ میری

حالت اس شخص کی سی تھی جسے شکاری بنا کر شکار کر لیا گیا ہو۔ میں ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو گیا لیکن میں نے دوڑ جاری رکھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں رک گیا تو زمین میں دھنس جاؤں گا۔ اس ملاقات سے میرا مقصد سہوا سے اعتراف کرانا ہرگز نہیں تھا۔ اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ میرا گلا بھٹے میں پکتی ہوئی کسی ٹیوب کی طرح سوکھا ہوا اور گرم تھا۔ سہوا کا کیا بنے گا؟ میری آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں ڈال دی ہوں اور میرا دل ایسے اچھل رہا تھا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ مجھے چکر آنے لگے اور متلی محسوس ہونے لگی، پھر میں نیچے بیٹھ گیا اور میں نے قے کر دی۔ مینڈک کی طرح کی آواز نکالتے ہوئے میں نے وہ نکال دیا جو میرے معدے میں تھا۔ شدید کپکپی اور بخار نے مجھ پر یک دم ہلہ بول دیا۔ مجھے گلے میں معدے کی کسیلی رطوبتوں کا ناگوار ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور جانا کہ شام ہو گئی ہے، سورج غروب ہو چکا تھا۔ سمت کا اندازہ کئے بغیر میں بس چلتا رہا۔

میں جنگل میں پہنچ گیا، مجھے نہیں معلوم تھا کون سی طاقت مجھے ادھر لے جا رہی ہے۔ میں نے اوپر درختوں کی چوٹیوں پر نگاہ دوڑائی لیکن مجھے کچھ بھی واضح طور پر نظر نہ آیا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے چلانا چاہا لیکن الفاظ جیسے میرے گلے میں کہیں پھنس گئے تھے۔ پھر میں نے اپنی طاقت مجتمع کی اور زوردار آواز لگائی ''قابل نفرت مخلوق! فوراً نیچے اترو''۔

نیچے گرتے ہوئے میں نے اچانک سوچا کہ روشنی کا ایک وسیع دائرہ میری طرف حرکت کر رہا ہے، بہت وسیع اور بہت تیز روشنی یا غالباً روشنی بالکل بھی نہیں تھی بلکہ آسمان کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر دیکھا یہ ایک بہت بڑا پرندہ تھا ایک چمکدار اور عظیم الجثہ پرندہ گھاس پر اتر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اوپر اٹھایا اور اس کی طرف بڑھا۔ پرندہ بھی یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی کے آنے کے انتظار میں ہو۔ اس کی صاف شفاف آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔ میں نے تھوڑا سا بھی خوف محسوس نہ کیا۔

بغیر کسی تذبذب یا خوف کے میں نے پرندے کی گردن پکڑ لی اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ یہ بالکل بھی پھسلواں نہیں تھی بلکہ یہ بہت نرم اور آرام دہ تھی۔ میں نے اپنے بازو اس کی بڑی سی گردن کے گرد حلقہ کر لئے، میں نے اپنے پاؤں پھیلائے اور پرندے کے سینے کے ساتھ چمٹا لئے، اس نے کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کے جسم کی گرفت نے مجھے اتنا آرام دیا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی، میں بس

سونے ہی والا تھا کہ یخ بستہ ہوا کا جھونکا میرے ساتھ ٹکرایا۔ میں نے نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور خود کو ہوا میں بلند پایا۔ اس کے پروں کی حرکت کے ساتھ ساتھ پرندے کی پیٹھ بھی اوپر نیچے ہچکولے کھا رہی تھی۔ بہت نیچے مجھے بہتے ہوئے دریا نظر آ رہے تھے جیسے ننھا سا سانپ بل کھا کر تیر رہا ہو۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ عظیم الجُثہ پرندہ ایک چھوٹے سے سمندری پرندے میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے اپنے وجود کا جائزہ لیا، میں اب بھی پرندے پر سوار تھا، لیکن یہ تو صرف شیشے کی بنی گڑیا تھی۔

اگلے روز مجھے جنگل سے تلاش کر لیا گیا، میں اس وقت بے ہوش پڑا تھا۔ طویل بیماری کے بعد مجھے اگلے سال سکول جانے سے روک لیا گیا تھا اور میں سارا دن گھر پر پڑا رہتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی کسی کو یہ نہیں بتایا کہ اس روز کون سی چیز مجھے جنگل میں لے گئی تھی۔ میں بتا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میری سہوا سے ملاقات کے اگلے ہی روز یتیم خانے کی عمارت کو بموں سے سے ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا، حتیٰ کہ جب مجھے سہوا کی موت کی خبر دی گئی اس وقت بھی میں نے جذبات کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ میں نے کسی کو کبھی اس عظیم الجُثہ سفید پرندے کے بارے میں بھی نہیں بتایا حالانکہ وہ طویل عرصہ تک میری یادوں میں بسا رہا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ میں اس کے بارے میں کسی کو بتا سکتا ہوں۔

بعدازاں میں نے یون سئی (Yonsei) یونیورسٹی میں ''چوانگ تازو'' کی تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر کولون میونگ ہمیں پڑھاتے تھے۔ وہ چھوٹے قد کے تھے اور ان کا چہرہ کم سن لڑکوں کی طرح کا تھا۔ وہ سست قدموں سے پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے آگے بڑھتے اور بک سٹینڈ پر اپنی کتاب رکھ کر کھولتے تھے۔ پہلے دن انہوں نے باب اول شروع کیا ''آزادانہ اور آسان سفر''

''شمالی تاریکی میں ایک بہت بڑی مچھلی رہتی ہے، اس کا نام کون (Kun) ہے۔ یہ اتنی بڑی ہے کہ کوئی بھی اب تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ یہ کتنے میل لمبی ہے۔ یہ مچھلی بعض اوقات پرندے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس پرندے کو پنگ کہتے ہیں۔ یہ پرندہ بھی اتنا بڑا ہوتا ہے کہ کوئی نہیں جانتا اس کی لمبائی کتنے میل ہے۔ جب یہ پرندہ غصے میں آوازیں نکالتا ہے تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ لیا ہو۔ ہمارے لئے اس مضمون کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر کو نے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں موسم بہار کے ابتدائی آثار پیدا ہو رہے تھے، پتہ نہیں کیوں وہ کافی دیر تک ہنستے رہے۔

پروفیسر کے الفاظ نے میری یادداشت کے تاروں کو چھیڑ دیا۔ عظیم الجُثہ پرندے پنگ کے

نام نے مجھے بہت سی باتیں یاد دلا دیں۔ اگرچہ حقیقت میں ہم پرندوں پر سواری نہیں کر سکتے لیکن پنگ ہمیں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر حقیقت اور خواب کے درمیان کسی بھی جگہ لے سکتا ہے چنانچہ جو حقیقت سے گہرے وابستہ ہیں وہ نہیں اڑ سکتے۔ پھر پروفیسر صاحب نے ہمیں کتاب کا یہ حصہ غور سے نہایت محتاط انداز میں پڑھنے اور اپنے طور پر اس سے نتیجہ اخذ کرنے کیلئے کہا۔ خوشی اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور سینے میں ہلچل جاری تھی۔ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی کوئی چیز میری آنکھوں کو گرما رہی تھی۔

میں نے اپنے ان جذبات کو حوالہء قلم کیا اور وہ مضمون ایک ادبی میگزین ''رائیڈز'' میں شائع ہوا۔ اس کے دو برس بعد مجھے پوری دنیا کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ میرے اس طویل سفر کے منصوبے میں جکارتہ، انڈونیشیا کا دورہ بھی شامل تھا۔ میں کورین ایئر لائنز کے ذریعے ہانگ کانگ پہنچا اور پھر گرودا کے ذریعے ہانگ کانگ سے جکارتہ چلا گیا۔

گرودا انڈونیشیا کی ایئر لائن کا نام ہے اور انڈونیشی زبان میں اس کا مطلب ہے ''عقاب'' میں نے گرودا کے ذریعہ جکارتہ سے پیکانیارو، جو سماٹرا کا دارالحکومت ہے اور پھر وہاں سے سنگاپور چلا گیا۔ اس طرح میں نے اسی ایئر لائنز پر تین سفر کئے۔

دوران سفر مسافروں کو کھانا پیش کرتے ہوئے ایئر ہوسٹس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ناسی؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ مطلب؟ اس پر وہ فوراً بولی ''چاول؟'' انڈونیشیا والے چاول کو ''ناسی'' بولتے ہیں۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا اور جنوب مشرق ایشیاء کے چاول کھاتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

گرودا یعنی خواب ...... اتنے برسوں کے بعد میں آخر کار ایک پرندے پر سوار تھا۔ میرے نزدیک یہ پیچیدہ مشینری یا معاصر تہذیب کا شاہکار نہ تھا بلکہ ایک زندہ اور جیتے جاگتے عقاب کی طرح تھا۔ یہ ایک پرندہ تھا۔ فضائی حالات کے باعث گرودا کا جہاز ہچکولے کھانے کی وجہ سے یا اس سبب کہ میں اپنے اندر سہوا سے ہم کلام ہونے کی ایک خواہش دبائے بیٹھا تھا اور اس کے بارے میں سوچ رہا تھا ناسی یعنی چاول میرے چمچ پر سے گر کر میرے دامن میں اکٹھے ہوتے رہے۔

☆ ☆ ☆

(3)

چند روز قبل میں نے ایک روزنامے میں ایک خوردبینی تصویر دیکھی جس میں ایک مچھر کو ایک انسانی جسم سے خون چوستے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ تصویر مجھے بہت دلچسپ لگی۔ اس تصویر کے ساتھ ایک مضمون بھی تھا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ تصویر ایک سویڈش سائنسی فوٹوگرافر نے کھینچی تھی جس نے مچھر کو کیڑے مار سپرے کے ذریعے اس لمحے مار دیا تھا جب مچھر نے انسانی جسم میں خون چوسنے والی اپنی ٹیوب گاڑ رکھی تھی۔ پھر اس مچھر کی ٹانگوں کو گوند کے ذریعے انسانی جلد کے ساتھ چپکا دیا گیا اور جلد کے اتنے ٹکڑے کو جسم سے الگ کر کے مائع نائیڈروجن کے ذریعے منجمد کر دیا گیا۔ اس تصویر میں مچھر پتلی بدوضع ٹانگوں اور عدسوں کی طرح موٹی آنکھوں کے ساتھ کوئی غیر زمینی مخلوق نظر آتا تھا جبکہ اس کی تیز خون چوسنے والی سونڈ انسانی کھال میں اترتی نظر آتی تھی۔ تصویر کو دیکھتے ہوئے مجھے تھوڑا عرصہ پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کبھی کبھی میں حقیقت اور غیر حقیقت کے بارے میں اس قدر ابہام کا شکار ہو جاتا ہوں کہ حال ہی میں مجھے یہ سوچ حیرت میں مبتلا کر گئی کہ آیا چوآنگ ٹی زو کی اپنی کتاب ''تمام چیزوں کو مساوی بنانے کی بحث'' میں کی گئی تمام تر پیش گوئیاں میرے کیس کے بارے میں تو نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے یقیناً تمام عظیم دانشوروں کے خیالات بہت گہرے اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ چوآنگ ٹی زو کا کہنا ہے کہ اس نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ وہ ایک تتلی بن گیا ہے۔ جب وہ نیند سے جاگا تو اسے پتہ چلا کہ وہ تو ایک آدمی ہے جس کا نام چوانگ لی زو ہے۔ اس خواب پر وہ بہت حیران ہوا کہ آیا وہ ایک آدمی ہے جس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک تتلی بن گیا ہے یا وہ ایک تتلی ہے جس نے خواب دیکھا کہ وہ ایک آدمی بن گئی ہے۔ بہرحال بہت سی ادھر ادھر کی پیش گوئیوں کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں بھی آسانی سے سمجھ آ جانے والی اور حقیقت پر مبنی سوچوں کا حامل ہو سکتا ہوں، کم از کم جہاں معاملہ مچھروں کا ہو۔ مجھے اب بھی اس روز صبح کے وقت رونما ہونے والے واقعہ کی پوری تفصیل یاد ہے اور فوٹوگراف کی تفصیلات میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا میں وہ بھی بیان کر سکتا ہوں۔ میرے دوست اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں مچھروں سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں۔ ایک دفعہ گرمیوں کے موسم میں میں پوہانگ میں ساحل سمندر پر تیراکی کیلئے گیا اور باوجود اس کے کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی کمرے کے اندر میں نے خود کو ڈھانپے رکھا اور بہت سی راتیں ایسے ہی سوئے بغیر گزار دیں۔ سمندری علاقوں میں مچھر اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ کمبل کی کئی تہوں کے اندر

MashalBooks.com

بھی گھس سکتے ہیں اور جب وہ اڑ رہے ہوں تو ایسی آوازیں نکالتے ہیں جیسے کامی کازی طیاروں کے اڑنے سے نکلتی ہے۔ ایسے طیارے میں نے ایک فلم میں اڑتے ہوئے دیکھے تھے۔ میں جب بھی ان کی آواز سنتا خوف سے کانپنے لگتا اور یوں محسوس کرتا جیسے میں چیخ رہا ہوں۔ چنانچہ اخبار میں شائع ہونے والی مردہ مچھر کی تصویر سے میرا خوفزدہ ہو جانا غیر معمولی بات نہ تھی اور اسی سے مجھے پتہ چلا کہ اب میں آخر کار ایک مخصوص مچھر کے بارے میں کچھ لکھ سکتا ہوں۔

اپنی طلاق یافتہ بیوی سے میری دو بیٹیاں ہیں۔ چھوٹی بیٹی کے جسم اور چہرے پر ہر موسم گرما میں مچھروں کے کاٹنے کے نشان ہوتے ہیں۔ موسم گرما میں مچھروں کی بہتات ہوتی ہے اور یہ بہت سے لوگوں کو کاٹتے ہیں لیکن میری چھوٹی بیٹی تو جیسے ان حشرات کے لئے خاص کشش رکھتی ہے۔ وہ بہت جذباتی ہے اور ہر وقت مقابلہ بازی کیلئے تیار رہتی ہے۔ چنانچہ جب میں اسے تنگ کرنے کیلئے کہتا ''میرے خیال میں مچھر تم سے نفرت کرتے ہیں'' تو وہ منہ بنا لیتی لیکن جب میں یہ وضاحت کر دیتا کہ نہیں میرے خیال میں مچھر تو تم سے محبت کرتے ہیں تو اس کا موڈ پھر بھی ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال پتہ نہیں مچھروں سے محبت کرنے کے باعث یا نفرت کی وجہ سے وہ ہمیشہ شدید بیمار رہتی تھی، اتنی زیادہ بیمار کہ اسے دیکھنے والے کو تکلیف اور اذیت ہوتی تھی۔ یہ معصوم لڑکی اپنی بیماری کے بارے میں شکایت کرتی رہتی تھی لیکن محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی انجانے اندرونی خوف کی وجہ سے بھی سلگتی رہتی ہے۔ اس کا سارا جسم مچھروں کے کاٹنے سے سرخ ہو جاتا اور سوج جاتا تھا۔ اس کی اس صورتحال سے مجھے ایک پرانی انڈین ہندوستانی کی یاد آ جاتی جس کا جسم شدت جذبات سے سرخ ہو جاتا تھا۔

مچھروں کا موسم ایک بار پھر آ چکا تھا اور میں نے ضرورت محسوس کی کہ اپنے بچوں پر توجہ دوں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ یہ ایک وعدہ تھا جو میں نے کسی سے کیا تھا اور جو میں پورا نہیں کر سکا تھا۔ اگرچہ میں نے یہ وعدہ کافی عرصہ پہلے کیا تھا پھر بھی میں نے فیصلہ کیا کہ دیر سے ہی سہی اسے پورا کر دیا جائے، اپنے بچوں کی خاطر نہیں بلکہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کیلئے۔ میرے راستے میں کھلونوں کی جو پہلی دکان آئی میں اس میں داخل ہو گیا اور پنسل شارپنر لانے کیلئے کہا۔ شیلف کے پیچھے کھڑے زرد چہرے والے کلرک نے کہا کہ اس کے لئے مجھے سٹیشنری دکان پر جانا پڑے گا۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا کہ قرب و جوار میں ایسی دکان کہاں ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر سٹیشنری کی دکان مل

بھی جاتی ہے تو ان کیلئے اس قدر غیر اہم چیز لے جانے کی کوئی اہمیت ہو گی۔

کلرک نے جب یہ جواب دیا کہ ایسی دکان آپ کو اس گلی کی دوسری طرف مل سکتی ہے تو میں سوچ کی دنیا سے واپس آ گیا اور ادھر نگاہ دوڑائی جدھر اس کلرک نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں ایک شخص ہتھ ریڑھی پر گھونگے اور سیپیاں فروخت کر رہا تھا۔ ایک طرف ایک میڈیکل سٹور تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ اس علاقے میں سٹیشنری سٹور کا ہونا ممکن نہیں۔ اس وعدے کو پہلے ہی دو سال گزر چکے تھے، اس وقت لڑکیوں نے پنسل شارپنرز کا تقاضا کیا تھا۔ جب میں بچہ تھا تو مجھے بھی پنسل شارپنرز کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ایک نسل بعد اب میری بچیوں کو بھی اس کی ضرورت تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ ان کو بتا دوں یہ کوئی اتنی اچھی چیز نہیں ہے لیکن پھر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا اور میں ایسا نہ کر سکا۔ جس زمانے میں مجھے پنسل تراش کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، ہر سو جنگ کی تباہ کاریاں نظر آتی تھیں۔ جنگ تو ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی باقیات اب بھی ہر سو بکھری پڑی تھیں چنانچہ جب میں کسی راستے پر جا رہا ہوتا تو مجھے لگتا جیسے میں جنگ زدہ مردہ جسموں کے اوپر چل رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا کہ گھاس اور جھاڑیوں کے بیچ سے مردہ اجسام جھانک کر مجھے دیکھ رہے ہیں اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور پہاڑی میدانوں میں بنی غاریں اور سوراخ مجھے گھورتے ہیں، وہ غاریں اور وہ سوراخ جہاں کبھی لوگ رہتے تھے اور جہاں اب کوئی نہیں رہتا۔

میں خراماں خراماں چلتا ہوا اوور پاس کے اوپر چڑھا اور سڑک کے دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ غالباً میں نے اپنا کام وقت سے بہت پہلے چھوڑ دیا ہے۔ راستے میں میں نے قریب سے گزرنے والے ایک شخص سے وقت دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ بارہ بجنے میں بیس منٹ۔ اس کا جواب مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے یاد آ گیا کہ میرے پاس بھی تو گھڑی موجود ہے۔ میرے پاس ایک روز پہلے سے گھڑی موجود تھی۔ مجھے اپنی کمپنی سے کچھ رقم پیشگی مل گئی تھی اور اس میں سے آدھی میں نے یہ گھڑی خریدنے پر صرف کر دی تھی۔ میں وقت کے معاملے میں بڑا لاپروا تھا اور اب تک میں نے اپنی زندگی گھڑی کے بغیر ہی گزار دی تھی۔ اصل بات یہ ہے ایک بس پر سفر کرتے ہوئے میری وہ گھڑی کھو گئی تھی جو مجھے میری بیوی نے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ تب سے میں گھڑی کے بغیر ہی گزارہ کر رہا تھا۔ مجھے کبھی گھڑی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جب مجھے یہ یاد آیا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت لڑکیوں کو سکول سے واپس آنا ہے تو میں فوری طور پر ایک جیولر کی دکان پر گیا اور وہاں سے ایک گھڑی خرید لی تاکہ لڑکیوں

MashalBooks.com

کے سکول سے واپس آنے کا وقت میرے ذہن سے محو نہ ہو جائے۔ لیکن شاید مجھے اپنے پاس گھڑی کے موجود ہونے کا احساس ہو جانے کے باوجود وقت پوچھنا پڑتا کیونکہ میں ٹھیک ٹھیک وقت جاننا چاہتا تھا۔

ابھی پندرہ منٹ باقی تھے، مجھے یہ وقت کیسے صرف کرنا چاہیے، میں نے سوچا۔ تب یاد آیا کہ مجھے ایک پنسل شارپنر خرید لینا چاہیے۔ اسی لئے تو میں نے پیشگی رقم لی تھی۔ میں سائن بورڈ دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں پنسل شارپنر کی تلاش میں پندرہ منٹ صرف کر سکتا تھا پھر بارہ بجنے سے پانچ منٹ پہلے سڑک ایک بار پھر پار کر کے سکول کی طرف جا سکتا تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ سکول کے نزدیک یقینی طور پر کوئی نہ کوئی سٹیشنری سٹور ہوگا لیکن میں عین وقت پر سکول جانا چاہتا تھا۔ سٹیشنری سٹور کی تلاش دراصل بازار میں ادھر ادھر گھومنے کا ایک بہانہ تھا۔ پنسل تراش کا وعدہ دو سال قبل کا تھا جبکہ بڑے ہوتے ہوئے بچے تیزی سے بدلتے ہیں۔ بچیوں نے تو اپنی اس طفلانہ خواہش کو دہراتے ہوئے بھی شرم محسوس کی ہوگی۔ غالباً اس سے انہیں میری بے اعتباری پھر سے یاد آ جائے گی اور ان کی نظروں میں بطور ان کے والد کے حیثیت اور کم ہو جائے گی۔ لیکن وعدہ تو پھر وعدہ ہی ہوتا ہے اور جب تک پورا نہ ہو جائے وعدہ ہی رہتا ہے۔ فرض کریں کہ اس مرتبہ میں اسے نظرانداز کر دیتا ہوں تو وقتاً فوقتاً مجھے اپنی وعدہ خلافی یاد آتی رہے گی۔ ٹھیک ہے محض ایک پنسل تراش کے بارے میں اتنی زیادہ فکرمندی احمقانہ سی محسوس ہوتا ہے لیکن میں تو بس اسی طرح کا ہوں۔ اگر اسی طرح سوچا جائے تو میں لاتعداد وعدے ایسے ہیں جو میں نے پورے نہیں کئے۔ عام سادہ سی ملاقات سے لے کر پیار اور محبت کے بااہتمام عہد و پیان تک اور زندگی کی آخری سانس تک کسی کو اپنے دل سے لگائے رکھنے تک کے وعدے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کہاوت موجود ہے ''وعدے تو توڑنے کیلئے ہی کئے جاتے ہیں'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے بہت زیادہ وعدے پورے نہیں کئے، وعدہ خلافی کرتا رہا۔ اگر ایسا ہی ہے تو سوال یہ ہے کہ اب میں اتنے معمولی سے وعدے کے حوالے سے اس قدر جذباتی کیوں بنا ہوا ہوں، جو کافی عرصہ پہلے کیا گیا تھا؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی بچیوں کے ساتھ یہ میرا آخری وعدہ تھا۔ میں نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا تھا، غالباً اسی وجہ سے بچیوں نے مجھ سے کوئی اور چیز لانے کا مطالبہ نہیں کیا۔ میں ہی اس بات کو سب سے بہتر انداز میں جانتا ہوں اور اس بات کو دو سال گزر گئے۔ میں حیران تھا کہ کوئی سٹیشنری سٹور میری نظر میں نہیں آ رہا تھا، کیونکہ یہ سب اب وقوع پذیر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں حال کی گلیوں میں اپنے ماضی کو ساتھ لے کر

چل رہا ہوں۔

چلتے چلتے میں نے کسی کے انتظار میں کھڑے ایک آدمی سے پوچھا ''آپ کی گھڑی پر کیا وقت ہوا ہے؟'' اس شخص نے اپنا خالی بازو مجھے دکھایا اور پھر میرے بازو کی طرف دیکھا جہاں گھڑی بندھی ہوئی تھی۔

شرمندگی کے احساس کے ساتھ مسکراتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ اٹھایا، اپنی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور پھر اپنے سر کو دائیں بائیں ایسے جھٹکے دیئے جیسے اسے یہ دکھانا چاہ رہا ہوں کہ میری گھڑی خراب ہے۔ میری گھڑی کے ڈائل پر بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ عام دنوں میں اس وقت میں اپنی میز پر بے چینی میں مبتلا ہوتا تھا اور دوپہر کے کھانے کے وقفے کا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ چند روز پہلے تقریباً اسی وقت کسی ساتھی نے میرے ساتھ ہر چیز کے وجود سے انکاری راہبوں کی بات کی تھی اور کسی نے میرے ساتھی سے سوال کیا کہ کوریا میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ہر شے کے وجود سے انکاری ہوں؟ اس پر اس نے جواب دیا ''مجھے نہیں یقین''۔

کوئی درمیان میں بول پڑا ''میں نے سنا ہے کہ ایسا فرقہ جاپان میں موجود ہے''۔

''میرے خیال میں، میں نے بھی ان کے بارے میں سن رکھا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لکڑی کی بانسریاں بجاتے ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں اور انہوں نے چھجے دار ہیٹ پہن رکھے ہوتے ہیں، ویسے ہی ہیٹ جیسے مجرموں کو پہنائے جاتے تھے''

''یہ بات بالکل درست ہے اور ان کا کوئی خاص ٹھکانہ نہیں ہوتا''۔

اس کے ساتھ یہ بحث ختم ہوگئی جیسے وہ ساری بحثیں ختم ہو جاتی ہیں، جو ہمارے مطلب کی نہیں ہوتیں۔

میں ایک جنرل سٹور کے سامنے ایک سٹول پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ میں نے کام سے اتنی جلدی چھٹی کیوں لے لی اور پھر یہاں آنے کیلئے ٹیکسی کیوں کرالی جبکہ میرے پاس کافی وقت تھا۔ میں نے ایک سوڈا کا آرڈر دیا اور جب دکاندار میری مطلوبہ چیز میرے پاس لے کر آیا تو میں نے اس سے پوچھا ''یہاں قریب کوئی سٹیشنری کی دکان ہے؟'' دکاندار نے سپاٹ چہرے کے ساتھ لمحہ بھر کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر یہ کہہ کر واپس دکان کے اندر چلا گیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے ایک بار پھر

گھڑی دیکھی بارہ بجنے میں سات منٹ تھے۔اب مجھے دو تین منٹ اور گزارنا تھے۔

کپ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس کیے بغیر میں نے سوڈا اپنے حلق میں انڈیلا۔ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا گلا بند ہو گیا ہے لیکن پھر جلد سوڈا آسانی سے میرے معدے میں اتر گیا۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ احساسات خوشگوار تھے یا ناخوشگوار۔ میں اب پنسل تراش کے بارے میں بھی زیادہ فکرمند نہ تھا۔اچانک میرے ذہن میں سوال ابھرا، اس بھری دوپہر میں اس علاقے میں گھومنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ کون سی شدید خواہش نے صبح کے وقت مجھ پر غلبہ پالیا اور نظر میں آنے والی ہر چیز کو محو کر دیا اور مجھے میرے بچوں کی طرف دوڑا دیا تھا، جیسے پوری دنیا میں وہی ایک حقیقت ہوں اور باقی سب کچھ افسانہ۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ پہلے میں نے انہیں دیکھا تھا۔اس وقت بچیوں نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا ''ابا جان، ہمیں آپ کی ایک تصویر مل سکتی ہے؟'' میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میری بیٹیاں مجھ سے جدا ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں گی۔ ''کس لئے'' میں نے ان کے چہروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''جب ہم آپ کی یاد میں اداس ہوں گی تو اس تصویر کو دیکھ لیا کریں گی'' انہوں نے جواب دیا اور میں نے سوچا شاید اسی وجہ سے لوگ بیٹیوں کی تمنا کرتے ہیں۔ میں نے اپنے اندر محبت اور شفقت کی ایک لہر ابھرتے محسوس کی، اس کے ساتھ ہی میرے اندر حالات سے سمجھوتا کرنے کی حس بھی بیدار ہوئی جیسے ان سے جدائی ایک ایسی حقیقت ہو جسے تبدیل نہ کیا جا سکے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ملنے اور پھر جدا ہو جانے کا آخر کیا مطلب ہے۔زندگی میں ملاقاتیں اور جدائیاں کیوں رکھی گئی ہیں؟ کیا یہ بات درست ہے کہ یہ ملاقاتیں ہی ہیں جو زندگی کی قدر کو بڑھاتی ہیں اور اسے ایک معنی عطا کرتی ہیں۔اگر یہی بات درست ہے تو پھر جدائیاں ملاقاتوں کی تکمیل اور اختتام نہیں ہیں؟ بہرحال میں نے اپنی بیٹیوں کو اپنی تصویر نہیں دی۔ میں اس بات پر متحیر تھا کہ وہ کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں اور میں نے ان سے پوچھا کہ وہ میری تصویر کیوں رکھنا چاہتی ہیں جبکہ وہ کسی بھی وقت میرے ساتھ ملاقات کر سکتی ہیں۔ بچیاں اپنی ماں کے ہاتھ تھامے ڈھلوان سے نیچے اتر گئیں۔ جب میری بیوی نے کہا ''تم اپنے ڈیڈی کو خدا حافظ نہیں کہو گی تو وہ واپس مڑیں اور جھک کر مجھے سلام کیا۔ایک پہاڑی پر ٹکے ہوئے اپنے گھر میں کھڑے ہو کر میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بچیاں لمبے لمبے ڈگ بھرتی

MashalBooks.com

ہوئی نیچے چلی گئیں جیسے وہ اس بات سے آگاہ ہوں کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں، لیکن انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہوسکتا ہے ان کے پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی وجہ بھی یہی احساس ہو کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ ڈھلوان کافی تنگھی تھی، اتنی تنگھی کہ میں یہ سوچ کر فکرمند ہوگیا کہ موسم سرما میں جب برف پڑے گی اور نیچے برف جمی ہوگی تو اس وقت کیا صورتحال ہوگی۔ میں تو غالباً انہیں بہت پہلے سے اس طرح نیچے جاتے دیکھتا رہا ہوں۔ اس وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت میں نے اپنی بیوی کے کانوں میں سرگوشی کی تھی ''میں تمہارے لئے پھول اکٹھے کروں گا'' دراصل میں چاہتا تھا کہ وہ بغیر کسی پریشانی یا فکر کے سو جائے۔ میں خاموشی کے ساتھ ہوٹل سے باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر کیلئے ادھر ادھر گھوم کر صبح کی صاف اور ٹھنڈی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھرتا رہا۔ یہ سوچ اور آگاہی میرے اندر سے ابل رہی تھی کہ میں آخر کار خوشی اور شادمانی کو حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس جذبے نے مجھے آرام سے لیٹنے بھی نہ دیا۔ میں نے سوچا کہ صبح کی خنک اور صاف ہوا اپنے اندر بھر کر میں نے خود کو کافی حد تک شانت کر لیا ہے۔ میں درختوں سے بھرے ایک پہاڑ پر چڑھ گیا اور خود کو اتنا چھپا لیا جتنا اس وقت ممکن تھا۔ اکتوبر کے آخری دن تھے اور پہاڑوں پر پھول ختم ہو چکے تھے۔ میں جمی ہوئی شبنم کو روندتا ہوا آگے بڑھتا اور پہاڑ پر اوپر چڑھتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی بیوی کے جاگنے سے پہلے میں واپس ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر میں نے خود کو جنگل کی وسعتوں میں پایا، وہاں ادھر ادھر گھومتے ہوئے میں نے اپنے بچوں کا تصور کیا ان کے خدوخال اصل بچوں سے ممتاز تھے، انہوں نے میری طرف دیکھ کر اپنے ننھے ہاتھ ہلائے۔

جب وہ پیدا ہوئے تو میں کبھی کبھی ان چہروں کا جائزہ لیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے ان چیزوں کو اپنے دماغ پر کندہ کر لینا چاہیے تاکہ اگر مجھے ان کا مجسمہ بنانا پڑے تو میں یہ کام کرسکوں۔ واضح ہے کہ مجھے اپنے بچوں سے پہلے مرنا ہے اور یہ پہلے مرنیوالوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ساتھ ان لوگوں کی شبیہیں لے کر جائیں جن کو وہ اپنے پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں۔ زندہ رہ جانے والے تو تصویروں سے بھی کام چلا لیتے ہیں لیکن مرنے والے تو صرف اپنے ذہنوں میں بنی تصویریں ہی لے جاسکتے ہیں۔ کچھ سوڈا گر گیا اور میری شرٹ آگے سے بھیگ گئی۔ یہ صورتحال مجھے ناگوار گزری۔ میں نے تو اس روز صبح اپنے جوتے بھی پالش کئے تھے۔ میں اس ابتر حالت میں اپنے بچوں کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے ذہنوں پر اپنے باپ کی اس طرح کی تصویر نقش ہو۔

سورج اب بالکل سر کے اوپر چمک رہا تھا۔ یہ میرا اپنی بچیوں کے پاس جانے کا وقت تھا۔ اس لئے نہیں کہ میں نے اپنی بچیوں کو اپنی تصویر نہیں دی تھی۔ جب میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ بچیاں میری تصویر مانگ رہی ہیں تو وہ مسکرائی، بالکل ویسے ہی جیسے وہ شادی کے بعد مسکرائی تھی اور کہا کہ انہیں تصویر طلب کرنے کی ضرورت نہیں، ہمارے گھر میں تمہاری تصویریں موجود ہیں۔ جب وہ خاموش ہو گئی تب بھی ایک قہقہہ، ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر منڈلا رہی تھی۔ میری بیوی بے ساختہ ہنستی تھی اور اس کی ہنسی میں کوئی بناوٹ بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہنسی مجھے بہت فرحت دیتی تھی چنانچہ میری کوشش ہوتی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ ہنسا سکوں۔ چنانچہ جب مجھے یہ احساس ہوا کہ اب میں یہ ہنسی کبھی کبھی سن سکوں گا اور ممکن ہے کبھی نہ دیکھ سکوں تو میں نے اس کے سامنے غیر جذباتی قسم کی محبت کا ڈھونگ رچایا جس طرح میں نے اس روز دکھاوے کے جذباتی لگاؤ کا اظہار کیا تھا جب میں ایک غیر عورت کے ساتھ رات باہر گزار کر آیا تھا۔ یہاں اس کا ذکر ذرا بے محل سا لگتا ہے۔

میں نے تیزی سے سکول کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اسی وقت مجھے جس کسی نے بھی دیکھا ہو گا اسے یہ شبہ ہی نہیں ہوا ہو گا کہ چند منٹ پہلے میں وقت کاٹنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ میری رفتار سے یہ لگ رہا تھا کہ میں کئی ماہ فارغ رہنے اور آوارگردی کرنے کے بعد آج اپنے کام پر جا رہا ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ سکول کا فاصلہ بڑھ جائے تاکہ میں اور زیادہ تیز چل سکوں لیکن جلد ہی میں سکول کے سامنے کھڑا تھا، جو سکول سے زیادہ مال اسباب رکھنے والا گودام لگ رہا تھا کیونکہ بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس کے کئی ونگ اور تعمیر کر لئے گئے تھے۔ میں نے اور دس سال تک میری بیوی رہنے والی عورت نے، میرے بھائیوں اور بہنوں اور میری بیوی کے بھائیوں اور بہنوں نے اسی سکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب ہماری اگلی نسل اسی جگہ پر اس عمل سے گزر رہی تھی۔ جب میں نے بار بار دہرائے جانے والے اس عمل کے بارے میں سوچا تو اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ بچے سوکھی ہوئی ہیرنگ مچھلی کی طرح ہوتے ہیں سکول کے ایک ارتقازی کیمپ یا اشیاء سٹور کرنے والے گودام کی طرح احترام وہی کرتے ہیں جنہیں جنگ کے زمانے میں زندگی گزارنے کا تجربہ حاصل ہوا ہو۔

اچانک سکول میں سے شور اٹھا۔ دوسری اور تیسری جماعت کے بچوں کو چھٹی دے دی گئی تھی۔ سکول کی عمارت میں سے شور ایسے باہر آ رہا تھا جیسے دھویں کے بادل اوپر اٹھتے ہیں یا بمباری کے بعد تباہ

ہونے والی عمارت سے گرد کا غبار اٹھتا ہے۔ بچے سکول کی عمارت سے نکل کر ادھر ادھر غائب ہو رہے تھے جیسے سول ڈیفنس کے مظاہرے کے دوران لوگ گلیوں محلوں اور محفوظ جگہوں پر چھپ جاتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بچیوں کو فوراً پہچان لوں گا، یہ ہجوم دیکھنے کے بعد میں خود کو بے وقوف تصور کر رہا تھا۔ اس ہجوم میں اپنی بچیوں کو تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔ میری نظر کافی کمزور ہے۔ مجھے امید تھی کہ میری بچیاں مجھے پہچان کر میرے پاس آ جائیں گی۔ میرا اطاعت گزاری والا طرز عمل میرے لئے تکلیف دہ حد تک ذلت آمیز تھا اور مجھے یہ احساس دلا رہا تھا جیسے میں قانون سے بھاگا ہوا کوئی جرائم پیشہ ہوں یا کوئی فقیر ہوں جو لوگوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔ بچے مجھے کسی غضبناک ہجوم کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ سب کسی آفت کے نازل ہونے کے انتظار میں ہیں تاکہ وہ سب کچھ تہس نہس کر دے۔

میں نے گیٹ سے باہر آنے والی ایک لڑکی سے دریافت کیا کہ کونسی جماعت کو چھٹی ہوئی ہے۔

''تیسری جماعت کو'' لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے اور مجھ پر نظر رکھتے ہوئے جواب دیا جیسے اسے شبہ ہو کہ میں ضرور بچے اغواء کرنے والا آدمی ہوں۔ میری بڑی بچی اس جماعت میں پڑھتی تھی۔ میں آگے بڑھا اور گیٹ کے قریب ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہو گیا جہاں بڑے دروازے سے باہر آنے والے سبھی بچے مجھ دیکھ سکیں۔ میری بڑی بچی تیسری جبکہ چھوٹی والی دوسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ وہ اکٹھے سکول آتی اور اکٹھے ہی واپس گھر جاتی تھیں۔ ہفتے میں دو روز تیسری جماعت والوں کو دوسری جماعت کی نسبت ایک گھنٹہ دیر سے چھٹی ہوتی تھی اور میں نے سن رکھا تھا کہ میری دوسری جماعت میں پڑھنے والی بچی اپنی چھٹی کے بعد سکول کے صحن میں اپنی بہن کی چھٹی ہونے کا انتظار کرتی تھی تاکہ وہ اس کے ساتھ گھر واپس آ سکے۔ سردیوں کے ٹھٹھرتے دنوں میں بھی وہ ایسا ہی کرتی تھی حالانکہ ہڈیوں میں اتر جانے والی یخ بستہ ہوا کے باعث وہ سسک رہی ہوتی تھی۔ جب میں نے یہ سنا تھا تو میں نے سوچا کہ دونوں لڑکیوں کو اپنی زندگی کے طویل سفر میں غم اور خوشیاں اکٹھے رہ کر ہی بانٹنی ہیں اور میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ''خون کا رشتہ جو ہے''۔ تبھی اس عام سی ضرب المثل کا مطلب حقیقی طور پر میری سمجھ میں آیا۔ میں کس طرح اتنا بے وقوف ہوں کہ خون کے تعلق کا مطلب ہی نہ محسوس کر سکا؟

''ڈیڈی؟'' اس آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں عالم خیالات سے یکدم واپس آ گیا۔ مجھ سے پہلے میری بچیوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ بڑی نے اپنے بال پیچھے کی طرف برش کئے ہوئے تھے اور پونی

ٹیل بنائی ہوئی تھی، اس سے وہ بڑی نظر آ رہی تھی جبکہ چھوٹی کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں نے سکول کا یونیفارم اور جرابوں کے اوپر نرم تلے کے جوتے پہن رکھے تھے۔

''ارے آپ کیسی ہیں؟'' میں نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے اپنے اندر موجزن جذبات کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔ اس کے جواب میں بچیوں نے صرف سر ہلائے۔ دونوں بدلی بدلی لگ رہی تھیں لیکن دونوں کے ہونٹ ہمیشہ کی طرح چیری کی مانند سرخ تھے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سیکسی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے یہ تشبیہ اس لئے استعمال کی ہے کہ ایک موسم بہار میں ان لڑکیوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں صحن میں چیری کا ایک پیڑ لگا دوں لیکن میں نے ان کا یہ مطالبہ نظر انداز کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحن میں جگہ چیری کے درخت کے لحاظ سے بہت تھوڑی تھی، دوسرے چیری کے درخت کے موٹے پتے مجھے بالکل پسند نہ تھے۔ اس واقعہ کے بعد ہی میں نے یہ سوچا تھا کہ میری بیٹیوں کے ہونٹ چیری کی طرح سرخ ہیں۔ لیکن بچے اپنی خواہش آسانی سے فراموش نہیں کرتے چنانچہ بہار کا موسم گزر جانے کے بعد بھی ایک روز میری چھوٹی بیٹی نے مجھ سے پوچھا تھا ''ابا جان! آپ اگلے موسم بہار میں چیری کا درخت لگا دیں گے؟'' بلاشبہ وہ اپنے دلوں میں چیری کا ایک درخت اگا رہی تھیں، امید کے درخت کے طور پر۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ یہ سوچا کہ ان کے ہونٹ چیری کی طرح ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی وہی کچھ کاٹتا ہے، جو کچھ اس نے بویا ہوتا ہے۔ میں ان کے چیری کے مانند ہونٹوں کا دردمندانہ جذبات اور خواہشات کے اظہار کے طور پر احترام کرتا ہوں اور میں اس سوچ میں ایک پوشیدہ خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میں، صرف میں ان کی قابل قدر امیدوں کے اس ثبوت کو پہچان سکتا ہوں۔

میں نے لڑکیوں سے پوچھا کہ آپ کچھ کھانا پسند کریں گی۔ انہوں نے پوچھا ''کیا''؟

''چائنیز نوڈلز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور پھر دونوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میں نے چائنیز ریسٹورنٹ کا رخ کر لیا۔ اپنی بیٹیوں کے ساتھ چلنا مجھے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ جانی پہچانی سڑک، میں اور بچے، حتیٰ کہ مجھے پوری دنیا بذات خود خواب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے ہم سب کسی سراب میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا میں ہی غالباً وہ پہلا صاحب علم نہیں تھا جس نے کسی دوسرے سیارے پر چہل قدمی کی؟ میں نے یہ بات سن رکھی

ہے کہ قطبی ستارہ زمین سے **1090** نوری سال کے فاصلے پر ہے چنانچہ اس وقت ہم اس ستارے کی جو روشنی دیکھ رہے ہیں وہ دراصل ہزاروں سال پہلے وہاں سے چلی تھی۔ اسی طرح یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آج ہماری جو حقیقت ہے وہ دراصل ایک ہزار سال پہلے کی حقیقت ہو۔ دوسرے لفظوں میں، میں یہ خواہش کر رہا ہوں کہ میرے اردگرد جو حقیقت ہے وہ اصل نہیں ہے کیونکہ میں خوفزدہ ہوں، میں خود کو اس میں داخل ہونے سے روک نہیں سکتا۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ ہم میں سے ہر ایک کا اصلی وطن یقینی طور پر کوئی ستارہ ہے۔ یہ ستارہ جسے ہم زمین کہتے ہیں فضول سے جزیرے سے زیادہ نہیں ہے۔ اچانک مجھے اپنی بیٹیوں پر دل وجان سے پیار آنے لگا۔ میرے گزر جانے کے بعد انہیں طویل عرصہ تک اسی سیارے پر رہنا ہے۔ یہ ایک خوفناک سزا ہوگی۔

کم سن لڑکیاں ان سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھیں جو چینی ریسٹوران کی طرف جاتی ہیں۔ میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اگر میں نے ان سے یہ پوچھا کہ انہوں نے میری کمی محسوس کی یا انہیں یہ بتاؤں کہ میں ان کی کمی محسوس کرتا رہا ہوں تو اس سے ایک دوسرے کیلئے ہمارے حقیقی اور بالکل اصلی جذبات کا اظہار نہیں ہوگا۔ لڑکیاں بھی خاموش رہیں۔ عمارت کا وہ حصہ تاریک تھا جہاں زینہ بنایا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ اس زندگی میں ہمارے جو تعلق واسطے ہوتے ہیں وہ کسی سابق زندگی کے تعلق واسطوں کا ہی سلسلہ اور توسیع ہوتے ہیں۔ تاریک سیڑھیوں پر اوپر چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ گذشتہ زندگی میں بھی میرا اپنی بچیوں کے ساتھ رشتہ ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک منظر لہرا گیا کہ اپنی گذشتہ کسی زندگی میں، میں اپنی بچیوں کے ساتھ کسی آلودہ اور تاریک رستے جا رہا ہوں اور اس سابق زندگی میں بھی ہم ایک ایسی جگہ جاتے ہیں جہاں تیل اور چینی نوڈل ساس کی بساندبسی ہوئی تھی، بالکل اسی طرح جیسے ہم اس وقت کر رہے تھے۔

''آؤ، وہاں کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہیں''۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ چونکہ ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا، اس لئے وہاں بہت کم لوگ تھے۔ بچیاں کھڑکی کے پاس لگائی گئی میز پر میرے سامنے بیٹھ گئیں اور انہوں نے اپنی پیٹھ پر لدے بستے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ میں جانتا ہوں کہ لڑکیاں چینی نوڈلز پسند کرتی ہیں، سبھی بچے چینی نوڈلز پسند کرتے ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بچے چینی ریستورانوں میں اکیلے بیٹھے نوڈلز کھا رہے ہوتے ہیں۔ ''میں چائنیز نوڈلز اور تلی ہوئی پڈنگ کا

آڈر دے دوں''؟ میں نے پوچھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بچیوں نے شرمندگی سے منہ کھولے اور پھر بند کر لئے اور دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

''اس بارے میں فیصلہ آپ کریں'' انہوں نے صرف اتنا کہا۔

''میں کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں کہ تم لوگ کیا کھانا چاہتے ہو؟''

''آپ کر سکتے ہیں''

''نوڈلز کے ساتھ آپ کو میٹ ساس بھی چاہیے؟''

''نہیں'' انہوں نے جواب دیا۔

میں نے عام چٹنی کے ساتھ چائنیز نوڈلز لانے کا آرڈر دیا اور کچھ پڈنگ لانے کا بھی کہا۔ ویٹر ہم میں سے ہر ایک کیلئے ایک کپ پانی لایا۔ میں نے لکڑی کی ڈنڈیاں (چاپ سٹک) علیحدہ کیں اور لڑکیوں کو ان کا ایک ایک جوڑا دیا۔ باہر سورج چمک رہا تھا اور کھڑکیوں سے چھن کر آنے والی اس کی روشنی میں وہ اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ پختہ نظر آ رہی تھیں۔ لڑکیوں نے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا، وہ خود سے سوال کر رہی ہوں گی کہ وہ اتنے انوکھے انداز میں اپنے والد سے کیوں ملیں۔

''سکول میں پڑھائی کیسی چل رہی ہے'' یہ آخری سوال تھا جو میں اپنی بیٹیوں سے کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ سکول میں ممتاز اور فائق ہوں، میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے راستے خود تلاش کریں اور ان راستوں پر کسی تصنع اور بناوٹ کے بغیر پوری سچائی کے ساتھ آگے بڑھیں۔

''آپ کو معلوم ہے یہ ایک نامور طالبہ ہے'' چھوٹی نے اپنی بڑی بہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تفاخر کے ساتھ کہا۔ وہ اپنی بہن کی کامیابیوں پر فخر کرتی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر شرمندہ بھی لگتی تھی کہ وہ کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں کر سکی۔

ایک لمحے کے لئے مجھے پنسل تراش کی یاد آ گئی اور میں نے کافی شرمندگی محسوس کی لیکن میری دونوں بیٹیاں پرسکون تھیں اور ایسا محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کسی حوالے سے قصوروار قرار دے رہی ہوں۔ وہ اپنا تقاضا بھول چکی ہوں تب بھی حقیقت تو یہی ہے کہ اس بارے میں میں اپنے وعدے سے انحراف کا مرتکب ہوا تھا۔ یہ مایوسی ان کی زندگی میں کہیں نہ کہیں یقینی طور پر موجود تھی، جیسا کہ ہم اصول

MashalBooks.com

بقائے توانائی کے حوالے سے جانتے ہیں۔

''تو آپ نے اعزازی طالبہ بننے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے چھوٹی سے پوچھا اوراس کی بہن کی طرف دیکھ کرمسکرایا۔ بڑی نے اپنے سر کو تھوڑا نیچے گرایا جبکہ چھوٹی نے نیم آواز میں کہا کہ نہیں، وہ کبھی اعزازی طالبہ نہیں بنی۔ تب بڑی نے بتایا، اس کی وجہ یہ ہے وہ میوزک کے امتحانات میں وقت ضائع کررہی ہے۔ وہ دراصل اپنی بہن کا دفاع کررہی تھی۔ چھوٹی نے کندھے اُچکائے اوراپنی زبان باہر نکال لی۔ میں نے اپنی انگلی سے اس کی زبان چھوئی تو اس نے ایک دم اپنی زبان واپس منہ میں کھینچ لی۔

''ایسا کیوں ہوا؟ تم میوزک کی تعلیم حاصل کرتی رہی ہو، ایسا ہی ہے ناں؟''

''آپ جانتے ہیں، اس بار میں چیزوں کو سمجھ نہیں سکی'' اس کے اس جواب پر مجھے یاد آیا کہ بڑی کی نسبت اسے موسیقی کی تعلیم کے حوالے سے مسئلہ درپیش تھا۔ وہ اسی معاملے میں تھوڑی دیر تگ ودو کرتی رہی اور پھر ترک کردی۔ کچھ عرصہ بعد پھر سے شروع کردی۔ آغاز سے اسی بارے میں کوشاں رہی اور پھر آخرکار ایک بار پھر موسیقی کی تعلیم ترک کردی۔ بڑی والی اس میں ماہر تھی اور وجہ یہ تھی کہ اس نے یہ اس وقت شروع کیا تھا جب ہم سب اکٹھے رہ رہے تھے۔ میں نے چھوٹی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، ''تم اپنی بڑی بہن سے کیوں نہیں کہتی کہ وہ تمہیں پڑھائے، وہ اگر تمہاری مدد کرے گی تو اگلے امتحان میں تم بھی اچھے نمبر حاصل کرسکوگی، ٹھیک''؟

''بالکل ٹھیک'' چھوٹی والی نے واضح الفاظ میں اعلان کیا اور پھر مسکراہٹ بھری آنکھوں کے ساتھ اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھا۔

''تم میری مدد کروگی؟''

''ہاں کیوں نہیں، میں نے کبھی تمہاری مدد کرنے سے انکار کیا ہے؟''

چھوٹی والی نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے شرمندہ ہوکر اسے جھڑک دیا گیا ہو۔

''تم اس کی کچھ زیادہ مدد کروگی'' میں نے صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

چھوٹی نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا ''صرف ایک بار'' بڑی والی نے پلکیں جھکا کر رضامندی کا اظہار کیا اور یقین دھانی کے طور پر کئی بار سر ہلایا۔ اس پر چھوٹی والی نے اس کا شکریہ ادا کیا، اپنے ہاتھ پھیلائے اوراپنی بڑی بہن کے گال سہلائے، بڑی والی ہاتھ سے بچنے کیلئے پیچھے ہٹی لیکن

MashalBooks.com

اس نے ناخوشگواری کا اظہار نہیں کیا۔ میں اس تبدیلی پر خوش تھا۔ دونوں لڑکیاں والدین کی علیحدگی کی وجہ سے یقیناً تکلیف محسوس کرتی ہوں گی، یہ سوچ کر میرا دل بھاری ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ غم زدہ یا ناخوش دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

''آپ ان دونوں کیا کر رہے ہیں ڈیڈی'' بڑی بیٹی نے مجھ سے پوچھا، میں متذبذب ہو گیا۔

''میں کس بارے میں کیا کر رہا ہوں سوال پوچھنے کا مطلب کیا ہے''۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے کام کے علاوہ یہ بھی پوچھ رہی ہے کہ میں ان کی پریشانی کے حوالے سے کیا کر رہا ہوں۔

''میں بہت محنت کر رہا ہوں، میں اپنے دفتر میں کام کرتا ہوں اور لکھتا بھی ہوں'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا لیکن اس طرح کا جواب دینے پر میں خود کو نہایت کمتر اور حقیر سمجھ رہا تھا۔ لڑکیوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس امر کی وضاحت کا کوئی طریقہ نہ تھا کہ لکھنے سے میرا کیا مطلب ہے۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ اگر میں لکھتا نہ ہوتا تو زیادہ خوش رہتا۔ میں اس لئے بھی اذیت محسوس کرتا رہتا تھا کہ اب تک میں نے ایسی کوئی تحریر نہیں لکھی جو واقعی پڑھنے کے لائق ہو۔ پھر بھی میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا جیسے میں لکھنے کی یہ عادت دنیا میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ آپ یقین کریں ایک بار انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا ''ڈیڈی آپ لکھتے کیوں ہیں''؟ میں اس وقت سینے کے نیچے ایک تکیہ رکھے پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا، میں نے ان کی طرف دیکھنے کیلئے اپنا چہرہ گھمایا۔ میں نے سوچا جب یہ بڑی ہو جائیں گی تو ان سے اس سلسلے میں بات کی جا سکے گی چنانچہ میں صرف اتنا کہہ سکا ''پیسہ کمانے کیلئے'' حالانکہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کچھ لکھ کر پیسہ کمانے کا کم از کم میرے لئے کوئی چانس نہیں ہے لیکن میں یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے اور میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے''

ہماری بات چیت کا سلسلہ اس وقت رک گیا جب بیرا ہمارے لئے تین پیالے چائینز نوڈلز کے اور ایک پلیٹ تلے ہوئے پڈنگ لے کر آ گیا۔ ہم سب نے نوڈلز میں چٹنی ملانا شروع کر دی۔

''اب کھانا شروع کرتے ہیں'' میں نے کہا اور پھر ہم سب نے نوڈلز کھانا شروع کر دیئے۔

جب ہم کھا رہے تھے تو میرے اوپر ایک پیچیدہ جذبہ غالب آ رہا تھا۔ یہ بات ناقابل یقین نہیں ہے کہ اس سادہ سے کھانے کے بعد ہم میں سے ہر کوئی اپنی اپنی زندگیوں میں لوٹ جائے گا۔

''میں ٹھیک طریقے سے نہیں کھا سکتی کیونکہ میرے دانت ہل رہے ہیں'' بڑی لڑکی نے کہا اور

پھر اپنا منہ کھول دیا تا کہ میں دانتوں کا جائزہ لے سکوں۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ایک دانت غائب ہے۔

''ارے تمہارے دودھ کے دانت اکھڑ رہے ہیں؟ تمہیں پچھلے دانتوں کے ساتھ احتیاط سے کھانا چاہیے'' چھوٹی نے کہا۔ میں نے لڑکیوں کو بتایا کہ اگر وہ ہموار دانت چاہتی ہیں تو انہیں جلدی سے اپنے پہلے والے دانت نکال دینے چاہئیں۔ اس پر چھوٹی نے نشاندہی کی کہ ابو آپ کے دانت تو غیر ہموار ہیں۔ دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ہم پھر کھانے میں مصروف ہو گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میری چھوٹی بیٹی بے چین ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے، کیا درد ہو رہا ہے اور پھر مجھے اس کی مچھر مکھیوں کے کاٹنے کی پریشانی یاد آ گئی۔

''ہاں خارش ہو رہی ہے، چھوٹی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

میں میز کے دوسری طرف گیا اور ان دانوں کا جائزہ لیا اس کی انگلیاں جنہیں کھجلا رہی تھیں۔ جرابوں اور زیر جامہ کے درمیان اسے بہت سے بڑے سرخ رنگ کے دانے نکلے ہوئے تھے۔

''مچھر بھگانے والی دوائی اور مچھر دانی استعمال کیا کرو'' میں نے واپس اپنی سیٹ پر آتے ہوئے تجویز دی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ تمام حربے بے سود ہیں۔ ہم نے ہمیشہ مچھر دانیاں اور مچھروں کو بھگانے والی ادویات استعمال کیں لیکن اس بچی کے جسم پر ہمیشہ مچھروں کے کاٹے کے نشان ہوتے تھے۔ کئی موسم گرما تو ایسے گزرے کہ اس کا سارا جسم مچھروں کے کاٹنے سے سرخ ہو جاتا اور سوج جاتا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گرمیوں کے جلد گزرنے کی دعا کی جائے۔ اب اس کی رانوں پر ایک تکلیف دہ موسم گرما کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس سوچ نے مجھے غضب ناک کر دیا کہ اس کا چھوٹا سا جسم مچھروں کے ہاتھوں کٹنے، سوجنے اور پھر کھرنڈوں سے بھرنے جا رہا ہے اور وہ اس سارے معاملے میں بے بس ہے۔ میں یقیناً اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ میرا غصہ مچھروں سے زیادہ اپنے آپ پر تھا۔ یہ غصہ میرے سینے کے اندر ایک جھاگ دار، آلودہ جوہڑ کی طرح ابل رہا تھا، ایک ایسا جوہڑ جس میں گلی سڑی مچھلیاں، مینڈک اور کیچوے چکر لگاتے ہیں اور ابلی مچھلیاں لہراتی ہوئی رقص کرتی ہیں۔

جب ہم نے رومالوں سے اپنے منہ صاف کئے تو رخصت ہونے اور جدا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے چاہا کہ انہیں پر امید رہنے اور زندگی کے بارے میں مثبت رویہ اپنانے کی نصیحت کروں لیکن میرے منہ سے ایک بھی لفظ نہ نکل سکا۔ بھاری دل کے ساتھ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دوپہر کا کھانا ختم کرنے کا

کتنا عجیب طریقہ تھا۔ میں تذبذب کا شکار تھا اور میرے لئے اپنا سر اوپر اٹھائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس ملاقات سے میں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا تھا، بچوں کو یہ ضرور پتہ چل گیا کہ میں کتنا کمزور اور ناگوار آدمی ہوں۔ بچیوں کے پاس اب کوئی موقع نہ تھا کہ وہ مجھ سے چیری کا درخت لگانے کا مطالبہ کر سکتیں۔ وہ چلا کر یہ بھی کہہ سکتی تھیں کہ ڈیڈی مچھر کو مار دیں۔ ان سارے معاملات کے باوجود انہیں ایک سمجھ نہ آنے والی چیز دی گئی تھی، ''جدائی'' میں نے پوچھا اس جدائی کو اور زیادہ طوالت نہیں دینی چاہیے اور ان تضادات سے باہر آجانا چاہیے۔ میں جس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا اس سے مجھے جان چھڑا لینی چاہیے۔ جب ہم سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے تو مجھے محسوس ہوا جیسے میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔

جب ہم ریسٹوران کی عمارت سے باہر دن کی تیز روشنی میں آئے تو میرا ذہن جیسے خالی ہو گیا۔ جیسے سفید روشنی نے میرے ذہن کو صاف کر ڈالا ہو۔

''ہمیں اور کتنی دور جانا ہے''۔

''مجھے تو کام پر واپس جانا ہے'' میں نے خود کلامی کی۔ دونوں لڑکیاں دکانوں کی کھڑکیوں میں ایستادہ انسانی مجسموں کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔

''آپ دونوں کو بیمار نہیں ہونا چاہیے، ہمیشہ صحت مند رہنا ٹھیک ہے'' مجھے گلا گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور میرے منہ سے الفاظ ایسے نکل رہے تھے جیسے میں ہانپ رہا ہوں۔

''بالکل ٹھیک ہے'' دونوں بچیوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا۔ اس کے بعد میں جلدی سے شرمندگی کے احساس کے ساتھ چلتا چلا گیا۔ ایک لامحدود خلا نے مجھے نگل لیا اور بے زاری، اکتاہٹ اور بے دلی نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لڑکیاں وہاں موجود نہ تھیں۔ میرا دل زور سے دھڑکا، میں نے لرزتے ہوئے قدم اٹھائے۔ میں دنیا کے آخری کونے کی طرف بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کدھر جا رہا ہوں۔ میرے قدم مے خانے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ شراب نہ تو مجھے بچا سکتی ہے اور نہ ہی تباہ کر سکتی ہے۔ تو پھر شراب کیوں؟ یہی کہہ لیں کہ دماغ سے مچھروں کا خیال ختم کرنے کیلئے۔

اگر میں یہ اندازہ لگاؤں کہ کتنا درد سہہ چکا ہوں تو عیسیٰ کی قربانی کے نتیجے میں گناہوں کی معافی کی بشارت کے عقیدہ کے مطابق مجھے آدھی نجات تو مل ہی جائے گی۔ میں نے حساب کا سلسلہ

جاری رکھا۔ کائناتی ترتیب اور دیگر بہت سے تصورات اور نظریے میرے ذہن میں ایک ایک کر کے آتے اور جاتے رہے۔ یہ نظریے حقیقتاً کیا تھے؟

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکی تھی جس کا نام سہوا تھا۔ وہ ایک کم سن لڑکی تھی۔ اس سے بھی چھوٹی جتنی میری بیٹیاں ہیں لیکن وہ وفات پا گئی۔ جب دوسرے بچے ساحل سمندر پر کھیلنے چلے جاتے اس وقت بھی ہم دونوں اکٹھے اور اکیلے کھیلتے تھے۔ ہم ڈاکٹر اور مریض کا کھیل کھیلتے تھے۔ کھیل کے دوران ہم کپڑے تک اتار دیتے اور یوں دکھاوا کرتے جیسے ایک دوسرے کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو بالکل مکمل پایا۔ ساحل سمندر پر وہ اپنی ٹانگیں پھیلا کر اپنی جانگھ پر ریت چھڑک لیتی تھی۔ ہم جوانی کی حدوں کو پہنچ رہے تھے اور جوانی کی ہی ایک حرکت پر کھلکھلا کر ہنس دیئے تھے۔ لیکن اس کے فوراً بعد وہ مر گئی، پرندوں پر سواری کا کوئی موقع حاصل کئے بغیر۔ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر ملک عدم کو سدھار گئی تھی۔ وہ ہمیشہ کیلئے مجھے چھوڑ گئی تھی یہ سب کچھ جنگ کے خاتمے کے بعد ہوا تھا۔

مجھے نہیں یاد، اس روز میں نے کتنی شراب پی تھی۔ مجھے صرف یہ یاد ہے کہ اس روز مے خانے کی مالکن نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے سہوا نام کی کوئی لڑکی یاد ہے؟ وہ داغ دار تھی۔

''وہ.................'' میں محض اتنا کہہ سکا۔

''ہاں وہی، وہ زچگی کے دوران وفات پا گئی'' مے خانے کی مالکن نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکالتے ہوئے اظہار افسوس کیا۔

''یہ درست ہے، وہ مر چکی ہے، کیونکہ ہم زندہ ہیں'' میں نے خود کلامی کے انداز میں اسے جواب دیا اور شراب کا ایک بڑا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ سر شام میں نشے میں دھت ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میں کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس دنیا سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ میں ایک غیر معروف سڑک پر نکل آیا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے زمین بلکہ پوری دنیا گھوم رہی ہو۔ سب چہرے ایک جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ میں بلند آواز سے چلایا ''ایک لڑکی تھی جس کا نام سہوا تھا۔ ایک وقت میں وہ زندہ تھی، یہاں موجود تھی، وہ اس عمر میں مر گئی جب بچے گھر گھر والا کھیل کھیلتے ہیں''۔ میں نے اس کا چہرہ ذہن میں لانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کا چہرہ نسیان کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گیا تھا، جیسے وہ وقت فراموش ہو چکا تھا۔ جب اور جہاں وہ زندہ تھی۔ چلتے چلتے میں نے سوچا کہ وقت ایک ایسا مقبرہ

ہے۔ میری بیٹیاں، میری بیوی سبھی وقت کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو چکے تھے۔ ایک پرانا بچپن کا دوست وقت کی اس قبر سے باہر آیا۔ کیا میں جدائی کے معنی جان کر سحر زدہ تھا؟ کیا زندگی گھر گھر کا کھیل کھیلنے کے سوا کچھ نہیں؟ میں نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا ''ایک دفعہ کا ذکر ہے......ہم زندہ تھے، زندگی کی تمام تر رعنائیوں سے بھر پور، وہ وقت اب ہے، موجودہ زمانہ، ہم کتنی خوشی اور مسرت کے ساتھ ایک مقبرے میں رہتے تھے''۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں جیسے میں کوئی بھوت پریت تھا لیکن میرے آنسو نہیں نکل رہے تھے۔ میں ایک قبرستان میں پہنچا، وقت کا مشترکہ قبرستان، ایک عورت میرا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔

''کس کی تلاش ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''میں تنگ آ گیا ہوں..........تنگ۔ اس لیے ایک لڑکی کو ڈھونڈ رہا ہوں جس کا نام سہوا ہے''۔

مختصر وقت کی خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس عورت نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں نے نمایاں طور پر پریشانی کی حالت میں کوئی راستہ کوئی طریقہ تلاش کیا تاکہ اسے یہ بتا سکوں کہ میں سنجیدہ ہوں۔ میں وقت کی اس قبر میں اتر جانا چاہتا تھا، اپنے بچپن کے اس عدم آباد سدھار چکی دو دوست کے ننھے منے جسم کو تکیہ بنا کر سو جانا چاہتا تھا۔ میں نے کمپنی سے ایڈوانس میں حاصل کی گئی تنخواہ نکالی اور اس عورت کے سامنے لہرائی یہ کہنے کیلئے کہ میری سنجیدگی کا یقین دلانے کیلئے یہ کافی ہے۔

''آؤ، آ جاؤ'' وہ مسکرائی، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی ڈھانچہ مسکراتا ہے۔ مجھے ایک قبر پر لے جایا گیا، میں سکون اور شوق کے ساتھ آگے بڑھا۔ میں ایسی جگہ پہنچا جہاں سے فرار ممکن نہ تھا۔ میں ایک قبر کی طرف جانے والے راستے پر ٹٹول ٹٹول کر چل رہا تھا۔ کہیں سے ایک مدہم سی روشنی پھوٹ پڑی۔ مجھے دفنانے سے پہلے تیاری کرتے ہوئے مردے کو تیار کرنے والے افراد نے میرے منہ میں کچے چاول ڈالے تھے۔ وہ چاول چباتے ہوئے میں نے اس روشنی کی طرف بڑھنے والے لامتناہی راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ اچانک اندھیرے میں سے کوئی میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور پوچھا کہ میں کون ہوں، میں کون ہوں، میں نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں کون ہوں۔ میں نے شرماتے ہوئے مصنوعی ہنستی ہنسی لیکن اس کے چہرے کی کرختگی کم نہ ہوئی۔ اس نے کہا ''تم اس وقت تک نہیں مر سکتے جب تک تم یہ نہیں جان لیتے کہ تم کون ہو؟

میرا سینہ غم کے جذبات سے بھر گیا اور میں نے سرد آہ بھری کہ مرنے کی اجازت بھی نہیں دی جا رہی۔ ایک غیر مجسم اور غیر واضح خوف نے مجھے نگل لیا۔ مجھے ہر حال میں مرنا ہے چاہے مجھے یہ کام سہوا کے اوپر چڑھ کر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اگلی صبح ایک مچھر دیکھا۔ میں جب جاگا تو بالکل برہنہ تھا۔ میں نے بغیر کوئی کپڑا پہنے کمرے کے چکر لگائے، خالی کمرہ......ایک مقبرے جیسا ہی لگ رہا تھا۔ میں نے نیند میں چلنے والے آدمی کی طرح کمرے کا چکر لگایا۔ کل کیا ہوا تھا؟ اور میری زندگی میں کون سی تبدیلی آئی تھی؟ ہر چیز دھندلی تھی۔ وہ عجیب سیارہ جس پر میں رہتا تھا چمکدار روشنی کے ساتھ مر رہا تھا اور اس میں سے روشنی کی باریک سی کرنیں نکل رہی تھیں، جو اَب سے ہزاروں سال کے بعد دوسرے سیاروں پر رہنے والوں تک پہنچیں گی۔ ایک مچھر دیوار پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے قریب گیا اور اس کا بغور جائزہ لیا۔ مچھر کا پیٹ بالکل سرخ تھا، ہتھوڑے کی زد میں آئی ہوئی انگلی کی طرح سرخ۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے مچھر کو رگڑا تو وہ دیوار پر چپک گیا۔ یہ عجیب بات نہ تھی کہ ایک رات پہلے جس مچھر نے بڑی بے رحمی کے ساتھ میرا خون پیا تھا وہ اپنے شکار کی ایک ضرب سے مر سکتا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا۔ میں وہیں کھڑا تھا اور مچھر کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے احساس نہ تھا کہ میں برہنہ حالت میں ہوں۔

☆ ☆ ☆

میرے آبائی گاؤں میں غروب آفتاب

ژی من کو

ژی من کو 1941ء میں پیدا ہوئے۔ وہ امتیازی رنگوں اور روشنیوں کے ادیب ہیں۔ وہ ایک قدیم اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم جب وہ ہوش میں آئے تو ان کا خاندان انحطاط پذیر ہو چکا تھا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ ژی من کو کو کالج سے دور میں اپنی پڑھائی اور دیگر ضروریات کے لئے کام کرنا پڑا۔ جلد ہی انہیں ایک تعمیراتی کمپنی میں کام کرنے کیلئے کالج کی پڑھائی چھوڑنا پڑی۔ گردش زمانہ اتنی بڑھی کہ انہیں اپنی غیر محفوظ زندگی کو کسی قدر بہتر بنانے کیلئے اس کام کے علاوہ بھی قسمت آزمائی کرنی پڑی۔ ان کا پہلا ناول A Long and Better Dream اپارٹمنٹ بلڈنگ بنانے کے لئے قبرستان کی صفائی کے لئے ایک دن کے مزدور کے طور پر حاصل ہونے والے تجربات پر مبنی تھا۔ بطور ادیب اپنے کام کے آغاز کے بعد کو نے وطن واپس آنے کا فیصلہ کیا اور وہاں دس سال قیام کیا۔ ان کی وطن واپسی عارضی اور جزوی تھی کیونکہ فوجی ڈکٹیٹر شپ کے تحت معاملات کو جس طرح آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ وہ اس سے بے زار تھے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعوں میں سے زیادہ پذیرائی حاصل کرنے والی "My Neighbour Mr......" سیریز میں زراعت کے جدید طریقوں میں پھنسے ہوئے کوریا کے دیہاتی فارموں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ ان کی کہانیوں میں طنز کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ژی من کو نے اپنی آبائی زبان کو اپنی کہانیوں اور افسانوں میں نئے انداز

MashalBooks.com

میں استعمال کیا ہے۔اس کے برعکس کوانچ آن ان کی بچپن کی یادداشتوں اور ان کے پڑوسیوں کی زندگی کے حالات پر مبنی ہیں، جو اس وقت پیدا ہونے والی تبدیلی کی لہر کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔اپنے افسانے ''میرے آبائی گاؤں میں غروب آفتاب'' میں انہوں نے خود کو بجا طور پر اپنے دادا سے نسبت کا ثبوت دیتے ہوئے الفاظ سے تصویر کشی کی ہے کہ وہ روایتی ثقافتی اور دانشورانہ ورثے میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ان کا تاریخی شخصیات کی دو طویل افسانوی زندگی تحریر کرنا ان کی کورین آباؤ اجداد کے رجحانات اور ان نژادی خصوصیات میں دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے جو وہ مرکز گریز انوکھے ذہین ترین افراد کیلئے محسوس کرتے ہیں۔غیر معمولی ذہنی صلاحیت والے یہ لوگ اپنے معاشرے کی روایات سے موافقت پیدا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ پیدا نہ کر سکے۔کورین لٹریچر میں عالمانہ ترین کلاسیکی تحریروں کے ساتھ ساتھ ادنیٰ درجے کے فحش موضوعات پر لکھی گئی کتابیں بھی مل جائیں گی، ژی من کو نے ان سب سے الگ اپنے لئے ایک لاجواب گوشہ منتخب کیا ہے۔

''میرے آبائی گاؤں میں غروب آفتاب'' 1972ء میں لکھا گیا جو ژی کی نہایت سادہ اور آسان طریقے سے لکھی گئی آپ بیتی ہے۔یہ افسانہ نگار کے بوڑھے دادا کی یادداشتوں پر مبنی افسانہ ہے جو جدیدیت کے نام پر تیزی سے وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود اپنے آباؤ اجداد کی طرز زندگی کو قائم رکھے ہوئے تھے۔یہ افسانہ پڑھنے والے کے دل میں ماضی کی خوفناک یادوں کو تازہ کر دیتا ہے، ماضی کا ایسا طرز زندگی جو مصنف کے بچپن میں ہی نا معقول بنا دیا گیا تھا لیکن جس میں ایک خاص کشش اور دلچسپی موجود ہے۔

مجھے اپنے آبائی گاؤں گئے دس برس سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا اور اب میں وہاں جا رہا تھا۔ چونکہ اب وہاں میرا کوئی رشتے دار نہیں رہتا تھا اس لئے میں اکیلا ہی جا رہا تھا اور میرے اس دورے کا مقصد اپنے آباؤاجداد کی قبروں کی زیارت کرنا تھا۔ اپنی زندگی میں وہ پہلا موقع تھا کہ میں نئے شمسی سال کے موقع پر ان سے ملنے گیا۔ نئے شمسی سال کے آغاز پر اپنے دادا کی قبر پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میں کسی قدر بے چینی محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ نئے شمسی سال کی تقریبات، جو جاپانیوں نے متعارف کرائی تھیں، منانے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن اپنی نوکری سے جڑی مجبوریوں کی وجہ سے میرے پاس اس کے علاوہ کوئی موقع نہ تھا، قمری سال کے آغاز پر چھٹیاں نہیں ملتی تھیں۔ جب میں گاؤں جانے کیلئے ٹرین پر سوار ہو رہا تھا تو مجھے پوری طرح معلوم تھا کہ میں سخت نامناسب حرکت کرنے جا رہا ہوں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں میرے دادا اپنے خاندان کے واحد وارث تھے اور انہوں نے ان تکلیف سے بھرے برسوں میں بھی اپنے خاندان کی اقدار کو زندہ رکھا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے ماں، باپ بہن بھائیوں کی بجائے میرے دادا خاندانی پیڑھی کو ظاہر کرتے ہیں۔ میرے دادا ژی (Yi) سلسلے کے آدمی اور میرے آباؤاجداد کی طرز فکر کی زندہ مثال ہیں۔ صرف اور صرف وہی ہمیشہ میرے لئے اس حیثیت میں برقرار رہیں گے۔ یقین کیجئے پیار اور لگاؤ کے لحاظ سے یقیناً میری ماں ہے میں جس کی کمی محسوس کرتا ہوں لیکن یہ میرے دادا ہیں جن کی تعلیمات کا میں باقی سب سے زیادہ احترام کرتا ہوں چنانچہ میرا خیال ہے مجھے سب سے پہلے ان کی قبر پر حاضری دینی چاہیے۔

ریل گاڑی کے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میں نے اپنے سفر کیلئے تین جنوری کا دن چنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت تک لوگ اپنے والدین سے مل چکے ہوں گے اور ان کی واپسی ہو چکی ہوگی لہٰذا ٹرین میں ہجوم زیادہ نہیں ہوگا۔ لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ بہرحال میں اپنے آبائی گاؤں میں ٹرین میں سے کسی نہ کسی طرح پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا گاؤں قصبے ہنائی کے شروع میں ہے اور اس کا نام کوانچ آن ہے۔ ٹرین جونہی گاؤں سے آگے ایک خم دار راستے پر مڑی، بارش شروع ہو گئی۔ جو اشارہ تھا کہ سردیوں کا موسم کتنا گرم تھا۔ بارش میں ان پہاڑیوں کو دیکھ کر، جو میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا اور میں جذبات میں ڈوب گیا۔

ریل گاڑی کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر میں ان پہاڑوں اور اپنے گاؤں کے گھروں کو دیکھتا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل کا ایک حصہ شاداں تھا لیکن میرا ایک حصہ اداس، تنہا اور غمگین تھا۔ کوئی بھی چیز ویسی نظر نہیں آتی تھی جیسی میرے بچپن میں ہوتی تھی۔ کسی چیز کیلئے ایک جیسا رہنا اتنا مشکل ہوتا ہے؟ وہ تبدیلی جس نے میرے دل کو اپنی گرفت میں لے کر زور سے بھینچا تھا، چیڑھ اور صنوبر کے درختوں کا وہاں نہ ہونا تھا۔ پتھروں کی سلیبوں سے بنی چھت والے متفرق اشیاء کے سٹور کی چمنی اب اس جگہ ایستادہ تھی جہاں صنوبر کا درخت آسمان کی طرف اپنی بے محل شاخیں پھیلائے کھڑا نظر آتا تھا۔ تیرہ برس پہلے، میرے گاؤں سے جانے سے کچھ پہلے، چیڑھ کے درخت کے سوئیوں کی طرح کے پتے پیلے پڑ رہے تھے اور اس کی شاخیں مردہ ہو رہی تھیں۔ لیکن یہ دیکھ کر میرا دل اور دماغ کھول رہے تھے کہ گاؤں میں چار سو سال سے کسی محافظ کی طرح کھڑا متبرک درخت بھی کاٹ دیا گیا تھا۔

مجھے وہ دن اب بھی اچھی طرح یاد ہے جب میری عمر کے ساتویں برس میں ایک ہزار حروف پر مہارت حاصل کرنے پر دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دعوت کے بعد میں نے اپنے دادا جان کو اپنے ساتھ لیا تھا اور ہم ساحل پر بنے حفاظتی پشتوں کے پاس چلے گئے تھے۔ ہم وہاں لہریں دیکھتے رہے جو اس تیزی سے آ کر پشتوں کے ساتھ ٹکراتی تھیں جیسے پورے گاؤں کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کا تہیہ کئے ہوئے ہوں۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں لہروں پر پڑ کر انہیں منور کر رہی تھیں اور سمندری بگلے اور دوسرے سمندری پرندے اپنی چہچہاہٹوں سے فضا میں نغمے بکھیر رہے تھے۔ حفاظتی پشتوں کے ساتھ ساتھ ریل گاڑی کے لئے بچھائی گئی پٹڑی دور تک جاتی تھی اور حال ہی میں بنی بڑی سڑک تھوڑا سا خم لے کر کہیں غائب ہو جاتی تھی۔ چیڑھ کا درخت ریل کی پٹڑی اور بڑی سڑک کے قریب تھا۔ اس کے آس پاس کوئی اور درخت نہ تھا۔

اس روز دادا نے چیڑھ کے درخت کے تنے کو چوم کر کہا تھا ''میرے بچے چیڑھ کا یہ درخت میرے دادا کے ہاتھ کی چھڑی تھی، جنہوں نے ایک روز سیر کرتے ہوئے اس کو یہاں گاڑ دیا تھا۔ میرے دادا مہان تھے۔ انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ جب لوہے کا بنا ہوا گھوڑا اس درخت کے پاس سے دوڑتا ہوا گزرا کرے گا تو ہمیں، یعنی ہانسان قبیلے کے ژی ژکو یہ قصبہ چھوڑنا پڑے گا، ممکن ہے مجھے ہی یہ قصبہ چھوڑنا پڑے جب فولاد کا بنا ہوا گھوڑا یہاں دوڑنا شروع کرے گا۔ یہ عمل بہت سی بدقسمتیوں کا رخ موڑے گا......

''میں نے اندازہ لگایا کہ چار جوان آدمی اپنی بانہیں پھیلا کر ایک دوسرے سے ملالیں اور ایک دائرہ کی شکل میں کھڑے ہوں تو اس درخت کے تنے کا بمشکل احاطہ کیا جا سکے گا۔

مجھے اپنے دادا جان کے اس روز کے الفاظ اب بھی بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ چیڑھ کے درخت کے بارے میں میں نے جو قصے سنے یہ ان میں سے ایک تھا۔ بات یہ ہے کہ مجھے اس قصے پر یقین نہیں آیا تھا کہ میرے آباؤ اجداد میں سے ایک ٹی او جونگ، کے ہاتھ کی چھڑی اس طرح چیڑھ کے درخت میں تبدیل ہو گئی تھی اگر چہ میں نے اپنے دادا سے سن رکھا تھا کہ ہمارے بزرگ ٹی او جونگ اس کے علاوہ بھی بہت سے مافوق الفطرت کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ میں لوگوں کی جانب سے ان کو دیئے جانے والے احترام اور تعریفوں کو سمجھ سکتا تھا۔ یا ممکن ہے اس میں کچھ حقیقت ہو، چیڑھ کا یہ درخت گاؤں کے تمام درختوں سے بڑا تھا اور نزدیک تو کیا دور دور تک کوئی درخت حجم اور وقار کے لحاظ سے چیڑھ کے اس درخت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کھڑکی میں سے اپنے گاؤں کا کچھ عجیب سا منظر دیکھ کر میں نے تصور ہی تصور میں محسوس کیا کہ درخت وہاں سے مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے اور میں فولاد کے گھوڑے پر سوار ہوں، ہمارے آباؤ اجداد میں سے کسی نے جس کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا تھا کہ اس کے آنے سے خاندان کو یہ جگہ چھوڑنا پڑے گی۔ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ''یہ جگہ تو اب بہت زیادہ بگاڑ کا شکار ہو چکی ہے۔ چیڑھ کا درخت ریل گاڑی کے دھوئیں اور اس کی تیز آواز سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہو گا، اس ٹرین سے جو دن میں کئی بار یہاں سے گزرتی ہے اور گرمیوں کے موسم میں تو اس کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے کہ یہ علاقہ ایک تفریحی ساحل کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ میرے غمگین اور پریشان ہونے کی وجہ واحد چیڑھ کے درخت کا غائب ہونا نہیں تھا اپنے گھر کی تباہ حالت نے مجھے اس سے زیادہ دکھی کر دیا تھا حتیٰ کہ جب ٹرین کی کھڑکی میں سے میں نے لمحہ بھر کے لئے اپنا گھر دیکھا تو مجھے وہ خستہ حال نظر آیا حالانکہ یہ وہی گھر تھا جو کسی زمانے میں نہایت عالی شان ہوتا تھا، اتنا شاندار کہ وہاں سے گزرنے والے اجنبی اسے گاؤں کے سربراہ کا گھر سمجھ لیتے تھے۔

ہمارے گاؤں میں زیادہ تر گھر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اور ان کی تعمیر میں نفاست کا بھی کچھ خاص خیال نہیں رکھا گیا تھا چنانچہ میرے پرانے گھر کے اندرونی حصوں کی لکڑی سے بنی چھت کی پشت کو دیکھیں تو اس میں بھی قدیم نفاست کے آثار نظر آتے تھے۔ میرا پرانا گھر بھی کافی خستہ حال ہے۔

اسی لئے دیوان خانے کی چھت کے کنارے جو کسی زمانے میں بڑے نفیس اور شاندار نظر آتے تھے اب بے ڈول اور بے رعب نظر آتے تھے۔ عشق پیچاں کی وہ بیل جو کبھی بڑی نفاست کے ساتھ پوری دیوار پر پھیلی ہوتی تھی اب نہایت بے ہنگم انداز میں اگی ہوئی تھی، اور وہ درخت جو پورے احاطے کے گرد اگے ہوتے تھے اور ایک باڑ سی بناتے تھے اب اپنی شان و شوکت کھو چکے تھے اور ان میں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ مجھے تو پورا گاؤں متذبذب اور خستہ حال نظر آتا تھا۔

مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میں وہ شخص ہوں جس کا کوئی آبائی قصبہ نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ میں نے دس برس سے زیادہ عرصہ تک اس گاؤں کا رخ نہیں کیا تھا کیونکہ یہاں پر اب کوئی تعلق واسطہ باقی نہیں تھا، سوائے اپنے آباؤ اجداد کی چند قبروں کے، اس کے باوجود اپنے قصبے کو اس قدر بری حالت میں دیکھ کر میں خود کو نہایت تنہا اور ناآسودہ محسوس کر رہا تھا۔

میں اپنا پہلا فرض سمجھتا تھا کہ اپنے دادا کے مقبرے پر جاؤں اور ان کیلئے دعا کروں۔ ان کا مقبرہ ایک پہاڑی ڈھلان پر واقع تھا۔ یہ زمین ہمارے قبیلے کی ملکیت ہے لیکن یہ ایک اور گاؤں کومان کی حدود میں ہے۔ یہ قصبہ ساحل سمندر پر واقع ہے اور قصبے ہنائی سے کوئی دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ جگہ کافی دور تھی اور وہاں تک کوئی ٹرانسپورٹ بھی نہیں جاتی تھی، میرے پاس پیدل وہاں جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ دن کا جتنا حصہ باقی تھا اس میں وہاں جانا اور پھر لوٹ کے واپس آنا ناممکن تھا، لہٰذا میں نے رات گاؤں میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ میں کافی عرصہ سے گاؤں نہیں آیا تھا، پھر بھی پرانے تعلقات کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ مجھے رات کو وہاں ٹھہرنے کی جگہ مل ہی جائے گی۔ میں نے اپنی والدہ کے ایک عزیز کے گھر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اب میں اپنا باقی وقت ادھر ادھر گھوم کر گزار سکتا تھا۔ پھر میں گھومتے گھماتے اپنے پرانے گھر میں چلا گیا اور وہاں جانا محض وقت گزارنے کے مقصد کے تحت نہیں تھا۔ میں اپنے بچپن کی یادوں میں چھپی دنیا دیکھنا چاہتا تھا اور یہ اندازہ لگانے کا خواہش مند تھا کہ اس وقت اس کی کیا حالت تھی اور اب کیا صورتحال ہے۔ دراصل میں خود کو اس بات پر آمادہ کر رہا تھا کہ میرا ابھی ایک آبائی گاؤں ہوتا تھا اگرچہ میں اس سے کافی دور رہا اور اسی دوران اس میں بہت سی تبدیلیاں در آئی تھیں۔

ریلوے سٹیشن کی عمارت سے باہر نکلتے وقت مجھے پلاسٹک کی بنی ہوئی چھتری اپنے اوپر تاننا پڑی تھی۔ بارش کے قطرے چھتری کے پلاسٹک کے گنبد پر گر رہے تھے اور میرے اندر کھوکھلے احساس کو

نمایاں کر رہے تھے۔ خالی معدے کی وجہ سے یہ احساسات زیادہ شدت اختیار کر رہے تھے۔

گاؤں کوانچ آن ہنائی کے مضافات میں ہے، قصبہ کے مرکز سے دس منٹ کے پیدل فاصلے پر گاؤں کے داخلی دروازے کے قریب، گاؤں سے شروع ہونے والی نئی سڑک کے اس پار چھپر کی طرح کی چھتوں والے تین گھر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک متفرق اشیاء کا سٹور تھا جہاں ٹافیاں اور ماچسیں وغیرہ فروخت کی جاتی تھیں، اس سٹور کو ایک جوڑا چلاتا تھا، جو کسی زمانے میں ایک سرائے کا بھی مالک تھا۔ اس کے بالکل سامنے ایک کوٹھڑیا تھی جو ایک لوہار کی ملکیت تھی۔ ایک آنکھ والا لوہار سارا دن اپنی بھٹی کی دھونکنی چلاتا رہتا تھا۔ ان دونوں سے تھوڑی دور ایک کمرے کی جھونپڑی تھی۔ یہ ایک شراب خانہ تھا جو چانگ چنگ چیول نامی ایک شخص چلاتا تھا۔ اس جھونپڑے کے باورچی خانے میں شراب اور سنیکس کے ٹرے تیار کئے جاتے تھے اور اس کے چھوٹے سے صحن میں ایک غیر لائسنس یافتہ نائی کھلے میں اپنی دکان چلاتا تھا۔ وہاں کافی لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا، خاص طور پر ان لوگوں کا جو منڈی میں کاروبار کرتے تھے۔ شراب خانے اور لوہار کی دکان کے درمیان ایستادہ بجلی کے ایک کھمبے کے قریب ایک سلنڈر نما ڈرم رکھا رہتا تھا، جو کپڑے رنگنے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ مارکیٹ میں فروخت ہونے والے کپڑے یہاں رنگے جاتے تھے۔ کپڑا رنگنے کے اس عمل میں آگ جلانے کیلئے وہ لکڑی استعمال کی جاتی تھی جو پہاڑوں پر سے اکٹھی کی جاتی تھی۔

اب وہاں ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ تھی۔ جہاں متفرق اشیاء کا سٹور ہوتا تھا وہاں اب ایک نئی صاف ستھری عمارت کھڑی تھی جس کی پیشانی پر ایک سائن بورڈ جگمگا رہا تھا ''کوانچ آن باربر شاپ''، جہاں لوہار کی دکان تھی وہاں اب سیمنٹ کے بلاکوں سے بنا گھر تعمیر ہو چکا تھا اور اس کی صورتحال سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں متوسط اقتصادی حیثیت کا حامل کوئی خاندان رہائش پذیر ہے۔ وہ جھونپڑا جو کبھی شراب خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، وہ بھی اب موجودہ نہ تھا، اب اس پر لوہے کی چادر کی چھت ڈال دی گئی تھی اور اس کی لکڑی کے تختوں سے بنی دیوار پر نیلے رنگ کا پینٹ لگا ہوا تھا اور اس پر کمیونسٹ مخالف نعرے درج تھے اور چاولوں کی قلت پر قابو پانے کیلئے آٹے کے بڑھتے ہوئے استعمال پر احتجاج کیا گیا تھا۔ اس پر لکڑی کا ایک بورڈ بھی لگا ہوا تھا جس پر ٹیڑھے میڑھے لفظوں میں لکھا تھا ''چاول سے بننے والی شراب کی سیلز ایجنسی'' باربر شاپ کی کھڑی میں سے باہر نکال کر اوپر اٹھائی گئی چمنی میں سے سفید رنگ کے

دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے اور کھڑکی کے شفاف شیشے میں سے کچھ ناشنا سا چہرے حیرت آمیز نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے، ان میں سے کوئی بھی شخص میرا جانا پہچانا نہ تھا۔ میں نے وہاں خود کو اجنبی محسوس کیا حالانکہ میں یہیں پلا بڑھا تھا اور اپنی زندگی کے اٹھارہ طویل برس میں نے اس جگہ گزارے تھے، انہی لوگوں کے درمیان، میں تو اس گاؤں کا اپنے صحن جیسا احترام کرتا تھا، بلکہ اس کا حصہ سمجھتا تھا۔

میں بڑی سڑک سے نکلنے والی ایک پتلی گلی میں مڑ گیا اور جلد ہی میں ایک باغ میں پہنچ گیا۔

کسی توقع اور آس کے ساتھ میں دم بخود ہو گیا کیونکہ باغ سے بالکل متصل گارڈینیا کی باڑ کے اخیر پر تین سو مربع میٹر کا ایک ٹکرا تھا جہاں سبزیاں اگائی جاتی تھیں اور جسے میں فصل اگانے کیلئے خود تیار کرتا تھا۔ آبائی قصبہ چھوڑنے سے پہلے میں نے گھر کے ساتھ اس قطعہ اراضی کو بھی فروخت کر دیا تھا۔ گلی، جس کی سطح پر جمی برف کو حال ہی میں ہونے والی بارش نے کافی حد تک پگھلا دیا تھا، کیچڑ سے بھری ہوئی تھی اور اس نے میری ماضی کی یادوں کو بھی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ چشمہ جو تھوڑی سی بارش ہونے پر بھی صاف شفاف ندی میں بدل جاتا تھا اب انحطاط پذیر ہو کر محض ایک نالے کی شکل اختیار کر گیا تھا اس اور کے ساتھ سیمنٹ سے بنے بدوضع گھروں کی ایک قطار کھڑی تھیں، یہ سب کچھ دیگر کسی دور دراز کے گاؤں کی طرح ہی تھا۔

اپنے گھر کے باغ کے اس حصے میں پہنچنے کے بعد میں تیزی سے اس میں سے کود پڑتا تھا اور جو کی فصل کاٹ لینے کے بعد بچی ہوئی جڑوں، جس میں سے نئے شگوفے پھوٹ رہے ہوتے تھے، پر چلتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجھے ایسا کرتے ہوئے اپنی جگہ پر ساکت، جامد ہو جانا پڑتا تھا۔ میں دیکھتا کہ دادا جان اپنی چھڑی کے سہارے کھڑے ہیں اور اس مقبرے کی طرف دیکھ رہے ہیں جو انہوں نے اپنے لئے بنوایا تھا تا کہ مرنے کے بعد انہیں وہاں دفن کیا جا سکے۔ وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے، یہی ان کے کھڑے ہونے کا انداز تھا اور ان کی سفید داڑھی کے بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے ہوتے تھے، انہوں نے اپنے سر پر گھوڑے کے بالوں سے بنا ہیٹ رکھا ہوتا تھا اور ان کی ریشمی جیکٹ کے نیچے ان کی عینک کا کور بیلٹ سے جھول رہا ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا اور گہری سانس بھرتے ہوئے اپنا رخ ''ڈیرراکس'' کی طرف موڑ لیا۔ وہ سات چٹانیں جن کو مشترکہ طور پر ''ڈیرراکس'' کا نام دیا جاتا ہے، میں ان میں سے پہلی چٹان پر چڑھ گیا۔ یہ ہموار چٹان میرے بچپن کی جنت تھی۔ کھیتوں میں سے

MashalBooks.com

خربوزے توڑتے ہوئے، باجرے کے سٹے اکٹھے کرتے ہوئے جب میں تھک جاتا تو اس چٹان پر لمحہ بھر کو آرام کر لیتا تھا۔ میں نے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ بارش ابھی تک جاری تھی اور بارش کے قطرے میری چھتری کے گنبد پر گر کر آواز پیدا کر رہے تھے۔ 'آؤل ماؤنڈ' کے دامن میں پست قامت صنوبر کے جھنڈ کے درمیان بنے چھپر کی چھتوں والے گھروں کی چمنیوں سے نکلنے والے چیڑ کے سوئیوں جیسے پتوں کے جلنے سے پیدا ہونے والے دھوئیں کو بارش کی بوچھاڑ بکھیر رہی تھی چنانچہ عام دنوں میں جب موسم صاف ہوتا ہے دھواں بگولوں کی صورت میں اوپر اٹھتا ہے لیکن بارش کی وجہ سے یہ دھند اور کہر میں تبدیل ہو رہا تھا۔

میں نے ایک ایک کر کے ان چٹانوں کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ بڑی ٹھوس چٹانیں ہونے کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر قائم تھیں اور بگ ڈپر یعنی تفریحی پارک میں ایک ٹریک پر اوپر نیچے اور دائیں بائیں جانے والی بچوں کی ٹرین جسے رولر کوسٹر بھی کہتے ہیں، کی شکل بنا رہی تھیں، جیسا کہ وہ ہمیشہ بناتی تھیں۔ ان میں سے سب سے چھوٹی چٹان، جو سڑک کے قریب تھی اور گاؤں کے لڑکے بالے جسے سب سے زیادہ استعمال کرتے تھے، اپنی جیپ کی طرح کی شکل برقرار رکھے ہوئے تھی اور جس کی شکل مینڈک کی طرح تھی وہ بھی اسی طرح عاجزی سے اپنی جگہ کھڑی تھی۔ تیسرے نمبر پر سب سے بڑی چٹان کی شکل آرام کر رہے شیر کی طرح تھی اور اس نے بھی اپنی یہ شکل برقرار رکھی تھی اگرچہ اس کے گرد جو جھاڑیاں اگی رہتی تھیں وہ اب زیادہ ہو گئی تھیں۔ ان میں لیس دار مادہ خارج کرنے والے دو درخت، جنگلی گلاب کی چڑھواں بیل اور زمین پر بچھنے والے بہت سے پودے تھے شامل تھے اور یہ سب پرندوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے اور پرانے لوگوں کے لیے کشش رکھتے تھے، یہی سب کچھ پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔

وہ جگہ جو دادا جان کے مزار کیلئے چنی گئی تھی شیر کی شکل والی چٹان کے بالکل نیچے واقع تھی۔ جب ابا جان زندہ تھے تو یہ قطعہ گھاس کی خوبصورت تہہ سے ڈھکا رہتا تھا۔ ان کا بیٹا ہونے کے ناطے ابا جان کا یہ فرض بھی تھا جس طرح کہ وہ ہر مہینے کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو دادا جان کیلئے خصوصی دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو اپنے فرزندانہ فرائض اس وقت بھی ادا کرنے چاہئیں جب باپ زندہ ہو، صرف اس کے مرنے کے بعد ہی فرائض یاد نہیں آنے چاہئیں۔ مزار کی جگہ کا انتخاب دادا جان نے خود کیا تھا اور اب وہاں عمارت بھی انہوں نے اپنی نگرانی میں مکمل کروائی تھی۔ چونکہ ان کے بہت زیادہ مشاغل نہ تھے اور وہ تمبا کو اور شراب نوشی کے بھی رسیا نہ تھے اسی لئے وہ ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے

اور بہار کے طویل موسم میں کبھی کبھار ادھر بھی نکل جاتے تھے جدھر ان کے مزار کی عمارت تھی تاکہ اس امر کا جائزہ لے سکیں کہ مقبرے کے آس پاس جڑی بوٹیاں تو نہیں اگی ہوئیں یا وہاں چوہوں کے بل تو نہیں ہیں۔ وہ بید کی چھڑی کا سہارا لے کر وہاں کھڑے رہتے اور اس عمارت کی طرف دیکھتے رہتے جس کو ان کا مزار بننا تھا۔ ان لمحوں میں ان کو دیکھتے ہوئے میں تمکنت اور وقار بھرے جذبات سے مغلوب ہو جاتا تھا۔ یہ جذبات اسی سارے عرصے کے دوران میرے ساتھ رہے تھے۔

میرے بچپن کے زمانے میں باغ کا یہ قطعہ جڑی بوٹیوں اور بیری کی جھاڑیوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہاں ایک ایسا پودا اگتا تھا جس پر میٹھے کھانے کے قابل بیر جیسے پھل لگتے تھے، جب وہ پکتا تو میرے دادا جان کے مقبرے کے آس پاس اس کی بہتات ہو جاتی تھی چنانچہ میں موسم بہار کے آخری دنوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں گھومتا رہتا اور ہم یہ بیر تلاش کر کے کھاتے تھے۔ ہم اتنا گھومتے کہ ہمارا رنگ گہرا سانولا ہو جاتا۔ ایسے ہی خوشگوار دنوں میں میرے دادا بھی وہاں آ جاتے اور اپنی بید کی چھڑی کے سہارے کھڑے ہو کر ماحول کا جائزہ لیتے رہتے۔ ہمارے گھر میں کام کرنے والی نوکرانی بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس کا نام اونگ جومی تھا اور وہ اس قدر تیز تھی کہ گاؤں کی دیگر لڑکیوں کے مقابلے میں دوگنا جڑی بوٹیاں اکٹھی کر لیتی تھی۔

اونگ جومی ایک محبت کرنے والی دریا دل لڑکی تھی۔ وہ ہمارے مسلسل چلے آ رہے نوکر، جس کا تعلق میرے ننھیال سے تھا، کی بیٹی تھی۔ اپنی شادی کے وقت میری ماں اونگ جومی کے باپ کو جہیز میں اپنے ساتھ لائی تھی۔ میرے نانا فوجی امور کے شعبے میں نچلے درجے کے حکام میں شامل تھے۔ وہ سرکاری ڈاکٹر تھے، وہ بعد ازاں اپنے آبائی گاؤں لوٹ گئے تھے تاکہ وہاں رہائش اختیار کر سکیں۔ ملازمہ ہمارے آنے کے فوراً بعد بھاگ گئی تھی اور کئی عاشقوں کے پاس رہنے کے بعد آخر کار شراب خانے کی مالکہ بن گئی اور اپنی زندگی گزارنے لگی۔ اونگ جومی اس عورت کی بیٹی تھی لیکن ایک اور خادمہ کے سابق رنڈوے شوہر سے۔ اس کے نام کے معنی ''مٹی کا مرتبان'' بنتے ہیں۔ اور اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ مٹی کے برتنوں کی دکان میں مرتبانوں کی ایک قطار کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔ اونگ جومی ہمارے ساتھ رہنے کیلئے اس وقت آئی تھی جب وہ ابھی سات برس کی تھی۔ اس کی ماں اسے ہمارے ننھیال والوں کے سپرد کر گئی تھی، جنہوں نے اسے میری ماں کے حوالے کر دیا۔ میری ماں ہر وقت اس کی تعریف کرتی رہتی تھی کیونکہ وہ بہت نرم دل

تھی، ہوشیار تھی اور ہاتھوں سے کرنے والے ہر کام کی ماہر تھی۔ اپنی فیاضی کی وجہ سے وہ فقیروں، راہبوں اور کوڑھیوں میں بھی خاصی مقبول تھی۔ ہمارے کھیتوں میں کام کرنے والے بھی اس کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ اس کیلئے پانی سے بھرے مٹکے یا جلانے کے لئے لکڑی کی گیلیاں لے جاتے یا ہر وہ کام کر دیتے جس کی وہ تمنا کرتی تھی۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ میری ماں کس طرح اونگ جومی کے لہجے کی نقل اتار کر مجھے ہنسایا کرتی تھی۔ دادا جان نے اسے آداب سکھائے اور یہ بتایا کہ تہذیب کیا ہوتی ہے۔ میرے دادا میں یہ خوبی تھی کہ وہ ایک ہی نظر میں بندے کو پہچان سکتے تھے، پس انہوں نے اس میں کچھ دیکھا اور اسے تعلیم دینے اور تہذیب سکھانے کا تہیہ کر لیا۔ ''تمہاری عمر کیا ہے؟'' یہ وہ پہلا سوال تھا جو ہمارے گھر آنے کے بعد اس سے کیا گیا۔ اونگ جومی، جسے کبھی یہ نہیں سکھایا گیا تھا کہ بڑوں کے ساتھ کیسے بات کرتے ہیں، نے نہایت بے باکی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میری ماں ہر وقت ڈانٹا کرتی تھی کہ میں ابھی صرف چھ سال کی ہوں، لیکن یہ گذشتہ برس کی بات ہے لہٰذا میں نہیں جانتی کہ اس وقت میری عمر کیا ہے''۔

تمہارے کہنے کا مطلب ہے، تم نہیں جانتیں کہ اس وقت تمہاری عمر کیا ہے؟''

''نہیں، کسی نے مجھے بتایا تھا کہ میں اس وقت سات سال کی ہوں لیکن کسی اور نے مجھ سے کہا کہ میں ایک سال کھا گئی ہوں، اس لئے اب میں پانچ سال کی ہوں''۔

''کیا واہیات باتیں ہیں، تو تمہاری وہ پھوہڑ ماں تمہیں ملنے وقتاً فوقتاً یہاں آتی رہتی ہے''؟

''ہاں، پچھلی مرتبہ وہ لارڈ کا خطاب حاصل کرنے والے رئیس کے گھر آئی تھی، وہ غیر اصلی ریشم کی سکرٹ پہنے ہوئے تھے اور اس نے اپنے بال گھنگریالے بنائے ہوئے تھے، وہ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی''۔

''کیا وہ اب بھی اتنی ہی شراب پیتی ہے جتنی وہ ہمیشہ پیتی رہتی تھی؟''

''ہاں، کچھ عرصہ پہلے وہ نشے میں تھی کہ میرے والد نے اسے گھر سے باہر پھینک دیا، اس وقت وہ صرف زیر جامہ پہنے ہوئے تھی۔

''بڑے شرم کی بات ہے''۔

اس کے بعد دادا جان نے مزید سوال نہیں کیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اونگ جومی کے جوابات

سے وہ پریشان ہوگئے تھے بلکہ اس لئے کہ اس نے میرے ماموں کو لارڈ کا خطاب حاصل کرنے والا رئیس قرار دیا تھا حالانکہ وہ بدچلن عیش پرست آدمی تھا۔ اس لڑکی کیلئے یہ خطاب کسی کو دینا یا اس نام سے پکارنا مناسب ہوسکتا ہے لیکن میرے داداجان کے لئے نہیں، ان کے نزدیک یہ بے ادبی اور گستاخی تھی۔ پھر بھی داداجان اپنی ناراضی کو پی گئے اور اس سے اس کا نام پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے''؟

''مجھے پہلی والی کہا جاتا ہے''

''پہلی والی، اس کا مطلب ہے اب تک تمہارا کوئی نام نہیں ہے''؟

لڑکی اس سوال کو سمجھ نہ سکی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسے ایک نام دیا جا چکا ہے۔

''ٹھیک ہے! میں نے سنا ہے کہ تمہاری ماں نے تمہیں مٹی کے مرتبانوں کی ایک قطار کے پیچھے جنم دیا تھا، تو کیوں نہ تمہیں اونگ جومی پکارا جائے، تمہیں مٹی کا مرتبان ہی کہا جائے''۔ اس طرح اسے اونگ جومی کا نام ملا اور یہی اس کا سرکاری نام بھی بن گیا۔

اونگ جومی بزرگوں کے موڈ کے بارے میں بڑی حساس تھی اور موقع محل دیکھ کر ہی بات کرتی، وہ بچوں سے بہت محبت کرتی اور ان کیلئے فیاضی کا مظاہرہ کرتی حالانکہ وہ اکثر پلیٹیں وغیرہ توڑ دیتی اور اچھی خاصی باتونی بھی تھی۔ وہ باغ کے اس قطعہ میں سے جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے کے بعد واپس آتی تو ماں سے داداابو کے بارے میں شکایت کرتی، جنہیں وہ اپنے مزار کے پاس گھومتے ہوئے دیکھ کر آئی ہوتی ''ماں، میرے خیال میں سرکار موسم بہار کے حزن میں مبتلا ہیں''۔

''اف خدایا، اے لڑکی تو کب ڈھنگ سے بات کرنا سیکھے گی''۔ ماں اسے برا بھلا کہتی اور اپنا سلائی کا سامان رکھ دیتی تاکہ باہر جا کر داداجان کی خیریت معلوم کر سکے۔

''میرے خیال میں سرکار اپنے مزار کے بارے میں فکرمند ہیں'' اونگ جومی اپنی بات جاری رکھتی۔

''کافی بک بک ہوگئی۔ اب جاؤ اور اپنا کام کرو''۔ ماں اطمینان کا سانس لیتی اور پھر پوچھتی ''تم ٹوکری میں کیا لے کر آئی ہو''۔

''پلیٹی کوڈون اور ارا روٹ جو سرکار کو بہت پسند ہیں۔ دن بہت طویل ہے، فیری چلنے کو ہے

اور اس کے ہارن کی آواز ساحل پر سے آ رہی ہے۔" اونگ جومی فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور باغ میں سے لائی گئی سبزی چھننے کے ساتھ ساتھ گیت گانے لگی، جو اس نے پتہ نہیں کہاں سے سنا تھا۔

وہ سولہ برس کی ہو رہی تھی اور یقیناً اپنی بلوغت کے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔

"ہاں وہ یقیناً فکر مند ہوں گے، وہ اپنے دفن ہونے کی جگہ کا جائزہ لے رہے ہوں گے"۔

ماں نے کچھ اونگ جومی اور کچھ اپنے آپ سے کہا۔ ماں دادا جان کو سمجھتی تھی۔ دادا جان نے اس علاقے میں موجود ہر فال نکالنے والے سے مشورہ کیا تھا اور دور و نزدیک کی پہاڑیوں پر چڑھ کر اس جگہ کا جائزہ لیا تھا۔ انہوں نے ملک میں موجود تمام مشہور پہاڑیوں کے چکر لگائے تھے جہاں ان کے معروف آباؤ اجداد دفن تھے اور آخر کار جو مبارک جگہ انہیں پسند آئی وہ ان کے اپنے گھر کے باغ کا وہ حصہ تھا۔

دادا جان اپنی قبر کی جگہ کی اس طرح دیکھ بھال کرتے کہ مجھے بھی اس میں دلچسپی پیدا ہو جاتی۔ آخر ایک روز میں بول پڑا اور میں نے دادا جان سے کہا کہ یہ جگہ کس طرح مبارک ہو سکتی ہے جبکہ یہ محض سرخی مائل زمین کا ایک حصہ ہے جس پر جا بجا جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔

دادا جان، جن کی سماعت ان کی نظروں سے زیادہ اچھی تھی، میری طرف مڑے اور کہا "ان چٹانوں کی طرف دیکھو کیا یہ بالکل اسی طرح ترتیب وار نہیں ہیں جیسے آسمان پر نظر آنے والا سات ستاروں کا گروہ جو ایک بڑے ریچھ کی شکل بناتا ہے"۔

میں نے بحث جاری رکھی اور کہا "لیکن آپ باغ کے اس حصے میں کیوں دفن ہونا چاہتے ہیں؟ آپ مرنا چاہتے ہیں؟ آپ کو مرنا پسند ہے؟"

"ایک ہی بات ہے، ایک کے بعد ایک ہر دن، ہر روز اپنی موت کا انتظار کرنا اور بس یا پھر جلد ہی مر جانا اور گھاس کے بعد ان کے نیچے اپنی جگہ حاصل کر لینا"۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کہنا چاہیے چنانچہ میں خاموش رہا، پھر وہ خود ہی گویا ہوئے، "ارے میں بھی کتنا احمق ہوں کہ ایک بچے کے ساتھ اس طرح بات کر رہا ہوں۔

"لیکن چٹانوں کے نیچے ہی کیوں، باقی لوگ تو پہاڑوں پر دفن ہونا پسند کرتے ہیں"۔

"یہ چٹانیں میرے لئے ایسے ہی ہیں جیسے ایک میں چار"

"کیا مطلب؟"

''کیا تم نے وہ جملہ سن رکھا ہے، چار میں سے ایک لیٹر نکال لو؟''

''نہیں''

''کتنے شرم کی بات ہے کہ تم نے ایک ہزار الفاظ سیکھ لئے ہیں اس کے باوجود تم اس سادہ سے جملے کے معنی تک اخذ نہیں کر سکتے۔

میں نے اپنا سر ہلایا۔

''سنو! کیا تم جانتے ہو کہ کپاس کے چار کلو پھولوں میں سے ایک کلو روئی حاصل ہوتی ہے''؟

''ہاں میں جانتا ہوں، کپاس کے پھول، کپاس کے پودے سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ جب ان کے بیج نکال دیئے جاتے ہیں اور روئی کپاس کے انہی شگوفوں سے بنتی ہے۔

''کیا تم نے جڑی بوٹیوں کے ماہر ڈاکٹر سے یہ نہیں سن رکھا کہ اپنی پانی والی چار کلو جن سنگ اور ایک کلو خشک جن سنگ برابر ہوتی ہے''۔

''میرا نہیں خیال کہ میں نے ایسا سن رکھا ہے''۔

کیا ان محاوروں کا مطلب یہی نہیں ہے کہ جب کسی چیز کی تلخیص کی جاتی ہے تو کم ہو جاتی ہے یا یہ کہہ لو کہ گاڑھی ہو کر اصل حجم کا ایک چوتھائی رہ جاتی ہے۔

''تو پھر چار کلو جو کو ایک کلو چاولوں کے برابر ہونا چاہیئے''۔

''بڑے شرم کی بات ہے''۔

''بڑے شرم کی بات ہے'' والے الفاظ وہ اس وقت استعمال کرتے تھے جب انہیں کسی موقف سے اتفاق نہ ہو۔ اپنے سے کم عمر کسی فرد کی کسی بات پر اس کے کسی اطوار پر انہیں اعتراض ہو تو وہ اسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے تھے اور جب مجھے ڈانٹنا ہو تو پھر بے وقوف جیسے الفاظ ادا کرتے۔

اس وقت دادا جان 89 سالہ سفید بالوں والے بزرگ تھے، عمر رسیدہ اور کمزور، زندگی کے ساتھ ان کا ایک نازک سا تعلق تھا لیکن وہ ہمیشہ پرسکون اور باوقار نظر آتے تھے، اپنی عمر کے عین مطابق، میرا خیال ہے کہ چونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا چٹانوں کے ساتھ کیا تعلق ہے، اس لئے وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ان میں ہوا اور بارش اور دیگر قدرتی عناصر کی کیا خوبیاں مشترک ہیں۔

اس روز چٹانیں محض مادی اجسام نہیں نظر آ رہے تھے بلکہ دادا جان کی قوت ارادی اور جذبوں

MashalBooks.com

کے مجسم نشان لگ رہی تھیں یا کم از کم ان کی روح کی واجب الاحترام علامات ضرور محسوس ہو رہی تھیں۔

میں ہموار چٹان سے نیچے اترا اور اس چٹان کی طرف بڑھا جس کی شکل کسی شیر کی طرح تھی اور جس کے نیچے دادا جان کا مقبرہ تھا اور جہاں موسم سرما کی بارش میں بٹیر اور کبوتر آ کر پناہ لیتے تھے۔ ہمارا ایک مزارع جس کا نام پاک چواھلو تھا، بٹیر اور کبوتر بغیر کسی تردد کے پکڑ سکتا تھا۔ وہ یہ کام قدرتی گھاس کے ڈھیروں میں پھندا چھپا کر یا پھر زہر والا چارہ پھیلا کر کرتا تھا۔ میں دادا جان کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا اور میں نے باتوں کے دوران اکثر ان سے سنا کہ اگرچہ دنیا تبدیل ہو گئی ہے لیکن کچھ امتیازات اب بھی قائم ہیں، بٹیر، یانگ بانوں یعنی نیگھان کی خوراک ہے اور کبوتر عام لوگوں یا نوکروں وغیرہ کے استعمال کی چیز ہے۔ میرے خیال میں انہیں اندیشہ تھا کہ میں نادانستہ طور پر کبوتر کا گوشت کھالوں گا۔

سیول ہجرت کرنے سے پہلے میں نے دادا جان کی قبر ان آبائی پہاڑوں میں بنوا دی اور باغ کا وہ حصہ ایک ریلوے آفیسر مسٹر کم کو فروخت کر دیا تھا۔ ادھر ادھر بکھری سوکھی ہوئی آلو کی بیلوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ میرے دادا کی سابق قبر کی جگہ پر اس وقت آلو اور شکر قندی کاشت کی جا رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ بارش رک چکی ہے۔ بارش کے بعد خنکی بڑھ گئی تھی اور ہوا کی ٹھنڈک ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ ٹھنڈ بڑھنے اور اندھیرا چھا جانے سے پہلے مجھے قصبے کی طرف واپس لوٹ جانا چاہیے لیکن میری ٹانگیں مجھے اوپر لئے جا رہی تھیں، پیچھے والی پہاڑی کی طرف جہاں میرے بچپن کا اچھا خاصا وقت گزرا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے دادا جان کا مزار کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا کیونکہ ان چٹانوں کے گرداب سیمنٹ سے بنے ہوئے آدھی درجن گھروں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ان گھروں کی دیواریں نہیں تھیں اور ان کے ارد گرد گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے دادا کے مقبرے کو اس لئے منتقل کیا تھا کہ میں جانتا تھا، یہاں گھر تعمیر ہو گئے تو گندگی اور فضلہ مقبرے کے اندر چلا جائے گا۔ ان گھروں میں نکاسی آب کا کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ ان چٹانوں کے ارد گرد بدبودار پانی کے جوہڑ بنے ہوئے تھے اور مکانوں کے بیرونی صحنوں نے اس پورے علاقے کو بدبودار اور بدوضع بنا رکھا تھا۔

جب میں پہاڑی پر اور اوپر چڑھا تو مجھے کچھ اور پرانے گھر دکھائی دیئے جہاں میں نے اپنی

MashalBooks.com

زندگی کے اٹھارہ طویل برس گزارے تھے۔ 387 ٹائیج اون ری، ٹائیج اون اب میرے گھر کا نمبر ہے جہاں میرے دادا جان نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں اور ماں بھی راہی ملک عدم ہوئی۔ وہ گھر کے زوال پذیر معاملات کو برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتی رہیں۔ میں نے گھر ایک اجنبی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ آٹھ سو مربع میٹرز مین اور دو سو مربع میٹر سے کچھ زیادہ رقبے پر بنی ہوئی عمارت پر مشتمل اس گھر کا ایک بڑا حصہ اور دو ایک دوسرے کے متوازی بازو تھے جو کہ اصل عمارت کے ساتھ 90 درجے کا زاویہ بناتے تھے۔ عمارت کا رخ جنوب کی طرف تھا اور اس کے پچھواڑے میں قدرتی طور پر ایک ذخیرہ گاہ بنی ہوئی تھی۔ اس عمارت کا وقار اور شان اب بھی کسی حد تک قائم تھا البتہ ان درختوں کی چھاؤں جو کچن گارڈن کا چھجہ بنائے تھے اور شاہ بوط کے وہ درجن بھر درخت جو عقبی دیوار کے ساتھ اگے ہوئے تھے پرانے اور خستہ حال نظر آنے لگے تھے۔ پاؤلونیا کا درخت بڑے رواز ے کے سامنے تھا لیکن بڑا دروازہ اب کچھ تنگ سا نظر آتا تھا۔ بطخوں کے لئے بننے والے ڈربے نما جھونپڑے نے بڑے دروازے کی کچھ جگہ گھیر لی تھی۔

میں نے صحن پر ایک نگاہ دوڑائی۔ وہاں مجھے کچھ درخت نظر آئے۔ کیا وہی آلوچے اور عود الصلیب کے درخت تھے جو میں نے اپنے بچپن میں پودوں کی شکل میں دیکھے تھے؟ اور کیا مجھے نظر آنے والے آڑو کے وہی درخت تھے میری ماں جن کی دیکھ بھال کرتی تھی؟ اس پر یقین کرنا قدرے مشکل محسوس ہوتا تھا لیکن لگتا یہی تھا کہ وہ وہی درخت تھے۔ اندرونی صحن خستہ حال اور بکھرا ہوا لگتا تھا تاہم درخت وہاں بھی پوری استقامت کے ساتھ کھڑے تھے، خوبانی کا وہ درخت جس سے ہم ہر سال کئی سو پھل حاصل کرتے تھے اور اس کے ساتھ کھڑا اعناب کا درخت اب چھت سے اوپر ہو گئے تھے اور مجھے صحن کا بغور جائزہ لینے کیلئے پیروں کے بل اوپر اٹھ کر دیکھنا پڑ رہا تھا۔ مجھے اس وقت خرمالو کا ایک اور درخت بھی یاد آیا جس پر خزاں کے موسم میں پھل لگتے تھے جو پورے موسم سرما کے دوران باقی رہتے تھے لیکن وہ درخت ہمارے وہاں سے چلے آنے سے پہلے ہی سوکھ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم درخت کس نے لگایا تھا، نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ کس برس جنوری میں پورن ماشی کے روز کس نے اس درخت کی دو بڑی شاخوں کے درمیان خانے کی شکل کا پتھر رکھا تھا۔ پتھر رکھنے کی یہ رسم جس بے ڈھنگے جنسی تمثیلچے کے طور پر شادی کا نام دیا گیا جنوری کے پورے چاند کے دنوں میں ادا کی گئی تا کہ جب درخت بڑا ہو تو اس کی شاخیں دور تک پھیل

جائیں۔ جب یہ سوکھ گیا تو میں نے کلہاڑی سے اسے نیچے گرایا اور پھر چولہے کا ایندھن بنا دیا۔ میری ماں چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک دمے کی بیماری کا شکار رہنے کے بعد فوت ہو گئی۔ اس وقت میں انیسویں برس میں تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ مجھے پکا یقین ہے کہ خرمالو کا درخت بھی اسی لمحے مر گیا ہو گا۔ جب ماں کو دفنانے کے بعد ہم گھر واپس آئے تو ہم نے دیکھا کہ وہ درخت جس پر چند روز پہلے ہرے سبز رنگ کے شگوفے تھے اور جس کی ڈالیاں پھلوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں، اب اچانک مرجھا گیا ہے، اس کے پتے سوکھ چکے تھے اور اس کے سوکھے ہوئے پھل ہلکی سی ہوا چلنے پر بھی بارش کی طرح برسنے لگتے تھے۔ میرے تمام رشتے دار اور میرے گاؤں کے بہت سے لوگ اس بات پر متفق تھے کہ میری ماں کے مرنے کے بعد یہ درخت بھی اچانک مردہ ہو گیا ہے، اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی اور ماں کی پہلی برسی کے بعد بھی اس میں زندگی کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے۔ اس کے برعکس یہ مکمل طور پر سوکھ گیا اور اس کی ٹہنیاں اس قدر خشک ہو گئیں کہ ہلکا سا ہاتھ لگانے پر بھی آواز کے ساتھ ٹوٹ جاتی تھیں۔ گاؤں والوں کا کہنا تھا کہ یہ درخت انہیں میری ماں کی یاد دلاتا ہے۔ یہ بلا واسطہ تجویز تھی کہ مجھے اس درخت کو کاٹ دینا چاہیے۔ میں بھی محسوس کرتا تھا کہ میں اس درخت کو اس طرح سوکھا ہوا چھوڑ کر گھر سے نہیں نکل سکتا تھا، وہ درخت جو میری ماں کے ساتھ جیا اور اس کے ساتھ موت کی آغوش میں بھی سو گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ درخت کاٹنے سے درخت دیوتا غضبناک ہو جائیں گے چنانچہ اگر میں درخت کاٹتا ہوں تو وہ مجھے گرے ہوئے درخت کے ٹھنٹھ میں ایک درانتی یا کوئی چاقو گاڑنا ہو گا تاکہ درخت کاٹنے کا غلط نتیجہ سامنے نہ آئے۔ میں ایسے لوگوں میں شامل ہوں جو کبھی کسی کی تجویز یا ہدایت کو رد نہیں کرتے لیکن مجھے اب تک یاد ہے کہ اس درخت کے ٹکڑوں کو نذر آتش کرتے ہوئے میں کس قدر رویا تھا۔

وہ جگہ جہاں خرمالو کا وہ درخت ہوتا تھا اب وہاں بھوسے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ گودام کے ایک طرف چیری کا ایک درخت ہوتا تھا اور اس کے بائیں طرف انار اور آڑو کے جو درخت ہوتے تھے وہ اب بھی وہاں موجود تھے اور ان کا سابق مالک غم میں ڈوبا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔

جب اس گھر کی دیکھ ریکھ میرے ذمے تھے تو اس وقت میری خواہش ہوتی تھی کہ میں ایک چھوٹے سے آرام دہ گھر میں رہوں کیونکہ میں خزاں کے موسم میں ڈھیروں کے حساب سے گرنے والے

درختوں کے پتوں اور اندرونی وبیرونی کوارٹروں کے لاتعداد برآمدوں اور کمروں کے فرشوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کے کام سے سخت عاجز آیا ہوا تھا۔ غالباً یہ میری اس احمقانہ خواہش کا پورا ہونا ہی ہے کہ اب میری ملکیت جائیداد ایک کمرے پر مشتمل ہے۔ میرے پرانے گھر کا مغربی حصہ جس میں اناج کی کوٹھی اور گودام ہوتے تھے، اب غالباً ایک رہائشی کوارٹر میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور مزارعوں کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ دیوان خانے کے سامنے پھولوں کی جو کیاریاں ہوتی تھیں، ان میں آلوچے، گلاب، سفید اور چنی دار سوسن کے پودے ہوتے تھے، جن پر لگنے والے پھولوں کی خوشبو سے سارا صحن مہکا رہتا تھا اور جن میں ہم پودینے اور اسی طرح کی دوسری ادویات کے طور پر کام آنے والی جڑی بوٹیاں اگاتے تھے، اب سبزیاں اگانے والے کھیت میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔

نوکروں کے لئے بنائے گئے کوارٹر، جن میں ہمارے وقت میں ٹے ای بوک خاندان رہتا تھا اب ایک الگ گھر بنا دیا گیا تھا جس پر کسی کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دھان کے کھیت، جو ہمارے باہر والے صحن سے اس جگہ تک پھیلے ہوئے تھے جہاں اب نئی بڑی سڑک بنی ہوئی ہے اور جن کو آبپاشی کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اب وہاں سے غائب ہو چکے تھے اور ان کی جگہ پر مختلف طرز کے مکان کھڑے نظر آتے تھے۔ دراصل ہمارے گھر سے لے کر نئی بڑی سڑک تک پھیلی ہوئی ساری زمین ہماری تھی اور ریلوے لائن ہائی وے سے ذرا آگے تھی۔ اب یہ ساری زمین مکانوں میں تقسیم اور تبدیل ہو چکی تھی اور وہ دیو قامت صنوبر کا درخت جو ہماری زرخیز زمینوں کے محافظ کے طور پر ایستادہ تھا اب وہاں نہیں تھا اور اس کی جگہ سیمنٹ کے بلاکوں کے سٹور اور ایک پتھر سے بنے ہوئے نشان کو دے دی تھی جس پر زرد رنگ میں لکھا ہوا تھا "صوبائی حدود" یہ نشان کسی گناہ گار پہرے دار کی طرح کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ ریل کی پٹڑی سے آگے سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ساحل سمندر پر گاؤں کے ننگ دھڑنگ لڑکے کھیلتے رہتے تھے۔ بھاٹا کی صورتحال میں جب پانی ساحل سمندر سے پیچھے چلا جاتا تھا، افق گہرا کبودی ہو جاتا تھا اور جوار کی صورت میں سمندر کا پانی رکاوٹ کے لئے باندھے گئے اس بند تک اوپر چڑھ آتا تھا جو ریلوے لائن کے ساتھ منسلک تھا۔ سمندری بگلے اور دوسرے سمندری پرندے اس بند کے اوپر اڑانیں بھرتے تھے اور اس کے ساتھ سمندر کا پانی خشک کر کے نمک بنانے والی فیکٹریوں سے دھواں اٹھتا رہتا تھا جو سمندری دھند جیسا دکھائی دیتا تھا۔ چھڑی اور کانٹے سے ٹراؤٹ کا شکار کرنے والے اس بند پر اس طرح قطار بنا کر بیٹھے رہتے تھے جیسے

MashalBooks.com

ہیرنگ مچھلی ڈوری پر پروئی جاتی ہے۔ جب مچھیرے سمندر سے مچھلی لے کر لوٹتے تو ان کی لہک لہک کر کی جانے والی گفتگو سمندری پرندوں کی چہچہاہٹ سے زیادہ مترنم محسوس ہوتی تھی اور فضا ان کے نغموں سے گونج اٹھتی تھی۔

میں عالم خیالات سے واپس آیا تو دیکھا کہ بادل چھٹ چکے تھے اور سارا گاؤں اور اُس کے اردگرد پھیلے کھیت غروب ہوتے ہوئے سورج کی شفق رنگ روشنی میں نہائے ہوئے۔ میں نے پہاڑی سے نیچے اترنے کا ارادہ کیا۔ درجہ حرارت کافی گر گیا تھا، سردی بڑھ گئی تھی۔

گاؤں میں میرے پرانے کچھ پڑوسی ضرور موجود ہوں گے لیکن میں پرانے تعلق کی بنا پر ان سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا اور یہ بتا کر اپنا حق نہیں جتا سکتا تھا کہ ہم ساتھ رہتے رہے ہیں۔ میں انہیں ہمیشہ کمتر سمجھتا رہا ہوں، اب انہیں کس حوالے سے پکار سکتا تھا۔ یہ ایک گمبھیر مسئلہ تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے پرانے پڑوسیوں سے ملنے نہیں جاؤں گا۔ اور آپ سے کیا پردہ، میں یہ توقع کر رہا تھا کہ سرراہے بھی ان سے ملاقات نہ ہو۔ اس حوالے سے اپنا ذہن بنا کر ہی میں نے گاؤں کی طرف اپنے قدم بڑھائے تھے۔

لہٰذا وہاں سے اپنی روانگی تک میں اپنے خاندان یا قبیلے کے بزرگوں کے علاوہ کسی کے ساتھ ادب سے پیش نہیں آتا تھا۔ دادا کا حکم بھی یہی تھا اور پھر بچپن سے میری یہ عادت سی بن گئی تھی۔ بڑی اور درمیانی عمر کے مردوں کو میں ان کے خاندانی نام کے ساتھ ''سوبانگ'' کا لفظ لگا کر پکارتا تھا۔ یہ معاشرتی لحاظ سے نچلے طبقوں کے لوگوں کو بلانے کا ایک انداز تھا۔ وہ مرد جن کی عمر تیس سال کے قریب ہوتیں جو ابھی نوجوان ہوتے، ان کو میں ان کے ناموں سے پکارتا تھا۔ گاؤں کی خواتین کو میں فلاں کی ماں، فلاں کی خالہ کہہ کر پکارتا تھا۔ جدید دور میں اسے یقیناً ناقابل برداشت گستاخی تصور کیا جاتا لیکن ان وقتوں میں ان کیلئے اور میرے لئے یہ عام سی بات تھی۔ دادا جان کا اصرار تھا کہ چونکہ گاؤں کے زیادہ تر لوگ ہمارے خاندان کے افراد کے نوکر تھے اس لئے انہیں بلانے کے لئے بے تکلفانہ انداز تکلم ہی مناسب ہے۔ دادا جان کے سماجی حیثیت کے حوالے سے اس قدر باشعور ہونے کا ہی نتیجہ تھا کہ بچپن کے زمانے میں میرا کوئی دوست نہ تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ گاؤں کے لڑکوں کو اپنا دوست بنالوں لیکن وہ لگاتار مجھ سے فاصلے پر رہے۔ ہمارے گاؤں میں میرے ہم عمر کوئی درجن بھر لڑکے تھے لیکن اپنے والدین کی طرح وہ بھی

میرے دادا جان سے خوف کھاتے تھے۔ان کے کھیلوں میں حصہ لے کر اور انہیں اپنی بنائی ہوئی پتنگوں کے تحفے دے کر میں نے ان کے دل جیتنے کی بڑی کوشش کی لیکن انہوں نے مجھے اپنے گروہ کا حصہ بنانے سے انکار برقرار رکھا۔جب کبھی دادا جان کو میری ان کوششوں کا پتہ چلتا تو وہ اچھا خاصا ناراض ہوتے جس کے نتیجے میں مجھے اپنی اس خواہش کو مارنا پڑتا اور میں خوف کے مارے بستر میں پڑا کروٹیں بدلتا رہتا۔دادا جان نے خود کبھی مجھے نہیں مارا بلکہ وہ کہا کرتے تھے، میں تمہارے باپ سے کہتا ہوں وہ تمہاری مرمت کرے۔یہ میرے لئے سب سے بڑی دھمکی ہوتی تھی۔لیکن حقیقت میں انہوں نے کبھی ابا جان سے مجھے جھڑکی دینے کیلئے بھی نہیں کہا۔یہ ساری کارستانی اونگ جومی کی ہوتی تھی۔اس کی باتوں سے دادا جان کو خبر ملتی تھی کہ میں گاؤں کے عام لڑکوں کے ساتھ راہ ورسم بڑھا رہا ہوں۔وہ اس وقت بڑی خوش ہوتی اور لطف اٹھاتی تھی جب دادا مجھے جھاڑ پلا رہے ہوتے، یہ اس کیلئے سب سے بڑی تفریح تھی۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے،تم ان آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلتے رہے ہو؟ اگر تمہیں انہی سے دوستی کرنا تھی تو پھر اتنا پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔

''تعجب ہے کہ تم پر ہر وقت گھر سے باہر جا کر کھیلنے کی دھن سوار رہتی ہے''۔

''لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ کھیلنے کیلئے کہتے ہیں''۔

''اگر تم ان آوارہ لڑکوں کو دوست بناؤ گے تو تم بھی انہی کی طرح آوارہ ہو جاؤ گے۔میں تمہارے ہی بھلے کیلئے تمہیں خبردار کرتا رہتا ہوں کہ ان کے ساتھ نہ کھیلو، نہ ان سے دوستی کرو لیکن تم پر میری باتوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا''۔

مجھے اس طرح کی نصیحتیں کرتے ہوئے دادا جان کی آواز اس قدر بلند ہوتی تھی کہ زنان خانے میں بیٹھے لوگ بھی آسانی سے سن سکتے تھے اور مجھے یہ باتیں سر جھکا کر سننا پڑتی تھیں۔

دادا جان کے سامنے ایک معصوم سا جھوٹ بولنے پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا اور میں مغموم ہو جاتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں دادا جان سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکے مجھ سے اپنے ساتھ کھیلنے کیلئے نہیں کہتے تھے بلکہ یہ میں تھا جو ان کی تلاش میں رہا کرتا تھا کہ ان کے ساتھ دوستی کر سکوں۔حقیقت یہ ہے کہ گاؤں میں گزرے سارے برسوں کے دوران ایک دن بھی گاؤں کے لڑکے میرے گھر پر مجھے

MashalBooks.com

بلانے نہیں آئے تھے کہ میں ان کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان بچوں کے والدین اپنے بارے میں دادا جان کے خیالات سے بخوبی آگاہ تھے لہٰذا وہ اپنے بچوں کو میرے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ بڑی کلاسوں میں بھی وہ مجھے اپنے ساتھ کھلانے پر پس و پیش کے بعد ہی راضی ہوتے تھے یا سکول آتے جاتے ہوئے میں اگر بھاگ کر ان کے گروپ میں شامل ہو جاتا تھا تو وہ بادل نخواستہ ہی مجھے اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ یہ تفریق اس وقت بھی قائم رہی جب میرے سارے بزرگ وفات پا گئے، میرے اور ان کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج حائل رہی جو کبھی پاٹی نہ جا سکی۔

میں ابتدائی سکول کے دوسرے درجے میں تھا کہ کوریا کی جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ نے میرے خاندان پر تباہی و بربادی مسلط کر دی۔ دادا جان کا انتقال صرف ہمارے خاندان کے لئے غم کا باعث نہ تھا، پورا گاؤں سوگ منا رہا تھا، جیسے ان کا کوئی روحانی سربراہ وفات پا گیا ہو۔ جنگ سے میں نے سیکھا کہ انسانی معاملات کس قدر غیر محفوظ اور نازک ہیں۔ دادا جان کی وفات کے بعد بھی بچے مجھ سے گریزاں رہتے تھے اور اس سے میں نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ آفات بھی داخل فطرت، عادت کو تبدیل کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ یہ بات ہر لحاظ سے آپ کیلئے سبکی کا باعث اور پریشانی اور فکر کا سبب ہوتی ہے کہ مڈل سکول کی سطح پر آپ کا کوئی دوست نہ ہو۔ میں نے ایک بار اپنی اس فکر مندی کا ذکر اپنی ماں سے بھی کیا تھا لیکن انہوں نے بھی میرے لئے ہمدردی کے جذبات کا اظہار نہ کیا۔ انہوں نے بس یہی کہا، ''تمہیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اس قابل ہی نہیں کہ تمہارے دوست بن سکیں۔ وہ تمہارے ساتھ اس لئے نہیں ملنا چاہتے کہ تم ایک بہترین طالب علم ہو اور ہر لحاظ سے ان سے بہتر ہو''۔

ماں کی یہ بات درست تھی کہ میں پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ گھر پر حالات اچھے نہ تھے، اس کے باوجود میں نے مڈل سکول کا داخلہ امتحان سب سے زیادہ نمبر لے کر پاس کیا اور میں سارا سال اس پر شاداں رہا۔

یہ بات درست ہے کہ بالکل اکیلا ہونے پر میں ناخوش تھا لیکن ایسی صورتحال بھی نہ تھی کہ میں خود کو بے خانماں فرد تصور کرنے لگتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ دادا جان معاشرتی طبقوں کے درمیان سخت امتیاز کے حامی تھے اور وہ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ ان کے خاندان کا وقار قائم رہے۔ اپنے بچپن سے میں نے قدرت کی بہت سی ستم ظریفیاں سہی تھیں، اس لئے ان تجربات کی بنا پر میں نے چیزوں کو اس

طرح لینا شروع کر دیا جیسے یہ سامنے آتی ہیں، میں نے حالات کی ناگزیریت کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

پہاڑوں سے نیچے کی طرف چلنے والی ٹھنڈی یخ ہوا نے مجھ پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ چلنے کی وجہ سے میرے پاؤں کے نیچے سے چڑ چڑ کی آوازیں نکل رہی تھیں کیونکہ زمین کی سطح، جو بارش کی وجہ سے کسی قدر پگھل گئی تھی، اب دوبارہ جم چکی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اترا لیکن میں ابھی سیدھا گاؤں کی طرف جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے ابھی اپنے پرانے گھر کو جی بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ایک تنگ راستہ اپنانے کا فیصلہ کیا جو پہاڑی کی بلندی سے مردانے کے کوارٹروں کے سامنے کھلے صحن تک جاتا تھا۔

ماضی میں صحن میں موجود رہنے والی کسی بھی چیز نے اپنے سابق مالک کا استقبال نہ کیا۔ نہ اس صحن نے جس میں اس کا سابق مالک دو عشروں تک چلتا پھرتا رہا، نہ اس کنویں نے جو اپنے خدا کے عطا کردہ ذائقے کی وجہ سے علاقہ بھر میں مشہور تھا، نہ اس کنویں کے ساتھ ایستادہ اس چٹان نے جس پر کھڑے ہو کر نیچے نہانے والے پر بڑے اچھے طریقے سے پانی ڈالا جا سکتا تھا، نہ ان درختوں نے جو گھر اور باغ کے اس حصے کو فروخت کرتے وقت اشیاء کے طور پر درج کئے گئے تھے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی صحن میں موجود نہ تھا، وہاں چند سور اپنے باڑے میں دندنا رہے تھے اور کچھ مرغے پورے صحن میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ اندر سے برتنوں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی آوازیں آ رہی تھیں، جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ سارا خاندان رات کی کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ مردوں کے حصے کے وسیع برآمدے کا فرش اب بھی لکڑی کا بنا ہوا تھا لیکن اب یہ وارنش سے چم چم چمکنے والا فرش نہ تھا اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اور جگہ جگہ کیچڑ لپی ہوئی تھی۔ اس فرش کے اوپر کا چھت چوہوں کے پیشاب کے دھبوں سے داغدار ہو گیا تھا۔ دو طرفہ سلامی دار چھت کی اریبی کڑیوں، چھجے کے نچلے حصے اور ابابیلوں کے گھونسلوں میں مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے جو اس بات کی نشانی تھی کہ ابابیلیں اب وہاں نہیں رہتیں۔

دادا جان کے مطابق اس گھر کی تعمیر کے دوران تمام تر ضروری معاملات کا خیال رکھا گیا تھا۔ اس گھر کے پچھلی طرف ایک پہاڑی تھی جو پیچھے سے اس کی حفاظت کرتی تھی، اس کے سامنے دھان کے کھیت تھے، دائیں اور بائیں سے بھی اس کی حفاظت کا خاص خیال رکھا گیا تھا، مختصر یہ کہ ٹھوس بنیادوں پر ایک کھلا، وسیع اور خوبصورت ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تو تب یہ گھر بنا تھا۔ دادا جان اکثر کہا کرتے تھے، ''یہ ایک

MashalBooks.com

شاندار گھر ہے، اس میں روشنی کا اچھا انتظام ہے، کھلی اور تازہ ہوا آتی ہے اور اس کا پانی میٹھا اور صاف ہے۔ جب میں اپنے مقبرے میں جا سوؤں گا تو اس کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنا۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری کام کرنے کی فطری صلاحیتیں جواب دے چکی ہیں لیکن مجھے اس وقت تک فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے جب تک میرا یہ معمولی سا کھلیان خالی نہیں ہو جاتا لیکن یہ تکلیف میں مبتلا کرنے والا وقت مجھے پریشان کر دیتا ہے''۔ دادا جان یہ باتیں کرتے اور پھر ایک ویران سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آ جاتی تھی۔ جب سے میرے پردادا اپنی نوکری سے استعفیٰ دے کر واپس آئے اور اپنے آبائی گاؤں میں بس گئے تھے، اس وقت سے میرے خاندان کے معاشی معاملات کچھ اچھے نہیں جا رہے تھے اور بتدریج زوال پذیر تھے۔

ایک لمحے کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اپنے دادا جان کو اس جگہ کے قریب کہیں دیکھا ہے جو کبھی ان کی قبر کہلاتی تھی۔ بعد میں ایک اور واہمہ میرے ذہن پر چھا گیا کہ میں نے انہیں دیوان خانے کے کوارٹروں کے آگے بنے ہوئے برآمدے میں دیکھا لیکن رونے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ میرے دادا کے پاس ہمیشہ نرکل سے بنی ہوئی دو چٹائیاں ہوتی تھیں جو ان کے پڑھائی کے کمرے کے باہر برآمدے میں بچھی رہتی تھیں اور ان کے ہاتھوں سے لکھا ہوا ایک سائن بورڈ تھا جس پر لکھا تھا ''مچھلی نما سمندر سے آسمان پر چھلانگ لگاتی ہے'' اُس بورڈ کے نیچے تاڑ سے بنے ہوئے نلکی نما بازو، نرسل سے بنا ہوا بارش سے بچاؤ کرنے والا ایک ہیٹ اور پیٹھ کھجانے والی چھڑی لٹکی ہوتی تھی۔ بازو پوش گرمیوں کے دنوں میں آستینوں میں ہوا کی آمد و رفت کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ پیٹھ کھجانے والی چھڑی سے میں اکثر کھیلا کرتا تھا اور اس کی عجیب سی ہیئت دیکھ کر ہنستا تھا۔ برآمدے کے آخر میں ایک مربع شکل کی میز پڑی ہوتی تھی جس پر سیاہی کی دوات، خطاطی کیلئے برش اور پرندوں کے پروں سے بنے دو پنکھے رکھے ہوتے تھے۔ آلو بخارے کی لکڑی سے بنی ایک منقش الماری ایک اندھیرے کونے میں پڑی رہتی تھی، اس پر آڑو کی لکڑی سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ ان کی چھڑی لمبے رخ پر برآمدے میں پڑی ہوتی تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے ایسے یاد آ رہی تھیں جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں وہاں اس نیم تاریک کونے میں ایسے کھڑا تھا جیسے کوئی بھولا بھٹکا مسافر کسی دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے اور اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہوتی کہ آگے کدھر جانا ہے۔

میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور ایک دروازے سے اندر جھانکا۔ایک چولہے میں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ یہ دیوان خانے کے کمروں کا باورچی خانہ تھا جس میں فرش پر بنے ہوئے چولہے پر ایک بڑا سا فولاد کا برتن رکھا ہوا تھا۔ چونکہ ہم نے کبھی مویشی نہیں پالے اس لئے فولاد سے بنا ہوا یہ بڑا برتن کبھی مویشیوں کی خوراک تیار کرنے کیلئے استعمال نہیں کیا گیا البتہ کبھی کبھار اس میں پھلیوں کی پیسٹ پکائی جاتی تھی یا مچھلی کا تیل نکالا جاتا تھا اور ایسی ہی دوسری چیزیں بنانے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔

دروازے اور دوسری درزوں سے باہر آنیوالا دھواں میرا جانا پہچانا تھا۔اس کی خوشگوار خوشبو بتا رہی تھی کہ وہ باجرے کی چھڑیاں اور پھلیوں کے چھلکے جلا رہے ہیں۔اس خوشبو، پچھلے دس برسوں سے میری قوت شامہ جس سے نا آشنا رہی، سے مجھے اپنا پرانا دور پھر یاد آ گیا جب میں باجرے کی چھڑیاں اور پھلیوں کے چھلکے چولہے میں ڈال کر آگ جلاتا تھا۔ مجھے اپنی جوانی اور لڑکپن کا زمانہ زیادہ یاد آتا ہے حتیٰ کہ اس وقت مجھے زمینوں کی کاشت کا کام بھی سنبھالنا پڑا تھا، بہ نسبت اپنے بچپن کے جب مجھے ہر طرح کی آسائش حاصل تھیں اور سبھی مجھ سے پیار کرتے تھے۔ میں وہ تمام خوشبوئیں یاد کرنے لگا جو مردانے کے پڑھائی کے کمرے میں جلنے والے چولہے سے اٹھتی تھیں اور جو میرے ذہن میں اب تک محفوظ تھیں۔ہم بہت سی چیزیں بناتے تھے لیکن مکئی اور پیٹھا کدو اور شکر کے شیرے سے بنی ہوئی مٹھاس کی خوشبو میرے بدن میں سمائی ہوئی ہے۔ ہر سال فصل کی کٹائی کے بعد اور آباؤ اجداد کی رسوم ادا ہو جانے کے بعد ہم اس طرح کی مٹھائیاں بناتے تھے۔ان مٹھائیوں سے ہم اہم مواقع جیسے نئے سال کی رسومات یا دادا جان کی سالگرہ کے موقع پر میٹھے پکوانوں کے لئے شیرہ حاصل کرتے تھے۔ان سے سنیکس تیار کئے جاتے تھے جو دادا جان بہت پسند کرتے تھے۔ دادا جان کے کمرے میں ان کی مطالعہ کی میز کی دراز میں شیرے والی مٹھائیاں ہر وقت موجود ہوتی تھیں اور اس وجہ سے بچے ان کے کمرے کے چکر لگاتے اور طواف کرتے نظر آتے تھے۔ جب مٹھائیاں کچھ کم ہوتیں تو ماں کچھ اور بنا کر وہاں رکھ دیتی تھی۔اس کے علاوہ ماں ہر شام ان کے کمرے میں چاولوں کے پانی کا پیالہ رکھنا بھی نہیں بھولتی تھی۔

ماں کھانے پکانے کے معاملات کی ماہر تھی، وہ ایک پرہیز گار اور باعصمت بہو بھی تھی چنانچہ وہ اپنے سسر کے لئے وقت اور موسم کی مناسب سے کھانے تیار کرتی تھی۔ جنوری کے آغاز میں وہ کافی مقدار میں رائس کیک تیار کرتی تھی۔ جنوری کے پورے چاند کے روز وہ شیرے والے چاول پکاتی جس کی تیاری

میں شکر اور کئی قسم کے میوے استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ مختلف نوعیت کے مشروب اور روایت کے مطابق کچھ خستہ پھلیاں بھی بناتی۔ مختلف طرز کے کھانوں کی تیاری کا یہ سلسلہ سارا سال چلتا رہتا اور وہ مختلف نوعیت کے کیک بھی تیار کرتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں وہ مرغ کے گوشت سے کھانے تیار کرتی اور موسم سرما کے وسط میں سرخ پھلیوں کا پیسٹ تیار کرتی۔ وہ دسمبر کے مہینے میں کسی روز دستور کے مطابق سلاخوں پر گوشت بھوننا بھی نہیں بھولتی تھیں۔ جن دنوں دادا جان بیرونی دورہ پر جاتے میری موج ہو جاتی تھی۔ میں ان کے کمرے میں گھسا اپنی پسند کے سنیکس کھاتا رہتا تھا۔ ان کے کمرے میں مجھے شہد اور ٹافیاں وغیرہ ہی نہیں ملتی تھیں بلکہ شیرے اور چاول سے بنے ہوئے کیک، پھل اور پھلیاں بھی وافر مل جاتی تھیں۔

موسم بہار اور خزاں میں ان کے کمرے سے مچھلی کے تلے ہوئے ٹکڑے اور خشک کی ہوئی اور شیل فش ملتی تو گرمیوں میں مختلف ادویات میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں میرے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کیلئے وہاں پڑی ہوتی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ میں ہر بار دادا جان کی چیزیں چرا کر ہی کھاتا تھا، وہ اکثر مجھے اپنے پاس بلا لیتے تھے اور مزے مزے کی چیزیں کھانے میں مجھے اپنے ساتھ ملا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ میری ماں مجھے کچھ جیب خرچ بھی دیتی تھی چنانچہ میں بازار سے بھی اپنی پسند کی چیزیں خرید کر کھا سکتا تھا۔ دادا جان کی نظر کمزور تھی چنانچہ ان کی نظر بچا کر میں جی بھر کر کھاتا تھا۔ لڑکپن کے اختتام اور جوانی کے آغاز کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت مجھے بھوک بھی کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔ جب میں نے ابھی پڑھائی شروع نہیں کی تھی تب بھی میں اپنی مرضی کی چیزیں حاصل کر لیتا تھا۔ میرا طریقہ کار یہ تھا کہ میں کمرے کے فرش پر بیٹھ کر اتنی اونچی آواز میں ماں سے کوئی کھانے کی چیز طلب کرتا کہ جس کی آواز مردانے حصے میں بھی سنی جا سکے، اونچی آواز میں بات کرنے کا مقصد دادا جان کی توجہ حاصل کرنا ہوتا اور میں اپنے مقصد میں اکثر کامیاب رہتا تھا۔ اس وقت اونگ جومی کہتی کہ ذرا اور اونچی آواز میں بولو اور میں اس کی ہدایت پر عمل کرتا رہتا تھا۔

جلد یا بدیر مطالعہ کے کمرے سے دادا جان کی آواز آتی ''یہ بچہ کیوں رو رہا ہے؟'' پیٹ میں درد تو نہیں؟ یا کوئی اور مسئلہ ہے۔ پھر توقع کے عین مطابق وہ کہتے ''اسے یہ دوا کھلا دو'' اس تجویز کے پیش ہونے کے بعد میں بھاگنے کیلئے تیار ہو جاتا تھا کیونکہ مجھے دوا کھانے سے زیادہ برا کام اور کوئی نہیں لگتا تھا۔ پھر اونگ جومی سارا بھانڈا پھوڑ دیتی اور کہتی کہ میں بیمار نہیں ہوں بلکہ ٹافی کے لئے ضد کر رہا ہوں۔ اس پر

MashalBooks.com

داداجان تاسف کا اظہار کرتے اور اگر میری قسمت اچھی ہوتی تو اپنے پاس بلا کر چاندی کے چمچ کے گرد لپٹی ہوئی شیرے والی مٹھائی دیتے۔ میرے خیال میں چمچ پر سے کاٹ کر مٹھائی یا گڑ الگ کرنا دنیا کا سب سے مزے دار کام ہے۔ لیکن جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی اس حوالے سے داداجان کی فیاضی گم ہوتی گئی۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں سات سال کا تھا اور میرا بھتیجا تین برس کا ہونے والا تھا۔ میں ابتدائی قاعدہ ختم کر چکا تھا اور پہلی جماعت میں پڑھنا شروع کر رہا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے میرا بھتیجا دادا جان کی فیاضی کا زیادہ مستحق بنتا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے دادا جان سے اپنی پسند کی چیزیں نکلوانے کے مختلف طریقے وضع کر لئے تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح اپنے بھتیجے کو رونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ داداجان اسے چپ کرانے کیلئے ٹافیاں اور مٹھائیاں دیتے تھے اور اس میں سے میں اپنا حصہ وصول کر لیتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ یہ میں اپنے بھتیجے کو مغلظات سکھاتا اور ایسی صورتحال پیدا کرتا کہ وہ داداجان کے سامنے اپنی توتلی زبان میں وہ کلمات بولے۔ چونکہ داداجان بچوں سے ذرا کم ہی محبت کرتے تھے چنانچہ وہ اسے کوئی ٹافی یا مٹھائی دیتے اور وہاں سے بھگا دیتے۔ اس میں سے میں اپنا حصہ لے لیتا تھا۔ یہ دونوں طریقے میں نے جب بھی آزمائے مجھے ان میں کامیاب ملی۔

میں اپنے بھتیجے کے ساتھ مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوتا اور وہ اپنی پوری آواز میں چلاتا ''دیکھو دادا کے سر پر مرغا، دادا کے سر پر مرغا'' دادا ایک دوبار کھانستے جیسے جماہی لے رہے ہوں اور پھر مطالعہ کے کمرے کا دروازہ کھولنے کیلئے مڑتے۔ ہر بار داداجان کے مٹھائیوں والے مرتبان کے اثاثے میں کچھ کمی واقع ہو چکی ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد میرا بھتیجا میری ترغیب کے بغیر ہی یہ عمل دھراتا اور مجھے بغیر کسی مشکل کا سامنا کئے کچھ اور ٹافیاں مل جاتی تھیں۔

میں نے اندازہ لگایا کہ دھواں صرف مردانے کے مطالعہ کے کمرے سے ہی نہیں آ رہا تھا، بڑے دروازے کے ساتھ بنے کواٹروں کی چمنی سے بھی نکل رہا تھا اور دھویں کا رنگ بتاتا تھا کہ خشک گھاس اور درختوں کے گرے ہوئے سرکی پتے جلائے جا رہے ہیں۔ دراصل بیرونی کوارٹر ٹین کے چھتوں والی الگ عمارت تھی جس کے دو کمرے اور ایک بڑا داخلی دروازہ تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے شخص نے ان میں سے ایک کمرے میں اپنی رہائش رکھی ہوئی تھی جہاں ہم اناج کی بوریاں بھی رکھتے تھے جبکہ دوسرا کمرہ خشک گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا چنانچہ موخر الذکر میں ہم کبھی آگ نہیں

MashalBooks.com

جلاتے تھے اور رات کو بھی کبھی کبھار ہی اس میں روشنی کرتے تھے۔ البتہ آج وہ کمرہ واضح طور پر گرم کیا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ اس میں سو رہے ہیں۔ ریلوے آفیسر کا خاندان اتنا بڑا نہ تھا، چنانچہ واضح تھا کہ یہ کمرہ کرائے پر دیا گیا ہے اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کمرے میں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ اس کمرے کا فرش کاغذ کا بنا ہوا تھا اور اسے ہر وقت صاف ستھرا رکھا جاتا تھا۔ اس میں رکھی جانے والی چیزوں کا تقاضا تھا کہ یہ صاف ستھرا رہے۔ اس کمرے میں کچھ تھا، یہ یاد کرتے ہوئے میں دوسری طرف چلا گیا۔

جب میں بچہ تھا تو اس کمرے میں جانے سے گھبراتا تھا، میں ہر وقت محتاط رہتا کہ کوئی مجھ سے یہ نہ کہہ دے کہ اس کمرے سے فلاں چیز لا دو۔ فرض محال مجھے اس کمرے میں جانا ہی پڑتا تو میری کوشش ہوتی کہ کوئی نہ کوئی میرے ساتھ چلے، چاہے وہ میرا چھوٹا بھتیجا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ کمرہ متفرق اشیاء سے بھرا رہتا تھا، وہاں ادویات میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں اور ان کی جڑوں کے گٹھے رکھے ہوئے تھے، عبادت کے لئے ایک کالے رنگ کی میز تھی، لوبان یا کسی خوشبودار شے کی دھونی دینے کیلئے ایک انگیٹھی تھی اور رسم ادا کرنے کا سامان تھا، علم لانساب کے بارے میں کتابوں کا ڈھیر اور کتابوں کے کور کے لئے لفظ کندہ کرنے والا ایک پریس تھا۔ لیکن مجھے ان سب چیزوں سے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں جس چیز سے خوفزدہ رہتا تھا وہ اس کمرے میں رکھا ہوا ایک تابوت تھا جو پٹ سن کے ٹاٹ سے ڈھانپا گیا تھا اور یہ کمرے کے آخری کونے میں پڑا رہتا تھا۔ اس تابوت کے اوپر ایک بڑا سا بنڈل رکھا ہوتا تھا اور وہ بھی پٹ سن سے بنے ٹاٹ میں لپٹا ہوتا تھا۔ اس میں دادا جان کا کفن اور خاندان کے افراد اور نوکروں کیلئے رسمی پوشاکیں تھیں، اس کیلئے اس میں کفن دفن سے متعلق اشیاء بھی تھیں۔ یہ چیزیں اس لئے اکٹھی کر کے رکھی گئی تھیں کہ دادا جان کی عمر اس وقت نوے سال کے قریب تھی اور وہ کسی وقت بھی اس دنیا سے عدم آباد سدھار سکتے تھے۔ میں تابوت اور اس پر رکھے بنڈل سے خوف کھاتا تھا۔ میں نے اکثر جنازے کے جلوس کو گزرتے دیکھا ہے اور ہر بار میں جب یہ منظر دیکھتا تو کانپ جاتا اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا۔

کوریا کی جنگ میرے خاندان کیلئے تباہی کا سامان لے کر آئی۔ اس جنگ سے کئی خاندان متاثر ہوئے تھے لیکن ہمارے خاندان کو اس سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اس سال دسمبر میں ہمارے

دادا جان چل بسے۔ وہ اس لحاظ سے بہت بدقسمت تھے کہ ان کا بیٹا اور ایک سب سے بڑا پوتا ان کی آنکھوں کے سامنے مر گئے۔ تنکوں سے بنی ہوئی ایک چٹائی اور بانس کا ایک ڈانڈا امردوں کے کوارٹر کے برآمدے میں تین سال تک رکھے رہے اور پٹ سن سے بنا ہوا لمبا با کوٹ پھانسی لگے ہوئے سپاہی کی طرح دیوار کے ساتھ لٹکتا رہا۔ مرنے والوں کی نیاز کرنے کیلئے یہ میرا تعزیتی لباس تھا۔ اپنے پورے خاندان میں، میں واحد فرد تھا جو اس وقت وہاں موجود نہ تھا جب دادا جان بستر مرگ پر پڑے تھے۔ مجھے کسی رشتے دار کے ہاں بھیج دیا گیا تھا تا کہ میں جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ سکوں۔ دادا جان کی موت اچانک نہیں ہوئی تھی۔ اپنے بیٹے اور پوتے کی موت کا دکھ ان کے دنیا سے چلا چلے جانے کا باعث بنا تھا۔ مرتے وقت وہ نوے سال کے تھے۔ انہوں نے آخری الفاظ یہ کہے تھے کہ میری علم الانساب کی کتابوں کی دیکھ بھال کرنا۔

یہی سب کچھ تھا۔ یہی علم الانساب ہے۔ جو شخص معاشرتی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کے زمانے میں اپنے خاندان کی عظمت اور وقار کا علم بلند کئے ہوئے ہو اس کیلئے خاندانی حسب ونسب خطابات اور گھر اور زمینوں کے معاملات سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اب میں اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ان کی کتابوں کو سنبھالے ہوئے ہوں جن میں دادا جان کے وقت سے کوئی ردو بدل نہیں کیا گیا۔ مجھے جب بھی دادا جان کی یاد آتی ہے میں ان کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کتابوں کے اوراق میں اپنے دادا کی خوشبو سونگھ سکتا ہوں۔

ایسا نہیں تھا کہ دادا جان کو معزز خاندانوں کے سلسلہ میں کوئی نمایاں مقام حاصل تھا یا وہ خود پرستی اور خود پسندی کے فریب میں مبتلا تھے۔ ہمارے خاندانی سلسلے میں سے کبھی کوئی وزیراعظم یا عام وزیر نہیں بنا لیکن میرے آباؤ اجداد بادشاہ کی حکومت میں نسل در نسل خدمات انجام دیتے رہے۔ دادا جان ایک نجی سکالر کے طور پر پہچانے جانے پر شرم محسوس کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کی عزت واہمیت کم کرنے کا ذمہ دار خود کو قرار دیتے تھے۔ اپنی ساری زندگی وہ اپنے خاندان کے گزرے لوگوں کی عزت و تکریم کرتے رہے اور ایک ایسے وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کرتے رہے جس سے ثابت ہو کہ وہ ایک باعزت اور معزز خاندان کے وارث ہیں۔ اپنی نوے سالہ زندگی میں دادا جان نے کبھی سر پر پہننے والا بینڈ اور ہیٹ کے نیچے پہننے والی ٹوپی نہیں اتاری، چاہے جتنی بھی گرمی پڑے وہ کبھی ننگے پاؤں نہیں چلے، روایات کے ساتھ دادا جان کے اٹوٹ تعلق کا نتیجہ تھا کہ میری ماں نے گھٹنے تک لمبے ڈھیلے

جا نگئے کبھی نہیں پہنے اور ہماری نوکرانی اونگ جومی کو اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے بال کاٹ سکے۔ ہمارے خاندان کی خواتین ایسا کچھ کرنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھیں، جسے دادا جان ناپسند کرتے ہوں۔

دادا جان کا اختیار کردہ نام ننگ ہا تھا، وہ 1861ء میں پیدا ہوئے۔ وہ سانگ جو کے مجسٹریٹ کے بیٹے اور کانگ ننگ کے میئر کے پوتے تھے لیکن انہوں نے سول سروس کے امتحان میں شرکت نہیں کی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ امتحان میں شرکت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ خاندان کے سبھی بڑوں نے اپنے عہدوں سے استعفے دے دیئے تھے اور اپنے آبائی گاؤں لوٹ آئے تھے تاکہ ریٹائرڈ زندگیاں بسر کرسکیں اور خاندان کے زوال کے زمانے میں وہ خود کو سول سروس کے امتحان میں شرکت کیلئے تیار نہ کرسکے۔ سرکاری نوکری میں شامل نہ ہونے کا ذمہ دار وہ ملک کے سقوط اور زوال کو قرار دیتے تھے اور خود کو بدقسمت تصور کرتے تھے۔ وہ انقلاب کے مخالف تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے طور طریقوں پر عمل کرنے کو مناسب گردانتے تھے۔ اس خاندان کا ایک شخص ژی سانگ جئی جدیدیت اور اصلاحات کو فروغ دینے کا حامی تھا اور اس نے دادا جان کی سوچ کو مسترد کردیا تھا۔

واحد عہدہ جو دادا جان نے قبول کیا وہ ہوام اکیڈمی کی چانسلر شپ تھی۔ یہ اکیڈمی صوبے چولو نگنا کے علاقے اوکی میں تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اس وقت اسی سال سے زیادہ کے ہوچکے تھے لیکن ڈولی والے کہار بڑی تقریبات میں ان کی شرکت کیلئے انہیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ دادا جان نے اکیڈمی میں رہائش اختیار نہیں کی تھی اور وہ اپنے گھر میں رہ کر ہی سارے معاملات نمٹاتے تھے۔ جس کسی کو بھی دادا جان سے کوئی کام ہوتا وہ ہمارے گھر آجاتا تھا۔ جب میں اتنا بڑا ہوا کہ یہ سمجھ سکوں کہ اکیڈمی کیا ہوتی ہے تو اس وقت تک دادا جان اپنی عمر کا جواز پیش کرکے اکیڈمی سے الگ ہوچکے تھے۔ جاپانیوں کے قبضے کے دوران اس اکیڈمی نے ہر طرح کی زیادتیوں اور مداخلتوں کا کامیابی کے ساتھ سامنا کیا لیکن جدیدیت کے طوفان کے سامنے وہ بھی نہ ٹھہر سکی۔ میرے خیال میں دادا جان کے اس اکیڈمی سے الگ ہونے کی بڑی وجہ ان کی عمر نہیں بلکہ جدیدیت کی یہی لہر تھی تاہم اس بارے میں، میں کوئی واضح رائے قائم نہیں کرسکتا۔

اکیڈمی کے ملازمین میں سے ایک بڑی عمر کا شخص اکثر ہمارے گھر آتا تھا۔ اس کی عمر 60 سال کے قریب ہوگی اور گاؤں کے باہر یا بڑی شاہراہ کے کنارے میں اگر اسے نظر آجاتا تو وہ تعظیماً نیچے

MashalBooks.com

جھک کر سلام کرتا اور پوچھتا کہ دادا جان گھر پر ہیں؟

میں اسے بتاتا کہ ہاں وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں ہیں۔

ایک دفعہ میں اسے لے کر گھر آ گیا اور دادا جان سے کہا کہ آپ کے مہمان آئے ہیں۔

''کون مہمان''؟ دادا جان نے پوچھا۔

''ایک معمر، معزز آدمی ہے'' میں نے جواب دیا لیکن بعد ازاں اسے مہمان بلانے اور معزز قرار دینے پر میری سرزنش کی گئی۔ دادا جان اسے ہمیشہ یہی کہتے ''ارے تم ہو سبوک''؟ یہ ایسے الفاظ تھے جسے سامنے والا بالکل بچہ ہو۔ کافی بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ معمر شخص ایک جبری نوکر ہے اور اس کا تعلق اکیڈمی سے ہے۔ دادا جان اکیڈمی کے نوجوان نوکروں کو بھی انہی الفاظ میں مخاطب کرتے یا شاباش دیتے تھے اور میں حیران ہوتا تھا کہ اکیڈمی کے سبھی ملازمین کا ایک جیسا نام ہے جو دادا جان انہیں ''سبوک'' پکارتے تھے۔ میں نے جو الفاظ سیکھ رکھے تھے ان میں ''سو'' اور بوک'' جیسا کوئی امتزاج نہیں تھا۔ میرا نام محض اس بناء پر کئی بار تبدیل کیا گیا تھا کہ گاؤں کے کئی لوگوں نے اپنے بچوں کا وہی نام رکھ لیا تھا چنانچہ یہ میرے لئے حیرت کا باعث تھا کہ دادا جان اکیڈمی کے سبھی ملازمین کو سبوک کہہ کر پکارتے تھے۔ جب یہ معمہ میری سمجھ میں نہ آیا تو ایک روز میں نے اپنی ماں سے پوچھ لیا کہ اکیڈمی کے سبھی ملازمین کا نام ''سبوک'' ہے۔

''ہاں یقیناً وہ سبوک ہیں کیونکہ وہ اکیڈمی میں نوکری کرتے ہیں۔ ماں نے جواب دیا، تب مجھے سمجھ آیا کہ ''سبوک'' کوئی مخصوص نام نہیں ہے بلکہ نوکروں کیلئے استعمال کیا جانے والا عام سا لفظ ہے۔

اکیڈمی کے نوکروں پر دادا جان کا حکم چلتا تھا، پورے گاؤں اور اس کے مضافاتی علاقوں کیلئے بھی ان کا کہا ہوا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے ہی نہ تھا بلکہ ان میں کچھ ذاتی خوبیاں بھی ایسی تھیں کہ عام لوگوں کے علاوہ علاقے کے معززین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا ہے کہ جب میں پیدا ہوا تو دادا جان کی عمر اسی سال کے لگ بھگ تھی چنانچہ میرے ذہن میں ان کی جو تصویر ہے وہ محض جزوی ہے، جو کچھ میں نے دیکھا وہ ایک بچے کی آنکھ سے دیکھا، اس کے باوجود میری زندگی پر ان کی عادت واطوار کا اچھا خاصا اثر ہے۔ میری زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جو ان کی یاد سے خالی ہو۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پوتوں میں سے صرف میں ہی

ہوں جس نے ان کی تعلیمات کو پلے باندھا اوران پر عمل بھی کیا۔ میرے ابا جان نے اس کے برعکس راستہ اختیار کرتے ہوئے اس زمانے اور وقت کی روایات کو مسترد کر دیا لیکن یہ میری پیدائش سے کافی پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے ابا جان نے جو راستہ اختیار کیا اس کی وجہ ان کے اپنے ابا جان سے کوئی ذاتی مخالفت نہ تھی نہ ہی انہوں نے کبھی قدیم رسوم اور روایات کو فضول قرار دیا۔ ابا جان ایک بیٹا ہونے کے ناطے اسی قدر وفادار تھے کہ اگر ابا جان ان سے جان مانگتے تو وہ ہنسی خوشی اپنے والد پر نثار کر دیتے لیکن نظریے اور سوچ کے لحاظ سے انہوں نے دادا جان سے الگ راستہ اختیار کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابا جان نے اپنے عالی نسب ہونے کو بہت کم اہمیت دی تاہم وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ چند ہی دانشور افسران ایسے ہوں گے جس کی ایمانداری ہمارے بزرگوں کی طرح مثالی ہو گی۔ انہوں نے اپنے عالی نسب ہونے کا کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، نہ ہی کبھی یہ شکایت کی کہ ان کو ترکہ بہت کم ملا۔ دادا جان نے بھی کبھی اس حوالے سے شکایت نہیں کی، وہ شکایت کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہی تھے جو خاندانی وقار میں کمی کا باعث بنتے تھے۔ انہیں اپنے والد یعنی میرے پردادا سے اچھی خاصی جائیداد ملی تھی، جو دادا جان نے جاپانی قبضے کے دوران اجناس کی مارکیٹ میں پیسہ لگانے کیلئے تھوڑی تھوڑی کر کے بیچ ڈالی۔ اس کے برعکس ابا جان کو انتظامی معاملات میں اچھی خاصی مہارت حاصل تھی۔ پیشے کے لحاظ سے وہ عرائض نویس تھے لیکن وہ بہت سے مچھلی فارموں کے بھی مالک تھے اس کے علاوہ نمک کے فارم کا ایک حصہ بھی ان کے پاس تھا۔ یہ صورتحال میری پیدائش سے چند سال پہلے کی تھی۔ پھر حالات نے کروٹ لی اور فوجی آزادی کی جدوجہد شروع ہونے کے وقت یا آپ یہ کہہ لیں کہ میری پیدائش کے بعد سے میرے ابا جان انقلابی بن گئے۔ وہ سماجی طبقات کے نظام کو مہلک قرار دیتے تھے اور انہوں نے ایک ایسے نظام کی جدوجہد کیلئے اپنے آپ کو وقف کر لیا جس میں عوام ہی اصل طاقت ہوں۔ ابا جان اپنی جدوجہد کی کامیابی کے لئے جگہ جگہ تقریر کرتے اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ انہوں نے بہت سے کسانوں اور مزدوروں کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ اس کے کئی سال بعد ساؤتھ لیبر پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اب ابا جان اور دادا جان کے درمیان خلیج کا حائل ہونا قدرتی امر تھا۔ اگرچہ دادا جان نے ابا جان کے نظریات کو مسترد کر دیا تھا لیکن انہوں نے ابا جان کو ان کی سرگرمیوں سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ غالباً وہ تاریخ کی اس ناقابل مزاحمت لہر کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتے تھے، جس کی وجہ سے انہیں قبل از وقت ریٹائر بھی ہو جانا پڑا تھا۔

MashalBooks.com

جس دنوں میں ابتدائی سباق مکمل کرنے کے بعد پہلی جماعت میں پڑ رہا تھا ان دونوں ابا جان زیادہ تر جیل میں رہتے تھے۔ وہ بحری جہاز کے مالک نہ تھے، نہ ہی وہ وثیقہ نویس تھے بلکہ وہ چھوٹے درجے کے ایک کسان تھے اور زمینی اصلاحات کے بعد ان کے پاس زمین کا جو ٹکرا بچا تھا، اس سے گزر بسر کر رہے تھے۔

اس طرح میرا لڑکپن دو مکمل طور پر متضاد دنیاؤں میں گزرا۔ میرے گھر کے مردانے میں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک کمرے میں دادا جان نے اپنے مطالعہ کیلئے جگہ بنا رکھی تھی اور وہ سارا دن اپنی میز پر بیٹھ کر کچھ پڑھتے یا لکھتے رہتے تھے، جس کی پشت اس الماری کی طرف ہوتی جس سے میں ٹافیاں اڑایا کرتا تھا۔ دوسرا کمرہ ابا جان ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ابا جان سے جو لوگ ملنے آتے وہ خستہ حال ہوتے تھے جبکہ دادا جان سے صرف وضع دار لوگ ملتے تھے ابا جان سے ملنے والوں میں زیادہ تر عام دیہاتی ہوتے جن کی موجودگی کا دادا جان نوٹس لینا بھی گورانہ کرتے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر پر جمع ہو جاتے تھے۔ جمع ہونے والوں میں گاؤں کا آگ جلانے کی لکڑی فروخت کرنے والا، لوہار، کشتی چلانے والا جو اب نمک لگے جھینگے فروخت کرتا تھا، نمک کے فارم پر کام کرنے والے مزدور، بڑھئی، مل میں کام کرنے والے اور اجناس کے کاروبار میں مڈل مین کا کردار ادا کرنے والے ہوتے تھے۔ وہ روزانہ کے مہمان تھے۔ اس کے علاوہ اکا دکا لوگ رات بھر کے قیام کے لئے بھی آتے تھے، ان میں سے زیادہ تر گھوم پھر کر چیزیں فروخت کرنے والے یا پھر فال نکالنے والے ہوتے تھے۔ پولیس کے چھاپوں کا خوف نہ ہوتا تو ہمارا گھر دن رات ایسے ہی مہمانوں سے بھرا رہتا۔ ابا جان کے مہمان ایک دوسرے کو ''کامریڈ'' کے نام سے بلاتے تھے۔

ممکن ہے ابا جان کے ایسے رویے کی وجہ سے ہی دادا جان نے مجھے، اپنے پوتے کو روایتی طرز زندگی کے مطابق پروان چڑھانے کا موقع دیا ہو۔ ''ایک ہزار حروف'' سکھانے کا مقصد ممکن ہے میرے اندر کلاسیکی تعلیم اور کلاسیکی طرز زندگی اپنانے کی امنگ پیدا کرنا ہو۔ پہلے پہلے میں دادا جان کا واحد شاگرد تھا لیکن ان کی تمام تر محنت اور کوششوں کے باوجود میں نے پڑھائی میں کوئی پیش رفت نہ دکھائی کیونکہ جو کچھ پڑھایا جا رہا تھا مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر ماں نے تجویز پیش کی کہ میرے ساتھ کچھ اور بچوں کو بھی پڑھایا جائے تو ممکن ہے اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں لیکن دادا جان عام آدمی کے بچوں کو

میرے سکول کے ساتھی بنانے کو تیار نہ ہوئے۔

جب پڑھائی میں میری عدم دلچسپی کا سلسلہ جاری رہا تو آخر کار دادا جان مجھے چند ساتھیوں کے ساتھ تعلیم دینے پر رضا مند ہو گئے چنانچہ گاؤں سے میرے دو ہم عمر ساتھیوں چون بائی اور چن ہائی اون کو میرے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی لئے بلایا گیا۔ یہ دونوں ان لوگوں کی اولادوں میں سے تھے جو کسی اور جگہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ان دونوں کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ دادا جان خاندان کے سابق غلاموں اور پرانے وقتوں کے کلرکوں کی اولادوں کو تعلیم دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

پڑھائی دو وقفوں میں ہوتی تھی صبح دس سے بارہ بجے تک اور پھر بعد دوپہر دو سے چار یا پانچ بجے تک یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں ہے کہ پہلے دن کا سبق ہمارے اوپر سے گزر گیا۔ ہمیں پڑھائی سے زیادہ اس سے دلچسپی تھی کہ کب ہمیں اکٹھے کھیلنے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ جب ہمارا سبق ختم ہوا تو ہم پہاڑیوں پر چڑھے، سمندر کی طرف گئے اور اس وقت تک کھیلتے رہے جب تک کہ رات کے پھیلتے ہوئے اندھیرے نے ہمیں واپس گھروں کو جانے پر مجبور نہ کر دیا۔ دادا جان پڑھائی کے دوران بھی ہمیں چھوٹے چھوٹے وقفے دیتے تھے تاکہ ہم تازہ دم ہو سکیں لیکن اس کا مزہ نہیں آتا تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں دادا جان میرا نام پکارتے اور ہمیں واپس آنا پڑتا۔ چنانچہ ہم نے کھیلنے کودنے کیلئے زیادہ وقت نکالنے کیلئے دادا جان کو جل دینا شروع کر دیے۔

پڑھائی کے دوران ہم میں سے ایک کہتا، ''سر مجھے بیت الخلاء جانے کی حاجت ہو رہی ہے'' پھر وہ ایسی اداکاری کرتا کہ جیسے اپنی بیلٹ کھول رہا ہے۔

دادا جان کہتے، ''نمک والی چیزیں زیادہ نہ کھایا کرو۔ نمک والی چیزیں کھانے سے تمہیں زیادہ پانی پینا پڑتا ہے اور پھر تمہیں رفع حاجت کیلئے بیت الخلاء جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ٹھیک ہے اب جلدی سے جاؤ اور فوراً واپس آ جاؤ''۔

دادا جان کے اتنا کہنے پر ہم تیزی سے باہر کی طرف دوڑ لگا دیتے، اگر ہم تیزی دکھائیں اور خاموش رہیں تو دادا جان کو آسانی سے جل دے سکتے تھے کیونکہ ان کی نظر کافی کمزور تھی۔ دادا جان کبھی ہماری پٹائی نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ دوسرے دونوں لڑکوں کو اپنے پوتے کی خاطر پڑھاتے ہیں اس لئے سزا دینا نامناسب تصور کرتے تھے۔

مجھے محسوس ہوتا کہ دادا جان ہمیں پڑھانے میں خوشی محسوس کرتے تھے ورنہ پہلے تو وہ سارا دن کنول آسن میں بیٹھے بند آنکھوں کے ساتھ پرانی یادوں سے دل بہلایا کرتے تھے یا پھر ان کتابوں سے اپنے پسندیدہ پیرا گراف کئی کئی بار پڑھتے جو انہوں نے کبھی اپنی جوانی میں پڑھی تھیں چنانچہ کڑھنا اور دوسروں کو برا بھلا کہنا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔

پڑھائی کے لحاظ سے میں دوسرے لڑکوں سے کافی آگے تھا، اس کی دو وجوہ تھیں، ایک یہ کہ میں نے ان لڑکوں سے کافی پہلے پڑھنا شروع کیا تھا اور دوسرا یہ کہ ان کی اور میری نصابی کتابیں بھی مختلف تھیں۔ میرے پاس جو کتاب تھی وہ میرے دادا جان نے اپنے ہاتھوں سے لکھی تھی اور اس میں الفاظ کے معانی اور ان کے کورین زبان میں تلفظ واضح نہیں کئے گئے تھے۔ اس کے برعکس دوسرے دو لڑکوں کی کتابیں کمرشل بنیادوں پر چھاپی گئی تھیں اور ان میں یہ چیزیں موجود تھیں۔ یقیناً ہم میں سے کوئی بھی کورین زبان نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن اس سے فرق تو پڑتا ہے۔ دادا جان جو کچھ بتاتے اور بولتے تھے ان کے تلفظ اور معانی میں اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیتا تھا۔ دوسرے دونوں لڑکے اپنے گھروں میں اپنے ماں باپ کی مدد سے پڑھتے تھے۔ اب دادا جان جو کورین زبان بولتے یا لکھتے تھے وہ نصف صدی پرانی تھی چنانچہ جب دادا جان کچھ بتاتے یا پڑھاتے تھے تو میں اپنی یادداشت کی مدد سے اسے آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا تھا لیکن باقی دونوں لڑکے تذبذب کا شکار ہو جاتے تھے کیونکہ جو کچھ دادا جان بتاتے تھے اور جو کچھ گھروں میں انہوں نے اپنے والدین سے سیکھا ہوتا تھا ان میں زمین آسمان کا فرق ہوتا تھا۔ بہرحال ہم نے کسی نہ کسی طرح ’’ایک ہزار حروف‘‘ یا شبیہوں‘‘ کا کورس مکمل کر لیا اور پہلی جماعت میں آ گئے۔ اب ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ دادا جان کے پیچھے پیچھے الفاظ اور محاورے بول اور سمجھ سکیں۔

دادا جان کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے کتاب کے کسی سبق کا ایک پیرا گراف پڑھتے اور پھر بڑے دلچسپ انداز میں اس کی تشریح کرتے جو ہماری سمجھ میں آ جاتی تھی۔ دادا جان نے میری کچھ اور ذمہ داریاں بھی لگا رکھی تھیں جن کا تعلق میرے روزمرہ کے کاموں سے تھا۔ کوئی بھی موسم ہو اور سال کا کوئی بھی مہینہ ہو مجھے صبح چار بجے بستر سے اٹھنا پڑتا تھا۔ سب سے پہلے میں ٹھنڈے پانی سے اپنے منہ ہاتھ دھوتا۔ ابا جان نے گرم پانی استعمال کرنے سے منع کر رکھا تھا کیونکہ ان کے خیال

MashalBooks.com

میں گرم پانی آدمی کو کاہل اور سست بنا دیتا ہے۔ پھر میں دادا جان کے کمرے میں جا کر ان کی خیریت دریافت کرتا اور گھٹنوں کے بل نیچے جھک کر تعظیم بجالاتا۔ اس کے بعد میں ان کا پیتل کا بنا ہوا سٹول اور اگالدان صاف کرتا تھا۔ جب میں نے ان دونوں چیزوں کی صفائی کا کام شروع کیا تو اونگ جومی مجھ پر بہت زیادہ مہربان ہوگئی کیونکہ یہ اس کے ناپسندیدہ کاموں میں سے ایک تھا۔ چلو سٹول کی صفائی تو کسی نہ کسی طرح کر دی لیکن اگالدان میں سے فضلہ پھینکنا اور پھر اسے مانجھ کر صاف کرنا طبیعت خراب کر دینے والا کام تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد میں مطالعہ کے کمرے کے فرش کو بھیگی ہوئی ٹاکی کے ساتھ رگڑ رگڑ کر صاف کرتا تھا۔ اتنی دیر میں پو پھوٹ پڑتی اور پھر سورج کے طلوع ہونے تک میں دادا جان کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر گذشتہ دن کا سبق دوہراتا تھا۔ چونکہ ہمارے گھر میں زیادہ تر دنوں میں مہمان ٹھہرے ہوتے تھے اس لئے مجھے محتاط رہنا پڑتا تھا کہ کوئی غلطی نہ ہو کیونکہ وہ بھی دم سادھے میرے آواز سن رہے ہوتے تھے۔ عام طور پر میں اس امتحان پر پورا اترتا تھا اور بغیر کسی غلطی کے پورا سبق دادا جان کو سنا دیتا تھا۔

دادا جان اکثر ہمیں یہ نصیحت بھی کرتے تھے کہ خوراک کیسی کھانی چاہیے۔ ''ایک ہزار حروف'' پڑھتے ہوئے جب ہم اس محاورے پر پہنچے کہ سبزیوں میں رائی اور ادرک بیش قدر ہیں'' تو انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''لوگ سبزیوں کا مناسب انتخاب نہیں کرتے اور پھر ان کی تیاری میں بھی احتیاط نہیں کی جاتی اور ان کی تاثیر کو سمجھے بغیر انہیں کھا جاتے ہیں لیکن کسی بھی معزز شخص کو اپنی خوراک کے بارے میں محتاط ہونا چاہیے اور یہ احتیاط سبزیوں سے شروع ہوتی ہے۔ تمہیں یہ محاورہ یاد رکھنا چاہیے اور کبھی کوئی ایسی سبزی نہیں کھانی چاہیے جس میں رائی اور ادرک شامل نہ ہو''۔

''میں خیال رکھوں گا'' میں انہیں وہی جواب دیتا جو ان کی اکثر ہدایات کے آخر میں میری طرف سے دیا جاتا تھا۔ پھر وہ کہتے ''یہ احتیاط تمہیں گھر سے باہر کھانا کھاتے ہوئے بھی کرنی چاہیے''۔

آج بھی جب ان باتوں کو طویل عرصہ گزر چکا ہے، میں اس سلسلے میں پوری احتیاط کرتا ہوں اور آج بھی کھانا کھاتے ہوئے مجھے یہ محاورہ اور دادا جان کی نصیحتیں یاد آ جاتی ہیں۔ ان دنوں ہمارے گاؤں میں بہت سی تقریبات اور دعوتیں ہوتی تھیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک سال موسم خزاں میں کم از کم پانچ شادی کی تقریبات ہوئی تھیں۔ یہ ہمارے گاؤں کا اصول تھا کہ تقریب کہیں

MashalBooks.com

بھی ہو رہی ہو، کھانوں سے سجی ایک میز دادا جان کیلئے ضرور بھیجی جاتی، غالبًا یہ گاؤں والوں کا علاقے کے سب سے بوڑھے شخص کیلئے نذرانہ ہوتا تھا۔ عام طور پر کھانوں سے سجی میز دو نوجوان اٹھا کر لاتے اور میز دیوان خانے کے برآمدے میں رکھ دی جاتی تھی۔ پھر دادا جان آتے اور پوچھتے ''کیا ناشتہ آیا ہے''۔

اس سے پہلے کہ کوئی اور جواب دے اونگ جومی فورا بول اٹھتی ''حکیم صاحب کی بیٹی کی شادی ہے، وہاں سے آیا ہے۔ دادا جان یہ کہہ کر کھانا لانے والوں کو فارغ کر دیتے کہ حکیم صاحب کو میری طرف سے مبارک دینا'' پھر وہ پوچھتے کہ کھانے میں کیا کیا ہے؟

اونگ جومی کھانے کی میز پر سے چادر ہٹاتی اور ایک ایک کر کے کھانوں کے نام بولتی جاتی۔

دادا جان سپاٹ چہرے کے ساتھ کہتے ''میرا نہیں خیال کہ ان میں سے کوئی کھانا ٹھیک طریقے سے تیار کیا گیا ہوگا۔ دادا جان ایک دو گھونٹ مشروب پیتے اور کسی کھانے کے ایک دو لقمے لے کر ہمیشہ یہی کہتے ''بڑے شرم کی بات ہے، یہ لوگ اسے کھانا کہتے ہیں۔ اسے آپ لوگ کھا لو اور میز واپس بھیج دینا''۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ دادا جان خوراک کے حوالے سے بڑے محتاط رہتے تھے۔

ابا جان اس سلسلے میں بھی دادا جان کے مخالف سمت میں چل رہے تھے۔ وہ ہر طرح کی خوراک کسی کے بھی ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے تھے اور جب میری خوراک میں توازن برقرار نہ رہتا تو وہ مجھے دادا جان کی طرح سرزنش بھی نہیں کرتے تھے اور محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اجنبیوں کے سامنے میرے بڑھتے ہوئے شرمیلے پن سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا، جس کی وجہ بڑوں کے درمیاں حد سے بڑھے ہوئے اختلافات تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی میں خود کو لوگوں کے سامنے سکڑا ہوا اور کمزور محسوس کرتا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ مجھ میں غائب ہونے کی قوت ہوتو میں فوراً غیر مرئی بن جاؤں۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس حد تک شدید اختلافات کسی کام کے نہ تھے، نہ میرے نہ کسی اور کے۔ یقیناً اس کے جواز کے طور پر یہی کہا جائے گا کہ اس کا باعث وہ برا وقت تھا جس میں اخلاقی منزلت اپنی حیثیت کھو چکی تھی لیکن میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ پرانے وقتوں میں اسی ضابطے کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنی حقیقی حیثیت کی پہچان سے محروم رہ گئے۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ میرے جیسے شرمیلے اور ڈرپوک لوگوں کو دوسرے لوگوں کی ضرورت کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور ہمیں ہماری خوبیوں اور

خصوصیات کا مناسب صلہ نہ مل سکا۔ عاجزی اور انکساری میرے جیسے آدمی کیلئے اطمینان کا باعث نہیں ہے، جو صوفی بننے کا خواہش مند نہیں ہے۔ مجھے یہ بات سمجھنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ میرے والد صاحب کی طرف سے روایات سے انحراف والی کوئی خوبی مجھ میں پیدا نہیں ہوسکی۔ ابا جان کی سوچ کا زاویہ دادا جان کی سوچ سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے ہمیشہ وہی کام کئے جن سے دادا جان نے بیزاری کا اظہار کیا۔ کہیں جاتے ہوئے اگر انہیں یہ پتہ چلتا کہ چاولوں کی کاشت ہو رہی ہے یا ان کی فصل کاٹی جا رہی ہے تو وہ وہاں رک جاتے تھے اور چاولوں سے بنی شراب خریدنے کیلئے کچھ رقم فراہم کرتے اور پھر پینے پلانے میں ان کے ساتھ شریک بھی ہو جاتے۔ کہیں سے گزرتے ہوئے اگر کوئی کسان انہیں اپنے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتا تو اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ تھوڑی دیر کیلئے وہاں رکتے، اس کے کھانے میں سے ایک دو لقمے ضرور کھاتے اور اس کے ساتھ نیک خواہشات کا اظہار کرتے۔ وہ واحد معاملہ جس پر ابا جان اور دادا جان کا اتفاق تھا، یہ تھا کہ اپنے آباؤ اجداد کے ایصال ثواب کیلئے تقریب محتاط انداز میں منعقد کی جانی چاہیے، یہ کہ خاندان کا کوئی آدمی عیسائی چرچ یا بدھ عبادت گاہ کے قریب بھی نہیں بھٹکے گا اور دعا ہر سال اکتوبر میں کی جائے گی۔ کچھ اور چھوٹے چھوٹے معاملات پر بھی دونوں متفق تھے۔ مردانے حصے میں عورتیں نہیں جاسکتیں، مردوں کو عورتوں اور بچوں سے الگ سہولیات استعمال کرنی چاہئیں۔ کسی مرد کو باورچی خانے کے نزدیک نہیں جانا چاہیے، سوائے نوکروں کے۔ بچوں سمیت سبھی کو بڑھیا لباس زیب تن کئے رکھنا چاہیے۔ حتیٰ کہ چلچلاتی گرمیوں کے دوران بھی مردوں کو اپنے خاندان سے باہر کی کسی عورت کے ساتھ بات چیت نہیں کرنی چاہیے اور گاؤں کے اس کنویں کے قریب نہیں جانا چاہیے جہاں عورتیں نہاتی، کپڑے دھوتی اور بات چیت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر سبھی معاملات میں ان دونوں کے درمیان شدید اختلافات تھے۔

یہ بات درست ہے کہ ابا جان بھی بہت سے حوالوں سے دادا جان سے زیادہ قدامت پسند تھے لیکن ان میں بے باکی، جرأت اور تحمل تھا جس کی دادا جان میں شدید کمی تھی۔ ایک خفیہ نیٹ ورک کے منتظم ہونے کے ناطے ان میں یہ خوبیاں ہونا ضروری تھا لیکن اپنے بچوں کے حوالے سے وہ کافی سخت تھے اور گرفتار ہو جانے اور جیل جانے اور پھر اذیت کا سامنا کرنے کے مسلسل خوف میں مبتلا کسی شخص کے

برعکس وہ نہایت پرسکون رہتے تھے، لیکن میں مسلسل ابا جان کے خوف اور ہیبت میں مبتلا رہا۔ اگرچہ وہ زبان کے رواں شستہ اور موثر استعمال کے حوالے سے معروف تھے لیکن گھر پر وہ ہمیشہ کم آمیز رہتے۔ یہی کم آمیزی، خاطر جمعی، وقار اور بے باکی تھی جو میں نے ان میں بردباری اور سخاوت سے زیادہ محسوس کی اور اس احساس نے میرے اندر ان کیلئے خوف کی حد تک ایک عقیدت پیدا کر دی تھی۔ ابا جان کئی بار جیل گئے۔ ایک بار وہ ایک مہینے کیلئے جیل گئے تو میں روزانہ دو وقت ان کیلئے کھانا لے کر پولیس اسٹیشن جایا کرتا تھا اور مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوتا کہ میں ایک نمایاں سیاسی قیدی کا بیٹا ہوں۔ ابا جان کو سلاخوں کے پیچھے خوشی خوشی میں باتیں کرتے اور ہنستے دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ قید اور اس سے بھی برے حالات کے حوالے سے ان کی بے خوفی اور بے جگری نے میرے اندر خوف بھر دیا تھا۔ ان کے لگاؤ، جس نے انہیں موت سے بھی بے خوف کر دیا تھا، کے بارے میں سوچ کر میں ڈر جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور واقعہ نے میرے اندر چھپے خوف کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ میرا خیال ہے کہ ان دو واقعات نے مجھے ڈرپوک، نالائق اور غیر اہم بنا دیا تھا۔ دوسرا واقعہ پہلے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں ابا جان نے پہلی اور آخری بار کچھ سکھانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے دادا جان کے کمرے سے کتابت والی میز اپنے مطالعہ کے کمرے میں منگوائی اور مجھے لکھائی کے اسرار و رموز سکھائے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کس طرح پتھر کی تختی پر سیاہی پھیلانی ہے، کس طرح برش پکڑنا ہے اور کتنی طاقت کے ساتھ کس طرح برش کو حرکت دینی ہے۔ میں ان کی توقع پر پورا نہ اتر سکا وہ چلائے ''ایک بچے کے ہاتھ اتنے غیر متحرک کیسے ہو سکتے ہیں، تم صرف کھیتوں میں کام کرنے کیلئے ہی موزوں ہو''۔

اس لمحے مجھ پر جو مایوسی چھا گئی تھی، میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا، ابا جان اتنی اونچی آواز میں چلائے تھے کہ ان کی آواز دادا جان نے بھی اپنے کمرے میں سنی ہوگی۔ جب میرے اوسان بحال ہوئے تو ابا جان کمرے سے جا چکے تھے۔ اس کے بعد ابا جان نے مجھے لکھنا سکھانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اس کے بعد سے میں آج تک شرمندہ ہوں اور مجھے خود سے نفرت سی ہونے لگی ہے یہ سوچ کر میں کند ذہن تھا لیکن میں چھپ کر کتاب سیکھتا رہا اور اخبارات سے دیکھ کر اپنے حروف کو ان جیسے بنانے کی کوشش کرتا رہا تاکہ جب ہاتھ پک جائے تو میں کسی روز ابا جان کی کسوٹی پر پورا اتر سکوں لیکن میں جلد ہی مایوس ہو گیا۔ میرے گھر کا ماحول ایسا نہ تھا کہ مجھے آگے بڑھنے میں مدد دیتا۔ ان دنوں کی ہوئی پریکٹس کا نتیجہ ہے کہ میں

آج برش اور سیاہی کے ساتھ پوسٹر وغیرہ لکھ لیتا ہوں۔

باغ کے گرد گارڈینیا کی باڑھ کا موڑ مڑنے سے پہلے میں ایک لحہ کے لئے رکا اور اپنے پرانے گھر پر آخری نظر ڈالی۔ پہاڑی کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ چمنیوں سے اٹھنے والا دھواں، جس نے شام کی دھیمی دھیمی روشنی پر ایک چادر سی تان رکھی تھی، اب غائب ہو چکا تھا۔ میں نے ڈپر چٹانوں کی طرف نظریں دوڑائیں، اس امید کے ساتھ کہ وہاں مجھے دادا جان کی جھلک نظر آ جائے گی لیکن وہ شبیہہ غائب ہو چکی تھی تاہم میں نے محسوس کیا کہ دادا جان کی روح ان کی سابق قبر پر منڈلا رہی ہے جس کا انتخاب انہوں نے خود کیا تھا۔ ''خدا حافظ پیارے پرانے گھر'' میں نے اپنے گھر پر آخری بار نظریں دوڑاتے ہوئے سرگوشی سی کی۔ مغربی افق پر سورج غروب ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.com

MashalBooks.com

MashalBooks.com

دیواری تصویر

کم یونگ ہائیون

1953ء میں پیدا ہونے والے کم یونگ ہائیون عینیت پسندوں اور مسلمہ اقتدار سے منحرف ہونے والے دانشوروں کی ایک پوری نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جنوبی کوریا میں 1961ء سے 1992ء تک فوجی حکومت قائم رہی، سوائے ان چھ ماہ کے جب صدر پارک چنگ ہی کو قتل کر دیا گیا۔ طویل فوجی آمریت باغی طلباء اور جمہوریت کی جدوجہد کرنے والے جنگجوؤں کی ایک پوری فوج تیار کرنے کا باعث بنی، جسے فوجی حکومت کی طرف سے بدترین مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے کچھ اپنی اس ستائے جانے کی کیفیت کے ریکارڈ کو اثاثوں میں تبدیل کرنے اور انہیں اپنی سیاسی ترقی کیلئے استعمال کرنے میں کامیاب رہے لیکن ان میں سے زیادہ تر کو جسمانی اور نفسیاتی نتائج وعواقب اور ان لوگوں کی طرف سے بے اعتمادی کی صورتحال میں زندگی کے دن پورے کرنے پڑ رہے ہیں، جو قائم شدہ نظام کیلئے انہیں خطرہ تصور کرتے ہیں۔ کم یونگ ہائیون، جو سیول نیشنل یونیورسٹی میں فلسفے کے طالب علم رہے، کہتے ہیں کہ فوجی ڈکٹیٹر شپ کے سائے میں زندگی گزارنے سے انسانی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ مدافعانہ، ڈرپوک اور خود کو راہ راست پر سمجھنے والا یا بیچ کی راہ اختیار کرنے والا ہو جاتا ہے۔ کم ان لوگوں کی زندگیوں اور احساسات کے ترجمان ہیں جن کے زندہ رہنے کے اغراض معدوم

ہو چکے ہیں اور ان کی زندگی سے بھر پور اور عینیت پسندی کے خوابوں کے انباروں سے ان کی زندگیوں کو پھر سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

''دی میورل'' (دیواری تصویر) 1994ء میں لکھی گئی اس کے مرکزی کردار کے خدوخال مصنف سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ ایک آرٹسٹ ہے جس کا جمالیاتی ذوق انسانیت کی داخلی اور دائمی جہتوں کے ساتھ وابستہ ہے لیکن ایک تاریخی حقیقت نے اسے سماجی انصاف کی جدوجہد میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ زیر نظر افسانہ میں انہوں نے جس دیواری تصویر کی نقش نگاری کی ہے، وہ اشارہ ہے کہ مصنف کس شدت کے ساتھ کسی ایسے مسیحا کا آرزومند ہے جو انسانی مشاہدے سے بالاتر دیوتا کی بجائے پوری انسانیت کے ساتھ ہی مسائل اور مصائب کا سامنا کرے اور جو انسان کا غمگسار ہو۔ اس کہانی میں کوریا کے ان لوگوں کیلئے خصوصی پیغام پنہاں ہے جنہوں نے فوجی ڈکٹیٹرشپ کا پورا دور دیکھا جس میں معمول کی زندگی گزارنے کیلئے بھی ناانصافی کو قبول کرنا پڑتا ہے اور اردگرد رونما ہونے والی خرابیوں اور بداعمالیوں پر بے حسی ظاہر کرنا پڑتی ہے۔

ریل گاڑی سٹیشن سے باہر نکلی تو منظر تبدیل ہونا شروع ہو گئے، پٹڑی کے ساتھ خستہ حال گھر بنے ہوئے تھے جس کی نچلی چھتوں پر ٹیلی ویژن کے انٹینے ایستادہ تھے، گیند کی شکل کے ذخیرہ کرنے والے صنعتی ٹینک، پتلی لیکن لمبی چمنیاں جن سے دھواں اٹھ رہا تھا، اپارٹمنٹ کمپلیکس تعمیر کرنے کی جگہ جہاں کام کچھ وقت کیلئے روک دیا گیا تھا، خستہ حال ہوٹلوں کے سائن بورڈ جیسے عام طور پر ریلوے سٹیشن کے گرد پائے جاتے ہیں، آلودگی سے بھری ہوئی نالیاں جو ضرورت مند پڑوسیوں کے گھروں کے اندر سے بل کھاتے ہوئے نکلتی ہیں...... یہ اور ایسے ہی اور بہت سے بے ڈھنگے مناظر آتے اور کسی سلوموشن فلم کی طرح آگے نکل جاتے تھے کیونکہ ہماری گاڑی آگے چل رہی تھی، موسم سرما کے چمکدار آسمان نے اس خستہ حال

زمینی منظر کو ڈھانپ رکھا تھا جیسے کسی نے کمبل اوڑھ رکھا ہو۔

شہر سے باہر نکلنے کے بعد جونہی ٹرین نے رفتار پکڑی چائے ساپ نے اخبار، جسے وہ اب تک عدم توجہی کے ساتھ دیکھ رہا تھا، تہہ کر کے اپنے گھٹنوں پر رکھ دیا، جماہی لی اور پھر نم آلود آنکھوں کے ساتھ باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ برفباری کئی روز پہلے ہوئی تھی لیکن برف ابھی پوری طرح پگھلی نہیں تھی چنانچہ کہیں کہیں سے زمین اب بھی سفید نظر آ رہی تھی۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ لکڑی کے تختوں سے بنی دیوار کے اس پار چائے ساپ ایک نوجوان عورت اور ایک بچے کو دیکھ سکتا تھا۔ بچہ بڑے شوق سے چلتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہا تھا لیکن نوجوان عورت کپڑے پھیلانے میں مصروف تھی، ٹرین کی طرف اس کی توجہ بالکل نہیں تھی۔ جب ریل گاڑی شہر سے مکمل طور پر باہر نکل آئی تو مکانوں کی تعداد کم ہوگئی اور کھلے میدان، پہاڑ اور ندی نالے نظر آنے لگے۔ مناظر چائے ساپ کی نظروں کے سامنے اس طرح پھیلتے اور پھر سکڑ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے جیسے مسلسل کھلنے اور بند ہونے والے دستی پنکھے کی سطح کے اوپر شبیہیں بنتی ہیں۔

پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی ندی کے دونوں کناروں پر پاپلر کے ٹنڈ منڈ درختوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں اور درخت اس طرح ایستادہ نظر آتے تھے جیسے حال ہی میں بھرتی کئے گئے سپاہی چوکس کھڑے ہوں جبکہ یخ ہوا ان درختوں کی برہنہ شاخوں پر نہایت بے دردی سے کوڑے برسا رہی تھی۔ سورج کی کرنیں ریل گاڑی کی کھڑکی سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ چائے ساپ کو اپنی آنکھوں کو تیز روشنی سے بچانے کیلئے ترچھی نظروں سے دیکھنا پڑ رہا تھا۔ علاوہ ازیں ریڈی ایٹر بھی آن تھا، پوری رفتار سے چل رہا تھا اس لئے ماحول گھٹا گھٹا محسوس ہو رہا تھا حالانکہ ابھی صبح کا وقت تھا۔

شہری علاقہ ختم ہوا تو دیہی علاقے شروع ہو گئے۔ منظر تبدیل ہوا تو اس کی زندگی جو ایک گھنٹہ پہلے تک ایک بوجھ محسوس ہو رہی تھی، اب غیر حقیقی ماحول میں ڈھلنا شروع ہوگئی۔ اس کی مالک مکان بیوی، دوست، اس کی گرل فرینڈ، وہ گلیاں اور سڑکیں جہاں وہ گھوما پھرا کرتا تھا سب دھندلا کر پھیکے پڑ گئے تھے جیسے کسی پرانے فریم میں پھیکی پڑ چکی کوئی تصویر ہوتی ہے۔ چائے ساپ کے دماغ میں اب بھی بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔ وہ غم زدہ، نادم اور پریشان نظر آ رہا ہے حالانکہ بظاہر اس کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

تھوڑی دیر تک خالی نظروں سے باہر گھورتے رہنے کے بعد وہ اچانک اٹھا اور سر کے اوپر

MashalBooks.com

سے ریک پر رکھے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی۔ اس کا بیگ مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا اس لئے کتاب نکالنے کیلئے اسے کافی چیزوں کو الٹ پلٹ کرنا پڑا۔ کتاب لے کر وہ نیچے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسے یہ کتاب اپنے بک شیلف کے ایک کونے میں ملی تھی۔ وہ گزشتہ چند روز سے یہ ناول پڑھ رہا تھا لیکن اس پر بھرپور توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس کا ذہن مختلف معاملات میں الجھا ہوا تھا اسی لئے وہ یہ ناول زیادہ نہیں پڑھ سکا تھا۔ کتاب کا عنوان تھا ''اور کبھی ایک لفظ بھی نہ کہا''۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ پچھلی بار اس نے کہاں تک پڑھا تھا لیکن جب کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے ویسے ہی ایک پیرا گراف سے ناول پڑھنا شروع کر دیا۔

اس نے جہاں سے کتاب پڑھنا شروع کی تھی، وہ حصہ ایک شخص فریڈ کے بارے میں تھا جو اس کہانی کا ہیرو تھا اور گرجا گھر سے متعلق ایک تنظیم میں ٹیلیفون آپریٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ یہ ناول ہائنرک بال کا لکھا ہوا تھا اور اس میں درمیانی عمر کے ایک جوڑے کے اندر چھپی سوچ کو اجاگر کیا گیا تھا جو دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد کے مایوس اور نادار جرمنی میں تکلیف دہ زندگی گزار رہا تھا۔ چائے ساپ کو محسوس ہوا کہ وہ بھی فریڈ کی طرح ہے پچاس ساٹھ سال کا شرمیلا اور بوکھلایا ہوا شخص۔ اسے خیال آیا کہ زندگی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہیے۔ اپنے ہی خیالوں میں گم ہونے کی وجہ سے وہ بھول جاتا تھا کہ وہ کس صفحہ پر ہے۔ ''کیا آپ یہ لیں گے؟'' وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنے قریب بیٹھے آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے وہاں بیٹھا ہوا تھا لیکن اپنے خیالات میں گم ہونے کی وجہ سے چائے ساپ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ شخص پچاس کے پیٹے میں تھا اور اس نے روایتی لباس پہنا ہوا تھا جس کے کالر اور آستینیں اتنی گھسی ہوئی تھیں کہ ان کے روئیں اور دھاگے نظر آ رہے تھے۔ اس کے بال خاکستری رنگ کے تھے اور گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ لمبی ناک اور معصوم آنکھوں کے ساتھ وہ فریب، عیاری اور مکاری سے مبرا نظر آتا تھا۔ اس کی گود میں جو اخبار رکھا ہوا تھا اس پر چاولوں سے بنا ہوا خستہ رول رکھا ہوا تھا۔

چائے ساپ نے اپنی کتاب تھوڑی سی نیچے کی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نہایت متانت سے جواب دیا ''نہیں، بہت شکریہ'' سنجیدگی اختیار کرنے کا مقصد کسی دوستانہ بات چیت سے احتراز برتنا تھا کیونکہ وہ کسی اجنبی کے ساتھ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اگرچہ وہ پریشان اور مغموم تھا، پھر بھی

چائے ساپ کی خواہش تھی کہ اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ یہ سفر اس نے اسی لئے اختیار کیا تھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اجنبی نے اس کے موڈ کو نہ بھانپتے ہوئے ایک اور سوال داغ دیا۔

''ٹائی بائیک'' چائے ساپ نے پہلے سے زیادہ بے اعتنائی کے ساتھ جواب دیا۔

''پھر تو آپ کو 'چے ای چون' میں بس تبدیل کرنا پڑے گی، آپ وہاں کس مقصد کیلئے جا رہے ہیں''۔

اجنبی نے کسی قدر جرأت کے ساتھ ایک اور سوال پوچھا۔

''تا کہ کچھ دن سکون اور آرام کے ساتھ گزار سکوں'' چائے ساپ نے اپنا غصہ چھپاتے ہوئے جواب دیا اور پھر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کہاں تک پہنچا تھا میں......'' اس نے سوچا اور فوراً اس کے ذہن میں آ گیا کہ ہاں فریڈ نے پادری سے کچھ رقم ادھار لی تھی اپنی بیوی اور بچوں کی ضروریات کے لئے۔ اس رقم میں سے تھوڑے سے پیسوں سے اس نے ایک شراب خانے میں بیٹھ کر شراب پی۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے پاس گھر جانا چاہتا تھا لیکن اس کے کرائے کے مکان کی کوٹھڑی میں اس کیلئے کوئی گنجائش نہ بچی تھی۔ جنگ کے زمانے میں وہ وائرلیس آپریٹر تھا لیکن اب اس کے لئے کوئی کام نہ تھا جس سے وہ اپنے خاندان کی مالی حالت بہتر بنا سکتا۔

پاس بیٹھے ہوئے شخص نے پھر مداخلت کی ''تو آپ آرام کے چند دن گزارنے کیلئے ٹائی بائیک جا رہے ہیں، آپ چاولوں سے بنے رول میں سے ایک لقمہ بھی نہیں لیں گے؟ اچھا خیر سب جگہیں چھوڑ کر آپ آرام کیلئے ٹائی بائیک جا رہے ہیں۔ میری ایک بیٹی وہاں رہتی ہے، آپ میری بات کا یقین کریں۔'' وہ آرام اور سکون کی کوئی جگہ نہیں ہے''۔ اس کا ہم سفر ساتھ ساتھ چاول بھی کھا رہا تھا جیسے چائے ساپ سے باتیں نہ کر رہا ہو بلکہ اپنے آپ سے ہم کلام ہو۔ اُس نے اپنی زندگی کے بارے میں اپنی بات جاری رکھی، ''آپ کان کن نہیں ہو سکتے کیونکہ کان کنوں کو تو میں ایک ہی نظر میں پہچان لیتا ہوں۔ میں گورنمنٹ کے ایک محکمہ میں کلرک کا کام کرتا رہا ہوں، ایک سفید پوش ورکر، یہ محض ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہال ہے لیکن اس قصبے میں سبھی لوگ مجھے جانتے ہیں۔ پھر میں نے ریٹائرمنٹ لے لی اور سیئول اپنی بیٹی کے پا

س چلا گیا لیکن میرے داماد کی فرم دیوالیہ ہو گئی......'' چائے ساپ کا ہم سفر ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے وہ اسی طرح کے کسی آدمی کی تلاش میں تھا جسے وہ اپنے دل کی باتیں بتا سکے۔ چائے ساپ نے بھی یہ ظاہر کیا جیسے وہ اس کی باتیں سن رہا ہے حالانکہ وہ اپنی سوچوں کی طرف لوٹ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ مگر وہ تو کسی کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ ایک مبہم تصور یا ایک ناقابل بیان جذبے کی پیروی کر رہا تھا۔ یہ احساس کس قدر دردناک تھا لیکن اس میں کوئی چیز ایسی تھی جو قابل شناخت تھی اور کچھ ایسا تھا جو افسردہ کر دینے والا تھا۔

پھر اچانک یہ سوچ اس کے ذہن میں ابھری کہ اسے خود بھی اس کا کوئی واضح تصور نہیں ہے کہ وہ ٹائی بائیک کیوں جانا چاہتا ہے۔ آرام کرنے والی بات بالکل غلط بھی نہ تھی لیکن دراصل اس کا وہاں جانا بے مقصد نہ تھا، واضح مقصد وہاں بودھ آشرم کی نئی عمارت کی ایک دیوار پر کچھ نقش و نگار بنانا تھا۔ اس مرکز کا ڈائریکٹر اس کے ایک دوست کا واقف کار تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس نے جو عمارت تعمیر کرنے کا اہتمام کیا ہے اس کی سامنے والی دیوار پر ایک تصویر بنائی جائے۔ پروہت نے چائے ساپ سے یہ تصویر بنانے کیلئے براہ راست نہیں کہا تھا۔ اس نے تو چائے ساپ کے دوست مایونگ ہو سے تصویر بنانے کا کہا تھا لیکن وہ کسی کام میں بری طرح مصروف تھا اس لئے اس نے چائے ساپ سے کہا تھا کہ وہ یہ تصویر بنا دے، اس کے دوست نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ غالباً وہ مرکز اس کام کیلئے اسے کوئی معاوضہ ادا نہیں کر سکے گا۔

چائے ساپ کو دیواروں پر تصویریں بنانے کا کچھ تجربہ تھا۔ 80ء کی دہائی کے دوران اس نے اپنے اس پینٹر دوست، پاک مایونگ ہو کی ہدایت پر اس نے اور اُس کے چند دوستوں نے مل کر ایک فیکٹری کی دیوار پر تیس میٹر اونچی ایک تصویر بنائی تھی گرمیوں کے موسم میں انہوں نے یہ تصویر بنانے پر پورا ایک مہینہ لگایا تھا لیکن پھر اچانک ایک روز کسی نے اس پر چونا مل دیا تھا۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ یہ کام ڈسٹرکٹ آفس نے پولیس کے حکم پر طرف سے کیا گیا جسے تصویر کے موضوع پر اعتراض تھا۔ اس پر آرٹسٹوں کی ایسوسی ایشن اور حکام کے درمیان فنکارانہ جذبوں کے اظہار اور فن کے غیر قانونی اظہار کے ایشو پر ایک قانونی جنگ شروع ہو گئی لیکن اس فیکٹری کے مالک نے بعد ازاں دباؤ کے تحت پسپائی اختیار کر لی۔ چائے ساپ کو اس طرح پورے مہینے کی محنت پل بھر میں مٹی میں ملتے دیکھ کر سخت افسوس اور

مایوسی ہوئی۔

تاہم پاک مایونگ ہو کا اس حوالے سے تصور کچھ اور تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آرٹ کا کوئی بھی کام ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا اور یہ کہ آرٹسٹ کو صرف اپنے زمانے کیلئے کام کرنا چاہیے۔ ایک اچھا معاشرہ تشکیل دینے کیلئے وہ آرٹ کو ایک ہتھیار کے طور پر دیکھتا تھا۔ اسی لئے اس کی بنائی ہوئی تصویر میں مضبوط معاشرتی پیغام اور کھل کر سامنے آنے والی طاقت اور شدت رکھتی تھی۔

چائے ساپ اور پاک مایونگھو کالج کے زمانے کے دوست تھے اور تصویری نمائشوں پر اکٹھا جاتے تھے چنانچہ مایونگ ہو کی سوچ اور جذبے کو چائے ساپ سے بہتر طور پر کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے دوست کے کام سے متاثر ہو کر اس کا ساتھ دینے لگتا تھا۔ چائے ساپ اپنے دوست کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا لیکن اسے اس کی سوچوں اور نظریے سے اتفاق نہ تھا اور حقیقت تو یہ ہے اس کا آرٹ کے حوالے سے نظریہ اپنے دوست سے بالکل مختلف اور متضاد تھا اپنی غربت اور والدین کے اعتراض کے باوجود اس نے اگر کالج آف فائن آرٹس میں داخلہ لیا تھا تو اس کی وجہ محض تصویریں بنانے کا شوق نہ تھا۔ اس تیزی سے تغیر پذیر دنیا میں وہ کچھ ایسا کام کرنا چاہتا تھا جو دیرپا ہو، جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہو۔ اگر وہ محض اس وقت اس دور اور اس زمانے کیلئے کام کرنا چاہتا تو ٹیکنالوجی اور عملی سائنس کے دروازے اس کیلئے کھلے تھے لیکن اس نے اس سے الگ راستہ اپنایا۔

یہی چائے ساپ کا آرٹ کے حوالے سے نظریہ اور سوچ تھی۔ وہ اس امر کو اچھا نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی ایسی تصویر تخلیق کی جائے جو آرٹ گیلری کے کسی کونے میں پڑی رہے تاوقتیکہ کسی متمول مرد یا خاتون کی اس پر نظر پڑ جائے اور وہ اسے خرید لے۔ اس کا خیال تھا کہ بطور پینٹر اس کا ہدف نسل انسانی کے اندر دائم قائم شبیہوں اور خدوخال کو کینوس پر منتقل کرنا اور اس کے ساتھ اس کے اپنے زمانوں کی تکلیفوں کو اجاگر کرنا ہے۔ اس نے بڑے بوڑھوں کے مرکز کی دیوار پر تصویر بنانے کی جو ذمہ داری اپنے سر لی تھی وہ اس کی نوعیت اور مقصد کے بارے میں ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔ وہ اس احساس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا شدید خواہش مند تھا کہ حقیقت کے در ہر طرف سے اس پر بند ہو رہے ہیں۔ یہ کام اتنا دلکش نہیں تھا نہ ہی اسے امید تھی کہ اس سے اس کے اندر کے فنکار کی تسلی ہو سکے گی۔ ایک پہاڑی علاقے میں قائم بوڑھوں کے مرکز کی دیوار پر نقش نگاری سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں پھر بھی اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا

اور اس پر قائم رہا۔

دو سال قبل جب ان کی واحد اولاد، ان کی بیٹی وفات پا گئی تو چائے ساپ کی بیوی کو دیوانگی کے دورے پڑنے لگے اور پھر آخر کار ایک دن اسے چھوڑ گئی۔ اس وقت وہ ایک نمائش کی تیاریوں میں مصروف تھا جس کا موضوع فوجی آمریت کے شکار لوگوں کی تکالیف اور اذیتوں کو اجاگر کرنا تھا۔ نمائش کے لئے اس نے ایک ایسی پینٹنگ تیار کی تھی جس میں تکلیف سے کراہتے اور چلاتے ہوئے ایک آدمی کو تین اور افراد گھیرے ہوئے تھے، تصویر میں یہ اظہار بھی ملتا تھا کہ سبھی تناؤ میں تھے جیسے ہر کوئی اپنے اوپر مسلط کئے گئے کسی حکم کی بجا آوری میں لگا ہوا ہے۔ وہ کراہتے اور چلاتے ہوئے آدمی کے گرد اس طرح کھڑے تھے جیسے ڈاکٹر اور اس کے اسسٹنٹ آپریشن ٹیبل کو گھیرے ہوتے ہیں۔ تشدد کرنے والوں میں ایک کا چہرہ شیطان جیسا، ایک کا فرشتوں کی طرح کا اور تیسرے کا انسانی چہرہ تھا۔ صرف انسانی چہرے والے آدمی کی تصویر میں ہمدردی کے کچھ جذبات نظر آ رہے تھے۔

چائے ساپ کے دوستوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی بیوی کا غم بھلانے کیلئے کام میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے لیکن یہ بات صرف چائے ساپ ہی جانتا تھا کہ ایک روز اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی جائے گی کیونکہ ان میں اکثر ناچاقی رہنے لگی تھی اور لڑائی جھگڑا بھی تقریباً ہر روز ہی ہوتا تھا۔ ویسے بھی ان کی بیٹی کے وفات پا جانے کے بعد ان کے درمیان جو مشترکہ تعلق تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ پھر ایک اور بات بھی تھی۔ اسی دوران چائے ساپ کی ایک لڑکی یونگ آئی سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ فینسی کپڑے پہنتی تھی اور ان کے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں لٹک رہی ہوتی تھیں۔ وہ سٹائلش اور پرکشش تھی لیکن ساتھ ہی گھمنڈی اور غیر سنجیدہ بھی تھی، اس کے باوجود چائے ساپ نے اس کے ساتھ اظہار محبت کیا اگرچہ وہ دل سے اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ سٹوڈیو کے پردے کے پیچھے ایک گدے پر انہوں نے باہمی محبت کا عملی اظہار بھی کیا۔ یونگ آئی اپنے بارے میں چائے ساپ کے خیالات سے پوری طرح آگاہ تھی۔ وہ بھی اس طرح کی شخصیت سے دور ہی رہنا مناسب سمجھتی تھی۔

ایک دن وہ یونگ آئی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا تو اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ اسے انڈیا جانا چاہیے۔ کیوں؟ اس بارے میں وہ خود بھی واضح نہیں تھا۔ شاید اس کے پیچھے کسی بنیادی چیز، تہذیب کی پابندیوں سے آزاد کسی چیز کی تمنا کا عمل دخل تھا۔ وہ ان چیتھڑوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا

جو زندگی نے اس پر مسلط کر رکھے تھے۔ وہ انڈیا جانے کا خواہش مند تھا حالانکہ اس دورے کے لئے اس کے پاس وافر رقم موجود نہ تھی۔ اسے ایک جاپانی مصنف کے سفرنامے کا وہ حصہ یاد آنے لگا جس میں انڈیا کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا: میں نے ہر جگہ ہر گام پر خود کو پایا، مجھے اس دنیا کی بناوٹ اور تصنع کو جانچنے کا موقع ملا، جس کے بارے میں مجھے یہی سکھایا گیا کہ اسے قبول کرو۔ میں نے بہت ہی خوبصورت اور دلآویز چیزیں بھی دیکھیں۔ میں نے بہت سی چیزوں کو برگد کے درخت پر گھونسلوں میں رہتے ہوئے دیکھا۔ میں نے درخت کے پیچھے بہت دور بارش برسانے والے بادل بنتے دیکھے۔ میں نے ایک ہاتھی دیکھا جس نے چند آدمیوں پر حملہ کر دیا تھا اور پھر ایک ایسے بہادر لڑکے کو دیکھنے کی سعادت بھی حاصل کی جس نے اس ہاتھی کو رام کر لیا۔ میں نے اونچے لمبے درختوں والے جنگل دیکھے۔ وہ لڑکا اور ہاتھی جس میں غائب ہو گئے۔ دنیا خوبصورت اور اچھی تھی۔ زمین اور ہوا بے رحم اور تیز تھیں، پھول اور شہد کی مکھیاں خوبصورت تھیں۔ میں آگے بڑھتا گیا اور میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ غریب اور بدوضع ہیں، وہ قابل رحم حالت میں تھے لیکن وہ زندہ دل اور بافراغت تھے۔ وہ معزز اور مہربان بھی تھے اور سنگ دل اور بے رحم بھی۔ دنیا بڑی اچھی اور خوبصورت تھی۔

یونگ کے ساتھ محبت کے اظہار کے بعد اس نے ایک سگریٹ جلائی اور پھر بلند قامت برگد کے درخت، بارش برسانے والے بادلوں، ہاتھیوں اور چیتھڑوں سے بمشکل ڈھکے انسانوں کی تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ وہ کبھی انڈیا نہیں گیا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں اسے اپنا آپ تلاش کرنے کو موقع مل سکتا تھا، خود کو دریافت کرنے کی کوئی سبیل ہاتھ آ سکتی تھی۔

تصویری نمائش نہایت کامیاب رہی لیکن وہ اس گند اور اس بوجھ سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا جو اس کیلئے باعث اذیت بنا ہوا تھا۔ اس نے سنا کہ اس کی بیوی بہت سے دوستوں کے پاس رہتی رہی ہے اور آج کل کسی عبارت گاہ میں داخل ہو گئی ہے۔ نمائش کے بعد ایک اجلاس میں اس کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اس نے جی بھر کر شراب پی اور پھر آپے سے باہر ہو کر اپنے دوستوں پر طنز کے نشتر چلاتا رہا اور خود کو بھی برا بھلا کہتا رہا۔ اگلی صبح وہ نیند سے جاگا تو اسے اپنے گزشتہ روز کے عمل پر شدید شرمندگی ہوئی۔ اس کا دوست پاک میونگ اس کی حالت جانتا تھا چنانچہ اسی لمحے اس نے چائے ساپ کو اس دور دراز علاقے میں بڑے بوڑھوں کے مرکز کی دیوار پر نقش نگاری کرنے کی تجویز پیش کی تا کہ اس کی تھکاوٹ دور ہو سکے

اور وہ پہاڑوں کے پر فضا ماحول میں رہ کر اپنی زندگی کو پھر سے منظم کر سکے۔ چائی سوپ نے ایک لمحے کیلئے سوچا اور پھر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ سیول میں اس کے کرنے کو کچھ نہ تھا چنانچہ اگلے ہی روز اس نے اپنا سامان باندھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

وہ اپنے ٹائی بائیک جانے کے بارے میں کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس نے یونگ آئی کو بھی اس بارے میں مطلع نہیں کیا تھا تاہم اسے یہ فکر ضرور تھی کہ اس کی بیوی واپس آئی تو اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گی، پھر اس نے سوچا کہ وہ اس کی گھر میں غیر موجودگی کی ہی خواہش مند ہوگی۔ تھوڑی دیر کا غور وفکر کے بعد اس نے اپنی جواب دینے والی مشین میں پیغام ریکارڈ کرایا کہ وہ انڈیا جا رہا ہے۔

اس کی آنکھ لگ گئی تھی، جب وہ جاگا تو ریل گاڑی ایک سرنگ میں سے گزر رہی تھی۔ اس کا درمیانی عمر کا ہم سفر گہری نیند میں کھویا ہوا تھا۔ ٹرین چی چون پہنچی تو دو بجے کا عمل تھا۔ چائے ساپ نے ریلوے سٹیشن سے بس سٹیشن جانے کیلئے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور ٹائی بائیک جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ فروری کا مہینہ تھا لیکن سردی بہت زیادہ نہیں تھی۔ بس جگہ جگہ رک کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ بس میں زیادہ رش نہ تھا۔ وہ بس میں دائیں طرف کی سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس نے چی چون سے فوری طور پر تیار ہونے والے نوڈلز کا ایک پیالہ کھایا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی بھوک اب بھی باقی ہے۔

بس کا ڈرائیور ایک نوجوان آدمی تھا۔ اس نے ایک کیسٹ چلائی جو مشہور و معروف دھنوں اور گانوں پر مشتمل تھی۔ کیسٹ خودکار طریقے سے ری وائنڈ ہو جاتی تھی اور بار بار ایک ہی موسیقی اور گانے سنائی دے رہے تھے۔ ڈرائیور اپنی دھن میں مست تھا اسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس موسیقی کا بس کے مسافروں پر کیا اثرات ہو رہے ہیں۔ چائے ساپ بھی اس صورتحال کو ناپسند کر رہا تھا لیکن وہ ڈرائیور سے کیسٹ تبدیل کرنے کیلئے نہیں کہنا چاہتا تھا چنانچہ وہ برداشت کرتا رہا۔

اپنے گزشتہ حالات و واقعات پر غور کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ پچھلے کئی برسوں سے اس کے آنگن میں خوشی کا کوئی پھول نہیں کھلا۔ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوتی تو معاملہ کچھ اور ہوتا۔ وہ اس سے کہا کرتی تھی، ''ڈیڈی مجھے ایک کتا چاہیے''۔ پھر اس کے دوست چونگ مین کی موت نے اسے اور زیادہ غمگین کر دیا وہ اس کے سکول کے زمانے کا دوست تھا اور وہ سب مل کر حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرے کرتے

رہے۔اس نے مرنے سے پہلے ایک خط چھوڑا تھا جس میں اس نے اپنے ایک سینئر کو سیاسی لحاظ سے تشدد کا نشانہ بنانے پر بہت زیادہ مایوسی اور الجھن کا اظہار کیا تھا۔اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مکمل طور پر بے مقصدیت کی صورتحال سے نکلنے کا خواہش مند ہے اور یہ کہ جتنا اس کی زندگی بڑھتی جارہی ہے اتنا ہی اس صورتحال سے نبردآزما ہونے کے بارے میں اس کا یقین متزلزل ہورہا ہے۔

ان دو اموات نے اس کے سامنے بہت سے سوالات لا کھڑے کئے تھے اور اس صورتحال نے اس سے خوشی محسوس کرنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔وہ جب بھی سوچتا اسے محسوس ہوتا کہ بشاشت اور سرخوشی کا عنصر محروم ہوگیا ہے۔اس کا خیال تھا کہ زندگی کا ایک بڑا حصہ غموں سے عبارت ہے اور صرف ایک تھوڑا سا حصہ خوشی، شادمانی اور مسرت پر مبنی ہے اور زندہ رہنے کا مطلب حالات کی خرابی کی دلدل میں کنول کے ایک پتے سے دوسرے پتے پر چھلانگ لگانے کا نام ہے جبکہ کنول کے پتے ہمارے لئے خوشی اور مسرت کے مواقع ہوں۔

چائے ساپ نے بس کی کھڑکی تھوڑی سی کھولی اور ایک سگریٹ سلگا لیا۔ہوا کھڑی میں سے آواز پیدا کرتی ہوئی نکل رہی تھی اور اپنے ساتھ دھویں کو بھی لے جارہی تھی۔سگریٹ اپنی انگلیوں میں دبا کر وہ خیالوں میں کھو گیا۔اس کے ذہن میں عجیب عجیب سے سوالات گردش کرنے لگے۔اب تک میں نے اپنی زندگی کس مقصد کے تحت گزاری؟ یا میری زندگی میں ایسا کچھ تھا جس کیلئے میں اپنی ساری زندگی وقف کر لیتا؟ چائے ساپ نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر خود اس کا جواب بھی تلاش کر لیا" اگر ایسی کوئی چیز نہیں ہے تو پھر کیا ہوا" اور اس جواب کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن نظر آنے لگا۔پھر وہ اپنے اس کام کے بارے میں سوچنے لگا جو وہ کرنے جارہا تھا۔ان سوچوں نے اس کے غم کو کسی قدر ہلکا کر دیا۔یہ پروردگار کی بڑی عنایت تھی کہ اس کے پاس ایسا کام موجود تھا جو اس کی فوری توجہ کا متقاضی تھا۔

بس مختلف سٹاپوں پر رکتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی۔اس نے سوچا تھا کہ ٹائی بائیک چی چوں کے قریب ہوگا لیکن جب بس ٹائی بائیک پہنچی تو شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔شام کا اندھیرا ہی نہیں چھا رہا تھا بلکہ بارش بھی شروع ہوگئی تھی۔بوڑھوں کا مرکز ابھی چار میل دور تھا۔چائے ساپ نے پتہ کیا کہ وہاں کوئی بس جاتی ہے یا نہیں۔اسے بتایا گیا کہ اس طرف جانے والی بس ایک گھنٹے میں تیار ہوگی۔یہ سن کر اس نے پہلے پیٹ پوجا کرنے کا قصد کیا اور قریب ہی ایک ہوٹل میں چلا گیا۔

جب وہ ریسٹوران سے باہر نکلا تو اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا اور دھند نے اس پہاڑی قصبے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ چائے ساپ اپنا بیگ اٹھائے بس ڈپو کی طرف خراماں خراماں چلنے لگا۔ اگر چہ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ تھا پھر بھی ٹائی بائیک میں ہر طرف نیون کے سائن بورڈ جگمگا رہے تھے۔ بس پندرہ منٹ دیر سے پہنچی۔ چائے ساپ فورا بس میں سوار ہو گیا اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ اسے بوڑھوں کے مرکز پر اُتار دے۔

بس نے چائے ساپ کو بوڑھوں کے مرکز کے قریب اتار دیا اور خود دھند میں غائب ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دھند کی نمی والی ہوا سے جیسے پھوار پڑ رہی تھی۔ اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر چائے ساپ نے ڈرائیور کے بتائے راستے پر قدم آگے بڑھائے۔ پل پار کر کے وہ وادی کی طرف مڑا تو ایک بہتے ہوئے چشمے کی آواز اسے سنائی دی، اس کے ساتھ گھنٹیاں بجنے کی آوازیں مدغم ہو رہی تھیں لیکن یہ نہیں پتہ چل رہا تھا کہ گھنٹیوں کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ چائے ساپ نے ایک طرف دیکھا تو اسے دھند اور بارش کی چادر میں سے متعدد روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے ان روشنیوں کی طرف اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

وہ اونچے نیچے راستوں پر چلتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اسے معمر افراد کا مرکز اپنے سامنے نظر آیا جو کسی قلعے کی طرح لگ رہا تھا۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ مرکز کی عمارت بنائی ہی اس طرح گئی تھی کہ باہر سے قلعے کی طرح نظر آئے۔ اس مرکز کی عمارت ایک ڈھلوان پر بنائی گئی تھی۔ مرکز کے باہر صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ اس بلب کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے سوچا کہ اب کیا کرے، پھر اس نے عمارت کے بڑے داخلی دروازے کا سراغ لگانے کی ٹھانی اور آگے بڑھنے لگا۔ عمارت تک جانے والی لکڑی کی سیڑھیاں بارش کی وجہ سے پھسلوان ہو رہی تھیں۔ پھر اسے ایک آدمی نظر آیا جو سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ چائے ساپ کو دیکھ کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا تا کہ چائے ساپ وہاں سے گزر سکے۔ چائے ساپ نے اس شخص سے مرکز کے دفتر کا پتہ پوچھا۔

دفتر کے دروازے کے ایک طرف ایک بورڈ تھا۔ جس پر نوٹس لگے ہوئے تھے جن پر اس مرکز کے قواعد وضوابط لکھے ہوئے تھے، کچھ پر اعلانات تھے اور ایک نوٹس پر قصبے کی طرف جانے والی بسوں کی آمد ورفت کا شیڈول درج تھا۔ چائے ساپ نے دیکھا کہ ایک شخص، جس نے عینک لگا رکھی تھی، ایک میز

پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا اور قریب ہی کالے کپڑوں میں ملبوس ایک خاتون، جو تیس سال کی لگ رہی تھی، ایک جوڑے کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ چائے ساپ نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے ان سے خیریت دریافت کی لیکن ادھر سے خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی۔ اس سے چائے ساپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ اکثر اجنبی لوگوں سے ملتے رہتے ہیں اس لئے اس کا آنا اس کیلئے غیر معمولی بات نہیں ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ ڈائریکٹر صاحب کا کمرہ کس طرف ہے؟

اب کالے کپڑوں میں ملبوس خاتون نے اس کی طرف توجہ مبذول کی اور پوچھا ''آپ کون ہیں؟''

''میرا نام چائے ساپ ہے اور میں یہاں ڈائریکٹر صاحب کیلئے دیوار پر تصویر بنانے آیا ہوں''۔

''ہاں ڈائریکٹر صاحب نے آپ کے بارے میں بتایا تھا، کالے کپڑوں میں ملبوس خاتون نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، جس سے چائے ساپ کی فکرمندی کافی حد تک کم ہوگئی۔ خاتون نے اسے بیٹھنے کیلئے کہا اور وہ اپنا بیگ، جو بارش کے پانی سے تر بتر ہو چکا تھا، ایک طرف رکھ کر اس جگہ پر جا کر بیٹھ گیا جو اسے خاتون نے ایک طرف کھسکتے ہوئے صوفے پر اس کیلئے خالی کی تھی۔

پھر اس خاتون نے بتایا کہ ڈائریکٹر صاحب فی الحال وہاں موجود نہیں ہیں لیکن جنرل منیجر صاحب اس تصویر کے بارے میں سب جانتے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں ہم انہیں آپ کے لئے بلا دیں گے۔ پھر وہ خاتون اس بوڑھے کی طرف متوجہ ہوگئی جس سے وہ چائے ساپ سے مخاطب ہونے سے پہلے باتیں کر رہی تھی۔

چائے ساپ نے تاثر یہ دیا کہ ان کی باتیں نہیں سن رہا لیکن دراصل وہ ان کی ساری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ یہ جوڑا ایک رات کے قیام کیلئے وہاں آیا تھا لیکن کوئی جگہ خالی نہ تھی اس لئے اب وہ ٹائی بائیک جانے والی بس کے بارے میں معلوم کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہوا سے بچاؤ والی جیکٹ پہنے ایک آدمی اندر داخل ہوا اور اس نے اپنی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے سب کی طرف دیکھا۔

''تو آپ پینٹر ہیں'' اس نے مصافحے کیلئے ہاتھ آگے بڑھائے۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے تھے۔ غالباً اس لئے کہ وہ باہر سے ابھی اندر آیا تھا۔

''خوش آمدید، ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ آج صبح مسٹر ہاک کا فون آیا تھا، میرا نام آن جنگ سو ہے اور میں یہاں جنرل منیجر ہوں، میرا کرسچن نام پیٹر ہے''۔

اس نے ایک ہی سانس میں کافی معلومات فراہم کر دیں تو چائے ساپ نے پوچھا کہ آیا ڈائریکٹر صاحب طویل دورے پر گئے ہیں۔

اس نے بتایا کہ وہ اپنے علاج کی غرض سے سیول گئے ہیں اور یہ کہ جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ پھر اس نے رات کے کھانے کا پوچھا جس کے بارے میں چائے ساپ نے فوراہاں کر دی کیونکہ وہ سونے کیلئے جلد از جلد بستر پر جانا چاہتا تھا۔

جنرل منیجر نے کہا'' مجھے امید ہے آپ کل سے کام شروع کر دیں گے، کل صبح میں آپ کو پوری عمارت کا دورہ کرادوں گا اور دیوار، جس پر تصویر بنانی ہے، اس کے بارے میں بھی بتادوں گا''۔

''میں نے برش اور پینٹ تیار رکھنے کیلئے کہا تھا'' چائے ساپ نے پوچھا۔

''وہ تیار ہیں اور ہم نے عمارتیں تعمیر کرنے والی سیڑھی بھی لگا دی ہے آپ کو کھڑے ہونے میں آسانی ہوگی۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا''۔ اس کے اس جواب چائے ساپ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ کل حالات کا جائزہ لے گا۔ اس کے بعد جنرل منیجر پھر گویا ہوا۔ ''مسٹر ماریہ آپ کو اس مرکز کے قواعد وضوابط کے بارے میں بتائے گی۔ یہ صرف پادریوں اور ننوں کا آشرم نہیں بلکہ عام لوگوں کیلئے دیکھ بھال کا مرکز ہے۔ ہم دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی یکساں خوش دلی سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

جنرل منیجر کے جانے کے بعد چائے ساپ کو سارا ماحول جانا پہچانا محسوس ہونے لگا۔ پھر مسٹر ماریہ چائے ساپ کو اس کے کمرے کی طرف لے کر چلی۔ راستے میں اس نے کہا،'' آپ یہاں کام کرنے کیلئے آئے ہیں لیکن میرا خیال ہے آپ ہمارے ٹائم ٹیبل کا خیال رکھیں گے، اگر چہ یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم ساڑھے پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں۔ صبح کی عبادت چھ بجے ہوتی ہے۔ ناشتہ سات بجکر بیس منٹ پر''۔ پھر اس نے تفصیل بتائی کہ باورچی خانہ کس طرف ہے، خواتین کا حصہ کون سا ہے، پورے خاندان والے لوگ کہاں ٹھہرے ہیں اور کھانا کھانے کا کمرہ کون سا ہے۔

جس ڈھلوان پر چائے ساپ نے پہلی عمارت دیکھی تھی اس پر اب اسے بہت سی عمارتیں نظر

آ رہی تھیں۔ وہ سب سے اوپر والی عمارت کی دوسری منزل پر بنے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے اور مسز ماریہ نے اسے بتایا کہ اس کمرے میں اس کے ساتھ کچھ اور مہمان بھی ٹھہریں گے تاہم وہ اس کی موجودگی کا برا نہیں منائیں گے۔ وہاں تین افراد اپنے اپنے بستر بچھائے سو رہے تھے یا پھر مطالعہ میں مصروف تھے۔ کمرہ باہر کے موسم کی طرح ٹھنڈا تھا جس کا مطلب تھا کہ آتشدان میں جلنے والی آگ بجھ چکی ہے۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی۔ چائے ساپ نے اپنا بستر بچھایا اور پھر اپنے بیگ سے دانت صاف کرنے والا برش نکالا اور غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ اس کے سارے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ غسل خانے سے واپس آ کر وہ اپنے بستر میں گھس گیا اور دن بھر کے واقعات کو یاد کرتا ہوا نیند کی گہری وادیوں میں اتر گیا۔

اگلی صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو دن ابھی پوری طرح چڑھا نہیں تھا۔ کہیں قریب سے ہی چڑیوں کے چہچانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا سر مکمل طور پر شفاف محسوس ہو رہا تھا۔ بڑی سست روی کے ساتھ کپڑے پہن کر وہ طہارت، غسل اور سنگھار کے لوازمات پورے کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ بارش رک چکی تھی اور دن بڑا روشن اور چمکدار تھا۔ سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا اور اس کی چمکدار کرنیں بارش سے دھلے ہوئے درختوں کے پتوں پر پڑ رہی تھی۔ مرکزی عمارت سے نکلنے والا دھواں یخ ہواؤں میں پھیل رہا تھا۔ چونکہ وہ ڈھلوان پر بنی سب سے اوپر والی عمارت میں سویا تھا اس لئے وہ اب پورے مرکز کا ایک ہی نظر میں جائزہ لے سکتا تھا۔

''آپ کو نیند تو اچھی طرح سے آئی؟'' اچانک کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

چائے ساپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی تولیہ اپنی گردن کے گرد لپیٹے کھڑا تھا۔ وہ غالباً منہ ہاتھ دھو کر آیا تھا کیونکہ اس کے چہرے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جب چائے ساپ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس شخص نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔

''آپ کل رات کو یہاں پہنچے تھے، میں آپ کا روم میٹ ہوں، آپ کا بیگ کافی بڑا اور بھرا ہوا تھا اس لئے میں نے اندازہ لگایا کہ آپ کافی دن ٹھہرنے کیلئے آئے ہیں، میں تو یہاں سے جلد ہی جانے والا ہوں کیونکہ مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔......اب ناشتے کا وقت ہو رہا ہے تو دونوں اکٹھے ہی نیچے چلتے ہیں''۔

گرجا گھر کے بڑے کمرے کی طرف چلتے ہوئے اس گنجے سر والے آدمی نے چائے ساپ کو بتایا کہ وہ ایک مصنف ہے اور یہاں اپنے اگلے ناول کی منصوبہ بندی کرنے اور ذہن کو سکون دینے کیلئے آیا ہے اور یہ کہ اسے جتنا بھی وقت ملا وہ سویا رہا کیونکہ اس کی سوچ یہ ہے کہ سستی اور کاہلی تخلیقیت کی ماں ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ مذہب کے حوالے سے سوالات میں بالکل بھی دلچسپی نہیں رکھتا ہے۔ چائے ساپ نے اس کی باتیں بے دھیانی سے سنیں لیکن ظاہر یہ کیا کہ اس نے ساری باتیں نہایت دھیان سے سنی ہیں، اس نے اس سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا۔

جب وہ کھانے کے کمرے کے قریب پہنچے تو پکے ہوئے چاولوں کی خوشبو سے ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کمرے میں پہلے ہی کافی لوگ جمع تھے، یوں محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے صبح کی عبادت اسی کمرے میں کی ہے۔ وہاں تیس چالیس افراد موجود تھے جن میں سے آدھے مرد اور آدھی عورتیں تھیں۔ ہر عمر کے لوگ وہاں موجود تھے، بچے بھی تھے۔ دروازے پر ایک آدمی نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے صبح کا سلام پیش کیا۔ یہ ایک لنگڑا آدمی تھا اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ لکڑی کی میزیں مرتب کر رہا تھا۔ جب میزیں قطاروں میں لگ گئیں تو وہاں موجود لوگ اپنی اپنی گدیاں اٹھا کر میزوں کے سامنے بیٹھ گئے۔ چائے ساپ اس میز کے پاس بیٹھ گیا جس کے نزدیک گنجے سر والا ناول نگار بیٹھا تھا۔ جنرل منیجر نے انہیں دیکھا اور پھر ان کے پاس آ گیا تا کہ ان کے ساتھ بیٹھ سکے۔

''رات اچھی گزری، امید ہے آپ کو سردی نہیں لگی ہو گی؟'' اس نے کل رات کی طرح دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''انہیں ٹھنڈ کیسے نہیں لگی ہو گی جبکہ کمرہ گرم ہی نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے بھی دو رضائیاں اوڑھیں تب کہیں جا کر نیند آئی''۔ ناول نگار نے کچھ مزاحیہ اور کچھ شکایت کے لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں آگ بجھ گئی ہو گی اور کچھ لوگ آگ جلانے کی تکلیف گوارا کرنے کی بجائے ٹھٹھرنا زیادہ پسند کرتے ہیں''۔ جنرل منیجر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

کھانا شروع ہونے سے پہلے جنرل منیجر نے وہاں موجود لوگوں سے چائے ساپ کا تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ یہاں کی عمارت کو خوبصورت بنانے کیلئے آیا ہے۔ پھر اس نے آنکھ سے چائے ساپ کی طرف اشارہ کیا تا کہ وہ کھڑا ہو کر حاضرین سے بات کر سکے۔

MashalBooks.com

چائے ساپ نے اپنا تعارف کرایا۔ پھر کھانا شروع ہوگیا اور کھانے کے دوران باتوں باتوں میں یہ بھی طے ہو گیا کہ وہ گنجا ناول نگار دیوار پر تصویر بنانے کے سلسلے میں چائے ساپ کی مدد کرے گا۔ چائے ساپ کو ایسے مددگار کی ضرورت بھی تھی اس لئے وہ راضی ہو گیا، اگرچہ اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ وہ ناول نگار اس کیلئے رکاوٹ کا باعث بنے گا۔

کھانا کھانے کے بعد جب لوگ منتشر ہو گئے تو جنرل منیجر چائے ساپ اور گنجے ناول نگار، جس کا نام ہونگ یونبائی تھا، کو اس جگہ لے گیا جہاں دیوار پر تصویر بنائی جانی تھی۔ یہ عمارت وادی میں نسبتاً نیچے ذرا ہٹ کے واقع تھی۔ یہ ایک عام سی دو منزلہ عمارت تھی۔ جنرل منیجر نے بتایا کہ یہ قدرے عارضی محسوس ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جہاں آپ نے کھانا کھایا وہ جگہ بہت چھوٹی تھی جبکہ مہمان زیادہ تھے۔ مہمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو مدنظر رکھ کر ہی یہ عمارت تعمیر کی گئی۔ بڑی عمر کا ہونے کے باوجود ڈائریکٹر صاحب نے اس کیلئے خود سیمنٹ اور بجری ڈھوئی۔ ان کا ماٹو تھا ''مزدوری عبادت اور عبادت مزدوری ہے'' میرے خیال میں وہ اس عمارت کا اپنی آخری کامیابی کے طور پر خاص خیال رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کا خصوصی تعلق ہے''۔ چائے ساپ اور بوڑھا ناول نگار جنرل منیجر کی باتیں سنتے ہوئے عمارت کا چکر بھی لگا رہے تھے۔ دیوار پر پینٹ کیا گیا تھا جس میں سے تھنر کی بو ابھی تک آ رہی تھی۔ طویل قامت صنوبر کے درختوں کے سائے اس دیوار پر پڑ رہے تھے۔

جنرل منیجر کی باتیں سن کر چائے ساپ کچھ پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ سادہ سا کام ہو گا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کام محض دیوار کو سجانا نہیں ہے اور حقیقت یہ تھی کہ چائے ساپ نے اس سے پہلے کبھی دیوار پر مذہب سے متعلق تصویر ہی نہیں بنائی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے ایسی تصویر بنانے سے انکار کر دینا چاہیے یا پھر زیادہ تیاری کے ساتھ دوبارہ آنا چاہیے لیکن وہ خاموش رہا اور جنرل منیجر کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ چلتے چلتے جنرل منیجر ایک دیوار کے سامنے جا کر رک گیا اور بتایا ہے کہ یہی دیوار ہے جس پر تصویر بنانا ہے۔ چائے ساپ چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر دیوار کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے دیوار بہت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ یہ تقریباً پانچ میٹر چوڑی اور آٹھ میٹر اونچی تھی چنانچہ اگر وہ نیچے دو میٹر جگہ چھوڑتے تو تصویر کیلئے کینوس چھ میٹر اونچا اور پانچ میٹر چوڑا بنتا تھا۔ اس عمارت کی دیگر دیواروں پر تصویر

بنانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ پہاڑوں کی وجہ سے بلاک تھی۔

''آپ کتنی دیر میں اپنا کام مکمل کر لیں گے؟'' جنرل منیجر نے سارا سروے کروانے کے بعد سوال کیا۔

''مجھے دم بھر کو سوچنے دیں'' چائے ساپ نے کہا اور پھر کھڑے ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ سب سے پہلے اسے فیصلہ کرنا تھا کہ موضوع کیا ہونا چاہیے پھر اسے بنیادی پینٹنگ کرنا تھی یعنی پیکروں کے ذریعے پورے منظر کو واضح کرنا تھی۔ اگر یہ کام ٹھیک طریقے سے ہو گیا تو اس سکیچ میں رنگ بھرنا زیادہ کٹھن نہیں ہو گا۔ ایسی پینٹنگ ذرا فاصلے سے جاذب نظر آنی چاہیے اس لئے باریک بینی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سوال یہ تھا کہ کس قسم کی تصویر بنائی جائے جو اس ماحول کے مطابق ہو اور جس کی انفرادی حیثیت بھی قائم رہے۔ وہ ابھی تک سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جنرل منیجر وہاں سے چلا گیا اور چائے ساپ اور وہ ناول نگار اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ اس نے اپنے بیگ سے خاکوں والی کتاب اور پنسل نکالی۔ ناول نگار تو رضائی اوڑھ کر لیٹ گیا اور کہا کہ وہ اپنے ناول کے بارے میں کچھ سوچ بچار کرنا چاہتا ہے۔ چائے ساپ اپنی چیزیں لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے نئی عمارت کے پاس جا کر اپنی کتاب میں اس کے پورے ڈھانچے کی شبیہ بنائی اور پچھلی طرف والی پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اس پہاڑی کی چوٹی سے پورے کمپلیکس کا منظر بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔

پہاڑی پر مکمل خاموشی اور ویرانی تھی۔ پریشانی ہو رہی تھی تو صرف دھند سے۔ مرکز کے اندر چونکہ سگریٹ پینے پر پابندی تھی اس لئے اب چائے ساپ کو موقع ملا تو اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ایک چٹان پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے چائے ساپ نے اپنے دل کے اندر ایک اتھاہ خاموشی اور تنہائی کو اترتے محسوس کیا۔ اس کی بیوی کی شبیہہ اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی، وہ اس وقت کہاں ہو گی؟ اس نے اپنے ذہن میں سوچا۔ اس شادی کی ناکامی کا ذمہ دار غالباً دونوں میں سے کسی کو بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس متلون مزاج انسان کے لئے ناممکن ہے کہ پوری زندگی صرف پیار اور محبت کے سہارے گزار دے۔ اپنی اکیلی بیوی کے بارے میں سوچ کر اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ بھی اس کی طرح کہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہو گی۔

اس غمزدہ سوچ سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے چائے ساپ نے کتاب کھول لی اور کہانی وہیں سے پڑھنا شروع کر دی جہاں ریل گاری میں سفر کے دوران اس نے چھوڑی تھی۔ فریڈ ایک سنہرے بالوں والی لڑکی اور ایک شریر بچے کا پیچھا کرتا ہے اور پھر وہ ایک بیکری سے بسکٹ وغیرہ اور کافی خریدتے ہیں۔ اس کی بیوی کیٹ بھی پادری کے سامنے اعتراف کرنے کے بعد اسی بیکری سے ادھار چیزیں لینے جاتی ہے۔ وہ تنہا لوگ تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ایسے لوگ تھے تنہائی کا زہر جن کی ہڈیوں اور گوشت تک میں رچ بس چکا تھا۔ تب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون ہے جو تنہا نہیں ہے۔

پانچویں روز چائے ساپ نے دیوار پر خاکہ بنانا شروع کر دیا۔ سیڑھی درست مقام پر لگانے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس کے بعد چائے ساپ نے دیوار کو صاف کیا اور پینٹ ملانا شروع کر دیا۔ گنجا ناول نگار بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اس نے بالٹی میں پینٹ کو ایک چھڑی سے ہلاتے اور ملاتے ہوئے کہا کہ ایک بار اس نے بھی سوچا کہ ایک پینٹر بن جائے۔ پھر اس نے چائے ساپ سے پوچھا کہ اس نے رومین رولاں کا ناول ''جین کرسٹوف'' پڑھا ہے، پھر خود ہی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''اسکی مکمل کہانی کیا تھی یہ تو میں بھول گیا ہوں لیکن یہ بات یاد ہے کہ اس میں لکھا تھا، ''سایوں کے بھی رنگ ہوتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا سایوں کے رنگ ہوتے ہیں''؟ پھر سوال کیا'' تو کیا ساری تصویر آپ کے ذہن میں واضح ہوگئی ہے۔ جواب میں چائے ساپ نے کہا کہ اسے اس بارے میں یقین نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذہن میں تصویر کے خدوخال واضح نہ تھے اگرچہ اس کے دل میں ایک مبہم سی شبیہ ابھر رہی تھی لیکن تصویر ابھی بالکل صاف اور واضح نہ تھی۔ پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ اس پر کام شروع کر دینا ہی بہتر ہے۔ وہ فکرمند تھا کہ اتنا عرصہ بے کار رہنے کی وجہ سے اس کی صلاحتیں متاثر ہوئی ہوں گی، اس کا خیال تھا کہ ایک بار شروع کرے گا تو تصویر کی خود بخود کوئی نہ کوئی شکل نکل آئے گی یہ الگ بات ہے کہ چار دیواری سے باہر کسی دیوار پر بنی تصویر چند ہی برسوں میں پھیکی پڑ جاتی ہے۔

چائے ساپ نے یونبائی کو بتایا کہ وہ جنگل بیابان میں کھڑے حضرت عیسیٰ کی تصویر بنانا چاہتا ہے۔ بوڑھے ناول نگار نے اس طرح کا ردعمل ظاہر کیا جیسے یہ بات اس کی توقعات کے مطابق نہ ہو۔

چائے ساپ نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ ناول نگار کے تجسس کو کم کر سکے، اس کا ایسی

تصویر بنانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا۔لیکن ایک بار جب اس نے زبان سے یہ الفاظ ادا کر دیئے تو اسے محسوس ہوا کہ دراصل یہی کچھ تو ہے جو اس کے دل میں چھپا ہوا تھا۔ایک نوجوان آدمی جھکے ہوئے سر کے ساتھ گہری سوچوں میں غرق جنگل بیابان میں سے گزر رہا ہے جبکہ افق سے روشنی کی ایک کرن ابھر کر اس کی طرف آرہی ہے۔اس کی آنکھیں انسانیت کے لئے ہمدردی اور مہربانی کے جذبات اور ایک تکلیف دہ موت کے قریب آنے کے خوف سے چمک رہی ہیں اور وہ ایک جنگل میں تنہا کھڑا ہے، جو بہت وسیع ہے۔ بوڑھے ناول نگار کے سوال کے جواب میں اس کے ذہن میں یہی تصویر ابھری تھی۔

''کیا آپ خدا پر ایمان رکھتے ہیں''؟ یونبائی نے ایک نئی بحث شروع کر دی۔

''میں نہ تو اس پر ایمان رکھتا ہوں اور نہ ہی ایسا ہے کہ میں اس پر ایمان نہیں رکھتا''۔

''میں ملحد ہوں اور مجھے خدا کے موجود ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں جنت میں جانے کا بھی شوق نہیں رکھتا۔آپ جاننا چاہیں گے کیوں'' پھر اس نے خود ہی وضاحت کرتی،''میں ایسی جگہ سے اکتا جاؤں گا جہاں نہ کوئی تکلیف ہوگی اور نہ ہی کوئی جھگڑا ہوگا۔آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے''؟

چائے ساپ نے اس کی باتیں بالکل غور سے نہیں سنی تھیں۔وہ تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے صرف اتنا کہا کہ اس نے ان باتوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔اس نے اپنے بیگ سے کام کے وقت کپڑوں کے اوپر پہنے والا لباس نکالا، نیلے بارڈر والی ٹوپی پہن کر گردن کے گرد تولیہ لپیٹا اور سفید رنگ کے دستانے پہنے۔اب وہ پورا پینٹر نظر آرہا تھا اور وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ لوگ اپنے درمیان ایک پینٹر کو محسوس کریں۔حتیٰ کہ جب ماریہ نے اسے دیکھا تو وہ بھی حیران رہ گئی اور پوچھا'' آپ اپنا کام شروع کرنے جارہے ہیں''۔

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے''۔وہ دراصل اس سے ایک واش بیسن کا تقاضا کرنے گیا تھا تاکہ اپنے ہاتھ اور ضروری چیزیں دھو سکے۔

''مجھے تم پر رشک آتا ہے حالانکہ جو کام تم کرنے جارہے ہو اس کے سلسلے میں میں ایسے ہی ہوں جیسے کسی اندھے کو پینٹنگ کرنے کیلئے کھڑا کر دیا جائے''۔ماریہ نے مذاق کیا۔

''میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے البتہ میں بالکل کورچشم نہیں ہوں آپ کام کے حوالے سے مجھے

کانا کہہ سکتی ہیں'' اس مذاق پر ماریہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کی ہنسی کی بازگشت اسے اپنے کانوں میں اس وقت بھی سنائی دیتی رہی جب وہ دیوار کے پاس واپس آ گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل جو حضرت عیسیٰ کو بیابان میں دکھانے کے حوالے سے بوجھل تھا ایک دم صاف اور ہلکا ہو چکا ہے۔

کسی فن کی کون سی قیمت لافانی ہوتی ہے۔ کوئی بھی مادی قیمت ایک نہ ایک دن فنا ہو جاتی ہے۔ مجھے یہاں ہمیشہ تو رہنا نہیں ہے۔ اگر میں اس کام پر بھرپور توجہ دوں تو اس کیلئے دو ہفتے کافی ہیں۔ ہاں میں اسے دو ہفتے میں مکمل کر لوں گا۔ مجھے امید ہے اس وقت تک میری بیوی واپس آ چکی ہو، میری بیوی شادی سے پہلے کے معاشقے کے دوران وہ مجھے رلا دیتی تھی۔ جب میں فوج میں تھا تو ہم ایک دوسرے کو کس قدر خطوط لکھا کرتے تھے۔ وہ عمارت کی دوسری منزل پر کرائے کے کمرے کے ٹیرس پر مختلف پھول اگاتی تھی۔ ممکن ہے یہ میری غلطی ہو کہ ہم اس طرح سے الگ ہو گئے۔ ممکن ہے میری بیٹی کی موت اس معاملے میں محض ایک بہانہ ہو۔ میں بغیر کسی وجہ کے متزلزل ہو گیا تھا اور میری بیٹی کی موت میرے متزلزل ہونے کی وجہ نہ تھی بلکہ نتیجہ تھی۔

اسے تصویر کے ابتدائی خدوخال تیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے دیوار کی پوری چوڑائی کو بھر دیا تھا لیکن نیچے سے دو میٹر کا مارجن چھوڑا تھا۔ مارجن چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ دیوار کا نیچے والا حصہ عام طور پر خراب ہو جاتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ دیوار کیلئے نیچے والے حصے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جس دوران چائے ساپ تصویر کی بنیادیں بھر رہا تھا بوڑھا ناول نگار ایک چٹان پر بیٹھا اسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی وہ کسی مشورے سے بھی نواز دیتا تھا۔ ایک روز وہ کہنے لگا

''میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے کہ میں اپنے کسی ناول میں آپ کا کردار شامل کروں''۔

اس بات پر چائے ساپ تو ٹھٹھہ مار کر ہنسا لیکن بوڑھے ناول نگار نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''میرا مطلب ہے کہ ایک المناک اور حسرت ناک آرٹسٹ کے طور پر کیونکہ تمہارے سارے وجود سے حسرت ٹپکتی ہے، یہی حالت تمہاری تصویروں کی بھی ہے اور تم یقیناً ایسے آدمی نہیں ہو جو اس دنیا کے مطابق ہو''۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوا

''حقیقت یہ ہے کہ یہاں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ملیں گے''

اس نے تصویر کا ابتدائی کام مکمل کیا ہی تھا کہ برفباری شروع ہو گئی اور چند ہی گھنٹوں میں

پوری وادی نے برف کی سفید چادر اوڑھ لی۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ تیسرے دن برف باری رک گئی اور چمکدار سورج طلوع ہوا۔ اس کی گرمی سے درختوں، مکانوں اور چٹانوں پر سے برف پگھلنے لگی اور ان پر سے پانی کے قطرے گرنے کی زندگی آمیز آوازیں آنے لگیں۔ بوڑھوں کی دیکھ بھال کا مرکز بھی جیسے جاگ گیا ہو اور چائے ساپ کو کچھ دیر کی خانہ پری کے بعد اس کی زندگی زیادہ قیمتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ اس نے آسمان اور جنگل کے بنیادی رنگ لگائے اس نے آسمان کیلئے گہرا نیلا اور جنگل کیلئے سنگترہ رنگ استعمال کیا کیونکہ بعد میں ان پر رنگوں کی ایک اور تہہ چڑھائی جانی تھی۔ اس نے حضرت عیسیٰ کی شبیہہ کے خدوخال کالے رنگ میں بنائے۔ دیوار کافی چوڑی تھی اور سیڑھی زیادہ اونچی نہیں تھی اس لئے یہ ایک تکلیف دہ اور تھکا دینے والا کام تھا۔ پھر رنگ بھی پانی میں گھلنے والے تھے اس لئے وہ سوکھنے میں زیادہ وقت لیتے تھے۔ بنیادی رنگ بھرنے کے بعد چائے ساپ نے تفصیلی کام شروع کر دیا۔ آسمان اوپر سے گہرے رنگ کا بنایا گیا جو افق تک آتے آتے ہلکے رنگ کا ہو جاتا تھا۔ افق گہرے سمندر کے رنگ میں بنایا گیا۔ پو پھٹنے کا وقت دکھانا سب سے زیادہ مشکل کام تھا لیکن ایسی تصویر بھی بن سکتی تھی کہ وہ شام کا دھندلکا دکھائی دے چنانچہ تصویر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کیلئے چائے ساپ نے ایک روز پہاڑی پر چڑھ کر سورج کو طلوع ہوتے دیکھا اور اور اسکے رنگوں کا جائزہ لیا۔ پھر اسے اس امر کا بھی خیال رکھنا تھا کہ جنگل کا رنگ آسمان کے رنگ کے ساتھ تال میل کھائے۔ اس کیلئے چائے ساپ نے جنگل کا نچلی حصہ گہرے رنگ میں پینٹ کیا جبکہ اوپر والا افق کے قریب کا حصہ ہلکے رنگ میں دکھایا۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ درختوں اور زمین پر پڑے چھوٹے پتھروں کو بھی نیلے رنگ میں پینٹ کیا۔ پھر اس نے سفید رنگ کی کرن پینٹ کی اور وہ اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا کیونکہ آسمان اور جنگل دونوں گہرے رنگوں میں تھے اور سفید رنگ کی کرن سے کینوس دو حصوں میں تقسیم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

چائے ساپ اب پر جوش دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ اور ہاتھ پینٹ سے لتھڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور اس کی آشفتہ داڑھی ایسے محسوس ہوتی تھی کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی شیو نہیں کرائی۔ اس کی آنکھیں کبھی خالی دکھائی دیتی تھیں اور کبھی ان میں شوق اور تجسس نظر آتا تھا لیکن کسی دوسرے کو اس کی آنکھوں کے اندر تک رسائی نہ تھی۔ اس نے کبھی زیادہ بات نہیں کی تھی اور اب تو وہ بالکل ہی خاموش ہو گیا

تھا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب وہ زیادہ اپنی دھن میں مست رہنے لگا تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ یہ وہ لوگ جنہیں اپنی اپنی زندگیوں میں کافی پریشانیوں کا سامنا تھا اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے طریقے سے دنیا سے انحراف برت رہے تھے۔ وہ سب پرامن اور پرسکون نظر آتے تھے لیکن رات کی عبادت میں آپ ان کی دعائیں اور التجائیں اور بعض اوقات تو سسکیاں بھی واضح طور پر سن سکتے تھے۔ لیکن اگلی ہی صبح وہ پھر سے پرامن اور پرسکون نظر آتے تھے۔ معاملہ جو بھی ہو حقیقت یہی ہے کہ وہ مہربان اور صورتحال کو سمجھنے والے لوگ تھے اسی لئے انہوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا تا کہ وہ اپنا کام کر سکے۔ کبھی کبھی ماریہ اور بوڑھا ناول نگار اس سے باتیں کرتے تھے لیکن وہ ان کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔

چائے ساپ کا کام کئی روز سے جاری تھا۔ اس کا معمول بڑا سادہ تھا۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنا کام شروع کرتا تھا جو دوپہر تک جاری رہتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرتا اور پھر دن ڈھلے تک تصویر کی تکمیل میں لگا رہتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ موسم اور پینٹنگ کے سوا کچھ بھی تبدیل نہیں ہو رہا ہے۔ چائے ساپ کو اپنا کام شروع کیے دو ہفتے گزر چکے تھے اور دوران میں موسم کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ اب بہار کی ہوا چلنے لگی تھی۔ پہاڑوں پر سے برف تقریباً مکمل طور پر پگھل چکی تھی۔ تصویر کے خدوخال اتنے واضح ہو چکے تھے کہ سبھی جاننے لگے تھے کہ دیوار پر جو نقش نگاری کی جا رہی ہے اس کا موضوع کیا ہے۔

اب مرحلہ حضرت عیسیٰ کی شبیہ بنانے کا تھا۔ پہلے چائے ساپ نے سوچا کہ ان کو پھٹے پرانے کپڑوں میں دکھایا جائے لیکن چونکہ تصویر کا پس منظر گہرا تھا اس لئے اس نے انہیں سفید کپڑوں میں ملبوس دکھانے کا فیصلہ کیا البتہ اس نے کپڑوں کی تہوں اور افق سے دوسری طرف چہرے کے رخ کو گہرے رنگ میں پینٹ کیا۔ اب حضرت عیسیٰ کے چہرے کی شبیہ بنانا تھی جس میں بہت سے جذبات اور احساسات کو اکٹھا کرنا تھا۔ اس کیلئے کچھ تفصیلی اور نفیس کام کی ضرورت تھی۔

جونہی تصویر تکمیل کے آخری مراحل میں داخل ہوئی تو لوگ اسے دیکھنے کیلئے آنے لگے۔ وہ گزرتے ہوئے لحہ بھر کے لئے رک کر تصویر کو دیکھتے تھے جیسے کہیں سے واپس آتے ہوئے تصویر دیکھنے کیلئے رک گئے ہوں اور یہ نہیں ظاہر کرتے تھے کہ وہ محض اس کام کیلئے اس طرف آئے ہیں۔ وہ کچھ بولتے

ہوں یا نہ بولتے ہوں ان کے چہروں سے ایک چیز واضح ہو جاتی تھی کہ وہ اسے ایک نادر چیز سمجھ رہے ہیں۔ایک دن جنرل مینیجر ادھر سے گزرا تو اس نے کام کی تعریف کی اور بتایا کہ ڈائریکٹر صاحب جلد آ رہے ہیں۔ ماریہ بھی اب اس پر زیادہ مہربان نظر آتی تھی۔ وہ اکثر اس کیلئے چھیلے ہوئے اور کٹے ہوئے پھل لے کر آتی تھی۔ یہ پھل اس نے ایک کپڑے سے ڈھانک رکھے ہوتے تھے تاکہ کسی کی ان پر نظر نہ پڑے تاہم بوڑھے ناول نگار نے دو مرتبہ یہ چوری پکڑ لی اور چائے ساپ کو مبارک باد دی کہ اتنی اچھی لڑکی اس پر فدا ہے۔

تصویر کی حتمی تکمیل سے پہلے چائے ساپ نے ایک دن کیلئے آرام کیا۔ناشتے کے بعد وہ پچھلی پہاڑیوں پر چڑھ گیا۔ ہمیشہ کی طرح پہاڑی اس روز بھی خاموش اور ویران تھی۔ وہ ایک ایسی چٹان پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ پورے مرکز اور اپنی بنائی گئی تصویر کا جائزہ لے سکتا تھا۔وادی سے دھند اوپر اٹھ رہی تھی۔ درماندگی کی سی کیفیت جو اس کے یہاں آنے سے پہلے اس کے دل و دماغ پر چھائی تھی اب کافی حد تک اس کی شدت میں کمی آ چکی تھی لیکن اس کے دل میں اب بھی ایک چبھن ایک بے چینی تھی جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ایک بے نام سا غم اور پریشانی اس کے دل میں پھیلی ہوئی تھی۔اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور آہستگی سے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ پھر مختلف خیالات اس کے ذہن میں آنے لگے، اگر وہ پوری رفتار سے کام کرے تو اگلے روز وہ تصویر مکمل کر سکتا تھا۔اسے حضرت عیسیٰ کی تصویر کو زندگی آمیز بنانا تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور پہاڑی پر بیٹھ کر سوچ اور فکر میں گم رہا۔شام کے قریب وہ پہاڑی سے اتر آیا۔

اس رات چائے ساپ کچھ شور سن کر جاگ گیا۔ کہیں جھگڑا چل رہا تھا اور کسی کے چلانے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے اسے جھنجھوڑا اور پکارا ''چائے ساپ بھائی، چائے ساپ بھائی، وہ لنگڑا نوجوان تھا جس کا نام پاک تا لجن تھا۔

''کیا بات ہے''؟ چائے ساپ نے پوچھا۔

''جلدی سے اٹھو برادر یونبائی نے تمہاری تصویر کے ساتھ کچھ کر دیا ہے''اس نے جواب دیا۔

''اس نے کیا کیا ہے تصویر کے ساتھ'' یہ اس کا اگلا سوال تھا۔

''اس نے تصویر پر پینٹ کے ساتھ دھبے لگا دیئے ہیں''۔

چائے ساپ اٹھا اور کمرے سے باہر کی طرف بھاگا، باہر ابھی اندھیرا باقی تھا، کسی کسی جگہ بلب جل رہے تھے جس سے راستہ نظر آ رہا تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ فروری کی ٹھنڈی یخ ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے کے ساتھ ٹکرائے۔ اس کے پیچھے پیچھے لنگڑا کر چلتے ہوئے تالجن نے بتایا کہ بھائی یونبائی کہہ رہا تھا کہ وہ تصویر کو خود مکمل کرے گا۔ چائے ساپ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سر پر زور سے ڈنڈا دے مارا ہو۔ راستے میں ان کو جنرل منیجر مل گیا۔ جنرل منیجر کا خیال تھا کہ وہ چائے ساپ ہے لیکن وہ تو ہونگ یونبائی تھا۔ چائے ساپ تصور کر سکتا تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن اس کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کس مقصد کے تحت ہوا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ یونبائی کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں۔

''کیا ہوا ہے''؟ چائے ساپ نے جنرل منیجر سے پوچھا۔

''میں اس پر چلایا کہ ایسا نہ کرے، میں سیڑھی پر چڑھا لیکن یونبائی کا پیر پھسل گیا اور وہ نیچے گر گیا، اس کے سر میں چوٹ آئی ہے'' جنرل منیجر نے جواب دیا۔

وہ تیزی سے نئی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے جبکہ تالجن بری طرح لنگڑاتا ہوا ان کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں جا کر انہوں نے دیکھا کہ گنجے ناول نگار کا پورا سر خون سے تر بتر ہو رہا ہے اور اس تولیے پر بھی خون جمع ہو رہا تھا جو اس کے زخم پر رکھا گیا تھا۔

ہانگ یونبائی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور گویا ہوا ''میں جانتا ہوں تمہارے اندر کوئی خدا نہیں ہے، اس لیے تم نے خدا کی تصویر نہیں بنائی، جو تصویر تم نے بنائی ہے وہ فراڈ ہے، مکمل فراڈ، تمہاری تصویر انسانی مصائب اور مایوسیوں پر مبنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں جو تصویر ہے وہ تمہاری ہے لیکن تم نے اسے ایک مایوس خدا کی شبیہہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ خدا کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ میں یہ بات ایک ملحد ہونے کے باوجود کہتا ہوں تم سمجھے''۔

کچھ لوگ یونبائی کو لے کر چلے گئے۔ جو وہاں باقی بچے وہ بھی ادھر ادھر منتشر ہونے لگے۔

چائے ساپ وہاں اکیلا رہ گیا۔ اس نے سگریٹ جلایا اور دیوار کا جائزہ لینے کیلئے اس پر نظر ڈالی۔ اگرچہ وہاں روشنی موجود تھی۔ پھر بھی وہ تصویر کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ تصویر پر درختوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ چائے ساپ سیڑھی پر چڑھ گیا۔ دیوار پر تازہ گیلا پینٹ اب بھی نظر آ رہا تھا۔ یونبائی نے حضرت عیسیٰ کے چہرے کے گرد زرد رنگ کا ایک ہالہ بنایا تھا جس سے چہرہ بچے کے چہرے جیسا نظر آ رہا تھا، یہ عمل نفیس

انداز میں نہیں کیا گیا تھا، پھر بھی یہ ایک واضح تصویر تھی۔ آنکھیں خاص طور پر بڑی اور جاذب نظر تھیں۔ چائے ساپ دیکھ سکتا تھا کہ یونبائی نے کیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی آنکھیں افق سے شروع ہو رہی تھیں، یہ آنکھیں مایوسی اور تکلیف کا احساس لئے ہوئے نہیں تھیں بلکہ شادمانی اور چیلنج سے لبریز تھیں۔ ایسی آنکھیں جنہوں نے اندھیرے اور رات کی سیاہی پر فتح پالی ہو۔

چائے ساپ وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ تصویر کا وہ حصہ یونبائی نے جس میں تبدیلی پیدا کی تھی بہت بڑا نہیں تھا اور اسے آسانی سے تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ وہ سیڑھی سے نیچے اتر آیا اور ریت سے بھری ایک بوری پر بیٹھ گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس حرکت پر اسے یونبائی پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ روشنی کے سفید ذرے ہوا میں پھیلے تو چیزیں زیادہ واضح طور پر نظر آنا شروع ہو گئیں، وہ اشیاء جو کچھ دیر پہلے اندھیرے کا حصہ بن چکی تھیں وہ اب انفرادی حیثیت اختیار کر رہی تھیں۔ جلد ہی عمارت کی چمنیوں میں سے کالا دھواں نکلنے لگا اور فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ مثبت انداز میں تبدیلی کا جائزہ لینے کے بعد چائے ساپ سیڑھی پر چڑھ گیا اور مگن ہو کر سارا دن تصویر پر کام کرتا رہا۔ بہت سے لوگ اسے کھانے کیلئے بلانے آئے۔ ماریہ کھانے کے بعد دودھ میں پکے ہوئے دلیے کا ایک پیالہ لے کر اس کے پاس آئی اور اسے نیچے آنے کیلئے کہا۔ وہ نیچے تو نہیں آیا البتہ اس نے ایک نظر ماریہ کی طرف دیکھا۔ اپنے روایتی کالے سوٹ کے اوپر وہ سفید رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ کالے کے اوپر سفید رنگ زیادہ روشن نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر پینٹنگ میں جت گیا۔ ماریہ کچھ دیر گہری سوچ میں ادھر ادھر چکر لگاتی رہی اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

چائے ساپ اس وقت ایک دیوانہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی ٹوپی نیچے گر گئی تھی اور اس کے بال ٹھنڈی ہوا میں لہرا رہے تے۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی تھیں۔ اس نے اس روز پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پیا تھا۔ کافی دیر کے بعد بعد از دوپہر اس نے اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا۔ اس نے وہی تصویر بنائی تھی جس کا یونبائی نے کہا تھا۔ اس نے اپنی تصویر بنا ڈالی تھی۔ یہ ایک تینتیس سالہ شخص کا مصائب و آرام سے گھرا ہوا چہرہ تھا جس کے بال اس کے کندھوں سے نیچے تک بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا آدھا چہرہ تاریکی میں تھا لیکن دوسرا رخ صبح کی تیز روشنی میں دمک رہا تھا۔ چائے ساپ نے یونبائی کا یہ آئیڈیا بھی

تسلیم کر لیا تھا کہ تصویر میں جو کوئی بھی ہے اسے دور افق کی طرف دیکھنا چاہیے۔اس کی آنکھیں اس کی اندرونی روشنی اور حرارت سے چمک رہی تھیں جس نے اسے ایک رات قبل ایک خوفناک تنہائی سے نجات دلائی تھی۔اس کے ہونٹوں پر ایک پروقار قسم کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

جب چائے ساپ نے برش رکھا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ یہ پانچ میٹر چوڑی اور چھ میٹر اونچی تصویر تھی شام کی شفق کی وجہ سے تصویر پر سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں جس سے تصویر اور زیادہ خوبصورت محسوس ہو رہی تھی۔ جب لوگوں نے مکمل کردہ تصویر دیکھی تو وہ داد و تحسین پیش کرنے لگے۔لیکن چائے ساپ تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔آخری زینے پر پہنچ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا اور نیچے گر گیا۔اس نے سنا کہ لوگ چلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن وہ اپنے ہوش کھوتا چلا گیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں نہ تھا۔ یہ کوئی اور کمرہ تھا جس میں کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہ تھا سوائے ایک لکڑی کے ڈیسک کے، دور کہیں سے حمد یہ کلمات سنائی دے رہے تھے اور اسے ویسی ہی گھنٹیاں سنائی دے رہی تھیں جیسی اس نے پہلی رات سنی تھیں۔ وہاں لیٹے لیٹے اس کی ماضی کی زندگی کی ریل کسی سیر بین کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ٹرین کا سفر،ٹرین کی کھڑکی میں سے دور کی کسی آبادی کے کسی مکان کی چمنی سے اٹھتا ہوا دھواں، پوٹریٹ،اس کی بیٹی کی موت،اس کی بیوی کا روٹھ کر چلا جانا، سٹوڈیو میں لڑکی کے ساتھ پیار کا اظہار اور دھند میں لپٹا ہوا بوڑھوں کی دیکھ بھال کا یہ مرکز انہی خیالوں میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ماریہ اندر داخل ہوئی۔

''آپ جاگ رہے ہیں'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! کیا وقت ہوا ہے؟''

''نو بجے ہیں، آپ اٹھنے کی کوشش بالکل نہ کریں۔ میں چاہتی تھی کہ آپ سوئے رہیں لیکن جنرل منیجر صاحب کا کہنا تھا کہ آپ کو کچھ نہ کچھ ضرور کھانا چاہیے''۔ ماریہ نے تفصیلی جواب دیا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے آپ اس بارے میں بالکل فکر نہ کریں''۔

''آپ نے کمال کی تصویر بنائی ہے سارے اس کی تعریف کر رہے ہیں'' یہ کہہ کر ماریہ نے چائے ساپ کو ایک خط دیا۔ یہ خط اس کی بیوی یاک مک یونگ کی طرف سے تھا،اس نے لکھا تھا۔

چائے ساپ!

میں تمہارے سٹوڈیو گئی تھی، وہاں سے پتہ چلا کہ تم انڈیا جا رہے ہو، میں ایک دم گھبرا گئی تھی لیکن مایونگ ہونے مجھے تمہارا پتہ دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ میں کسی کو یہ نہ بتاؤں کہ یہ ایڈریس اس نے مجھے دیا ہے۔ اگر وہ مجھے نہ بتاتا تو میں یہی سمجھ لیتی کہ تم انڈیا گئے ہو۔ تمہیں اس طرح چھوڑ آنے پر میں شرمندہ ہوں۔ ہم دونوں ہی اس عرصے میں پریشان رہے۔ میں نے اس وقت سے اپنے ماضی کو بہت یاد کیا ہے۔ تم نے مجھے یاد کیا؟ جب تم فوج میں تھے تو تمہاری چھٹی والے دن ہم فلاں فلاں جگہ گئے تھے۔ زندگی میں خوشگوار یادوں سے بہتر اور قیمتی کیا ہو سکتا ہے؟ میں یہ سوال کرتے ہوئے نہایت خوفزدہ ہوں کہ تم مجھے اب بھی پیار کرتے ہو؟ میں گھر واپس آنا چاہتی ہوں اور میں یہ بھی چاہوں گی ہمارے ایک اور بچہ پیدا ہو۔ میرا خیال ہے یہی وقت ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو بھول جائیں۔ جب تم انڈیا سے واپس آؤ تو مجھے فون ضرور کرنا۔

صرف تمہاری مک یونگ

سرسری طور پر پڑھنے کے بعد چائے ساپ نے خط کو دوبارہ آہستہ آہستہ اور ہر فقرے پر توجہ دیتے ہوئے پڑھا۔ پھر اسے نفیس طریقے سے تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔ کیا مجھے اس سے اب بھی محبت ہے؟ اس سوال پر وہ ہلکے سے مسکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی کی تصویر لہرا گئی اور دو آنسو اس کی گالوں سے پھسلتے ہوئے نیچے تکیے پر جا گرے اور اس میں جذب ہو گئے۔ وہ اس طرح یادوں میں کھوئے کھوئے سو گیا۔

صبح اٹھ کر چائے ساپ نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ جنرل منیجر نے یہ کہہ کر اسے روکنے کی کوشش کی کہ وہ ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا ہے لیکن وہ نہ مانا، پھر جنرل منیجر نے یہ کہا کہ کل ڈائریکٹر صاحب آ رہے ہیں لیکن چائے ساپ پر واپس جانے کی دھن سوار تھی۔ جنرل منیجر نے اس سے یونبائی کے کئے کی معذرت کی لیکن چائے ساپ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں ناراض نہیں ہوں بلکہ میں نے تو اس سے سبق سیکھا ہے۔ اپنی تصویر کو بہتر بنایا ہے۔ جنرل منیجر نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے بس کے اڈے تک چھوڑنے جانا چاہتا ہے، چائے ساپ انکار نہ کر سکا۔ جنرل منیجر نے اس کی جیب میں ایک لفافہ ڈال دیا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ ماریہ سے مل کر اس سے بات کر سکتا چنانچہ اس نے اپنے بیگ میں سے وہی ناول نکالا جو وہ ٹرین کے سفر کے دوران پڑھتا رہا تھا اور جنرل منیجر سے کہا کہ وہ اسے

ماریہ کو دے دے۔

وہ دفتر سے باہر آ گئے اور لکڑی کے زینوں پر پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔ عمارت کے صحن سے نکل کر وہ ایک سڑک پر آ گئے۔ دونوں گہری سوچ میں ڈوبے چل رہے تھے۔ پل کے پاس پہنچ کر جنرل منیجر نے خاموشی توڑی ''جب پہلی بار تم سے ملا تھا تو میرا خیال تھا کہ تم یہ کام نہیں کر سکو گے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ تم نے جو تصویر بنائی ہے وہ ایک شاہکار ہے اس میں ایک عام آدمی کی ساری خوشیاں اور سارے غم چھپے ہوئے ہیں''۔

یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک نکال کر چائے ساپ کو دیا اور کہا۔

''یہ ہماری طرف سے ایک حقیر سا نذرانہ ہے''۔

''نہیں، میں یہ نہیں لے سکتا''۔

''براہ مہربانی جناب، یہ محض محبت کا اظہار ہے، سسٹر ماریہ جانتی تھی کہ آپ آج جا رہے ہیں اور اُس نے یہ لفافہ تیار رکھا ہوا تھا''۔

چائے ساپ نے ایک بار پھر انکار کرنے کی کوشش کی لیکن منیجر نے زور دیا کہ وہ لفافہ قبول کرے۔

''میں اس کی توقع نہیں کر رہا تھا، پھر آپ کا شکریہ''۔

''یہ کسی بھی طور آپ کی محنت کا معاوضہ نہیں ہے۔ آپ نے جو کام کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کا معاوضہ ادا بھی نہیں کر سکتے لیکن مجھے امید ہے کہ اس سے آپ کے سفر کے اخراجات ضرور پورے ہو جائیں گے۔ مجھے افسوس ہے آپ کی ڈائریکٹر صاحبہ سے ملاقات نہ ہو سکی'' وہ اپنے ہاتھ پشت پر باندھے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ہوا نے اُس کے چھوٹے کٹے ہوئے بالوں کو لہرا دیا۔ چائے ساپ نے لفافے کو دوہرا کیا اور اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

اگلے چند منٹوں میں وہ بس سٹیشن پہنچ گئے۔ جلد ہی ایک بس موڑ پر ظاہر ہوئی اور اُن کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''ٹھیک ہے پھر خدا حافظ، چائے ساپ نے منیجر کے ساتھ مصافحہ کیا، اپنا سامان اٹھایا اور جلدی سے بس میں سوار ہو گیا۔

”بھائی چائے ساپ آپ کا بہت بہت شکریہ، موسم بہار میں یہاں کا دورہ کرنے کیلئے آیئے گا، ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے“۔ منیجر نے آگے بڑھتی ہوئی بس کے پیچھے سے چلا کر کہا لیکن اس کی آواز بس کی بڑھتی ہوئی آواز میں دب گئی۔ بس تقریباً خالی تھی، بالکل اس روز کی طرح جب وہ یہاں آیا تھا۔ آگے بیٹھے ہوئے چند عمر رسیدہ مسافروں نے چائے ساپ کا جائزہ لیا اور پھر جلد ہی نظریں پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ چائے ساپ نے بس کے درمیان میں ایک سیٹ سنبھال لی۔ وہ گہری دھند میں اس سڑک پر اپنا سفر یاد کرنے لگا۔ اس وقت اسے واہمہ ہوا تھا کہ وہ دنیا کے آخری کنارے کی طرف سفر کر رہا ہے۔ لیکن سڑک روشن گرم دھوپ سے منور تھی، جس نے اسے بھی کسی شفاف شیشے کی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ بس میں بیٹھ کر اس نے لفافہ کھولا تو اس میں ایک لاکھ وَن کی رقم اور ایک مختصر سا رقعہ تھا۔ عیسیٰ کی تعریف کی گئی، شکریہ برادر چائے ساپ، اللہ تعالیٰ تم پر رحمتیں نازل کرے۔ کم ماریہ“ چائے ساپ نے نوٹ دوبارہ لفافے میں رکھے باہر جھانکا، پہاڑی چٹان کے اس حصے پر جو سورج کے سامنے تھی، آزالیاز کے گلابی شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ چائے ساپ نے بارش بھری رات میں کالے کپڑوں کے اوپر ایک سفید چہرے کو یاد کیا۔ پھر اُس نے انڈیا کو یاد کیا، اُس کے برگد کے درختوں کو، غصہ ور ہاتھیوں کو اور چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی انسانیت کو۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ جونہی ٹی ای بائیک میں بس سے اترے گا تو سب سے پہلے اپنی بیوی کو فون کرے گا۔

☆ ☆ ☆

تیرہ خوشبوؤں والا پھول

چے اوے ین

چے اوے ین 1953ء میں پیدا ہوئیں، وہ بارعب خردمندی اور ہمہ گیر اسلوب والی مصنفہ ہیں۔ سوگانگ یونیورسٹی میں فرانسیسی ادب کی پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دینے کے دوران انہوں نے بہت کچھ تحریر کیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں جدید دور کے کئی افسانوی اسلوب کا استعمال کیا جیسے حقیقت کو خیالی صورت گری کے ساتھ ملا کر پیش کرنا، وقت کا متوازی ڈھانچہ، ایک ہی تحریر کے متنوع متن وغیرہ وغیرہ۔ ان کا مختصر ناول......

"Yonder a Flower is Quietly Fading" کوانگ جو قتل عام کے دوران ہونے والی تباہی کے پس منظر میں لکھی گئی دنیا کی بہترین کہانی قرار پائی۔ یہ قتل عام فوجی آمر چن ڈوئیوان نے 1980ء میں کرایا تھا اور اس کا مقصد یہ دکھا کر اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنا تھا کہ اس کی حکومت کے خلاف کسی بھی قسم کی مزاحمت کو سختی سے کچل دیا جائے گا۔ کیمونگ ہائیون کی طرح چے اوے ین کا تعلق بھی اس نسل سے ہے جس نے اپنے کالج کا زمانہ فوجی حکومت کے جابرانہ تسلط میں بسر کیا۔ ''مٹی آلود برف کا آدمی''......

(The Soiled Snowman) ان کی ایک کہانی ہے جو زبان زد عام رہی۔ اس میں مزاحمتی تحریک کی وجہ سے سامنے آنے والے ''ہیروز'' پر بڑی طنز آمیز نظر ڈالی گئی ہے۔

MashalBooks.com

اس کہانی کا بہادر آدمی ایک حقیقی ہیرو ہے کیونکہ وہ بے انصافی کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہتا ہے لیکن بعدازاں وہ اپنی شہرت اور تحسین آفرین پر بدعنوان بن جاتا ہے۔ اس طرح کہ انہوں نے تمام مردوں میں پنہاں خودفریبی کے جراثیم کو سب پر آشکار کر دیا۔ ایک اور بات جس کا ذکر انہوں نے اپنی تحریروں میں کثرت سے کیا قومی ورثہ ہے۔ اکثر یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ نظریات پر مبنی جدوجہد کا ترکہ تھا جو ملک کی تقسیم اور کوریا کی جنگ کا باعث بنا لیکن بعض اوقات قدیم اور زیادہ روایتی ترکے کی بات کی جاتی ہے یعنی کوریا کے آباؤاجداد کی اخلاقی، دانشورانہ اور فنون سے متعلق ترکہ کے حوالہ سے۔ چہ اوئے ین نے یہی پیغام دیا ہے کہ اگرچہ محسوس ہوتا ہے کہ جدید کوریا کے لوگ اپنے ماضی سے کافی دور جا چکے ہیں لیکن حقیقت میں ان کے پاس اپنے قومی ورثے سے دور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور یہ کہ انہیں اپنے ماضی کو پانے اور اپنانے کیلئے بامعنی اور تعمیراتی راستے اور طریقے استعمال کرنے چاہئیں۔

''تیرہ خوشبوؤں والا پھول'' 1995ء میں لکھی گئی اور یہ جدید دور اور موجودہ زمانے کی اساطیر ہے۔ اس کہانی کا پریوں کی کہانیوں کی طرح کا ماحول اس کے اندر چھپے سنجیدہ پیغام اور طنازمدعا کو قارئین تک پہنچانے کی راہ میں آڑے آجاتا ہے۔ ایک اکیلا نوجوان اور ایک لڑکی ملتے ہیں اور نہایت مقدس اور محترم نظر آنے والے پھول کو جنم دیتے ہیں جس سے تیرہ مختلف طرح کی خوشبوئیں نکلتی ہیں۔ اس پھول کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ ادویہ میں بھی استعمال ہوسکتا ہے اور یہی چیز کچھ وقت کیلئے ایک قومی طلب بن جاتی ہے لیکن آدمی کی دولت کیلئے لالچ اور شہرت حاصل کرنے کی ہوس اس پھول کو ہلاک کر دیتی ہے اور اس کے تخلیق کاروں کو ان کے علاقے سے باہر کر دیتی ہے اور ان کی اپنی زندگی اس کی نذر ہو جاتی ہے۔ خاتون افسانہ نگار چہ اوئے ین کی کہانی اگرچہ کچھ زیادہ ہی عالمانہ ہے لیکن اس کی روح تک قاری کی رسائی ہو جاتی ہے۔

قطب شمالی ایک فون کال

اس کا نام ہائی تھا اور وہ اپنے آبائی گاؤں سے ہائی سکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیول آیا تھا تاکہ کوئی اچھی نوکری تلاش کر سکے۔ اس نے کئی نوعیت کے کام کئے لیکن خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ایک بار اسے پتہ چلا کہ کوئی شخص کورین چنڈو نسل کے کتے کی پیداوار کرتا ہے تو اس نے کتے کے پلے بیچنے کا کام شروع کر دیا۔ اپنے چچا سے ٹرک چلانا سیکھا تو سامان ادھر ادھر لانے لے جانے والی کئی کمپنیوں میں ٹرک چلانے کا عارضی کام کرتا رہا۔ اس وقت زندگی کافی مشکل تھی لیکن جلد ہی اسے اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ یقیناً خوش بختی کی بات تھی لیکن معاملہ کچھ اس کے الٹ بھی تھا۔

اس کے چچا جو کئی برس پہلے اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر شہر چلے آئے تھے اور انہوں نے کافی تگ و دو کے بعد وہاں اپنا ایک چھوٹا موٹا کاروبار بھی جما لیا تھا، ایک روز اچانک وفات پا گئے۔ ہائی کے چچا اس سے صرف چھ سال بڑے تھے اور اس کی اچھی خاصی رہنمائی کرتے تھے۔ وہ اس کے دوست بھی تھے اور اس کا تحفظ کرنے والی مہربان شخصیت بھی۔ ہائی بھی ان کا احترام کرتا تھا، اس کا بھی سیول میں اپنے چچا کے علاوہ اور کوئی رشتے دار نہ تھا، چچا کی وفات کے بعد ان کا اشیاء کی ترسیل کیلئے استعمال ہونے والا چھوٹا سا ٹرک اس کے پاس آ گیا۔ مرنے والے کی شدید خواہش تھی کہ وہ ہوائی جہاز کا پائلٹ بنے۔ وہ کافی عرصہ تک گاڑیوں کی مرمت کرنے والی ورکشاپ میں کام کرتا رہا اور اس نے اتنے پیسے جمع کر لئے کہ اپنے لئے ایک ٹرک خرید سکے اور خود کو محدود سطح پر اشیاء لانے اور لے جانے کے کاروبار میں سیٹ کر سکے۔ اس نے بہت سا وقت گاڑیوں کے پرزے الگ الگ کرنے اور پھر دوبارہ جوڑنے پر صرف کیا۔ ہائی نے لاتعداد مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ گاڑیاں مرمت کرنا اور جہاز اڑانا دو بالکل مختلف نوعیت کے کام ہیں، لیکن اس کی ان نصیحتوں کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ چچا کی یہ بہت بڑی خواہش تھی کہ وہ جنگی پائلٹ بن جائیں لیکن وہ کبھی اتنی رقم جمع نہ کر سکا کہ پائلٹوں کو تربیت دینے والے سکول میں اپنا نام درج کرا سکے۔ علاوہ ازیں اس کے جہاز اڑانے کی عمر کو پہنچنے تک کوئی جنگ بھی نہیں چھڑی تھی۔ پھر اس نے اپنی امیدیں اپنے بھتیجے ہائی کے ساتھ وابستہ کر لیں اور سوچا کہ اس کی جگہ اب ہائی ایک ہونہار اور ماہر پائلٹ بنے گا۔ اس سوچ کے تحت اس نے اپنی محدود آمدنی میں سے ہائی کی تعلیم پر خرچ کرنے کیلئے کچھ رقم نکالی اور اسے ہائی سکول تک تعلیم دلوائی اور ایک روز جب اس نے گاڑیوں کے پرزوں سے ایک عجیب سی چیز

بنائی تو اسے بڑے فخر کے ساتھ بائی کو دکھایا۔ان میں سے زیادہ تر بچوں کے کھلونوں کی طرح کسی کام کے نہ تھے۔

اس کے چچا اسے اکثر کہا کرتے تھے،''تم جانتے ہو پائلٹ کیا ہوتا ہے، یہ کسی فاؤنٹین پن کے برانڈ کا نام نہیں ہے، سمجھ میں آئی بات''۔

اس پر بائی اس امید کے ساتھ ردعمل ظاہر کرتا کہ شاید اس طرح وہ ایسے نہ پورے ہو سکنے والے خواب دیکھنا چھوڑ دیں''اگر آپ جنگی پائلٹ بننا چاہتے ہیں تو آپ مناسب جگہ پر پیدا ہونا چاہیے تھا جیسے امریکہ کیونکہ وہ ایک ملک ہے جو ہر وقت کسی نہ کسی ملک کے ساتھ حالت جنگ میں ہوتا ہے۔آپ اس وقت تک جنگی جہاز کے پائلٹ نہیں بن سکتے جب تک آپ مناسب جگہ پر پیدا نہ ہوں''۔

اس کے چچا کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ اس کی ساری جائیداد اور دولت کا مالک بنے لیکن اس شرط پر کہ وہ اسے دفن نہیں کرے گا۔بائی نے اپنے چچا کی یہ خواہش پوری کی،انہیں دفن نہیں کیا بلکہ ان کے مردہ جسم کو آگ میں جلا دیا اور راکھ اپنے آبائی گاؤں میں ساحل سمندر پر بکھیر دی۔پھر اس نے اپنے چچا کا ٹرک اور کچھ دیگر اشیاء حاصل کیں جو وہ اپنے بھتیجے کیلئے چھوڑ گئے تھے۔ان اشیاء میں بہت سے نقشے، کچھ دوربینیں اور ایک درجن کے قریب کمپاس شامل تھیں۔بائی نہیں جانتا تھا کہ یہ اشیاء اس کے چچا کو اپنے خواب پورے کرنے کے حوالے سے کس طرح مددگار ثابت ہو سکتی تھیں پھر بھی اس نے ان اشیاء کو کاٹھ کباڑ سمجھ کر پھینک نہ دیا۔وہ اشیاء کی نقل وحمل کیلئے اپنے ٹرک پر باہر جاتا تھا تو ان میں سے ایک کمپاس ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔اس علاقے کی زیادہ تر سڑکیں اس کی جانی پہچانی تھیں اسی لئے درحقیقت اسے کبھی کمپاس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔البتہ جب کبھی وہ کسی سنسان سڑک پر اپنے کام کے سلسلے میں جاتا تو ٹرک سڑک پر کھڑا کر کے وہ کمپاس کے ذریعے اندازہ لگاتا تھا کہ وہ ٹھیک سمت میں جا رہا ہے۔اگر وہ ٹھیک سمت میں جا رہا ہوتا تو ایک دم مطمئن ہو جاتا تھا۔

اس نے ٹرک والے کاروبار کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ زندگی کی ضروریات پوری ہوتی رہیں لیکن وہ اپنے چچا کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہتا تھا جنہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال ٹرک ڈرائیوری میں گزار دیئے۔اس کی خواہش تھی کہ وہ قطب شمالی کے علاقے میں جا کر رہے، کچھ عرصہ کیلئے اس نے شہر کے مضافات میں ایک کمرہ کرائے پر حاصل کیا۔اس کمرے کا مالک کسی زمانے میں اس کا

گاہک تھا۔ وہ وہاں سامان کی ترسیل کرنے والی ایک کمپنی کیلئے کام کرتا رہا۔ جس دن اسے کوئی کام نہیں ہوتا تھا وہ گھر پر ہی رہتا اور گھریلو مرمت طلب اشیاء کی مرمت وصفائی کرتا۔ اسے اپنے چچا کی طرف سے ترکے میں جو ٹرک ملا تھا وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے چلتا رہا اور اس نے کبھی بائی کو کسی بھی حوالے سے پریشان نہیں کیا۔

بائی کی شامیں ایک پرانے ٹی وی سیٹ پر بے دھیانی سے پروگرام دیکھتے ہوئے گزرتی تھیں۔ اس ٹی وی پر صرف دو چینل آتے تھے اس لئے اسے یہی دو دیکھنا پڑتے تھے۔ یا پھر وہ ایک ٹوٹے پھوٹے ٹیپ ریکارڈر پر گانے سنتا تھا جو صرف اسی وقت چلتی تھی جب وہ اسے دو تین چپتیں رسید کرتا تھا۔ جب کیسٹ پلیئر چلتا تو وہ بھی اپنے سروں میں گلوکار کے ساتھ ساتھ گاتا تھا۔ بعض اوقات وہ ان آلات کا جائزہ لینا شروع کر دیتا تھا جو اس کے چچا اس کیلئے چھوڑ گئے تھے۔ وہ بے خوابی کا مریض تھا اس لئے کبھی کبھی رات کو بھی ڈرائیونگ پر نکل جاتا تھا تا کہ تھکاوٹ کے باعث اسے نیند آ جائے۔ اس کی سوچیں، خواب اور امنگیں رفتہ رفتہ شدت اختیار کر رہی تھیں اور اس کی نیند اڑتی جا رہی تھیں۔ وہ اکثر سوچتا کہ وہ کوئی ایسی عجوبہ مشین ایجاد کرے جس کے ذریعے طویل فاصلے پر بھی لوگ ایک دوسرے کے دلوں کے حال جان سکیں یا وہ کوئی ایسی بال پن ایجاد کرنے کے بارے میں غور کرتا جس کا رابطہ کسی انسان کے کانوں کے ساتھ کیا جائے تو وہ ذہن میں موجود ساری باتوں کو قرطاس پر اتار دے۔ پھر وہ اس سے آگے کی سوچتا اور یہ تصور کرتا کہ وہ اس عجیب وغریب بال پن کے استعمال کے بارے میں لوگوں کو بتانے کیلئے دنیا بھر کا سفر کرے کیونکہ اس حیرت انگیز ایجاد پر پوری دنیا حیرت میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ خیال کرتا کہ وہ ایک مجمع میں کھڑا ہو کر بغیر کسی رکاوٹ یا مشکل کے مختلف زبانوں میں اس بال پن کے استعمال کے بارے میں بتا رہا ہے اور اس کے گرد اس کے کام کی تحسین پیش کرنے والوں کی ایک بھیڑ موجود ہے۔

رات کا پچھلا پہر ہوتا جب وہ ایسے خوابوں کی دنیا سے باہر آتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک اکیلے نوجوان کے بالکل فرصت اور تنہائی کے خواب ہیں تاہم وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اس کے خواب، اپنے چچا کے خیالوں، سوچوں اور تصورات کے مقابلے میں کم غیر حقیقی ہیں۔

کبھی کبھی شام کے وقت جب وہ قدرے فارغ ہوتا تو وہ ان لوگوں کے چہروں کو یاد کرتا تھا جنہوں نے اس کے دل و دماغ پر اپنی شخصیت کے اثرات چھوڑے تھے۔ وہ ان لڑکیوں کو یاد کرتا جو اس

کے دل کی دھڑکن کی رفتار بڑھادیا کرتی تھیں۔ چونکہ اس کے پاس دلچسپی کا کوئی اور سامان نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ اپنی ان خوبصورت ہم جماعت لڑکیوں کی یادوں کو تازہ کرتا تھا جواب ادھرادھر بکھر گئی تھیں، کوئی بیوٹی پارلر میں کام کر رہی تھی تو کوئی فیکٹری میں یا پھر سپر مارکیٹ کی کسی دکان میں۔

ایک صبح جب سردی بہت زیادہ پڑ رہی تھی، اس نے اپنا واحد سوٹ استری کر کے زیب تن کیا اور گردن کے گرد سرخ رنگ کا مفلر لپیٹ کر سیول کی سڑکوں پر نکل گیا۔ وہ کسی ٹرک کی طرح بڑا لہرا لہرا کر چل رہا تھا۔ وہ اس طرح سارا دن سیول کی سڑکوں پر مٹرگشت کرتا رہا۔ اپنے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے ہوئے وہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی معجزے کے ظہور پذیر ہونے کے انتظار میں ہو یا وہ کسی اہم معاہدے پر دستخط کرنے جا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے میں اگر ذرا سی بھی دیر ہوگئی تو یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لیکن کوئی معجزہ ظہور پذیر نہیں ہوا، کچھ بھی نہیں ہوا، کوئی بھی اس کی ناقابل بیان تنہائی کو کم کرنے کیلئے نہ آیا۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، آگے بڑھتے ہوئے اس نے ذہنی اور جسمانی طور پر چاق و چوبند نوجوانوں کو سڑکوں پر ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا تھا، ان کے چہرے کھلے ہوئے اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ اس کی طرح وہ بھی 20 سال کے ہی تھے لیکن اتنے پرجوش اور توانائی سے بھرپور نظر آتے تھے کہ اس نے سوچا کہ ان کی سانسوں سے بھی خوشبو آتی ہوگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے ہم عصر ہیں، اس کے ہم عمر ہیں۔ شام کو جلد گھر واپس آ کر اس نے اپنے چچا کا چھوڑا ہوا ایک نقشہ نکالا اور اسے دیوار پر لٹکا دیا۔ پھر اپنے تہہ شدہ بستر پر جھکتے ہوئے اور شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ نقشے کا جائزہ لینے لگا اور اپنے قطب شمالی کا خواب دیکھنے لگا۔ جب وہ زندگی کی روٹین سے اکتا جاتا تو اسی طرح نقشہ نکال کر دیوار پر لٹکا دیتا اور پھر مشکل ناموں والے شہروں کے نام پکارنے لگتا تھا، الان بیٹور، ولادی ووستاک، سائیرالیون .... لیکن وہ نام جس سے اس کا جسم و جان سرشار ہو جاتے تھے قطب شمالی کا نام تھا، ایلسمیرے، ای ٹا، ٹولے، رک جادسک، قطب شمالی کے یخ بستہ اور جمے ہوئے میدانوں میں چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے جو محض چند گھروں اور کچھ گھریلو ضرورت کی اشیاء پر مشتمل تھے۔ اس طرح وہ شمال کی طرف اپنا سست رفتار سفر شروع کر دیتا تھا۔

ہر رات وہ قطب شمالی کے پہاڑی میدانوں میں بالکل تن تنہا چہل قدمی کرتا تھا۔ دور سے

روشنیاں جھلمل چمکتی نظر آتی تھیں لیکن جونہی وہ قریب آتا یہ اس سے دور چلی جاتی تھیں، پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔ وہ دم سادھے ہوتا تھا اور اسے اتنی ٹھنڈ لگتی تھی کہ اسے اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتا، اگر میں ان روشنیوں تک نہ پہنچ پایا تو ٹھنڈ سے جم کر مر جاؤں گا اور پھر وہ پوری کوشش کے ساتھ اپنے جمے ہوئے پاؤں آگے بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ پھر وہ سوچتا کہ کوئی مہربان سکیمولڑکی دیکھ کر اس سے شادی کرلے گا۔ ہم وفادار اینڈ رینڈ بیئر اور برف گاڑی کو کھینچنے والے کتے رکھیں گے، اسی دوران ہمارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوگا، جب وہ بڑا ہو جائے گا تو میں اسے باہر شکار پر لے جاؤں گا۔ قطب شمالی کے برفیلے میدانوں میں گشت سے اس کی طاقت ختم ہو جاتی اور پھر مرنے سے کچھ ہی دیر پہلے اسے جاگ آ جاتی اور وہ سوچنے لگتا کہ اتنے سادہ سے خواب کو پورا کرنے کیلئے مجھے اتنی دور قطب شمالی جانا چاہیے؟ لیکن جونہی وہ پھر سے نیند کی وادی میں اترتا تو خود کو قطبی میدانوں میں گھومتا پاتا جہاں نہ کوئی آواز ہوتی ہے، نہ کشش ثقل، نہ درد، نہ غم۔

ایک روز جب وہ قطب شمالی کے میدانوں میں مٹرگشت کر رہا تھا کسی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، گھنٹی کی آواز قطب شمالی کی یخ بستہ ہواؤں میں ہلکورے کھا رہی تھی۔ یہ سوچ کر کہ قطب کے ان برفانی میدانوں میں فون کہاں ہو سکتا ہے، وہ آگے بڑھ گیا پھر خود کلامی کے انداز میں بولا، یہاں ہوا کتنی صاف ستھری ہے اور خاموشی کس قدر گہری ہے جیسے یہ کوئی برفانی دور ہو۔ چلتے چلتے اسے جمے ہوئے میدان میں ایک مکان دکھائی دیا، وہ اس کے اندر چلا گیا، فون کی گھنٹی کی آواز اس گھر کے اندر سے آ رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا جو اس کے ہاتھوں میں بہت ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دوسری طرف سے ایک نہایت مدہم آواز سنی، پھر اس نے ایک دل آویز سرد آہ سنی جو کہیں قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پانچ منٹ تک انتظار کیا، پھر فون نے کام کرنا چھوڑ دیا اور ڈیڈ ہو گیا۔

قطب شمالی کی اس عورت نے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس نے اگلے روز اور اس سے اگلے روز پھر فون کیا۔ جب اس نے فون اٹھایا تو وہی آواز آئی "ہیلو" پھر انتظار کیا گیا۔ اگر وہ تھوڑی دیر کیلئے بات کرنا بند کر دیتا تھا تو وہ عورت بھی باتیں بند کر دیتی تھی۔

دن کے اوقات میں بائی نے پہلے کی طرح کام جاری رکھا۔ شہر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ ایک سے دوسری جگہ اور پرانے گھروں سے نئے گھروں کو جا رہے تھے۔ اسے بھی روزانہ فون کال آتی

MashalBooks.com

تھی۔ایک روز اس نے کئی درجن تیل کے ڈرم ایک سے دوسری جگہ پہنچائے، دوسرے روز پرانی خانے دار الماریاں اور سلائی مشینیں ڈھوئیں، تیسرے روز اس نے ایک بے گھر کی گئی خاتون کی اشیاء کی نگرانی کی اور اس طرح دن گزرتے رہے۔کبھی کبھی اسے کوئی کام مل جاتا لیکن پھر پتہ چلتا کہ وہ منصوبہ ترک کر دیا گیا ہے، کچھ دن ایسے ہی گزرے جب اس کے پاس کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔

وہ قطب شمالی کے بارے میں ابھی تک بہت زیادہ نہیں جانتا تھا۔اس نے قطب شمالی کی چند تصویریں دیکھ رکھی تھیں، یا پھر کچھ عرصہ پہلے ٹیلی وژن پر ایک اسکیمو جوڑے کے بارے میں ایک دستاویزی فلم دیکھی تھی۔ پھر بھی وہ اُسی طرح قطب شمالی کا تصور ذہن میں سجائے سوتا تھا۔ایک اسکیمو نوجوان تھا جس کا نام بے ہا گیتو تھا۔وہ ایک طویل دورے سے واپس آرہا تھا۔اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے یہ سفر کب شروع کیا تھا۔اس نے منصوبہ بندی کی تھی کہ وہ کافی مچھلیوں اور کھانوں کے ساتھ واپس آئے گا لیکن ایک تیرتے ہوئے برف کے تودے نے مونگھے کی چٹانوں پر رکاوٹ کھڑی کر دی اور اس کی جان بمشکل بچ سکی۔اس نے ایک پورا موسم سمندری شیروں کے درمیان گزارا۔پانی کے منجمد قطرے اس کی داڑھی کے ساتھ لٹک رہے تھے جبکہ اس نے اپنے دانتوں سے برف توڑی حتیٰ کہ ایک بار ایک سمندر شیرنی کی بچے کی پیدائش میں مدد بھی کی تھی۔اس دوران قطب شمالی پر بہت سی تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں۔ اس نے جب اپنا اگلو چھوڑا تھا تو سولہ سال کا لڑکا تھا،اب وہ ایک جوان آدمی بن چکا تھا۔اپنی کمپاس چیک کرتے ہوئے وہ اپنے گاؤں کی طرف بڑھتا چلا گیا لیکن وہ اس کے راستے میں کہیں بھی نہ آیا۔پھر بھی وہ آگے ہی آگے چلتا رہا کیونکہ چلتے رہنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔وہ اگر رک جاتا تو جم کر مر جاتا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر چلتا رہا،تب ایک رات اسے برفانی تودوں کے درمیان ایک عورت ملی جو ایک پرانی وضع کی برف گاڑی کھینچ رہی تھی۔

سبز ہاتھ

''میں یقینی طور پر سامنے آنے والی کار کے آگے کود جاؤں گی'' آدھی رات کے وقت جنگل کے کنارے پر سڑک کے ایک طرف ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھتے ہوئے گویا اس نے اپنے ساتھ سرگوشی کی۔جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چلتی ہوئی کار کے سامنے کود جائے گی تو اس نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا اور پیدل یہاں تک آتے آتے اسے کئی گھنٹے لگ گئے تھے۔وہ ایک پتلے سے موڑ پر ایک جھاڑی کے

اندر چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ جو کام وہ کرنے جا رہی تھی، اس کے خیال میں اس کیلئے یہ بہترین جگہ تھی۔ اس جھاڑی میں صنوبر کا ایک درخت تھا۔ جب وہ جھاڑی کے اندر گھسی تو صنوبر کے درخت کی سوئی جیسی پتیاں اس کے گالوں سے رگڑ کھاتیں جس سے اس کی ہنسی نکل جاتی تھی۔ سڑک کے کنارے لگی لائٹوں میں سے زرد رنگ کی روشنی چھن چھن کر دور تک پھیل رہی تھی اور وہاں تک بھی آ رہی تھی جہاں وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے کیلئے چھپی بیٹھی تھی۔ اس کے پاس سے کئی گاڑیاں گزر چکی تھیں اور اب اس نے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ایک بار پھر خود کو یقین دہانی کرائی تھی کہ اب جو بھی کار آئے گی، وہ اس کے آگے کود جائے گی۔ لیکن وہ کسی پرانی کار کے سامنے نہیں کودے گی۔ اس سے اسے کسی قدر حوصلہ ملا۔ جہاں وہ بیٹھی تھی وہاں سے سڑک پر کافی دور تک نیچے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی پسند کی کار کا انتخاب کر سکتی تھی پھر وہ کار کے سامنے چھلانگ لگانے کیلئے وقت کا انتخاب بھی کر سکتی تھی۔ اب تک اس کے پاس سے کتنی کاریں گزر چکی ہیں، اس کا اس نے حساب نہیں رکھا تھا کیونکہ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے ہر گزرتی کار کے ساتھ وہ ایک ایسی کھائی میں نیچے ہی نیچے گرتی چلی جا رہی ہے جس کا کوئی پیندا نہیں۔ اس رات تقریباً ہزارویں بار اس نے خود کو یقین دہانی کرائی کہ وہ خوفزدہ نہیں ہے۔ ایک بار وہ اس وقت ڈر گئی تھی جب اندھیرے میں سے کسی چیز نے اس کے اوپر چھلانگ لگا دی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے ادھر دیکھا تو وہ ایک جنگلی بلی تھی۔ پھر وہ ایک پتھر پر سے پھسل گئی تھی۔ ایسے چھوٹے چھوٹے حادثات اسے خوفزدہ کر دیتے تھے۔

''ایسا نہیں ہے کہ میں کسی بھی کار کے سامنے چھلانگ لگا دوں گی'' اس نے خود کو حوصلہ دیا اور اپنے دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ دبایا۔ اس کا نچلا ہونٹ کافی موٹا تھا کیونکہ بچپن میں وہ اسے کافی کاٹتی اور چباتی رہی تھی۔ اس نے ٹھنڈ اور سردی محسوس کی۔ اپنی ہمت مجتمع کرنے کیلئے ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ یہ گیت وہ اپنے بچپن میں اکثر گایا کرتی تھی۔ گیت گاتے ہوئے وہ مناسب کار کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

اس کا گاؤں اونچے پہاڑوں کے بیچ کسی وادی کے اندر تھا۔ اس کے نہ تو ماں باپ زندہ تھے اور نہ ہی بچے یا عزیز رشتے دار، ایک بوڑھی دادی اماں تھیں جو اس وقت سے اسے عمر رسیدہ نظر آتی تھیں جب سے اس نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیسے پیدا ہوئی، اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی بارہ سال اپنے آبائی گاؤں میں کیوں گزارے، کیوں وہ اپنے آبائی گاؤں سے چھوٹے قصبے میں اور پھر وہاں

سے شہر میں منتقل ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس شہر سے وہ وفاقی دارالحکومت کیسے آ گئی۔ ہر تبدیلی، ہر منتقلی ایک نئی پریشانی ایک نیا غم لے کر آتی تھی۔ اس نے اس دوران جو نوکری بھی کی، اسے اس سے نکال دیا گیا اور اب وہ اپنے آبائی گاؤں واپس جا رہی تھی۔ مختصر سے عرصے میں اس کے ساتھ اتنا کچھ پیش آ چکا تھا کہ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کیا ہوا۔ اپنے دماغ کے بارے میں وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ یہ چھوٹا اور قدرے بیمار اور لاغر ہے، کسی حد تک رنگ برنگے بسکٹوں کے باکس کی طرح جو اس کی دادی اماں سے ملنے کیلئے آنے والے اس کے ایک رشتے دار نے اسے دیا تھا۔ یہ ایک پرانا اور کسی حد تک گرد آلود ڈبہ تھا جس کا اوپر والا حصہ بند نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ رسیوں، خشک پتوں، کنکریوں اور ایسی ہی الم غلم چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے پاس اپنے دماغ کے باکس کی کئی چابیاں تھیں لیکن وہ انہیں ہمیشہ ادھر ادھر رکھ دیتی تھی اور پھر بھول جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ ضرورت کے وقت ایک بھی نہیں ملتی تھی۔

یہ فیصلہ کر کے کہ ایک ناکام لڑکی کی حیثیت سے وہ اپنی دادی اماں کا سامنا نہیں کر سکتی، وہ اس بس سے نیچے اتر گئی تھی، جو اس کے گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ جب اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا دماغ ایک بار چکرا گیا تھا۔ یقیناً وہ خود کو سمجھ نہیں سکی تھی کہ اسے کیوں مر جانا چاہیے۔ وہ صرف سولہ برس کی تھی اور اس عمر کی لڑکی کیلئے موت ایک دلکش پری کی طرح ہی ہو سکتی ہو گی جو آئے گی اور اس کے تمام مشکل مسائل حل کرنے میں اس کی مدد کرے گی۔ وہ لمبے عرصے سے پریوں سے باتیں کرتی رہی تھی۔ پہلی بار اس وقت جب وہ ایک معمولی غلطی پر اس گھر سے باہر نکال دی گئی تھی جہاں وہ نوکرانی کے طور پر کام کرتی تھی۔ لیکن وہ کسی کو یہ نہ بتا سکی کہ وہ مرنے جا رہی ہے کیونکہ اس پری نے اسے ایسا ہی کرنے کیلئے کہا تھا۔ سبھی اس کی باتوں کا ٹھٹھا اڑائیں گے۔ سبھی؟ سبھی کون؟ وہاں کوئی بھی نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی۔ پھر بھی چونکہ وہ مرنے جا رہی تھی تو کوئی بھی اس سے یہ نہیں پوچھے گا کہ اس نے اپنی زندگی کیوں ختم کر لی۔

اس نے اپنی زندگی کے گزرے ماہ و سال یاد کیے جیسے کوئی یخ بستہ پہاڑ پر ایک اداس صبح گزاری ہو۔ اسے وہ چھوٹی لڑکی یاد آئی جس کی وہ دیکھ بھال کرتی تھی، وہ وہاں نوکرانی کے طور پر رکھی گئی تھی۔ اس روز وہ سارا دن بچے کے پیچھے بھاگتی اور اس کا خیال رکھتی رہی تھی۔ اس کا قصور نہیں تھا کہ بچہ مر گیا لیکن اس کے مالکان نے نہ صرف اسے پیٹا بلکہ گھر سے بھی نکال دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں گملے میں

اگائی ہوئی گارڈینیا تھام کر وہاں سے بھاگ گئی۔ یہ گارڈینیا وہ ٹیرس میں اگاتی رہی تھی۔ اس نے ایسا اس لئے کیا کہ پودے کو زندگی دینے والے سبز ہاتھوں نے گارڈینیا کو تیز خوشبو سے نوازا تھا۔ مرنے والی لڑکی محض چار سال کی تھی اور اسے دل کا مرض لاحق تھا۔ وہ سبز ہاتھ جانتے تھے کہ یہ نوجوان جوڑا اسے باہر نکال دے گا کیونکہ اس کیلئے اپنے بچے کو کھونے کا غم بہت گہرا تھا۔

اس کے بعد اسے اور بھی کئی گھروں سے نکالا گیا اور ہر بار نکالے جانے کی وجوہ بالکل نہ جان سکی۔ ایک بار اس گھر کا لڑکا، جہاں وہ کام کر رہی تھی، دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا اور اسے گھر سے نکل جانے کیلئے کہہ دیا گیا۔ ایک بار گھر کے مالک نے شراب پی لی اور نشے میں اسے اچھا خاصا پیٹا۔ اس دوران گارڈینیا کا پودا جو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھی، مرجھا کر سوکھ گیا۔ پھر اسے ایک نرسری میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ اچھا وقت ثابت ہوا لیکن وہاں سے بھی اسے نکال دیا گیا کیونکہ اس نے صنوبر، پیپل اور باکس ووڈ کے چھوٹے پودوں میں الجھی ہوئی تاریں کاٹ دی تھیں اور پھر پودوں کو پانی دیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے بہت سی نرسریوں اور پودوں کی پرورش گاہوں میں کام کیا لیکن ہر جگہ سے آخر کار اسے نکال باہر کیا گیا۔

ایک اور کار اس کے پاس سے گزر گئی لیکن اس نے نفی میں سر جھٹکا۔ نہیں، یہ نہیں۔ چھوٹے سے ٹرک کی ہیڈ لائٹیں کسی شرابی کی آنکھوں کی طرح سفید اور چمکدار تھیں۔ ٹرک جھاڑیوں کے قریب سے تیز آواز کے ساتھ گزر گیا اور اس سے پیدا ہونے والی ہوا کی لہروں نے جھاڑیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد بڑی سڑک ایک بار پھر خاموش، سنسان اور ویران تھی۔

اس نے سوچا، میرا خیال ہے کہ میرا گوشت پھٹ جائے گی اور میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور پھر اس نے اپنے کوٹ کی آستینوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی گول مٹول کلائیوں کو چھو کر دیکھا۔ اسے اپنے کھردرے اور موٹے ہاتھوں کالمس محسوس ہوا۔ دادی اماں اس کے ہاتھوں کو "سبز ہاتھ" کہتی تھیں کیونکہ وہ جلی ہوئی اور پتھروں والی زمین سے بھی صحت مند اناج اور پھل اگا سکتے تھے۔ اس کے پڑوسی بھی اسے اس نام سے پکارتے تھے۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرنے والا شخص، جو ایک مرتبہ ان کے گھر رات بھر کے لئے ٹھہرا تھا، بھی حیران تھا کہ یہ لڑکی ان جگہوں کا پتہ کس طرح چلا لیتی ہے جہاں ادویات میں کام آنے والی جڑی بوٹیاں اگتی ہیں۔ اس نے بھی اسے "سبز ہاتھ" کہہ کر پکارا تھا۔ اس فارم پر بھی اسے "سبز ہاتھ" کا ہی نام

MashalBooks.com

دیا گیا جہاں وہ اسی جڑی بوٹیاں تلاش کرنے والے شخص کی اجازت سے کام کرتی رہی تھی۔ لیکن شہر کے اندر کسی نے اسے اس نام سے کبھی نہیں پکارا۔ شہر میں اسے ''اؤ'' کہہ کر پکارا جاتا تھا جیسے کہ رواج کے مطابق ان نوجوان عورتوں کو پکارا جاتا ہے جن کے نام یاد رکھنا لوگ گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ اب اسے کوئی بھی ''سبز ہاتھ'' کے نام سے نہیں پکارتا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتیوں کو چھوا۔ ماہانہ وقفوں کے دوران اس کی چھاتیاں درد کرنا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ چھاتیوں کے بڑے ہونے سے پہلے وہ مرجانا چاہتی ہے۔ ان حالات میں وہ کبھی عورت بننے کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب سے اس نے اپنا آبائی گاؤں چھوڑا تھا وہ کبھی خوش یا شادمان نہیں رہی۔ اس کے جسم کا گوشت اندھیرے میں ہموار اور لچکدار محسوس ہوتا تھا اور اس چیز نے اسے حیران کر دیا۔ یہ سوچ کر وہ تھوڑی دیر کیلئے رونے بھی لگی کہ اس کے جسم کا گوشت گاڑی کے پہیوں کے نیچے کچلا جائے گا۔ اسے یہ گمان گزرا جیسے کوئی اسے آوازیں دے رہا ہے۔ ''گرین ہینڈز'' کیا وہ اس کی دادی اماں تھی یا پھر کوئی پڑوسی تھا۔ اس نے ہاتھوں سے آنسو صاف کئے اور آواز کی طرف دھیان لگایا لیکن وہاں صرف ہوا کی آواز آرہی تھی جو زمین کے ساتھ رگڑ کھاتے ہوئے چل رہی تھی۔

اس نے آواز سنی کہ ایک اور کار آرہی ہے۔ سڑک کو تیز روشنی سے منور کرتی ہوئی وہ تیزی سے بڑھتی چلی آرہی تھی اس نے قدرے اوپر اٹھ کر دیکھا کہ یہ قدرے اچھی کار تھی۔ کسی وجہ سے آنسوؤں کے گرم قطرے اس کے گالوں پر دوڑ گئے۔ اسے اچانک یاد آگیا تھا کہ گاؤں سے رخصت ہوتے وقت دادی ماں کیسی نظر آتی تھیں، پتہ نہیں وہ زندہ بھی تھیں یا نہیں؟ اور پھر اس پہاڑی گاؤں میں وہ متعدد پڑوسی؟ کیا وہ اب بھی وہیں ہوں گے یا سب گاؤں چھوڑ کر جا چکے ہوں گے۔ جس طرح صبح اس نے گاؤں چھوڑا تھا تو اس نے اپنی دادی اماں کو دیکھا تھا، وہ سو رہی تھیں اور کسی جھینگے کی طرح اکٹھی ہو کر لیٹی ہوئی تھیں۔ دادی اماں کو غالباً احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کی پوتی نے گاؤں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے، جب وہ دادی جان کے ساتھ رہتی تھی تو دادی جان صبح اس سے پہلا کام یہ کراتی تھیں کہ کنویں سے پانی نکلواتی تھیں، پھر وہ کھیتوں میں کام کرتی تھیں اور اس کے بعد دوپہر کا کھانا اکٹھے بیٹھ کر کھاتی تھیں۔ جب وہ اپنے گاؤں سے کافی دور آگئی تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور محسوس کیا کہ پہاڑ اس کے گاؤں کے پہاڑوں جیسے شناسا نہیں تھے۔ پھر وہ نیچے سڑک پر اتر گئی۔ جب اس نے چاولوں کا بنا ہوا لڈو نکالنے کیلئے بیگ کھولا تو دیکھا کہ

اس میں چاولوں سے بنا ہوا کیک اور کچھ رقم بھی موجود ہے۔ یہ اُس کی دادی ماں نے بیگ میں رکھا ہوگا حالانکہ اس نے کپڑے سے بنا ہوا یہ بیگ فرش کے نیچے کھیتی باڑی میں کام آنے والے زنگ آلود اوزاروں کے درمیان رکھا تھا تاکہ دادی ماں کو اس کے جانے کی خبر نہ ہونے پائے۔

اتنی زیادہ تھکاوٹ اور اس کے دماغ میں گردش کرنے والی یادوں کی وجہ سے اسے نیند آ گئی اور وہ لمحہ بھر کیلئے سو بھی گئی تھی۔ اس مختصر سی نیند میں اس نے خواب دیکھا کہ ڈائنوسار اور اس طرح کے دوسرے عجیب و غریب رینگ کر چلنے والے جانور آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ اچانک اسے کھانسی آ گئی جس سے وہ جاگ گئی اور اس نے دیکھا کہ تیز روشنی والی وہ گاڑی اس کی طرف آہستہ آہستہ اور رک رک کر چلتی ہوئی آ رہی ہے۔ یہ بات اسے اتنی عجیب لگی کہ وہ اس خوفناک خواب کو بھول ہی گئی۔

''یہی ہے وہ گاڑی'' اس نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے سرگوشی کی۔ اس گاڑی کی صرف ایک ہیڈ لائٹ کام کر رہی تھی اور وہ موڑ پر سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب وہ گاڑی کے آگے چھلانگ لگانے کیلئے اٹھی تو اس نے دیکھا کہ وہ گاڑی اچانک وہاں آ کر رک گئی۔ ایک آدمی اس میں سے باہر کودا، اس کے ہاتھ میں فلیش لائٹ تھی۔ اس نے گاڑی کے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا اور ٹھوکریں لگا کر گاڑی کے ٹائر بھی چیک کیے۔ جب گاڑی پر روشنی پڑی تو اس نے بھی گاڑی کا جائزہ لیا وہ کسی سہیہ کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کا دل جو موت کے بارے میں سوچنے کی وجہ سے تیزی سے دھڑک رہا تھا اچانک پرسکون ہو گیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے، اس نے سوچنا شروع کر دیا، میں تو اس کے سامنے کودنے والی تھی، یہ میرے قریب آ کر رک کیوں گئی؟

وہ ایک چھوٹا اور پتلا سا آدمی تھا۔ اس کھڑے ہوئے ٹرک کے پاس سے کئی گاڑیاں گزر گئیں لیکن وہ اپنی جگہ ساکت رہی، اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ آخر کار اس نے ہمت کی اور اپنا سفری بیگ، جس پر وہ اب تک بیٹھی ہوئی تھی اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ آدمی کھڑا منہ سے سیٹی بجا رہا تھا اور بہت دور کسی روشنی پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ وہ آہستہ سے ٹرک کے اوپر چڑھ گئی۔ وہ شخص جب گاڑی میں واپس بیٹھا تو اپنے قریب ایک عورت کو دیکھ کر حیران تو بہت ہوا تاہم اس نے کہا کچھ بھی نہیں البتہ اس نے ایک بار اس کے خاک آلود چہرے، پھٹے پرانے بیگ اور کیچڑ سے لتھڑے ہوئے پیروں کا جائزہ ضرور لیا۔ ٹرک ایک بار پھر گڑگڑاہٹ کے ساتھ سٹارٹ ہو گیا۔ وہ اسے اسی شہر میں واپس لے آیا،

جہاں سے فرار ہو کر وہ ان پہاڑوں تک پہنچی تھی۔ شہر میں اسے ایک فارم میں کام مل گیا اور رہائش کا بھی بندوبست ہو گیا۔ وہ پھر سے زندگی گزارنے لگی۔

وہ بھی کم خوابی کے مرض میں مبتلا تھی۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد وہ شام کے وقت سوتی تو اسے عجیب غریب خواب آتے۔ وہ دیکھتی کہ وہ صنوبر کا چھوٹا سا پودا ہے جس کے گرد اگرد لوہے کی تار لپیٹی گئی ہے، وہ خواب میں خود کو پھسلنی ڈھلوان سے نیچے گرتے ہوئے بھی دیکھتی تھی۔ اس کی دادی اماں اسے بتایا کرتی تھی کہ خواب میں کسی چٹان سے نیچے گرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ بڑے ہو رہے ہو۔ لیکن اس کا قد تو اب بھی کافی تھا، اس لئے اس کا نہیں خیال تھا کہ اس بات میں کچھ سچائی ہو سکتی ہے۔ ایک رات پھر اس نے یہی خواب دیکھا تو اسے ایک لائٹ والا وہ ٹرک یاد آ گیا جو بڑی سڑک پر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اسے اس میں بیٹھا ہوا وہ شخص بھی یاد آیا جو اسے اس ویران علاقے سے واپس شہر لے کر آیا تھا۔ اسے وہ فون نمبر بھی یاد آیا جو اس کے ٹرک پر لکھا ہوا تھا اور اسے اس وقت نظر آیا جب اس شخص نے ٹرک پر فلیش لائٹ کی روشنی ڈالی تھی۔ اس نے اس شخص کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلے پہل اس نے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی۔ صرف اس کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اسے فون کرنا اس کا روزانہ کا معمول بن گیا۔

ونڈ کرائسنتھیمم کی پیدائش

ایک چمکدار اور روشن دن کو بائی پہلی مرتبہ ''سبز ہاتھ'' سے ملنے آیا۔ وہ ایک دوسرے سے شرما رہے تھے۔ ان کے اردگرد پھول کھلے ہوئے تھے لیکن وہ اس قدر شرما رہے تھے کہ پھولوں کی تعریف بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ اس جھجک کو آخر کار بائی نے ہی دور کیا اور اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام بائی ہے، یہ میرا فرضی نام ہے جو میں نے خود اپنے لئے تجویز کیا ہے، دن کے وقت میں ٹرک چلاتا ہوں اور رات کے وقت قطب شمالی کے میدانوں میں گھومتا ہوں۔ ''بائی'' کا مطلب ہی یہ ہے کہ قطب شمالی میں گھومنے والا آدمی''۔

''اور میرا نام ''سبز ہاتھ'' ہے، میں ایک پہاڑی علاقے میں پیدا ہوئی اور پھر تقدیر مجھے یہاں لے آئی۔ اگلے ستمبر میں میں سترہ برس کی ہو جاؤں گی''۔ پہلی بار جب ان کی ملاقات ہوئی تھی تو انہیں یہ حقیقت معلوم نہ تھی لیکن اس روز وہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ بہت طویل عرصے سے ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ وہ دونوں طویل عرصہ سے اکیلے رہ رہے تھے اس لئے انہیں معلوم نہ تھا کہ کیا کہیں،

اس لئے وہ بس ایک دوسرے کو تکے جا رہے تھے۔ قطب شمالی کے برف زاروں میں فون کرنے والی عورت خاموش تھی جس طرح کہ وہ فون پر خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ وہ آدمی جو اس رات بڑی سڑک پر کھڑے ہو کر منہ سے سیٹی بجا رہا تھا اور جو ہر رات اس کی فون کال کا جواب دیتا تھا، اس نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو اتنا تیز کر دیا تھا اور اس کے ہاتھ اس شدت سے کانپ رہے تھے کہ وہ دور بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھ رہی تھی، لیکن وہ بت بنے خاموش کھڑے تھے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ دونوں یوں محسوس کر رہے تھے جیسے انہیں آگ لگی ہوئی ہو۔ ساری رات وہ اسی طرح بخار میں جلتے رہے اور حیران ہوتے رہے کہ یہ خسرہ ہے، ٹائیفائیڈ یا پھر ملیریا۔ اگلے روز اس بخار کی شدت کچھ کم ہو گئی تاہم گذشتہ رات کے بخار اور پسینے کی وجہ سے ان کے چہروں پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں آئینے نے وہ سب افشا کر دیں۔ بائی کی آنکھوں کے گرد حلقے گہرے ہو گئے تھے اور سبز ہاتھ کے گالوں پر اتنے نشان تھے کہ جگہ جگہ ڈمپل بنے ہوئے تھے۔

اس رات کے بعد دونوں عجیب وغریب تبدیلیاں محسوس کرنے لگے۔ اگلی صبح بائی اپنے گھر سے ٹرک لے کر جلدی نکل پڑا۔ اسے مغموم آواز کے مالک پیانو بنانے والے کا پیانو شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہنچانا تھا۔ وہ اپنی منزل کی طرف چل رہا تھا کہ اچانک ٹرک کسی اجنبی اور عجیب سی سڑک پر نکل آیا اور کچھ دیر بعد وہ سبز ہاتھ کے پھولوں والے فارم کے سامنے کھڑا تھا۔ بائی اس صورتحال پر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح جب سبز ہاتھ پودوں کیلئے پانی بھرنے ٹونٹی کی طرف جا رہی تھی تو کسی طرح اس کے قدم گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ جب اس نے گیٹ کھولا تو سامنے بائی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

یہ سلسلہ پورے ہفتے چلتا رہا۔ وہ کہیں اور جا رہے ہوتے تھے کہ چلتے چلتے ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوتے جیسے کسی طوفان نے انہیں اٹھا کر ایک دوسرے کے سامنے لا پٹخا ہو۔ بائی اور سبز ہاتھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے جیسے ان کی آنکھیں کوئی مقناطیس ہوں اور ایک دوسرے کو کھینچ رہی ہوں۔ جلد ہی انہیں محسوس ہوا کہ صرف آنکھیں ہی نہیں، ہاتھ، پیر، ٹانگیں، سر اور ان کے سینے بھی مقناطیس بن چکے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ مقناطیسی قوت ان کے ہونٹوں میں سب سے زیادہ تھی۔ جب ہونٹوں کی یہ مقناطیسی قوت کام کرتی تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ کسی ایسی سرنگ میں کھینچ لئے گئے ہیں جہاں قرمزی رنگ کے کئی لیمپ جل رہے ہیں اور پھر وہ کسی ایسی پہاڑی پر آ گئے ہیں

جہاں ہر طرف تازہ ہوا ہے۔اس سے سبز ہاتھ کو اپنے گاؤں کے پہاڑ اور بائی کو اپنے خوابوں کے قطب شمالی والے میدان یاد آجاتے تھے۔

جب یہ سب کچھ چل رہا تھا تو کچھ عجیب وغریب واقعات بھی پیش آرہے تھے۔ایک بھاگی ہوئی لڑکی کا سوٹ کیس ایک کنوارے شخص کے بیڈروم میں چلا گیا اور پھولوں والے فارم کے مالک کو اپنے گاہک سے معذرت کرنا پڑی کہ اسے گارڈینیا کی بجائے سنگترے کا پودا فراہم کر دیا گیا۔لیکن ضروری نہیں عجیب وغریب واقعات پر ہر دفعہ شکایات ہی آئیں۔بعض اوقات گاہک اپنے پودوں کو بہتر حالت میں دیکھ کر خوش بھی ہو جاتے تھے۔سبز ہاتھ کی پودوں کے ساتھ محبت اور اس کے ہاتھوں کی کارکردگی دکھا رہی تھی۔موقع ملنے پر وہ فارم کے پچھواڑے مٹی کے ڈھیر کی طرف بھاگتی تھی اور فارم کا مالک سوچتا تھا کہ جب بھی اسے موقع ملے گا وہ اسے فارم سے باہر نکال دے گا لیکن جب بھی وہ اس کے سامنے آتی تھی وہ بھول جاتا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔

بائی اور سبز ہاتھ کی ایک دوسرے کو کھینچنے والی سرگرمیاں شدت اختیار کرتی جارہی تھیں، اتنی زیادہ کہ اب وہ ایک لمحہ بھی ایک دوسرے سے جدا رہنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے تھے۔وہ جب بھی بچھڑتے اداس ہو جاتے تھے۔ان کا پیار اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی ہڈیوں اور گوشت کے اندر اتر جانا چاہتے تھے اور اگر ممکن ہوتا تو ایک دوسرے کو سالم نگل لیتے۔کبھی کبھی وہ اس صورتحال کے بارے میں سوچتے اور جب کچھ سمجھ نہ آتی تو تھک کر سو جاتے تھے۔

ایک روز جب فارم کے پچھواڑے مٹی کے بڑے سے ڈھیر پر بیٹھے تھے۔سبز ہاتھ نے اچانک پوچھا''تمہارے ٹرک کا ٹینک بھر لیا جائے تو ہم کہاں تک جا سکتے ہیں''۔

''دور، بہت دور، سبز ہاتھ...... بہت دور''اس نے جواب دیا۔چنانچہ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ اس دور دراز علاقے تک جائیں گے جہاں تک ٹرک انہیں لے کر جا سکتا ہے۔اس کے بعد زندگی میں پہلی بار انہوں نے ایک پورا دن ایک دوسرے کے بغیر گزارا، اس دور دراز علاقے تک جانے کی تیاری کرنے کیلئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف بنیادی ضرورت کی اشیاء ساتھ لے کر جائیں گے۔

سبز ہاتھ کے پاس چند کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر میں پیکنگ مکمل کر

لی اور بائی کا انتظار کرنے لگی۔اس نے یہ کپڑے بھی اس لئے پیک کر لیے تھے کہ اس کی جیبیں بیجوں سے بھری ہوئی تھیں۔بائی نے بھی ٹرک پر سے غیر ضروری سامان اتار دیا اور اپنے چچا کے دیئے نقشے اور کمپاس ٹرک کے اندر رکھ لئے۔اسے بھی تیاری کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا لیکن جب وہ اپنے مالک سے ملنے اور یہ بتانے گیا کہ وہ جا رہا ہے تو وہاں اسے کافی دیر ہوگئی۔سبھی اسے مشورے دے رہے تھے کہ نئے علاقے میں اس نئے جوڑے کو کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی بلکہ لینڈ لارڈ کے خاندان کے افراد نے تو اسے اپنی طرف سے ایک ایک چیز تحفے میں بھی دے دی تھی۔لینڈ لارڈ نے اسے سپرٹ کی بوتلیں دیں۔ لینڈ لیڈی نے کھانا پکانے کے برتن، ان کی بڑی بیٹی نے ایک رضائی، بڑے بیٹے نے ریشم کی نکٹائی اور چھوٹے بیٹے نے کتے کا ایک چھوٹا سا بچہ اسے تحفے کے طور پر دیا۔

بائی اور سبز ہاتھ کو روانہ ہوتے ہوتے آدھی رات ہوگئی۔بائی نے کمپاس نکالی۔پہلے جنوب کی طرف چلے، پھر ایک ہفتے کیلئے شمال مغرب کی طرف، پھر ایک مہینہ وہ شمال مشرق کی طرف سفر کرتے رہے۔وہ کھانے پینے یا دیگر اشیاء کی فکر کئے بغیر بس چلتے ہی رہے۔کبھی وہ ساری رات سفر کرتے اور صبح طلوع آفتاب کا منظر ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے تھے۔درمیان میں جہاں ضرورت پڑتی وہ کہیں کچھ دن کیلئے رک جاتے اور کسی ریستوران، کسی تعمیرات کی جگہ پر، کسی فارم میں کام کرتے اور پھر روانہ ہو جاتے۔اس طرح چند ماہ کے دوران وہ سبز ہاتھ کے آبائی گاؤں پہنچ گئے۔چند ماہ کے بعد انہوں نے ایک نایاب پھول کو جنم دیا جس کا نام انہوں نے ''**ونڈ کرائسنتھیم**''(طوفانی گل داؤدی) رکھا۔اس وقت بائی بائیس سال کا اور سبز ہاتھ انیس برس کی تھی۔

''ونڈ کرائسنتھیم'' کا راز

کون تفصیل کے ساتھ یہ بتا سکتا ہے کہ **ونڈ کرائسنتھیم** کس طرح وجود میں آیا؟ کون اس کی ہئیت اور خوشبو بیان کر سکتا ہے؟

ونڈ کرائسنتھیم !تمہارا عرفی نام قطب شمالی کا پھول ہے۔تمہاری زندگی کی بنیاد جمی ہوئی زمین ہے چنانچہ اونچے پہاڑ میں شمال کی یخ بستہ ہواؤں اور بادلوں کے سرد سایوں میں تم پل کر مضبوط ہوئے ہو۔تمہارے پیلے اور جوانی رنگ کے پھول کی پچپن پتیاں ہیں، یعنی پانچ بار گیارہ، یہ وہ نمبر ہے جو زندہ رہنے کی طاقت کی علامت ہے۔ان کے ذریعے تم بادلوں سے چھن چھن کر آنے والی سورج

کی روشنی جذب کرنے کیلئے بے تاب ہو رہے ہو۔ تمہاری خالص خوشبو، جو تمہارے مختصر سے جسم کے گوناگوں شدید جوش و جذبے کی قلمی شکل ہے، اس دنیا کو ایک غمگین خراج تحسین ہے۔ خشک موسم سے لڑنے کیلئے تمہارا احبثہ بہت چھوٹا ہے، تمہارے تنہا پتے سدا بہار ہیں اور تمہاری پاکیزہ ٹہنیاں روئیں سے بھری ہوئی ہیں۔

ونڈ کرائسنتھیمم کی نایاب تفصیلات میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بائی اور سبز ہاتھ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے دنیا میں **ونڈ کرائسنتھیمم** کا پہلا باغیچہ کیسے اگایا۔ انہیں یقیناً یہ بات اچھی طرح یاد ہوگی کہ انہوں نے سب سے پہلے کس روز اس پھول کو دریافت کیا۔ جب یہ دریافت ہوا تو پودے پر صرف چند نڈھال سے پھول تھے۔ یہ بات تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ بعد میں پودے نے اتنی زیادہ حسن حاصل کر لی۔ وہ شمالی ہوا جو اس کے اوپر چلتی رہی اور وہ احتیاط جو سبز ہاتھ اس پر ایک ہزار دنوں تک دن رات کرتی رہی، اس نے اس پودے کو خصوصی اہمیت دلا دی۔ اس کے بعد سبھی **ونڈ کرائسنتھیمم** کے نام سے واقف ہو گئے۔

جب بائی اور سبز ہاتھ، سبز ہاتھ کے آبائی گاؤں پہنچے تو پورا گاؤں سنسان پڑا تھا۔ یہ علاقہ ملک کے اس حصے میں تھا جہاں دن کی روشنی سب سے کم وقت کے لئے آتی ہے۔ کتے کا پلا طویل اور لمبے سفر سے پوری طرح تھک چکا تھا اور اپنی منزل پر پہنچنے پر بے خود دکھائی دیتا تھا۔ سبز ہاتھ کا گھر پہاڑی ڈھلوان کے اوپر والے حصے پر تھا، گھر میں اس کی دادی ماں بس اس کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ واپس آئے تو اس سے آخری سلام دعا ہو جائے۔ گھر آنے کے بعد بائی نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ دادی اماں کی آنکھیں بند کیں اور پھر ان کی قبر کھودی۔

دادی اماں کو دفن کرنے اور موسم سرما کا انتظام کرنے کے بعد وہ پچھلے کئی ماہ میں پہلی بار جی بھر کے سوئے۔ وہ اپنی تنہائی، بھوک، سردی اور فکر و تشویش سب بھول کر سو گئے۔ اس پہاڑی سلسلے پر دن چھوٹے تھے رات کے مختلف حصوں میں وہ جاگتے رہے لیکن باہر تا حال اندھیرا ہوتا تھا چنانچہ وہ پھر سو جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ اس لئے سوتے رہتے تھے کہ انہیں نیند سے بیدار ہونے سے خوف آتا تھا۔ وہ اتنا سوتے تھے کہ دنوں کی گنتی ہی بھول گئے۔ آخر کار جب وہ جاگے تو انہوں نے پایا کہ اس چھوٹے سے مقدس اور محترم پودے پر پانچ جامنی رنگ کے شگوفے پھوٹ پڑے تھے۔ یہ پودا گھر کے پچھواڑے ایک

پہاڑی پر پھوٹا تھا۔

سبز ہاتھ نے سب سے پہلے ان پھولوں کو دیکھا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور بہت زیادہ برف باری ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ اتنی زیادہ تھی کہ اس کی سانسیں منہ سے نکلتے ہی جم جاتی تھیں۔ اسے اپنی دادی ماں کی آواز آتی ہوئی محسوس ہوئی "گذشتہ ستاسی برسوں میں یہ سرد ترین موسم سرما ہے"۔ ہاتھوں میں فلیش لائٹ تھامے سبز ہاتھ ٹھنڈی یخ ہوا میں باہر آ گئی تا کہ ان نازک کونپلوں کو ایک نظر دیکھ سکے جنہیں وہ کمرے کے اندر نہیں لا سکی تھی۔ جب ہوا کے تھپیڑے فرشتوں جیسی آواز کے ساتھ برف کے طوفان میں سے گزرے تو پانچوں جگہوں نے اپنی پنکھڑیاں کھول دیں اور یہ نظارہ دیکھ کر سبز ہاتھ کی حیرت سے چیخ نکل گئی۔ حیرت میں مبتلا سبز ہاتھ نے پنکھڑیوں پر رکھا ہوا پلاسٹک کا شفاف کور ہٹا لیا۔ بے رحم ہوا کے تھپیڑے اس قدر شدید تھے کہ محسوس ہوتا تھا وہ اس پودے کے پتے نوچ لے گی اور اسے جڑوں سے اکھاڑ پھینکے گی لیکن تیز ہوا میں پھول زیادہ اور زیادہ کھلتا گیا اور اس کا نازک تنا سیدھا کھڑا رہا، جیسے کسی الو کے کان کوئی عفریتی آواز سننے کے لئے کھڑے ہوں۔ سبز ہاتھ نے پاس کھڑے ہو کر اور پھول کی پتیوں کو آہستہ آہستہ کھلتے دیکھ کر بائی نے سوچا کہ یہ ویسا ہی پھول ہے جیسا اس نے ایک پوسٹ کارڈ پر دیکھا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ واحد پھول ہے جو قطب شمالی کے علاقے میں اگتا ہے۔ سبز ہاتھ کا بچپن بھی چونکہ پہاڑوں پر بسر ہوا تھا اس لئے اس نے رنگ رنگ کے پھول دیکھ رکھے تھے لیکن اس روز کھلنے والے پھول جیسا اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

لیکن ہوا یہ کہ جونہی ہوا کا زور ٹوٹا اور پہاڑ کی چوٹی پر سورج کی پہلی کرنیں پڑیں پھول نے مرجھانا شروع کر دیا۔ اس کے پتے گر گئے اور پھول نے اپنا سر نیچے جھکا لیا اور پھر ایک روز جب دھوپ کافی پھیلی ہوئی تھی اور دن کافی گرم تھا وہ پھول بالکل سوکھ گئے۔ انہیں پانی دینے، پلاسٹک کی شیٹ سے ڈھانپنے، گرم رکھنے اور کمرے کے اندر رکھنے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تاہم ایک عجیب بات یہ ضرور ہوئی کہ جب ایک پھول کملا جاتا تو اس کی جگہ ایک اور کلی بن جاتی تھی اور اس طرح ایک قیمتی زندگی کے ضائع ہونے سے پیدا شدہ کمی پوری ہو جاتی تھی۔ اس سے سبز ہاتھ کو لامحدود بے چینی اور فکر مندی لاحق ہو گئی۔

ونڈ کرائسنتھیمم کی ایک کالونی بنانے کیلئے انہیں کافی لمبا عرصہ لگا۔ پھول کی ہیئت،

کیفیت اور ساخت کے بارے میں باعلم ہونے میں بائی اور سبز ہاتھ کو کافی مدت لگ گئی۔انہیں اس سلسلے میں کافی محنت کرنا پڑی تھی کہ یہ پھول پانچ سے بڑھ کر دس کیسے ہوتے ہیں۔ان کی جوانی کا بہترین حصہ یہ جاننے میں لگ گیا کہ **ونڈ کرائسنتھیمم** صرف اور صرف ٹھنڈی سایہ دار جگہوں میں جڑیں پکڑتا ہے، اسے غیر تقطیر شدہ بارش کا پانی اور شبنم کے قطرے بالکل پسند نہیں ہیں اور یہ کہ اس کا زردی مائل اور ارغوانی رنگ موسم سرما میں گہرا ہو جاتا ہے اور اس کی خوشبو اس وقت بڑھ جاتی ہے جب یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں۔طویل اور محتاط تجزیے کے بعد وہ جان سکے کہ اس کے...... پر جو سفید رنگ کے روئیں ہیں ان سے سفید لیس دار رطوبت خارج ہوتی ہے۔ ہر پھول کی خوشبو انفرادی طور پر دوسرے سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ یہ خوشبو رات اور صبح صادق کے وقت تیز ترین ہوتی ہے۔ یہ خوشبو اس قدر تیز ہوتی کہ بعض اوقات پوری پوری رات ان کو جگائے رکھتی ہے۔ان راتوں کو وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے کہ کسی پہاڑی کی چوٹی کے اوپر سے اڑتے ہوئے جا رہے ہیں یا پھر کسی گہرے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔

یخ بستہ ہوا پیدا کرنے کیلئے بھاری برفباری اور کافی ژالہ باری کی ضرورت ہوتی ہے۔بائی نے دن رات ایک کر کے چچا کے چھوڑے ہوئے گاڑیوں کے حصوں اور پرزوں سے ہوا کو آگے دھکیلنے والا ایک طاقتور پنکھا اور بخارات کو جمانے والا ایک آلہ تیار کیا۔ تجزیئے اور تجربے سے انہوں نے جانا کہ وہ پودا جس نے 30 روز تک طوفان اور بھاری برفباری کا سامنا کیا اس کے پھول نہ صرف زیادہ صحت مند ہیں بلکہ وہ زیادہ دیر تک کھلے بھی رہے اور ان کی خوشبو بھی تیز ترین ہے۔ پھولوں کی خوشبو کو اور زیادہ تیز اور طاقتور بنانے کیلئے سبز ہاتھ نے فوارے کے پانی میں پٹ سن کا ایک ٹکڑا، جلی مرچ کی جڑ اور گارڈینیا کے تنوں کا رس ملا کر مکسچر تیار کرنے کی بھی کوشش کی یا پھر اس نے سن عیسوی کے لحاظ سے سات جولائی کو بارش کا پانی اکٹھا کیا اور پھر اسے پچپن دنوں کیلئے رکھ چھوڑا، پھر اس نے اس میں کاسنی کا ایک ٹکڑا ڈالا، بیج چگنے والی چڑیوں کے پر شامل کئے اور بیسم پودے کی نئی کونپلیں اس میں پیسیں۔اس طرح مختلف مکسچروں والے پانی سے پھولوں کی مختلف خوشبو حاصل کی۔ بائی اور سبز ہاتھ نے اپنی تنہائی کو مکمل طور پر فراموش کر دیا اور اس طرح تیزی سے کافی وقت گزر گیا۔

سبز ہاتھ کا لوگوں کو یہ بتانے سے قاصر رہنا کہ اس نے **ونڈ کرائسنتھیمم** کی کاشت کیس کس طرح کی، جان بوجھ کر کی گئی غلطی نہ تھی، جیسا کہ اس پر تنقید کرنے والے بعض لوگ سمجھتے ہیں۔

MashalBooks.com

بات بڑی سادہ تھی کہ اس نے پھولوں کو پانی دینے کیلئے اتنی اقسام کے مکسچر استعمال کئے تھے کہ وہ اکثر خود بھی ان کو گڈ مڈ کر دیا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں ہر سلوشن کی وجہ سے پھولوں کی خوشبو میں جو نازک سا فرق پیدا ہوتا تھا لوگ ان میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے، اس لئے اس حوالے سے وہ جو بھی وضاحت کرتی تھی وہ لوگوں کے اوپر سے گزر جاتی تھی۔

ایک روز بائی اور سبز ہاتھ ان پھولوں کے چند پودے فروخت کرنے کیلئے مارکیٹ لے کر گئے اور انہوں نے مارکیٹ سے تھوڑی دور ان پودوں کو ایک سایہ دار جگہ پر رکھ دیا لیکن کسی نے بھی قد میں ایک فٹ سے چھوٹے ان زرد اور غوانی رنگ کے پھولوں کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ صبح سے شام تک وہاں بیٹھے رہے لیکن ایک پھول بھی فروخت نہ کر سکے۔ حالانکہ وہ **ونڈ کرائسنتھیم** کے دس سب سے لمبے اور زیادہ جاذب نظر پودے لے کر منڈی گئے تھے اور ان پودوں کو لکڑی کے نئے گملوں میں رکھا گیا تھا جو بائی نے خاص طور پر ان کیلئے تیار کئے تھے۔ ہاں البتہ کچھ بچوں نے ان پھولوں کی خوشبو سے متاثر ہو کر ان کی طرف کسی قدر توجہ دی تھی لیکن فوراً ہی ان کے والدین بائی اور سبز ہاتھ پر شک بھری نظر میں ڈالتے ہوئے ان بچوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ہوا کو دھکیلنے والا پنکھا چلانے کیلئے انہیں ایندھن کی اشد ضرورت تھی چنانچہ بائی اور سبز ہاتھ پھول لے کر قصبے کی سب سے بڑی پھولوں کی دکان پر چلے گئے لیکن دکاندار نے ان کی طرف دیکھنے سے بھی انکار کر دیا، وہ ان کو پہاڑوں اور کھیتوں میں اگنے والی کوئی جڑی بوٹی تصور کر رہا تھا۔ سبز ہاتھ نے ایک پودا اٹھا کر دکاندار کی ناک کے قریب کر دیا تا کہ وہ اس کی خوشبو سونگھ سکے لیکن بدقسمتی سے اس پودے کی خوشبو ضائع ہو چکی تھی۔

اب ان کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان پودوں والے گملوں کو دوبارہ ٹرک پر لادیں اور تاریک ہوتی ہوئی سڑک پر گھر واپس چلے جائیں۔ راستے میں وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رکے جس کی آبادی دس بارہ خاندانوں پر مشتمل تھی۔ یہ وہی گاؤں تھا جو سبز ہاتھ کو چند برس قبل اچھے روزگار کیلئے دوسرے حصے کی طرف جاتے ہوئے نظر آیا تھا۔ جب وہ تھک کر ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے چاولوں سے بنا ہوا وہ کیک کھایا تھا جو اس کی دادی اماں نے اس کے بیگ میں رکھ دیا تھا۔ گاؤں خاموش اور پرسکون تھا اور پہاڑ گہرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے، اس صورتحال نے ان کے تھکے ہوئے دلوں کو تسلی دی۔ بائی نے تجویز پیش کی کہ گاؤں کے ہر گھر کے باہر **ونڈ کرائسنتھیم** کا

ایک پودا رکھ دیا جائے۔ پورے دن کی ناکامی اور تنہائی کے اثرات سے سبز ہاتھ کو نکالنے کا یہ اس کا طریقہ تھا۔ چنانچہ گاؤں کے ہر دروازے کے باہر پھولوں والا ایک گملا رکھ دیا گیا، اس وقت گاؤں کے لوگ دن بھر کے کام کاج کے بعد گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

خدا جانے کہاں سے آئے ہوئے ان پھولوں نے ایک پورے موسم کے دوران ماحول کو خوشبودار بنائے رکھا لیکن جب یہ پھول مرجھانے لگے اور ان کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تو لوگوں نے تلاش شروع کر دی کہ یہ پودے کہاں سے آئے تھے تلاش بسیار کے بعد وہ بائی اور سبز ہاتھ کے اس دور دراز پہاڑ تک پہنچ گئے۔ اس طرح **ونڈ کرائسنتھیمم** کے پودے ایک سے دوسرے گاؤں، گاؤں سے قصبوں اور قصبوں سے شہر تک پہنچ گئے۔

جب ان پودوں کی کالونی پھیلنے لگی تو زیادہ پنکھوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ جب یہ بات پتہ چلی کہ ہوا کی رفتار اور بہاؤ کا رخ پھولوں کی خوشبو اور رنگت میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے تو بائی اور سبز ہاتھ نے بہترین رنگ اور خوشبو والے پھول حاصل کرنے کے طریقے دریافت کرنے کے حوالے سے کافی ذہنی مشقت کی۔ وہ آٹھ طرح کے **ونڈ کرائسنتھیمم** تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ الگ خوشبو تھی۔ ایک گہرے پرسکون سمندر کی یادوں کی خوشبو لئے ہوئے، دوسرا وسیع، عریض میدان پر چلتی ہوئی ہوا کی بو باس والا تھا، ایک اور قدیمی جنت میں لے جانے والی خوشبو تھی جبکہ ان میں سے ایک عہد عتیق میں لے جانے والی خوشبو کا حامل تھا۔ پہلے پھول کی خوشبو سونگھ کر بائی اور سبز ہاتھ کے ذہنوں میں جو کیفیت طاری ہوئی اور جو خیالات گزرے انہوں نے اس کا وہی نام رکھ دیا۔

آہستہ آہستہ قریبی دیہات اور چھوٹے شہروں سے لوگ وہاں آ کر رہنا شروع ہو گئے تا کہ **ونڈ کرائسنتھیمم** کی پیداوار اور تقسیم میں مدد کر سکیں۔ اسی دوران پہاڑ کے اس طرف رہنے والا گاؤں کا مکھیا وہاں کے رہائشیوں کی لگاتار آمد اور شکایات سے حیران ہو گیا۔ وہ صوبائی گورنر کی طرف سے ایک تنبیہی نوٹ کے ساتھ آئے تھے۔ **ونڈ کرائسنتھیمم** کی کالونی اس پہاڑی چٹان کے آدھے سے زیادہ حصے پر پھیل چکی تھی اور قریب ہی کئی درجن گھر قائم ہو گئے تھے۔

MashalBooks.com

ونڈ کرائسنتھیمم بخار:۔

لوگ کافی دور سے آئے تھے۔ سب سے پہلے ایک زرد چہرے والا آدمی آیا جو بڑی مشکل سے سانس لیتا تھا، جیسے وہ دوڑتا ہوا دنیا کے اس دور دراز حصے تک پہنچا ہو۔ اس نے آتے ہی اعلان کیا کہ وہ انسانی **ونڈ کرائسنتھیمم** ہے، جس نے وہاں موجود سبھی لوگوں کو حیران کر دیا، پھر اس نے کہا، ''مجھے یہاں رکنے اور پھولوں کا مطالعہ کرنے کی اجازت دی جائے، میں وعدہ کرتا ہوں میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی''۔

اس نے اپنا نام مسٹر کو بتایا، وہ کم بلندی کی بیماری میں مبتلا تھا۔ اس نے بتایا کہ **ونڈ کرائسنتھیمم** کی طرح اس کی صحت بھی صرف اونچائی پر پائی جانے والی پہاڑی ہوا میں برقرار رہ سکتی ہے۔ وہ آدمی، جس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی، اپنی جوانی کے وقت سے ہی اس بیماری میں مبتلا تھا اور اس سے صحت یابی کے لئے وہ ملک بھر کے پہاڑی سلسلوں میں گھومتا رہا تھا لیکن اب تک اسے کوئی افاقہ نہ ہو سکا۔ بائی اور سبز ہاتھ اس کی بیماری کو بالکل نہ سمجھ سکے تاہم انہوں نے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی اور اس کے ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ پھولوں سے متعلق ان سے جو کچھ پوچھے گا، وہ بتائیں گے۔ مسٹر کو نے بتایا کہ اس کا جسم اور روح گھائل ہو چکے ہیں، کسی پاگل آدمی کی ایڑیوں کی طرح جو صدیوں تک صحراؤں کی خاک چھاننے کے باعث پھٹ چکی ہوں۔ اس نے بتایا کہ اس نے پڑوسی ملک میں ایک برفانی پہاڑ پر قیام کے دوران اس پھول کے بارے میں سنا تھا۔

اس نے **ونڈ کرائسنتھیمم** کی کالونی کے ساتھ ہی اپنا جھونپڑا تعمیر کر لیا اور اس پھول کے مطالعہ میں لگ گیا۔ اس کا چھوٹا سا جھونپڑا ہر طرح کے لیبارٹری کے سامان سے بھرنے لگا اور ہر ہفتے کے آخر میں وہ کئی بوتلیں اپنے دوست کی لیبارٹری میں لے کر جاتا تھا جو وہاں سے چھ گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ وہ خود سے سرگوشی کرتے سنا گیا، ''کیا میں خوش قسمت نہیں ہوں کہ مجھے کوئی ایسی چیز ملی ہے جس کیلئے آخر کار میں اپنی ساری زندگی وقف کر سکتا ہوں''۔

خود کو خاص طور پر اس پھول کے مطالعہ اور تجزیہ کے لئے وقف کر کے مسٹر کو دو سال کے بعد ایک ایسی گولی تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا نام انہوں نے ''باپا'' رکھا۔ اس گولی کا یہ نام بائی اور سبز ہاتھ کو خراج تحسین تھا اور یہ دونوں کے ناموں کو جوڑ کر ان کے مخفف سے بنایا گیا تھا۔ لیکن چونکہ بہت

MashalBooks.com

زیادہ لوگ اس بیماری سے متاثر نہیں ہوئے تھے اس لئے اس گولی کی کوئی کاروباری اہمیت وافادیت نہ تھی، یہ سوچ کر وہ اکثر مغموم ہو جاتا تھا۔ اس نے کم بلندی کے مرض میں مبتلا مریضوں کو متوجہ کرنے کیلئے اخبارات میں اشتہارات دیئے اور اپنا کثیر سرمایہ اور توانائی خرچ کر ڈالی۔ اس نے بہت سی ادویہ ساز کمپنیوں کو ان گولیوں کی بڑے پیمانے پر تیاری کی تجاویز بھی دیں۔ وہ ان کمپنیوں کو لکھے گئے خطوط میں **ونڈ کرائسنتھیمم** کی ایک پنکھڑی ڈالنا نہیں بھولتا تھا تا کہ ان کے خطوط سے خوشبو آئے، لیکن ڈاکیہ، جو ہمیشہ اس بات کی شکایت کرتا تھا کہ صرف ایک پہنچانے کی خاطر اسے اتنی بلندی پر آنا پڑتا ہے، اسے جو واپسی خطوط لا کر دیتا تھا، ان میں ہمیشہ بری خبریں ہی ہوتی تھیں، کچھ کمپنیوں نے تو جوابی خط لکھنا بھی گوارا نہ کیا چنانچہ تھوڑی مدت کے بعد خطوط آنے بند ہو گئے۔ اس کے بعد مسٹر کو نے یہ تصور کرنا شروع کر دیا کہ اس ملک میں اس بیماری میں مبتلا وہ واحد شخص ہے۔ اس کی مایوسی کا کوئی علاج نہ تھا۔ سبز ہاتھ کو اس پر اتنا زیادہ ترس آیا کہ اس نے خواہش کی کہ اسے بھی وہی بیماری لگ جائے۔ اس خواہش کا مقصد اس مایوس شخص کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنا تھا۔ اس کی بیالیسویں سالگرہ کیلئے سبز ہاتھ نے بیالیس خوبصورت ترین، خوشبودار **ونڈ کرائسنتھیمم** کاٹے اور خشک کئے، انہیں انہی پھولوں کی ڈنڈیوں سے بنی ہوئی ٹوکری میں ڈالا اور مسٹر کو کو بطور تحفہ پیش کئے۔ پھول کی دس طرح کی خوشبوئیں ٹوکری میں بہت نفاست کے ساتھ مربوط تھیں، نہایت لطیف آلات کی صوتی تخلیق میں شامل سنگیت کی طرح اور اس کی کمرے سے پورے گاؤں، پورے گاؤں سے پہاڑ کی چوٹی تک اور پہاڑ کی چوٹی سے عالم بالا تک پھیلی ہوئی تھی۔

پہلے پہل **ونڈ کرائسنتھیمم** کا بخار نہایت خاموشی سے اور دھیرے دھیرے پھیلا، مٹی کی ہوا کی طرح جسے اس علاقے کے لوگ ''مارنگ'' پکارتے ہیں۔ یا آپ یہ کہہ لیں کہ بخار پھول کی خوشبو کی طرح نہایت غیر محسوس انداز میں پھیلا۔ کچھ پھولوں کی خوشبو ہوا کی لہروں پر سفر کرتی میلوں تک پھیل جاتی تھی، لوگ اس خوشبو کا تعاقب کرتے اس دور دراز پہاڑی گاؤں تک پہنچ سکتے تھے۔ شاعروں نے پھولوں کی خوشبو اور رنگت پر شعر کہے اور دو شاعروں نے پیشکش کی کہ وہ شجاعت بھرے کارناموں پر مبنی اپنی طویل نظموں میں بائی اور سبز ہاتھ کی شخصیت کے تانے بانے بننا چاہتے ہیں۔ ''کے'' نامی شاعر کی نظم ''قطب شمالی کا پھول'' جو اس وقت ایک روزنامہ میں شائع ہوئی تھی پہلے پہل لوگوں کی توجہ

حاصل نہ کر سکی لیکن جلد ہی یہ نظم ہر شخص کی زبان پر تھی اور قدرتی شاعری کی ایک تنظیم سے منسلک ایک موسیقار نے تو اس کو باقاعدہ ایک گانے کا روپ دے دیا تھا۔

بلند و بالا پہاڑوں پر کسی گم گشتہ گاؤں میں
ایک تنہا جوڑے نے اک پھول اگایا
اے گل **ونڈ کرائسنتھیم** تیری پائیدار ناز کی
بقائے دوام کا جھونکا ہے
زردار غوانی جھٹ پٹے میں
تیرا خواب عہد عتیق کا امن وسکون ہے
تم ایک عاشق کے قطب شمالی کیلئے آرزومندانہ جذبات ہو
جو پھولوں کی مہک کا روپ دھار گئے ہیں
میں تمہیں اپنی محبت پیش کرتا ہوں
میں تمہیں اپنا اخلاص پیش کرتا ہوں
تمہاری مہلک میری غموں کی شدت کم کر دیتی ہے
اور تمہارے کھلتے ہوئے چہرے کی مسکراہٹ میری تنہائی کو ختم کر دیتی ہے

جب گانا ''نارتھ پول فلاور'' ہر دلعزیز بن گیا تو اس دوران **ونڈ کرائسنتھیم**، جو صبا کی طرح شروع ہوا تھا، ایک غصہ ور طوفان کی شکل اختیار کر گیا۔ لوگوں کے جھنڈ کے جھنڈ اس دور دراز کے پہاڑی گاؤں کی سیر کرنے لگے۔ اخبار کے رپورٹر بائی اور سبز ہاتھ کا انٹرویو کرنے آئے، تصویر کھینچنے والا ایک آرٹسٹ پانچ کیمروں اور دو نائیپن کے ساتھ وہاں آیا تا کہ ایک نمائش اور ایک کیلنڈر کے لئے پھولوں کی تصویریں اتار سکے۔ وہ دو دن مسلسل تصویریں کھینچتے رہے، انہوں نے درخت کے اوپر چڑھ کر تصویریں کھینچی تا کہ یہ دکھایا جا سکے کہ درخت پر بیٹھے ایک پرندے کو یہ پھول کس طرح کے لگتے ہیں، انہوں نے زمین پر لیٹ کر تصویریں کھینچیں تا کہ زمین پر رینگنے والے ایک کیڑے کی نظروں سے پھولوں کو دیکھا جا سکے، پھر انہوں نے کیمرے کے عدسوں کو پھول کی پنکھڑیوں کے بالکل ساتھ لگا کر تصویریں کھینچیں تا کہ یہ دکھا سکیں کہ پھول کو بالکل نزدیک سے دیکھیں تو وہ کس طرح کا لگے گا۔ انہوں نے پیچھے سے بائی کی

تصویریں کھینچیں جس میں اس نے اپنے ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے ہیں اور وہ پھولوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔انہوں نے سبز ہاتھ کی ایسی تصویریں اتاریں جس میں اس نے سر پر تولیہ باندھ رکھا ہے اور وہ پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھ رہی ہے۔سورج کی دھوپ اور ہوا کی وجہ سے بائی اور سبز ہاتھ کی جلد اس قدر سنولا گئی تھی جیسے پکے ہوئے آلو ہوتے ہیں، جلد میں جگہ جگہ دراڑیں بھی پڑ چکی تھیں، پھر بھی وہ مسکرا رہے تھے، وہ خوش نظر آ رہے تھے۔ بعد ازاں جب جوڑے کے بارے میں بات ہوئی تو فوٹو آرٹسٹ کے دو نائبین میں سے ایک نے اپنی یادوں کو دھراتے ہوئے کہا،''وہ کتنے خوش نظر آ رہے تھے، میرا دل چاہتا ہے، انہیں پھر سے دیکھوں''۔

سبز ہاتھ ہمیشہ تصویریں کھنچواتے وقت اپنے سر کے گرد تولیہ لپیٹ لیا کرتی تھی۔کبھی کبھی وہ وہاں آنے والے ہجوم کی طرف بڑی خوفزدہ نظروں سے دیکھتی تھی۔اتنے زیادہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر کبھی کبھی اس کے اندر تنہائی کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں، اس کی وجہ وہ کبھی نہ سمجھ سکی لیکن بائی ہر بار اسے یقین دہانی کراتا تھا کہ خوف نے اس پر غلبہ پا لیا ہے۔''ہم پھر کبھی الگ یا اکیلے نہیں ہوں گے، کم از کم اس وقت تک جب تک ہمارے اندر ایک دوسرے کی کشش کا مقناطیس کام کر رہا ہے، ہم نے اسے بڑی مشکل سے پایا ہے، ہم نے اپنا قطب شمالی دریافت کر لیا ہے''۔

سبز ہاتھ کو ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی جس کا ذکر اس نے بائی سے بھی نہیں کیا تھا۔ یہ اس کے بالوں کے حوالے سے تھا، جو تیزی سے گر رہے تھے، وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ مسئلہ دراصل شروع کہاں سے ہوا تھا کیونکہ شروع میں اس نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ وہ بس یہی تصور کرتی رہی کہ پرانے بالوں کی جگہ جلد ہی نئے بال اگ آئیں گے، گرد کے ذروں کی طرح یا گل قاصدی کے بیجوں کی مانند یا دھند کی طرح جو صبح کو پہاڑی چوٹیوں کو گھیرے میں لئے ہوتی ہے، دن کے وقت غائب ہو جاتی ہے اور شام کو نیچے وادی میں اتر آتی ہے۔لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے احساس ہوا کہ اس کے بال گر تو رہے ہیں لیکن ان کی جگہ نئے بال اگ نہیں رہے ہیں۔ایک وقت تھا کہ اس کے بال اتنے گھنے تھے جیسے گھاس کے میدان میں جنگلی پھول اُگے ہوئے ہیں لیکن اب وہ چھدرے ہو گئے تھے۔کسی مواقع پر سبز ہاتھ نے محسوس کیا کہ اس کے بالوں کے گرنے کا **ونڈ کرائسنتھیمم** کی لاتعداد افزائش سے ہے۔اس کے باقی ماندہ بال چمکدار اور غیر رونق تھے جیسے ندی کے شفاف پانی میں پڑی ہوئی کنکریاں، لیکن اس نے

MashalBooks.com

سارے بال رگڑ کر صاف کر دیئے اور اپنے سر کے گرد تولیہ لپیٹ لیا، اس کے بال یقیناً اس کیلئے خوبصورت **ونڈ کرائسنتھیمم** اگانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

گیت ''نارتھ پول فلاور'' جوں جوں مشہور ہوتا گیا، **ونڈ کرائسنتھیمم** کی خوشبو اور خوبصورتی زیادہ جانی پہچانی جانے لگی اور زیادہ لوگ چاہنے لگے کہ ان کی کھڑکی کے چھجے پر بھی اس پودے والا گملا رکھا ہوا ہو۔ پھر یہ فیشن بن گیا کہ نوجوان **1960**ء کے طلباء انقلاب کی سالگرہ کے روز یعنی **19** اپریل کو اپنے چاہنے والوں کو **ونڈ کرائسنتھیمم** تحفے کے طور پر دینے لگے۔ کسی نے بتایا تھا کہ ایک نوجوان نے اپنی محبوبہ کیلئے **ونڈ کرائسنتھیمم** کا ایک گملا خریدنے کیلئے ایک گیس سٹیشن پر پانچ مہینے کام کیا۔ جب یہ افواہ اڑی کہ اس پھول کی ایک خوشبو اپنے اندر شہوت انگیز اثرات رکھتی ہے، سیول کے مضافات میں قائم ہوٹلوں کے منیجروں نے **ونڈ کرائسنتھیمم** بلیک مارکیٹ سے خریدے۔ اس عمل نے بائی اور سبز ہاتھ کو مغموم کر دیا۔ وہ اتنے **ونڈ کرائسنتھیمم** نہیں اگا سکتے تھے جتنی لوگوں کی طلب تھی۔ **ونڈ کرائسنتھیمم** کو صرف کلیوں کے مرحلے تک پہنچنے کیلئے دس دن تک یخ بستہ شمال کی ہوا درکار ہوتی تھی اور بہت سے نازک طبع تو ایسے تھے جو اسی مرحلے کے بعد بھی کھلنے سے انکار کر دیتے تھے جبکہ بائی اور سبز ہاتھ کے پاس نہ تو زمین تھی اور نہ ہی افرادی قوت کہ وہ اس کالونی کو لامحدود حد تک پھیلا سکتے۔

اس دوران مارکیٹ میں بہت سے نقلی **ونڈ کرائسنتھیمم** پھول نمودار ہوئے اور لوگوں کو تذبذب میں مبتلا کرتے رہے۔ نقلی **ونڈ کرائسنتھیمم** کی نہ تو خوشبو ہوتی تھی اور نہ ہی اس کے پھول میں پچپن پنکھڑیاں ہوتی تھیں۔ ان کی پتیاں نہ تو لافانیت کی حد تک نفیس زرد ارغوانی رنگ کی آمیزش لئے ہوئے ہوتی تھیں، نہ ہی ان کی بناوٹ ستمبر کے مہینے میں شفق کی روشنی میں سوئے ہوئے بچوں کی آنکھوں کے پپوٹوں جیسی تھی۔ نقلی پھول چند ہی روز میں کمہلا جاتے تھے۔ زینگ، کتے کا وہ نیا پلا جو بائی نے سیول چھوڑتے وقت تحفے کے طور پر حاصل کیا تھا اور جو اس عرصہ میں جوان ہو چکا تھا اب کافی مصروف ہو گیا تھا۔ زینگ کو ان چوروں سے کالونی کو بچانا ہوتا تھا جو دن کے وقت یہاں چلے آتے تھے اور رات کو پھول چوری کرتے تھے۔ کچھ چور جب ان کو چرانے میں ناکام ہوتے تھے تو وہ تنگ کرنے اور نقصان پہنچانے کیلئے پھولوں کو اپنے بوٹوں سے روند دیتے تھے۔ لوگ نہیں جانتے تھے کہ جڑیں ہی پھول

MashalBooks.com

بناتی ہیں، جو کہ وہ بن چکے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک بار جڑوں سے الگ کر دیا جائے تو پھول اپنی مہک تقریباً فوری طور پر کھو دیتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ اور وہ جو پورے پودے کو اس کی لمبی جڑوں سمیت اکھاڑنے کی کوشش کرتے تھے زینگ انہیں تلاش کر لیتا تھا۔ زینگ کے کان اتنے تیز تھے کہ دور سے ہلکی سی آہٹ بھی سن لیتے تھے۔ وسیع پیانے پر پھولوں کی تجارت کرنے والے ایک گل فروش نے کافی بڑی قیمت پر پھولوں کی پوری کالونی خریدنے کی پیشکش کی۔ ایک اور شخص نے زیادہ اونچائی پر ایک بڑے قطعہ زمین کے عوض بائی اور سبز ہاتھ سے پھولوں کی کاشت کے راز حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

سبز ہاتھ کا آبائی گاؤں کوئی قابل نظارہ جگہ نہ تھی لیکن اب **ونڈ کرائسنتھیمم** کی کالونی بن چکا تھا۔ اب چونکہ **ونڈ کرائسنتھیمم** پہاڑ پر پھیلنا شروع ہو گئے تھے لہٰذا اس کی جہت کافی حد تک تبدیل ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے اب پہاڑوں پر چڑھنے والے اسی طرف آنا شروع ہو گئے تھے۔ پہاڑوں کے داخلی راستے پر دکانیں اور ہوٹل وغیرہ بن گئے تھے تا کہ کوہ پیماؤں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو ان کی ضرورت کی چیزیں فروخت کی جا سکیں۔ **ونڈ کرائسنتھیمم** کی پتیوں سے سجے کیک اور پین کیک فروخت کرنے والوں کو امیر بنا دیتے تھے۔ یادگاری تحفے جیسے شفاف دانوں والی تسبیح جس کے اندر پھولوں کی پتیاں بنی ہوئی ہوتیں، بید کی چھڑیاں جس کے ہینڈل پھول کی شکل کے ہوتے، پیٹھ کھجانے والی چھڑی جس کے کھجانے والے ہاتھ پھول کے جیسے زرد ارغوانی رنگ کے ہوتے اور پھولوں کے نقش والے تولیے تیار کرنے والوں نے بھی ان چیزوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

موسم گرما بائی اور سبز ہاتھ کیلئے کافی مشکل تھا۔ بہار کا موسم آیا تو بائی اور سبز ہاتھ کو پھولوں کی ہر نوع کیلئے سفید پینٹ سے الگ الگ حصوں پر نشانات لگانے پڑے اور ان کی تمام بارہ ورائیٹیوں کیلئے مناسب سردخانے تعمیر کرنے پڑے۔ یہ کام مکمل کرنے کے بعد بائی اور سبز ہاتھ مکمل طور پر تھک چکے تھے لیکن سردخانے اگلو، کی طرح نظر آتے تھے اور بائی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قطب شمالی کے کسی علاقے میں ہے۔ کچھ سیاحوں اور گل فروشوں کو ان خوبصورت سردخانوں کو دیکھ کر قرار نہ آتا تھا وہ ان میں جھانک کر دیکھتے تھے چنانچہ بائی کو سارا دن زینگ کے ساتھ ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر گزارنا پڑتا تھا تا کہ دراندازوں کو باہر ہی رکھا جا سکے۔ سبز ہاتھ کو سارا موسم گرما کولڈ ہاؤسز میں گزارنا پڑا تھا، وہ وہاں بیمار

MashalBooks.com

پھولوں کی تیمارداری کرتی رہی تھی۔

گرمیوں میں ایک شدید گرم دن کچھ غیر متوقع مہمان بائی اور سبز ہاتھ سے ملنے آئے اور انہوں نے ان دونوں کو احساس دلایا کہ **ونڈ کرائسنتھیم** بخار کتنا پھیل چکا ہے۔ دونوں سیاح شدید گرم طوفان، جو اوپر چوٹی تک لہریے دار انداز میں چکر لگا رہا تھا، کے باوجود پہاڑ پر چڑھ گئے، دونوں نے اکٹھے سفر کیا تھا لیکن وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے والے نہ تھے حتیٰ کہ دوست بھی نہیں تھے، انہیں محض اتفاقاً ایک دوسرے کا سامان اٹھانا پڑ رہا تھا اور دراصل وہ ایک دوسرے کے قریب تھے اور آپس میں اچھے تعلقات نہ رکھتے تھے، بائی اور سبز ہاتھ ان اجنبیوں کے ساتھ مسٹر کو کی مدد سے بات چیت کر سکتے تھے، غیر مانوس افراد سے بات چیت کے لئے وہ اکثر انہی کو استعمال کرتے تھے۔ یہ سوچ کر کہ نئے آنے والے اجنبی قطب شمالی سے آئے ہوں گے بائی نے اپنا نقشہ ان کے سامنے پھیلا دیا لیکن ایک نے نیدر لینڈز پر انگلی رکھی تو دوسرے نے اٹلی کے نقشے کی طرف اشارہ کر دیا۔

اس آدمی نے زور دے کر کہا کہ وہ ہیمل (Hamel) کی اولاد میں سے ہے، جو پہلا مغربی تھا جس نے کوریا کے بارے میں کتاب لکھی۔ پھر عورت نے کہا کہ اگرچہ اس کے آباؤاجداد مارکو پولو نامساعد حالات کی وجہ سے کوریا پہنچنے سے معذور رہے پھر بھی وہ پہلے مغربی تھے جنہوں نے مشرق کی طرف سفر کیا اور پھر اپنا سفر نامہ تحریر کیا۔ اپنے وافر کالے بال لہراتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی پر برتری حاصل کرنے کی سعی جاری رکھی اور کہا کہ مارکو پولو کا سفر نامہ نہ صرف حامل کی کتاب سے چار صدیاں پہلے لکھا گیا بلکہ دانشوران اور ادبی قدروں کے لحاظ سے بھی بعد الذکر پر فوقیت رکھتا ہے۔ دونوں غیر ملکیوں کی گفتگو نے محفل کا درجہ حرارت بڑھا دیا، اس سے اس دن کی گھٹن میں اضافہ ہو گیا چنانچہ ان کے درمیان ماحول کو پرامن بنانے کیلئے گھر میں سبز ہاتھ ایک **ونڈ کرائسنتھیم** اٹھا لائی جس کی خوشبو بہت تیز تھی۔ اس خوشبو کا ان دونوں پر مسمریزی اثر ہوا۔

پرسکون ہونے کے بعد دونوں سیاحوں نے اپنے کاروبار کے بارے میں بحث شروع کر دی۔ دونوں ہی رنگ سازی اور خوشبوئیں تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ **ونڈ کرائسنتھیم** کی حیرت ناک خوشبو کے بارے میں سن کر وہ مشرقِ بعید میں اس دور دراز پہاڑ پر آئے تھے تاکہ اس امر کا جائزہ لے سکیں کہ ان پھولوں سے ایک بالکل مختلف نوعیت کی خوشبو تیار کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ بائی اور سبز ہاتھ

MashalBooks.com

ان کوایک کولڈ ہاؤس میں لے گئے۔ جونہی انہوں نے کولڈ ہاؤس میں قدم رکھا وہ پریمیوں کی طرف ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے جیسے انہوں نے پوری دنیا میں تلاش کرنے کے بعد ایک دوسرے کی شکل دیکھی ہو اور زور زور سے خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ کولڈ ہاؤس میں **ونڈ کرائسنتھیمم** کی قطب شمالی والی خوشبو تھی، جو بائی اور سبز ہاتھ کو بہت پسند تھی۔

وہ تمام بارہ کے بارہ کولڈ ہاؤسز کا جائزہ لینا چاہتے تھے لیکن ان کے بغلگیر ہونے اور پھر خوشی اور سرمستی سے چلانے کا عمل کرنے کی ضرورت نہ محسوس نہ کی۔

''ارے یہ تو پی جے او 7965 سے ملتی جلتی ہے'' حامل کی اولاد میں سے ہونے کے دعوے دار نے دوسرے کولڈ ہاؤس میں داخل ہوتے ہی چلاتے ہوئے کہا۔

''بالکل بھی نہیں، یہ تو این ایچ 8247 سے ملتی جلتی ہے۔ جو ابجیان کے نام سے بھی جانی جاتی ہے، مارکو پولو کی اولاد میں سے ہونے کی دعویدار نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''لیکن تم ابجیان'' کے بارے میں کیسے جانتی ہو، یہ خوشبو تو میری کمپنی نے بڑی رازداری میں تیار کی ہے اور اس کو ابھی تک تجارتی پیمانے پر متعارف بھی نہیں کرایا گیا ہے''۔

اس کے جواب میں عورت نے اپنی اونچی ناک پر اپنی لمبی انگلی مارتے ہوئے کہا ''میں اپنی ناک سے دنیا میں ہونے والی کسی بھی چیز کو سونگھ سکتی ہوں، حتیٰ کہ وہ کچھ بھی جو تمہارے ذہن میں چل رہا ہوتا ہے''۔

اس کے بعد کسی نے بھی دوسرے کو خوشبوؤں کے نام رکھنے کے پراسرار عمل سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

''ارے سینٹ جبرائیل کا گلاب ان کے برعکس کتنا زرد محسوس ہوتا ہے اور اس مہک کے مقابلے میں سینٹ فلومینی کی خوشبو کس قدر ہلکی ہے''۔

''ارے فرحت اور شادمانی کا باغ، سرمستی اور شدید جذبوں کا باغ''۔

''جنت کا دریا، ناف زمین، ناف زمین''۔

انہوں نے بہت سے ایسے جذبوں کا اظہار کیا جو بائی اور سبز ہاتھ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس دوران وہ بارہ کولڈ ہاؤسز کی سیر کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ پھر وہ مبہوت بیٹھے ایک

دوسرے کی طرف تکتے رہے اور پھر اچانک اٹھ کر وہاں سے چلے گئے ایسے کہ ایک خاموش ہمدردی کے ساتھ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی ادھر نہیں آئے۔

جو لوگ آتے تھے وہ زیادہ تر علم نباتات اور فن باغبانی سے متعلق ہوتے تھے۔ کبھی کبھار وہ گروپوں کی صورت میں آتے تھے لیکن ان میں سے زیادہ تر انفرادی طور پر وہاں کا جائزہ لینے کیلئے آتے اور بڑے دلچسپ سوال کرتے، پھولوں کی پتیاں چباتے اور پورے ڈنٹھل پر مختلف قسم کے آمیزے چھڑکتے تھے۔ کچھ اپنے ساتھ خوردبین لاتے تھے جن کے ذریعے وہ کچلے ہوئے پتوں یا پھر پھول کے سٹیمن کا تجزیہ کرتے تھے۔ وہ ڈی این اے اور جینز کے بارے میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے تھے، اپنے سروں کو شک وشبہ ہونے کے انداز میں دائیں بائیں ہلاتے تھے اور پھر بائی اور سبز ہاتھ کے گھر کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے جیسے کوئی جاسوس کسی سراغ کی تلاش میں ہو۔ ان میں سے ایک نے مکان کے چبوترے پر سے گرد اکٹھی کر کے پلاسٹک کے لفافے میں ڈال لی تاکہ اپنے ساتھ لے جا سکے اور کچھ نے چند مٹھیاں مٹی بوتلوں میں ڈال لی اور چند ایک نے کنویں کے پانی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک تجزیہ نگار نے تو ہوا کو آگے دھکیلنے والے پنکھے پر کھدا ہوا سیریل نمبر تک لکھ لیا، جو اتنا مٹ چکا تھا کہ پڑھا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ سبز ہاتھ کے ایک بال یا ممکن ہو سکے تو اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، وہ اکثر گاؤں کے رہائشیوں سے ناراض ہو جاتے تھے، انہیں گلہ تھا کہ دیہاتی ریسرچ میں ان کی بالکل مدد نہیں کرتے ہیں۔

ہفتے کے ان اختتامی دنوں کے بعد بہت سے **ونڈ کرائسنتھیمم** بیمار پڑ جاتے تھے۔ وہاں کی صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے آنے والے پودوں کو چھوتے تھے، انہیں رگڑتے تھے اور انہیں اکھاڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پتیوں کی تعداد کم ہو جاتی اور پتے تنے سے جدا ہو کر نیچے گر جاتے تھے۔ سبز ہاتھ ان کے تنوں کو پٹی سے باندھ دیتی تھی، اس کے باوجود ان میں سے بہت سے پودے کمہلا جاتے تھے اور بعض اوقات مکمل طور پر سوکھ جاتے تھے۔ **ونڈ کرائسنتھیمم** کو دیکھنے کے شوق کی پرشدید لہر کے بعد ان میں سے بہت سے پودے مر جاتے تھے اور وہ بھی شوق کی تکمیل میں۔ اس صورتحال نے بائی اور سبز ہاتھ کو ایک تکلیف دہ فکر میں مبتلا کر دیا۔ وہ ہجوم کو کسی بھی طور ایسا کرنے سے منع نہیں کر سکتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ شوق کی تکمیل میں حد سے بڑھے ہوئے ہجوم کے ہاتھوں پھولوں

کی یہ درگت بنتے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مسٹرکو اور دیگر پڑوسی اس سلسلے میں ان کے بڑے مددگار تھے۔ وہ گاؤں والے جو یہ جانتے تھے کہ اس نوجوان جوڑے کے نزدیک ان پھولوں کی کیا اہمیت ہے، ہفتہ وار چھٹیوں کے دوران اپنے دیگر کام ترک کر دیا کرتے تھے تا کہ وہاں آ کر پھولوں کو ہجوم سے بچانے میں ان کی مدد کر سکیں۔ لیکن گاؤں والوں کی تمام تر نگرانی اور دیکھ بھال کے باوجود وہاں کی سیر کیلئے آنے والے کچھ لوگ اصرار کرتے تھے کہ وہ اس وقت تک وہاں سے نہیں جائیں گے جب تک انہیں کچھ چھوٹے پودے نہیں دیئے جاتے۔

کم بلندی کی بیماری کیلئے اپنی تیار کردہ گولیوں کو کمرشل پیمانے پر متعارف کرانے میں ناکامی کے بعد مسٹرکو نے اپنی باقی ماندہ زندگی **ونڈ کرائسنتھیمم** کی کاشت سے متعلق ہر چیز کا ریکارڈ بنانے کیلئے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے پھولوں کو بہت زیادہ سراہا تھا اور خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ جب وہ موڈ میں ہوتا تھا تو ایک ہفتے میں ایک ہدیہ ستائش لکھ لیتا تھا۔ وہ یہ ہدیہ ستائش ایک خصوصی نوٹ پیپر پر لکھتا تھا جو اس نے ایک خفیہ طریقہ استعمال کر کے بنایا تھا۔ وہ خصوصی طور پر تیار کی گئی سیاہی سے لکھتا تھا جو بڑی دل پذیر قسم کی خوشبو دیتی تھی لیکن چونکہ وہ انہیں خفیہ رکھتا تھا اس لئے بائی اور سبز ہاتھ کے سوا کوئی کبھی اس کی اس نوٹ بک کو نہ دیکھ سکا۔ جب کبھی اس کا موڈ اچھا ہوتا تو مسٹرکو اپنی ان تعریفی نظموں میں سے ایک یا دو گاؤں والوں کو سناتا تھا۔ بدقسمتی سے ایک کے سوا تمام نظمیں ضائع ہو گئیں، صرف ایک باقی رہ گئی جو اس امر کی گواہ ہے کہ وہاں اس طرح کے پھول ہوا کرتے تھے۔

گرم ہواؤں کی دو لہروں نے پہاڑ کو کئی روز تک اپنے غلبے میں رکھا لیکن بائی اور سبز ہاتھ گرمی سے بے خبر تھے اور کسی طرح منہمک تھے جیسے وہ بہت ہی انوکھی خوشبو والا پھول اگانے میں مشغول تھے۔ انہوں نے پودوں کو اکٹھی کی گئی شبنم اور اٹھارہ دیگر اجزاء والا پانی دیا جن میں ہجرت کرنے والی بطخوں کے انڈے، جگنوؤں کی دمیں، سہ برگہ جھاڑی کے پھولوں کا بقچہ اور پہاڑی ٹڈوں کی چڑیاں شامل تھیں۔ وہ شبنم اکٹھی کرنے کیلئے پہاڑوں پر گھومتے رہتے تھے اور سارا دن پودوں کو دیکھتے رہتے تھے کہ کب انہیں پانی دیئے جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

جب موسم گرما کی گرم ہوا، موسم خزاں کی ٹھنڈی ہوا اور یخ بستہ ہوا مصروف دنیا سے دوران کے گھر پر سے گزر کر اپنی جگہ پر چلی گئیں تو بائی اور سبز ہاتھ نے آخر کار دل موہ لینے والی حیرت انگیز خوشبو

MashalBooks.com

والا **ونڈ کرائسنتھیمم** کھلتے دیکھا۔اس میں قطب شمالی کی صاف ترین ہوا کا اخلاص تھااور اب تک کھلنے والے کسی بھی نوعیت کے پھولوں سے زیادہ دور تک پھیلنے والی خوشبو تھی۔ انہوں نے اسے تیرہ خوشبوؤں والا(Hoha) ''ہوہا'' کا نام دیا۔

ونڈ کرائسنتھیمم کا افسوسناک انجام

''خاموشی، خاموشی، براہ مہربانی باتیں کرنا بند کیجئے اور آیئے اپنی کانفرنس شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ ایجنڈا پیش کریں گے؟''

''بالکل، جیسا کہ ہینڈ آؤٹ میں واضح کر دیا گیا ہے، وزارت نباتات اور جنگلات کو پانچ مختلف امور پر فیصلے کرنے ہیں۔ان پر صلاح مشورے کیلئے ہماری پاس چالیس منٹ ہیں''۔

''چالیس منٹ کیوں''؟

''ہاں صرف چالیس منٹ کیوں؟''

''لیکن معاملہ ہے کیا؟''

''ایک پھول کے بارے میں غور کیا جانا ہے''۔

''کیا یہ صرف ایک ہے''۔

''کیا آپ نے ایک نظر اس کو دیکھ لیا ہے؟ کیا یہ عام مقامی پھولوں کی طرح نہیں ہے جن کا منبع غیر ملکی ہے، کیا ہم نے اس پر پچھلی بار بحث کی نہیں تھی؟''

''میرے خیال میں یہ مختلف نظر آتا ہے، اب کون سب سے پہلے بولے گا، آپ اس بارے میں بات کیوں نہیں کرتے ماہرین ادویات کی جانب سے؟''

''میں کیوں؟''

''ٹھیک ہے کسی کو تو سب سے پہلے بات کرنا ہے''۔

''ٹھیک ہے، میں صورتحال کو مختصراً بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تین ادویہ ساز کمپنیوں نے اس پودے سے متعلق تصدیق کیلئے درخواست گزاری ہے۔ ایک کمپنی نے پودے کے اندر کی رطوبت کی تلخیص سے دمہ جیسی سانس کی بیماریوں کیلئے علاج دریافت کیا ہے۔ ایک اور کمپنی اس پودے کی پتیوں اور سٹیمن سے نسیان سے بچنے کیلئے دوا تیار کر رہی ہے اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہاں ایک کمپنی ایسی بھی ہے جو

MashalBooks.com

بولیاتی خرابیوں کیلئے اس پودے کی معمول سے لمبی جڑیں استعمال کر رہی ہے۔ یقیناً یہ دوا ابھی غیر مصدقہ ہے چنانچہ ہمیں تینوں ادویات کا تجزیہ کرنا ہے اور ان میں سے بہترین دوا کا انتخاب کرنا ہے جو قوم کی صحت کیلئے فائدہ مند ثابت ہو تا کہ میرے نقطہ نظر کے مطابق بولیاتی اعضاء اعضائے تنفس سے زیادہ تکلیف دہ ہیں اور نسیان کا مرض بولیات سے متعلق بیماریوں سے زیادہ تشویشناک ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ تنفس زندہ رہنے کیلئے ذہن کی خرابی سے زیادہ ضروری ہے......''۔

''براہ مہربانی اصل موضوع کی طرف آیئے''۔

''مختصراً یہ کہ تین کمپنیوں کی جانب سے سرکاری طور پر تصدیق نامے کی درخواستیں میں اس پودے کی تیرہ مختلف خوشبوؤں میں سے صرف دوسرے، ساتویں اور گیارہویں نمبر والی خوشبوؤں والے پودوں کے استعمال کی اجازت چاہی گئی تھی۔ تنفس کی بیماری کے علاج کیلئے دوسرے نمبر کے **ونڈ کرائسنتھیمم** اور بولیات کے حوالے سے بیماری کیلئے ساتویں نمبر کا پودا استعمال ہوتا ہے''۔

''لیکن یہ مسئلہ کیوں ہے؟''

''ہم ان تینوں کی اجازت کیوں نہیں دے سکتے''۔

''ہم ایسا نہیں کر سکتے اور اس کی وجہ آپ جانتے ہیں کہ ان پودوں کی پیداوار محدود ہے''۔

''مجھے یقین ہے کہ اس پودے کی پیداوار بڑھانے کا بھی کوئی طریقہ ہوگا، ہمیں صرف وہ طریقہ تلاش کرنا چاہیے''۔

''معذرت خواہ ہوں لیکن میں چاہوں گا کہ مجھے اس حوالے سے کچھ وضاحت کرنے دی جائے''۔

''مجھے اجازت دیجئے، ایک ہی لفظ میں اس کا لب لباب یہ ہے کہ تمام متعلقہ کمپنیوں کا خیال ہے کہ اس پودے کی ایک چھوٹی سی کالونی میں اتنی زیادہ اقسام کاشت کرنا غیر ممکن اور معاشی لحاظ سے بھی مناسب نہیں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان میں سے صرف ایک دوا کو منظور کرنا ہے اور ایک وہ ہوگی جو ہماری قوم کی صحت کیلئے سب سے زیادہ مددگار اور فائدے مند ہو، ہمیں اس کمپنی، جو اس کی پیداوار کی ذمہ دار ہوگی، کو یہ اجازت نامہ دینا ہے کہ وہ اس دوا کیلئے درکار پودے کی قسم وسیع پیمانے پر کاشت کر سکے''۔

''یہی میرا بھی خیال ہے،تو پھر ہم ایسا کرتے کیوں نہیں ہیں؟''

''میرے خیال میں بولیاتی امراض کا علاج سب سے زیادہ ضروری ہے، آخر ہر کسی نے اپنے آپ کو آسان بنانا اور آسودہ کرنا ہوتا ہے''۔

یہ بات میرے علم میں ہے کہ اس علاقے کے رہائشی اس پودے سے کافی عرصہ پہلے دوا بنا چکے ہیں''۔

''تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو، تمہارے خیال میں کوئی پہلے ہی ان کی فروخت کا سرکاری تصدیق نامہ حاصل کر چکا ہے''۔

''میرے خیال میں مجھے اس کی وضاحت کرنی چاہیے کیونکہ یہ معاملہ میرے ہی ضلع سے متعلق ہے۔ وہ دوائی اہمیت کی حامل نہ تھی کیونکہ یہ ایک طرح کا عام طریقہ علاج تھا اور یہ ایک ایسے شخص نے تیار کی تھی جو ایسی بیماری میں مبتلا تھا جو کسی کو کبھی کبھار ہی لگتی ہے۔ یہ ایک عجیب بیماری ہے جسے بلندی کی بیماری کہا جاتا ہے اور اس بیماری میں مبتلا ہونے کے واقعات اتنے کم ہیں کہ گذشتہ پانچ دھائیوں کے دوران ملک میں اس کے صرف دو مریض دیکھنے میں آئے۔ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ بہت سے لوگوں نے علاقے میں رہائش حاصل کر لی ہیں، انہی وجوہ کی بناء پر جیسے کہ اس عجیب بیماری کے مریض کو پیش آتی ہیں اس لئے ہم ملک میں انتظامی مسائل کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کانفرنس میں آنے کا میرا مقصد اس علاقہ میں نئی رہائش گاہوں کے لئے وہ آبادکاری گرانٹ حاصل کرنا ہے جس کی منظوری اس وزارت نے دی ہے۔ آئیٹموں کے حساب سے متوقع اخراجات کیلئے آپ کو ہینڈ آؤٹس کا جائزہ لینا پڑے گا۔

''ہم کسی چیز کے بارے میں کیسے فیصلہ کر سکیں گے اگر آپ میں سے ہر کوئی ایک الگ ایجنڈا پیش کرے گا؟ اصل موضوع کی طرف واپس آنا ضروری ہے''۔

''ہماری ایسوسی ایشن کے پاس گذشتہ چند برسوں کے دوران بہت سے خطوط آئے۔ ان میں سے زیادہ تر ان شکایات پر مبنی تھے کہ پودوں کی کاشت کے طریقوں کو افشاء کر کے حکم نامے کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ 80 فیصد شکایات پودے کی کاشت کاروں کے متعلق تھیں، جنہوں نے آرڈیننس کے مطابق عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا''۔

''اب یہ بھی سن لیں، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں بہتری کاسمٹیک کمپنیوں نے پٹیشن دائر کی

ہے کہ انہیں مغرب کی کاسمیٹک کمپنیوں کے ساتھ مشترکہ منصوبے کے طور پر اس پودے سے پرفیوم کشید کرنے کی اجازت دی جائے۔اس میں وہ اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے ان پرفیوموں کے ناموں پر بھی اتفاق کر لیا ہے۔جیسے ''بلیوونڈ''، ''پول نارڈ''، ''فلومینی'' اور ''اوم فیلوس''، وہ جن اقسام میں دلچسپی رکھتی ہیں وہ چوتھے، نویں اور گیارہویں نمبر کی ہیں۔اب یہاں ادویہ ساز کمپنیوں میں سے ایک کے ساتھ مفادات کی ارتکازیت پائی جاتی ہے۔وہ بھی پوری کالونی میں صرف ایک قسم اگانا چاہتی ہیں۔مالی مفادات کے حوالے سے کاسمیٹک کمپنیاں بھی یہی کچھ چاہتی ہیں۔میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ ادویہ ساز کمپنیوں میں سے ایک قسم نمبر گیارہ میں دلچسپی رکھتی ہے اور خوشبوئیں بنانے والے جن اقسام میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان میں سے ایک یہ گیارہ نمبر بھی ہے''۔

ٹھیک ہے یہ قسم وہ ہے جس سے دماغی مرض نسیان کا علاج ہوتا ہے''۔

''یہ بات بالکل درست ہے''۔

''میرا نہیں خیال کہ ان کمپنیوں میں سے کوئی بھی لڑے بغیر اور مقابلہ کئے بغیر ہار مان لے گی۔انہوں نے یہ علاج دریافت کرنے اور یہ پرفیوم بنانے میں ٹنوں کے حساب سے رقوم خرچ کی ہیں اور پورا ایک سال لگایا ہے''۔

''دیگر معاملات بھی اتنے ہی پیچیدہ ہیں۔اس وجہ سے ہم یہاں ان مسائل پر بحث کر رہے ہیں''۔

''اس میں آپ کا کیا خیال ہے۔میرے خیال میں کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ دماغی مرض بولیاتی نظام کے خرابیوں سے کم خطرناک ہے''۔

''یہ بالکل درست ہے، میری تجویز یہ ہے کہ ہمیں نمبر گیارہ کی کاشت کی خصوصی اجازت دے دینی چاہیے''۔

''اگر ہم اس کو منظور کر لیں تو کیا ہمیں سبسڈی کا یقین ہوگا''۔

''میں تحریک پیش کرتا ہوں کہ ہمیں یہ منظور کر لینا چاہیے، ہم میں سے کوئی بھی ادھیڑ عمری سے زیادہ دور نہیں ہے''۔

''اگر ہم اس بات کی تصدیق کر دیں کہ ہم کم از کم اس قسم کے طریقہ کاشت کو افشاء کرنے کیلئے

کاشت کاروں پر باغبانی کے حوالے سے آرڈیننس کو نافذ کر سکتے ہیں تب یہ ممکن ہو سکے گا کہ کالونی کو وسیع کیا جا سکے تا کہ پیداوار بڑھانے کے قابل ہوا جا سکے۔

''تب پھر سبسڈی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ جگہ میرے ضلع کی حدود میں آتی ہے۔ اگر ہم کمرشل بنیادوں پر کاشت کی جازت دے دیں تو بہت سے مزید لوگ وہاں آ کر آباد ہوں گے''۔

''اب تم کیا چاہتے ہو، سبسڈی یا رہائشیوں کی تعداد میں کمی''۔

''یہ صرف ثانوی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ابھی تک غیر سرکاری ہے لیکن متعدد بڑی صنعتوں نے اجازت نامے کیلئے درخواستیں جمع کرائی ہیں کہ وہ وہاں تفریحی کمپلیکس بنانا چاہتی ہیں۔ اگر ہم اس کی منظوری دے دیتے ہیں تو اس سے ہمارے ضلع کو بہت سا ریونیو حاصل ہو سکے گا۔ اس علاقے کا موسم بہترین ہے اور موسم گرما اور موسم سرما کی سیر گاہ کیلئے بہت مناسب ہے۔ میرے بڑے بوڑھے اس بات پر کافی عرصہ افسوس کرتے رہے کہ زمین کا اتنا عمدہ اور قیمتی ٹکڑا اس طرح جھاڑ جھنکار کی کالونی کے طور پر ضائع ہو رہا ہے''۔

''یہاں زیادہ تر لوگ غیر قانونی طور پر رہ رہے ہیں، کیا ایسا نہیں ہے؟''

''کم و بیش، ان میں سے کچھ یہاں کے حقیقی رہائشی ہیں جو یہ جگہ چھوڑ گئے تھے اور پھر واپس آ گئے''۔

''اگر ادویہ ساز کمپنیوں کی طرف سے یہ پٹیشنیں دائر نہ کی گئی ہوتیں تو ہم جھاڑ جھنکاڑ والا راستہ مکمل طور پر صاف کر سکتے تھے اور اس طرح جگہ کو تفریح گاہ بنا سکتے تھے''۔

''میں نے سنا ہے کہ گیارہ نمبر کی مہک کافی تیکھی ہے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں''؟

''ارے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے''۔

''کیا آپ اسکی اٹنگ پسند کرتے ہیں''؟

''اس کمرے سے جانے سے پہلے مجھے وہ سب کچھ بتانا چاہیے کہ آخری اجلاس میں ہم نے معاملے کو کہاں چھوڑا تھا، بغیر کسی نتیجے پر پہنچے۔ کیا میں انٹرنیشنل فلاورا یگزیبیشن ایسوسی ایشن کی جانب سے بھیجا گیا یہ دعوت نامہ پڑھوں''۔

''ہاں صرف متعلقہ اور اہم پیراگراف پڑھیے''۔

MashalBooks.com

''ہماری ایسوسی ایشن، خاص طور پر آپ کے ملک کے اس نایاب پھول میں دلچسپی رکھتی ہے، عام طور پر جس کو **ونڈ کرائسنتھیمم** کا نام دیا جاتا ہے (نباتاتی نام کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا) میں باقی پیراگراف چھوڑ رہا ہوں کیونکہ یہ بہت طویل ہے''۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے اس پودے کا کوئی نباتاتی نام ہی نہیں ہے؟''

''مجھے اگلے نکتے کی طرف آنے دیجئے، ہمیں آپ کو دعوت دیتے ہوئے خوشی ہوگی کہ آپ دنیا کے نایاب ترین پودوں کی نمائش میں اپنے ملک کے یہ نادر پھول لوگوں کو دکھانے کیلئے رکھیں۔ یہ نمائش سال رواں کے دوران اس شہر میں منعقد ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے آپ کے اور ہمارے ملک کے درمیان دوستانہ تعلقات فروغ پائیں گے۔ ہم پسند کریں گے۔ اگر آپ.........''

''لیکن یہ خط تو آپ نے پچھلی مرتبہ پڑھا تھا''۔

''کیا میں نے پڑھا تھا؟ مسئلہ یہ ہے کہ اس معاملے پر علم نباتات اور علم باغبانی کی لاتعداد سوسائٹیوں میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیشنل گارڈننگ ایسوسی ایشن چاہتی ہے کہ شیرون کے گلاب کی تین قسمیں، دو اقسام کے صنوبر اور دونواح کے بانس بھیجے جائیں جوان کے علاقوں میں خوب تیزی سے پھولتے پھلتے ہیں، اور زیادہ تر خاندان سحلبیہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس صورتحال نے ہمیں شش و پنج میں مبتلا کر دیا ہے''۔

جو باتیں ہم پچھلی مرتبہ کر چکے ہیں ان کو دہرا کر ہم اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ شیرون کے گلاب کے بغیر ہم ایک بین الاقوامی نمائش میں اپنے ملک کی نمائندگی کیسے کر سکتے ہیں''۔

''لیکن شیرون کا گلاب نایاب پودا نہیں ہے۔ ہم اپنی پہلی ہی شمولیت سے نمائش کی شرائط سے انحراف نہیں برت سکتے''۔

''لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ زیادہ اہم چیز کیا ہے، نمائندگی کرنے والا یا پھر نایاب ہونا؟ یقینی طور پر نمائندگی کرنے والا''۔

''کچھ چھوٹی ایسوسی ایشنوں نے بھی تجاویز پیش کی ہیں، جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہے''۔

انٹرنیشنل گارڈننگ لوور ایسوسی ایشن نے بہت نایاب پودوں کے ساتھ شمولیت کیلئے درخواست دی ہے۔ یہ پودے انہوں نے اگائے ہیں جیسے کہ اصلاح شدہ گلاب، جنیاتی لحاظ سے سنگترے، کیمیلیا اور مقامی

جنگلی گلاب سے تشکیل پانے والا سہ برگہ ہے۔ جو چیز ہمارے کام کو اور زیادہ مشکل بنا رہی ہے، یہ ہے کہ خط میں **ونڈ کرائسنتھیمم** کی ایک ایسے پودے کے طور پر تخصیص کی گئی ہے۔ کسی ہارٹی کلچر ایسوسی ایشن نے **ونڈ کرائسنتھیمم** کا ذکر نہیں کیا ہے، چنانچہ سوال یہ ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''کیا یہ چیز تمہیں بہت زیادہ پریشان کر رہی ہے؟ تو پھر آپ جینیاتی طور پر تبدیل شدہ سائبیرین گل داؤدی کیوں شامل نہیں کر سکتے''؟

''گیارہ نمبر والے **ونڈ کرائسنتھیمم** کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

'اس سے ذہنی مرض کا علاج ہوتا ہے''۔

''اب دیکھئے کہ اتنا عاجز سا نظر آنے والا پھول ہمارے ملک کی نمائندگی کیسے کر سکتا ہے؟ ممکن ہے یہ شمالی کوریا میں طویل عرصے سے موجود ہو، ممکن ہے ہوا اسے جنوب کی طرف لے جائے''

''ٹھیک ہے، میں محسوس کر رہا ہوں آپ کافی سنکی ہیں، آپ اپنی مقامی بولی استعمال نہ کر رہے ہوتے اگر آپ کا اس سے تعلق نہ ہوتا۔

''معذرت خواہ ہوں، لیکن ہمارے چالیس منٹ پہلے ہی پورے ہو چکے ہیں۔ ہمیں اس کو اپنا حتمی فیصلہ بنانا چاہیے اور اس کانفرنس کو ختم کر دینا چاہیئے''۔

''لیکن نتیجے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''ہم نے بات چیت سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے''۔

''بائی، لوگ اس جگہ کو چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں''۔

''میں نے سنا ہے کہ انہیں اس چٹان کے اس طرف ایک تعمیراتی جگہ پر کام مل گیا ہے''۔

''اور زینگ اچانک کیسے مر گیا''۔

''میرا خیال ہے کسی نے اسے زہر دیا ہے، لیکن تم اتنا اداس مت ہو۔ زینگ جنت میں گیا ہوگا۔ زمین پر اس کی زندگی اتنی آسان نہ تھی، چنانچہ ایک آرام دہ زندگی اس کا حق بنتا ہے''۔

''بائی، ہم صرف **ونڈ کرائسنتھیمم** سے مختلف مگر ملتا جلتا پودا کاشت نہیں کر سکتے، جیسا کہ حکم نامے میں کہا گیا ہے، کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں''۔

MashalBooks.com

''یقینی طور پر نہیں''۔

''میں کبھی اپنے پھولوں کی کوئی ایک بھی قسم اگانا نہیں چھوڑوں گی' ہم کیا کریں گے؟''

''ہم کوئی راستہ تلاش کریں گے لیکن کل''

''اگر صرف **ونڈ کرائسنتھیمم** سے ملتے جلتے پودے کاشت کرنے کی اجازت ملی اور باقی سب چھوڑ دینے پڑے تو مسٹر کو پھر سے بیمار پڑ جائیں گے۔تم جانتے ہو کہ اصل پھول سے ملتا جلتا پھول اس بیماری کے لئے ضروری رس کا حامل نہیں ہوتا''۔

''میں جانتا ہوں لیکن مسٹر کو کسی بھی طور اکیلے نہیں ہوں گے''۔

''ہاں یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ایک اور نوجوان آدمی اس طرح کی بیماری میں مبتلا ہے''۔

''کیا کم بلندی والی بیماری میں مبتلا مریضوں کی آنکھیں اسی طرح گہری ہوتی ہیں''۔

''میرا خیال ہے کہ ایسا ہوتا ہے''۔

''تم جانتے ہو کیوں؟''

''نہیں میں صرف حیران ہو رہا تھا''۔

نباتاتی نام پر جنگ

مسٹر کے نے خود کو **ونڈ کرائسنتھیمم** کے مطالعہ کیلئے وقف کر رکھا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ آخری مرحلے میں اچھی خاصی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ **ونڈ کرائسنتھیمم** کی ایک نسل ایسی تھی جو کہیں اور نہیں پائی جاتی تھی۔اس نے اپنا کافی وقت یہ ثابت کرنے پر صرف کیا کہ **ونڈ کرائسنتھیمم** اپنے بائیولوجیکل کردار کے لحاظ سے **کرائسنتھیمم** مونٹوسم (Chrysanthemum montuossum) سے ملتا جلتا ہے جو **کرائسنتھیمم** کی پہاڑوں میں اگنے والے الپائن کی ایک نسل ہے، اس کی ظاہری شکل و شباہت آئی جیرین الپیکولانا **کرائسنتھیمم** لوبیلم (Erigeron Alpicolana Chrysanthemum lubellum) جیسی ہے لیکن یہ کچھ خاص قسم کے ریشوں سے بنا ہے جو **کرائسنتھیمم** کی کسی جانی پہچانی جنس کے ریشوں جیسا نہیں ہے۔لیکن یہ آخری انتہا تھی جہاں تک وہ جا سکتا تھا کیونکہ وہ پھول کے منقلب چیز کے ارتقاء اور اس کی تشکیل کے بارے میں ایک بھی ثبوت قائم نہ کر سکا۔یہ بتائے بغیر کہ کون سی

خصوصیات اسے ایک نادر اور نایاب پودا بناتی ہیں وہ اس کمیاب پودے کو کوئی نباتاتی نام دینے کا تاریخی کام پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے طالب علم نائیبن کے ساتھ کئی بار کالونی کا دورہ کیا حتیٰ کہ وہ اس حد تک بھی گیا کہ اس نے اپنے نائیبن کو ایک جھونپڑے میں چھپا دیا۔ یہ جھونپڑا پہاڑی ابھار کے دوسری طرف تھا۔ نائیبن کو چھپانے کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ پودا دھوپ میں کتنی دیر رہتا ہے، اس کو پانی دینے کا طریقہ کیا ہے اور دن میں کتنی بار پانی دیا جاتا ہے اور اس وقت ہوا میں نمی کا تناسب کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہ کر سکا۔ اس نے پودے اگانے والے نوجوان جوڑے سے تبادلہ خیالات بھی کیا لیکن ان کی الجھن پیدا کرنے والی وضاحتوں کی وجہ سے اسے کوئی خاطر خواہ معلومات نہ مل سکیں۔ البتہ اس نے یہ سمجھا کہ وہ کچھ معاملات کے بارے میں دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے ضرورت محسوس کی کہ ان کو کاشت کرنے کا طریقہ افشاء کرنے اور اس میں سے راز بے پردہ کرنے کیلئے آرڈیننس منظور کرایا جانا چاہیے۔ مسٹر کو، جو اپنی بیماری سے شفایابی کیلئے پودوں کی کالونی کے نزدیک رہائش پذیر تھا اور اس پودے کی پوری تاریخ مرتب کر رہا تھا، کے ساتھ بھی اس کی ملاقات ناخوشگوار رہی۔ اس آدمی نے بتایا کہ وہ تقریباً شروع سے ہی کالونی کے قریب رہ رہا ہے اور اس نے اس پودے کی ہر قسم کی پیدائش اور پیداوار ریکارڈ کی ہے لیکن بجائے اس کے کہ اسے اس نمایاں حیثیت کے حامل نباتات پر ان کے ساتھ بات کر کے عزت اور احترام کا احساس ہوتا، اس نے ہر قدم پر اس کی ریسرچ میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے چنانچہ مسٹر کے نے فیصلہ کیا کہ اب پودوں کی کالونی دیکھنے کا بالکل کوئی فائدہ نہیں ہے۔

کسی نایاب پودے کی دریافت ان دونوں کوئی عام واقعہ نہ تھا۔ یہ حقیقت کہ کیو **Kew** گارڈنز، جو برٹش رائل بوٹینیکل گارڈن ہے، کی اشاعت انڈیکس کیوونسز کی جلدیں پتلی ہوتی جا رہی ہیں اور اس کی اشاعت کا وقفہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ اب نئے پودوں کی دریافت کا کام کافی حد تک سرد پڑ چکا ہے۔ انڈیکس کیوونسز کے بارے میں سوچ کر اس کا دل اچھلنے لگتا تھا جیسے وہ ایک بار پھر نوجوان دانشور بن گیا ہو۔ وہ اس وقت تیس سال کا تھا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا مقالہ انڈیکس کیوونسز میں شائع ہو جائے۔

مسٹر کے نے سب سے پہلے **ونڈ کرانسنتھیم** کا نام کسی شہر میں پھولوں کی دکان

کے مالک سے سنا تھا۔ وہ اس شہر میں ایک لیکچر دینے کے سلسلے میں گیا تھا۔ جب اس نے دکان کے ایک کونے میں پڑے ہوئے آدھے فٹ قد کے اس پودے کو دیکھا اور اس کی دل لبھانے والی خوشبو سونگھی تو فوراً ہی جان گیا کہ یہی وہ نایاب پودا ہے جو دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں اگتا۔ اپنی خوشی اور مسرت کو دباتے ہوئے اس نے دکاندار سے اس پودے کا نام اور اسے حاصل کرنے کا ذریعہ دریافت کیا۔ اس کے جواب میں اس تاجر نے بتایا تھا کہ پہاڑوں پر رہنے والے لوگ لاتے ہیں۔ اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس کے ساتھ تین گملے خریدنے کی بات کرلے تو وہ اچھی خاصی رعایت کردے گا۔ پروفیسر نے تینوں پودے خریدے اور ساری مصروفیات منسوخ کر کے گھر واپس آ گیا۔ گھر پر اس نے محسوس کیا کہ پھولوں نے اس کے اندر جذبات ابھارنے اور بھولی بسری یادیں تازہ کرنے کی خصوصی طاقت پیدا کردی ہے۔ اسے اپنی بیوی کی جذبوں سے بھرپور مسکراہٹ یاد آ گئی جسے تقریباً ایک دہائی پہلے وہ کھو چکا تھا۔ وہ اپنے سفید بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سسکنے لگا اور موسم بہار کے اس سہانے دن کو یاد کرنے لگا جب اس نے اور اس کی بیوی، جو اس وقت نئی نویلی دلہن تھی، نے اکٹھے سیر کی تھی۔

اس سے پہلے وہ ایک دانشور کے طور پر اپنی پہچان بنا چکا تھا اور اس حوالے سے مستحکم ہو چکا تھا۔ وہ نایاب اور نادر پودوں پر ریسرچ کا کام کرتا تھا اور مسلسل تین مدت کے لئے اپنے ملک کے ایک بڑے اور اہم نباتاتی باغ کے ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دے چکا تھا۔ اس نے جو نئی تحقیق کی بہت سی صنعتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا چنانچہ اس کی دانشورانہ کامیابیوں کا اسے اچھا خاصہ معاوضہ بھی ملا۔ اتنے غیر اہم نظر آنے والے پھول اسے اتنی طاقت کے ساتھ متاثر کریں گے، یہ جان کر وہ حیران رہ گیا۔ بعض اوقات وہ خود کو اپنے کھلے سے باغ کے بیچوں بیچ پاتا اور وہاں بیٹھا بچپن کی یادیں تازہ کرتا رہتا۔ اس کا باغ جو قیمتی پیڑوں، پھولوں اور پودوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس چھوٹے سے خودرو گھاس کی طرح کے پھول نے ان سب کی اہمت ختم کردی تھی۔ اس طرح مسٹر کے نے اس پھول کو اپنے آخری برسوں میں مقدر کے پھول کے طور پر چنا اور خود کلامی کے انداز میں کہا ''ہاں یہ میری آخری کامیابی ہوگی''۔

اس پودے کا تجسس میں مبتلا کر دینے والا اسرار طشت از بام کرنے کی اس کی شدید خواہش اسے راتوں کو سونے نہیں دیتی تھی۔ مرنے اور اپنی بیوی اور رشتے داروں کے پاس جانے سے پہلے وہ اس پودے کو اپنا نام دینا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس پروجیکٹ میں اس کی کامیابی اس کی زندگی کی ایک

بڑی ناکامی کی تلافی کر دے گی۔اس ناکامی کی یاد اب بھی اس کے دل پر چرکے لگاتی تھی۔ جب وہ جوان تھا وہ ایک نادر پودے کو اپنا نام دیتے دیتے رہ گیا تھا۔ یہ ایک پودا تھا جس کو عام طور پر آرے کے دندانوں والا پہاڑی پودا کہا جاتا تھا۔اس نے اس پودے کے مطالعہ پر کئی برس صرف کئے تھے اور اس پر ایک طویل مقالہ مکمل کیا تھا لیکن جب وہ اسے ایک دانشورانہ مضامین والے رسالے میں بھیجنے والا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک جاپانی نباتات دان نے پہلے ہی اس پر ایک تحقیقی مضمون لکھ ڈالا تھا۔اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔

کرائسنتھیمم مونٹو اوسم کے جی بی! وہ اس پودے کو یہی نام دینے والا تھا۔اس نام کے پہلے حرف یقیناً اس کے نام کا مخفف تھے۔اسے ایک لمحے کیلئے بھی کبھی یہ شک نہیں ہوا کہ اس نے یہ پودا ایجاد نہیں کیا لیکن وہ پہلا محقق ہے جس نے اس کی حقیقی قدر کا ادراک کیا ہے اس لئے وہی مستحق ہے کہ اس کے نام پر پودے کا نام رکھا جائے۔اس نے اس کا نام **کرائسنتھیمم** بانٹی Chrysanthemum banti رکھنے کے بارے میں بھی سوچا، واضح کرنے کیلئے کہ یہ پھول ہوا میں بہتر طور پر کھلتا ہے لیکن اس نے اس نام کو پھول کے ممکنہ ناموں کی فہرست میں سے نکال دیا کیونکہ اس نام سے لوگوں کو اس نوجوان جوڑے کی یاد آ جاتی تھی جس کا اصرار تھا کہ انہوں نے یہ پودا ایجاد کیا ہے۔اس پودے کے نباتاتی نام کو اس نوجوان جوڑے کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہ ہوگا۔ یہ اس کی حتمی رائے تھی کہ نباتاتی نام کسی مصدقہ محقق کے نام پر رکھے جانے چاہئیں۔اگر چہ چند نکات ابھی وضاحت طلب تھے اور ان کو واضح کرنا ضروری تھا، پھر بھی اس نے جلدی جلدی میں اپنی ریسرچ مکمل کی اور جرنل آف الپائن پلانٹس کی جلد 45 شمارہ نمبر 2 میں شائع کرا دی۔

مسٹر ایل کو **ونڈ کرائسنتھیمم** میں اس وقت دلچسپی پیدا ہوئی جب انہیں پتہ چلا کہ مسٹر کے اس پر کام کر رہا ہے۔اس وقت تک یہ پھول کافی جانا پہچانا بن چکا تھا لہٰذا وہ اس کے بارے میں کافی معلومات اکٹھی کر سکتا تھا۔مسٹر ایل مسٹر کے کو ایک ٹیومر قرار دیتے تھے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ مسٹر کے کے سنجیدہ رویے اور اس حتمی رائے کہ ہر معاملے میں وہی درست ہیں، کی حمایت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ ایک ہی استاد کے شاگرد ہونے کے باوجود وہ کئی برسوں سے ایک دوسرے سے دور ہیں لیکن ایک وہ وقت بھی تھا کہ وہ قریبی دوست تھے اور مل کر کام کرتے تھے۔انہوں

MashalBooks.com

نے کئی منصوبوں پر اکٹھے بھی کام کیا۔لیکن جب سے مسٹرایل نے مسٹر کے کی طرف سے ٹیل فرن کے مختلف اقسام کی نسلوں کی درجہ بندی کے بارے میں سوالات اٹھائے تھے ان کی دوستی دشمنی میں بدل گئی تھی۔ یادرہے کہ ٹیل فرن کا پودا ایشیاء کے مختلف خطوں میں پایا جاتا ہے۔ مسٹرایل البتہ اپنے معاملات میں اتنے مصروف تھے کہ وہ اس کے اٹھائے گئے سوالوں کی جواب کی صورت میں وضاحت نہ کر سکے۔ وہ مسٹر کے کی طرح کے دانشوروں کو نفرت کے قابل سمجھتے تھے جو اپنا وقت حقیقی ریسرچ پر ضائع کرتے تھے اور جن کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کا نام پودوں کے نباتاتی ناموں کے ساتھ جڑ جائے۔ اپنی جوانی میں مسٹر ایل کی خواہش تھی کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر ایک فوجی کے طور پر اپنا کیریئر بنائے گا، اپنے والد اور چچا کی طرح، لیکن پھر ہوا یہ کہ سکول میں فٹ بال کھیلتے ہوئے وہ اپنا بازو تڑوا بیٹھا اس طرح اسے فوجی کیریئر سے دستبردار ہو کر تعلیمی شعبے کو اپنانا پڑا۔ البتہ اس کے عزائم اب بھی ذاتی شجاعت اور اعلیٰ شہرت حاصل کرنے کیلئے ہیں اور لیبارٹریوں میں اور پھولوں کے ساتھ کام کرنے کے نہیں ہیں چنانچہ پھولوں کے بارے میں اس کی سوچ مسٹر کے کی سوچ سے یکسر مختلف ہے۔

نباتاتی تحقیق کے تجارتی استعمال کو بڑھاوا دینے کیلئے قائم سوسائٹی، قومی پھولوں والے پودوں کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کیلئے قائم کواپریٹو اور فیئر بوٹینیکل پریکٹسز کے ایڈوائزر کے طور پر مسٹر ایل کو مطلع کیا گیا کہ **ونڈ کرائسنتھیم** نامی پودا بہت سے گمبھیر مسائل کو جنم دے رہا ہے۔ ان آرگنائزیشنوں نے نہ صرف اسے مسائل سے آگاہ کیا بلکہ ان کو حل کرنے کیلئے ضروری ریسرچ کی خاطر گرانٹیں فراہم کرنے کی پیشکش بھی کی۔ ان تنظیموں کو معلوم تھا کہ مسٹر کے ایک وطن پرست اور گرم جوشی دکھانے والے آدمی ہیں اور مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مسٹرایل نے ایک مشترکہ ریسرچ ٹیم تشکیل دی اور اس پودے کی تمام جہتوں سے متعلق معلومات مسٹر کے سے پہلے اور جلدی معلوم کرنے کی کوشش کی یعنی پودے کے لئے ضروری ماحول کیا ہے اور اس کی خصوصیات کیا ہیں، یہ سب کچھ پتہ چلانے کی کوشش کی۔ انہیں پتہ چلا کہ ایک ناپختہ محقق، جس سے اس نے ان پودوں کی کالونی میں ملاقات کی تھی، اس کے پاس پودے کے بارے میں قابل قدر معلومات ہیں۔

اسے فوراً اس شخص پر شک گزرا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس شخص کی بیماری محض ایک بہانہ ہے اور یہ کہ اس کا پھولوں سے محبت کر بیٹھنا ایک عمدہ مختصر افسانہ ہے۔ پھر بھی مسٹرایل کو تو اس شخص کا مرتب

MashalBooks.com

کردہ وہ ایک ایک دن کا ریکارڈ درکار تھا جو پودے کی تمام اقسام کے منبع اور پیدائش کے عمل کے بارے میں تھا۔ ریسرچ کے طریق کار کی درستی کی رفتار کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے مسٹرایل نے اپنے نائبین کو پودوں کے کالونی میں بھیجا تا کہ وہ اس شخص سے اتنی زیادہ معلومات حاصل کر سکیں، جتنی ممکن ہو اور اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بہت سے خطوط لکھوائے جن میں اس شخص کو بہت سی ایسی پیشکش کی گئی تھیں جو مسٹرایل کے خیال میں اس شخص کیلئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھیں۔ اس نے اس شخص سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی کم بلندی کی بیماری کا دریافت کردہ علاج کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے میں اس کی مدد کرے گا اور اس کی کتاب شائع کرنے کیلئے سرمایہ بھی مہیا کرے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اس کی ٹیم مقررہ مدت کے اختتام تک قابل اطمینان نتائج حاصل نہ کر سکی تو انہیں اس شخص کے علم سے استفادہ کرنا پڑے گا۔

مسٹرایل نے اس بات کا بالکل خیال نہ رکھا کہ اس پودے کو کون سا نباتاتی نام دیا جانا چاہیے بلکہ یہ خبر سن کر کہ مسٹر کے اس کا نام **کرائسنتھیمم** مونٹوسم کے جی بی رکھنے جا رہے ہیں، انہوں نے بس یہی سوچا کہ انہیں ایسا نہیں ہونے دینا ہے۔ اس نام سے یقیناً یہ غلط فہمی جنم لے گی کہ یہ پودا پرانے سوویت یونین کے کسی قید خانے میں ایجاد کیا گیا۔ مسٹرایل کا خیال تھا کہ **کرائسنتھیمم** مونٹوسم کے جی بی کی بجائے اس کا نام **کرائسنتھیمم** کوریانم، زیادہ بہتر رہے گا۔ یقیناً اس بات کا سو فیصد امکان موجود تھا کہ اگر اس کی مرضی کے مطابق نتائج حاصل ہوئے تو پھر پودے کے نباتاتی نام کے ساتھ وہ اپنا نام نتھی کرنے کی بھی کوشش کرے گا۔ لیکن جہاں وطن سے محبت کا معاملہ ہوتا تو وہ نہایت مخلص اور محبِّ وطن ہوتا تھا بلکہ اپنی نفی کر کے وطن کی محبت کا اظہار کرنا اسے زیادہ اچھا لگتا تھا۔

اس سوچ کے تحت کہ انہوں نے جس نام کا فیصلہ کیا ہے وہ اختیار کر لیا جائے گا انہوں نے اس پودے کو نادر پھولوں کے قومی مقابلے اور الپائن پودوں کی خصوصی نمائش میں شامل کرنے کی بھی اجازت دے دی تا کہ ان پودوں کو زیادہ مشہور اور زیادہ معروف بنایا جا سکے۔ ان دونوں تقریبات میں وہ خود ریفری تھے۔ اور اس پودے پر مقالہ لکھنے کیلئے اپنی تحقیق مکمل کرنے سے پہلے ہی اس نے 78 ویں انٹرنیشنل پلانٹ جیوگرافی کنونشن کے منتظمین کو لکھا کہ وہ اس کنونشن میں ایک نادر اور نایاب پودے کے ساتھ شرکت کریں گے۔

کرائسنتھیمم مونٹوسم کے جی بی، **کرائسنتھیمم** کوریانم، مسٹرایم نے اپنی داڑھی،

MashalBooks.com

جو انہوں نے تین روز سے صاف نہیں کی تھی، صاف کرتے ہوئے بڑے حقارت آمیز لہجے میں دونوں ناموں کا ورد کیا۔ ڈاڑھی صاف ہوگئی اور اس کی مصنوعی ہنسی واضح ہوگئی۔ کوئی بھی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے مسٹر ایم ڈاڑھی ضرور صاف کیا کرتے تھے۔ جونہی اس نے شیو ختم کی اپنی ریسرچ لیب اسسٹنٹ کو طلب کر لیا، یہ معلوم کرنے کیلئے کہ انہوں نے کچھ تلاش کیا یا نہیں۔ لیکن اس کے نائیبن نے وہی لگا بندھا جواب دیا کہ انہیں کوئی قابل قدر چیز نہیں ملی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی لیبارٹری میں جو پرانی مشینیں پڑی ہوئی ہیں ان سے کسی حیرت ناک انکشاف کی توقع کرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن وہ محض یہ نہ سمجھ سکا کہ اس کی لیبارٹری میں کام کرنے والے جو بھی تجزیہ کرتے ہیں اس میں یہ نادر پودا **کرائسنتھیمم** کے عام گروہ سے تعلق رکھتا نظر آتا تھا۔ پھر اس نے اس کمپنی کو ایک اور فون کیا جو اس پودے کے صنعتی استعمال میں دلچسپی دکھا رہی تھی۔ یہ خبر سن کر کہ جن مالکانہ حقوق کے حصول کیلئے وہ سر توڑ کوشش کر رہا تھا، وہ نہیں دیئے گئے، اس نے سوچا کہ اس کے سامنے جو دو متبادل راستے ہیں اسے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ مسٹر ایم نباتات کا کوئی سرکردہ سکالر نہیں تھا نہ ہی ایسا بننے کی اس کی کوئی خواہش تھی۔ انہیں اس چیز سے بھی کوئی غرض نہ تھی کہ مسٹر ایل، جن کا تعلق اس قصبے سے تھا جس سے مسٹر ایم کا تھا اور مسٹر کے جو اسے ہمیشہ نامعتبر قرار دیتا تھا اور دیگر ماہرین نباتات جیسے کہ مسٹر این، مسٹر او اور مسٹر پی، پودے کے مطالعہ میں لگے ہوئے ہیں جو کہ اس پورے عشرے کا سب سے بڑا خبط قرار دیا جا سکتا تھا۔

یہ بات درست ہے کہ مسٹر ایل، جو اپنے گاؤں کے لوگوں کے سامنے ایسا طرز عمل دکھاتے تھے جیسے وہ شاہی خاندان کے فرد ہوں، نے اپنا کام جاری رکھا لیکن اس پودے کو اپنی مرضی کا نام دینے کی خواہش کے پیچھے اصل وجہ وہ فائدہ تھا جو مختلف نوعیت کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے کی صورت میں اسے ملنا تھا۔ اس کا مطلب تھا رقم اور پیسہ، اس طرح وہ ایک بالکل نئی لیبارٹری بنا سکتا تھا۔ اس خواہش نے اسے اس دوڑ میں شامل ہونے پر آمادہ کیا تھا۔

وہ ایک ایسا آدمی تھا جو بہت آگے کی سوچ سکتا تھا۔ اس کی نظروں میں مسٹر ایل کے اندر ہیروازم کا نہایت تیز جذبہ اور امنگ تھی چنانچہ وہ بہت بے کار اور گھمنڈی ہیں اور اپنے رازوں کی حفاظت کے معاملے میں ناقابل بھروسہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ جہاں تک مسٹر کے کا تعلق ہے تو وہ حد سے زیادہ مغرور ہیں لیکن مسٹر ایم جانتا تھا کہ مسٹر کے کی جھوٹی تعریف اور خوشامد کر کے وہ ایسی جوڑ توڑ کر سکتے ہیں کہ

وہ مسٹرایل کے خلاف اس کی طرف سے لڑے اور مقابلہ کرے۔

اپنی ظاہر حالت کے بارے میں دقیقہ رس ہونے کی وجہ سے مسٹرایم آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے جینز کے بنے ہوئے پاجامے اور کاٹن کی ٹی شرٹیں چیک کرتے رہے۔ وہ معمول کا لباس پہنتے کیونکہ وہ پودے اگانے والوں سے مختلف نظر نہیں آنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ذہن میں اس سکرپٹ کی ریہرسل کی جو انہوں نے بڑی احتیاط سے تیار کیا تھا۔ کیا یہ ان کا تخیل تھا کہ وہ سوچتے تھے کہ اس پودے کے اگانے والے اور ان کے پڑوسی جن کے غیر مقامی باشندوں کے بارے میں دشمنی بدنامی کی حد تک مشہور تھی، اس کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے؟ وہ ایسا نہیں سوچتا تھا۔ اسے اپنی دوسروں کو متوجہ کر لینے والی ظاہری حالت اور اپنی ڈپلومیٹک صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔

وہ اس پودے کے اگانے والوں کو ایک ڈیل تجویز کرنے جا رہا تھا۔ اگر وہ اس کو اس کی مطلوبہ معلومات دے دیں تو وہ اس پودے کا ان کی پسند کا نام منظور کرا لے گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس مقصد کیلئے کسی بھی دوسرے شخص سے پہلے اپنا مقالہ مکمل کرے گا۔ اس کے پاس نفع بخش کاروباری تحویل کے حوالے سے بھی پوری تفصیلات موجود تھیں جن میں منافع میں حصہ داری اور دیگر پیچیدہ امور شامل تھے، جو اس نے اس سادہ لوح جوڑے کو پیش کرنا تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں اس پھول کا مسٹر کے اور مسٹرایل کے زیر غور ناموں سے زیادہ خوبصورت نام موجود تھا۔ مسٹر کے اور مسٹرایل کے ذہنوں میں کلبلانے والے نام باہر آ چکے تھے اور اس کیلئے فائدہ مند ثابت ہو رہے تھے۔ **کرائسنتھیمم** مونٹوسم بینٹی فیرم (Chrysanthemum bantipherum) ہوا کو آغوش میں لئے ہوئے، **کرائسنتھیمم** کیسا شاعرانہ اونچے پہاڑوں سے تعلق رکھنے والا نام ہے۔ اگر اس پھول کو اگانے والوں کو پھولوں کی ڈیٹا میں پائی جانے والی خوبصورت کی ہلکی سی جھلملاہٹ بھی مل گئی ہے تو یہ نام ان پر وجد طاری کر دے گا یا اگر وہ اس پھول کے عرفی نام قطب شمالی کا پھول، کو ہی اپنے دل سے لگائے ہوئے ہیں تو پھر وہ اس پھول کو **کرائسنتھیمم** آرکٹکم (Chrysanthemum arcticum) کا نام دینے کو بھی تیار تھا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہ نوجوان عورت جس نے اس پھول کو تخلیق کیا ہے اسے سب "سبز ہاتھ" کہہ کر بلاتے ہیں۔ ٹھیک ہے تب اس پھول کا نام **کرائسنتھیمم** آزوریم (Chrysanthemum Azureum) رکھا جا سکتا تھا۔ یہ بھی اتنا برا نباتاتی نام نہ تھا۔ اس نے

MashalBooks.com

اپنی کار سٹارٹ کی۔

''بائی! کیا قطب شمالی یہاں سے بہت دور ہے؟''

''ہاں بہت دور ہے''۔

''اگر ہم اپنی گاڑی کی ٹینکی بھر لیں تو وہاں تک پہنچ سکتے ہیں؟''

''ہاں، ہمیں وہاں جانے کیلئے ایک بیڑے کی ضرورت پڑے گی''۔

''پھر ہمیں کشتی کھینا سیکھ لینا چاہیے تھا''۔

''ہاں''

''کیا سمندر ہماری کشتی چھین نہیں لے گا؟''

''نہیں ایسا نہیں ہوگا بشرطیکہ ہم کسی طوفانی دن کو سمندر پار کریں، تم جانتی ہو کہ بادلوں کی چمک میں بجلی ہوتی ہے''۔

''تمہارے خیال میں قطب شمالی پر پھول کھل سکیں گے؟''

''یقیناً! میں نے ایسی تصویریں دیکھ رکھی ہیں جن میں قطب شمالی پر پھول اگے ہوئے تھے؟

''بائی! جب ہم قطب شمالی چلے جائیں گے تو پھر ہم اپنے پھول کو **ونڈ کرائسنتھیمم** نہیں کہیں گے، ہم اسے قطب شمالی کا پھول پکاریں گے''۔

''ہاں اگر تم پسند کروگی تو ہم اسے اسی نام سے پکاریں گے''۔

ونڈ کرائسنتھیمم کی موت

اگر یہ غیر متوقع صورتحال سامنے نہ آجاتی تو **ونڈ کرائسنتھیمم** کے نباتاتی نام کے سلسلے میں مقابلہ بہت طول پکڑ چکا ہوتا اور زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن کچھ ایسا ہوا کہ یہ مقابلے بازی ختم ہو گئی۔ اس نئی صورتحال کے بارے میں سب سے پہلے مسٹر ایل کو پتا چلا۔ اسے انٹرنیشنل پلانٹ جیوگرافی کنونشن کے انتظام کاروں کی جانب سے استرداد کا خط موصول ہو۔ اس کنونشن کو اس نے خط لکھا تھا کہ وہ ایک مقالہ لے کر اس کنونشن میں شرکت کرنا چاہتا ہے۔ اس خط میں کہا گیا تھا۔

ہمیں آپ کو یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ جس نادر پودے کے بارے میں آپ نے

مقالہ پڑھنے کی پیشکش کی تھی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق اس کے حوالے سے ایک رپورٹ نیو جرنل آف باٹنی جلد 37، شمارہ نمبر 2 میں پہلے ہی شائع ہو چکی ہے اور اس پودے کا مصدقہ نباتاتی نام "**ونڈ کرائسنتھیمم** کوریانم" رکھا گیا ہے۔

جونہی اس نے یہ خط، جس پر رپورٹ تیار کرنے والے مصنف کا نام درج نہیں تھا، موصول کیا، مسٹر ایل نے ایک دم فرض کر لیا کہ اس کا مصنف مسٹر کے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے مسٹر کے سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے بعد زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے وہی رسالہ اپنے خطوط والے بکس میں پڑا ملا۔ یہ رسالہ کسی نامعلوم شخص نے بھجوایا تھا۔ رسالہ لفافے میں سے نکالنے کے بعد اس نے فہرست پر نظر ڈالی۔ این اپروچ ٹو بائیولوجیکل کریکٹر آف **کرائسنتھیمم** ملٹی اوڈورم باپا" مصنف مسٹر کے نہیں بلکہ کوئی مسٹر اے تھا، یہ نام اس نے پہلی بار پڑھا تھا کیونکہ وہ اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس رسالے میں حصہ لینے والوں کی فہرست میں مسٹر اے کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئی تھیں، اس کے علاوہ وہ کوریا میں ایک مخصوص صوبائی یونیورسٹی کے ساتھ بھی منسلک تھا۔ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے شہ سوار کی طرح مسٹر ایل بھی فوری طور پر نتیجہ تک پہنچ گئے۔ اس مقالہ کے مصنف نے اس پودے کیلئے نباتاتی نام "**کرائسنتھیمم** ملٹی اوڈوریم باپا" رکھا تھا جس کا مطلب تھا باپا **کرائسنتھیمم**، متفرق خوشبوؤں کے ساتھ۔ مسٹر ایل میں اتنی برداشت نہ تھی کہ وہ یہ پڑھ سکے کہ مصنف نے اس کا یہ نام کیوں رکھا ہے چنانچہ اس نے وہ میگزین فرش پر دے مارا اور پھر وہاں سے اٹھا کر اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

اسی لمحے مسٹر کے اس رسالے میں مضمون دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے جو اس نے خریدا تھا۔ اس کا چہرہ اس سفید رنگ کے کاغذ کی طرح ہو گیا تھا جس پر پیلے رنگ کا بجلی کا بلب جلایا گیا ہو۔ اس وقت اس کے کافی کی میز پر پڑے ہوئے **ونڈ کرائسنتھیمم** کو موسم بہار کی ہوا سہلا کر گزری اور ایک تیز خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی۔ حیرت انگیز طور پر اس روز خوشبو کی وجہ سے نہ صرف اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی بلکہ اس سے اسے زکام کی شکایت بھی ہونے لگی۔ آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو لئے اس نے برق رفتاری سے پورے مقالہ کو کھنگال مارا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس روز اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو **کرائسنتھیمم** کی مہک کی وجہ سے چھا جانے والے بے نام حزن

کے باعث تھے، جو اس پر اکثر چھا جاتا تھا، یا اس کی وجہ غصہ تھا۔ مضمون کا آغاز بالکل اس کے اس مضمون جیسا تھا جو ایک مقامی رسالے میں چھپا تھا۔ یہ غیر اہم شخص کون ہو سکتا تھا؟ ملک کے سبھی ماہرین نباتات کو تو وہ جانتا تھا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ اس مقالہ میں ان سوالات کے جواب موجود ہیں جن کا جواب تلاش کرنے میں وہ ناکام رہا تھا، اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ مسٹر اے کوئی چربہ ساز ہے۔ ایک مسکن دوا استعمال کرنے کے بعد اس نے بڑی غمگین نظروں سے اپنے باغ کا سروے کیا۔ اس کی عادت بن گئی تھی کہ جب بھی کوئی چیز یا کوئی معاملہ اسے پریشان کرتا تھا تو وہ کوئی مسکن دوا لے لیتا تھا۔ کیا اسے یہ دوسری ناکامی تسلیم کر لینی چاہیے؟ یا اسے اس سے انکار کرنے کیلئے ہر حربہ آزمانا چاہیے؟

مسٹر ایم کا ردعمل دوسروں سے مختلف تھا۔ سب سے پہلے تو وہ ایک خوش اندیش تھا اور دوسروں کے مقابلے میں اس معاملے میں بہت کم حساس تھا۔ اس نے ایک غیر متوقع مقالے کی وجہ سے خود کو دل گرفتہ نہ ہونے دیا۔ نہ ہی وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ اس کے دل میں جو منافع بخش منصوبے تھے ان کو ترک کر دیتا۔ جن کے حوالے سے وہ خود کو تیار کر چکا تھا۔ اس نے اس رپورٹ کے اثرات کو ختم کرنے کیلئے ضروری معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ اسی پر اسکی لیبارٹری اور وہاں کام کرنے والے درجن بھر سٹاف کے مستقبل کا انحصار تھا۔ اس روز بھی اس نے صبح کے وقت کوئی درجن بھر فون کالیں کی ہوں گی۔ یہ فون کالیں سماجی رابطے کے حوالے سے تھیں تاکہ ان لوگوں کے ساتھ تعلق مضبوط ہو جو کسی نہ کسی طور اس کے کام آسکتے ہیں۔ اس نے اپنے اس روزمرہ کے معمول میں کبھی ناغہ نہیں کیا ماسوائے اس کا کہ وہ بہت زیادہ بیمار ہو گیا ہو۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ اس مسٹر اے کا پتہ چلاؤ۔ اس نے سوچا کہ مسٹر کے اور مسٹر ایل اس کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے اس کے باوجود اس کے لاشعور نے اسے اپنے ان مخالفین سے بات کرنے سے روکے رکھا۔ پہلے سے زیادہ احتیاط کے ساتھ اپنی داڑھی مونڈتے ہوئے مسٹر ایم اپنے ذہن میں مختلف منصوبے بناتا رہا۔

پھر ایک حیرت انگیز منصوبہ اس کے ذہن میں آیا۔ مسٹر ایم فوراً اپنے مطالعہ کے کمرے کی طرف اس حالت میں بھاگے کہ شیور ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنی فائلوں والی الماری سے ایک بڑی فائل نکالی اور اس پودے سے متعلق معلومات کا جائزہ لینے لگا۔ جب اس نے کافی اعداد و شمار پڑھ لئے تو پھر اسے کالیں آنا شروع ہو گئیں اور اسے مسٹر اے کے متعلق بتایا جانے لگا۔ فون کرنے

MashalBooks.com

والوں نے مسٹرایم کو جب یہ بتایا کہ مسٹر کے اور مسٹرایل نے بھی ان سے مسٹراے کے متعلق بتانے کیلئے کہا ہے تو مسٹرایم مسٹرایل اور مسٹر کے غضب ناک اور مایوس چہروں کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا لیکن وہ درد جس سے اس کے مخالفین یقیناً متاثر ہوتے تھے، اس کیلئے خوشی کا باعث نہ تھا جیسے وہ دونوں محسوس کرتے تھے۔ اسے مسٹراے کے بارے میں جو معلومات ملیں وہ اس کی ذات اور شخصیت کے بارے میں تھیں اس حوالے سے معلومات بہت کم تھی کہ اس نے پودے کے بارے میں اعداد و شمار کہاں سے حاصل کے اور وہ اس نتیجے پر کیسے پہنچا۔ البتہ اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو یہ بات پتا چلی کہ مسٹر نے نیو جرنل آف بائیالوجی کو یہ مقالہ خود جمع نہیں کرایا بلکہ اس نے اپنے ایک ڈچ دوست کو یہ مقالہ اس کی ذاتی رائے حاصل کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ یہ شخص اس کا دوست اس وقت بنا تھا جب وہ ایمسٹرڈیم یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اس دوست نے مقالہ اس رسالے کو بھجوا دیا۔ اس کے ہر معلومات فراہم کرنے والے نے اسے ایسی معلومات دی تھیں ہر جزو کے طور پر دوسرے سے مختلف تھیں چنانچہ مسٹرایم کسی قدر کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن ایک چیز اس کے سامنے نہایت واضح ہو گئی کہ بچاؤ کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسٹر کے اور مسٹرایل کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔

معلومات اکٹھی کرنے کے سلسلے میں اپنے طرز عمل اور رویے کے برعکس اب مسٹرایم مسٹر اے سے متعلق حقائق نہایت تحمل کے ساتھ سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ نوٹس بھی لے رہے تھے۔ اس کو معلومات فراہم کرنے والے تمام ہی افراد کا خیال تھا کہ مسٹراے کسی طور کوئی اہم آدمی نہیں ہے۔ حاصل کردہ معلومات سے مسٹرایم نے مسٹراے کی درج ذیل تصویر بنائی۔

مسٹراے کا قد پانچ فٹ نو انچ ہے اور وزن ایک سو چالیس پونڈ ہے۔ اس کی شہرت معتدل مزاج اور قابل بھروسہ آدمی کی ہے اور ذاتی نمائش کا قائل نہیں ہے۔ دیگر ماہرین نباتات کی طرح وہ بھی سفر کرنا پسند کرتا ہے۔ اس کے والدین محدود پیمانے پر سور پالتے تھے چنانچہ جب وہ جوان ہوا تو حالات اچھے نہ تھے۔ اس نے سکالرشپ پر ایمسٹرڈیم میں دو سال تعلیم حاصل کی اور جب سے وہ بیرون ملک سے واپس آیا تھا ضلع سی میں اپنی مادر علمی میں ہی پڑھا رہا تھا۔ اس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں اور اس نے اپنا وقت گھر اور لیبارٹری میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ کسی بھی تعلیمی ایسوسی ایشن کے ساتھ وابستہ نہ تھا اور اس کی سماجی تنظیم میں واحد رکنیت ایکچوئر گولورز سوسائٹی کی تھی۔ اس کی تصنیفات میں ''نباتاتی سائنس کی تاریخ''

MashalBooks.com

کی ضلع میں ڈبل سیڈ لیوڈ(Double seed leaved) لکڑی والے پودوں کی تقسیم اور مختلف رسائل میں درجنوں مضامین شامل ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی قابل قدر توجہ حاصل نہیں کی۔ ان کا تازہ ترین مضمون ''**کرائسنتھیمم** ملٹی اوڈورٹیم'' کے حوالے سے حیاتیاتی رسائی، پھول دار پودوں پر ان کا پہلا مضمون ہے۔

مسٹر کے اور مسٹر ایل کو بھی مسٹر اے کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں ان سے بھی یہی تاثر ابھرتا تھا۔ جونہی کچھ سکون ہوا تو مسٹر کے نے مسٹر اے کو ایک طویل احتجاجی خط لکھا، اصل میں یہ باضابطہ ایک لیکچر تھا جو تعلیمی حوالوں سے لکھی گئی تحریروں میں سخت ایمانداری کی ضرورت کے بارے میں تھا۔ اس نے اپنے سے چھوٹے ساتھی کو بتایا کہ اسے اس کے مقالہ میں آدھی سے زیادہ ان دریافتوں کو شامل کئے جانے پر افسوس ہے، جو اس نے کی تھیں اور جن کو پہلے سے عوامی بنا دیا گیا تھا اور یہ کہ اگر وہ معافی نہیں مانگے گا اور اس سارے معاملے کو درست کرنے کیلئے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کرے گا تو وہ آنے والی نسلوں کی بہتری کے لئے اس معاملے کو عدالت میں لے جائے گا۔ اس نے کوشش کی کہ اس نے اب تک زندگی میں جتنے بھی خطوط لکھے ان کے مقابلے میں یہ خط زیادہ متحرک اور باضابطہ اور بااثر ہو۔ اس نے خط بار بار لکھا تاکہ اس کی تحریر زیادہ پراثر بن جائے اور ان لوگوں کیلئے محرک ثابت ہو سکے جو اس کی موت کے بعد اس خط کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ خط کو لفافے میں ڈالنے سے پہلے اس نے خط کا پورا متن شروع سے آخر تک باآواز بلند پڑھا۔ اسی لمحے **ونڈ کرائسنتھیمم** کی مہک کا ایک جھونکا اس کے پاس سے گزرا جس نے اسے ایک اور خط کی یاد دلا دی جو اس نے پندرہ برس پہلے لکھا تھا لیکن اس کو ڈاک کے حوالے نہیں کیا تھا۔ جھونکے نے اس کی آواز کو شکستہ بنا دیا لیکن اس نے خط کی تحریر پڑھنے کا عمل جاری رکھا۔

مسٹر ایل نے فوجی مارچ کی آواز پوری کھول دی اور وہ اپنے جبڑے اپنے ہاتھوں پر ٹکا کر پورے انہماک سے فوجی مارچ سننے لگا اور پوری طرح محظوظ ہونے لگا۔ ترتیب اور بار بار دہرائے جانے کا حسن۔ کیا؟ **کرائسنتھیمم** ملٹی اوڈریٹیم بابا؟ **کرائسنتھیمم** کوریانم کے مقابلے میں یہ کتنا بے ذوقی پر مبنی اور کوتاہ نظر قسم کا نام ہے۔ یہ شخص یقیناً ایسے افراد میں سے ہے جس نے فوجی مارچ کی دھن کبھی نہیں سنی۔ ملٹری مارچ کے بینڈ کا ڈرم اس کے دل پر بج رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ اسے اپنی جرأت کو

MashalBooks.com

بڑھانا چاہیے ان لوگوں کو پکڑنے اور سزا دینے کیلئے جو تنظیم اور ترتیب کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لیکن یقیناً اگر یہ پوچھا جائے کہ وہ کون سا نظم اور کون سی ترتیب ہے، مسٹر اے نے جس کی خلاف ورزی کی ہے تو اس سے کوئی بھی جواب نہیں بن پڑے گا۔ یہی تلاش کرنے کیلئے وہ بار بار ایک ہی ریکارڈ بجار ہا تھا کیونکہ بار بار دہرانے کے عمل کو وہ حقیقی طور پر بہت پسند کرتا تھا۔

ونڈ کرائسنتھیمم کے مخالف ہوا صحیح معنوں میں ایک طوفان کی طرح شروع ہوئی کیونکہ یہ نہایت ہی غیر معقول اور خلاف عقل تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ آندھی کہاں سے شروع ہوئی۔ اس کے منبع کے بارے میں صحیح صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ یہ متعدد اور متفرق ذریعوں سے ابھری تھی اور سب نے مل کر ایک طوفان سا بپا کر دیا۔ دیگر طوفان کی طرح یہ بھی جب ایک بار ابھرا تو اس میں بھی داخلی سطح پر توانائی پیدا ہوئی۔ اس طوفان نے پورے ملک کو برباد اور مردوں کی روحوں کو الٹ پلٹ کر دیا اور کسی گرد باد کی طرح منٹوں میں صحرا کو صاف اور کارواں کو ریت کا ڈھیر بنا دیا۔ وہ پھول جس نے لوگوں کے ذہنوں میں رومانوی خیالات کو جنم دیا اب اس کے ساتھ عجیب وغریب قسم کی ایسوسی ایشین وابستہ ہو رہی تھیں۔ کتنے خوش نصیب تھے وہ لوگ جن کے ذہنوں میں اس پھول نے رومانوی خیالات ابھارے۔

اس کی سمندری مہک جو پرسکون عکس کا احساس پیدا کرتی تھی، اس کی بادلوں کی سی مہک جو اعصابی جذبوں اور طاقتوں کو ہموار کرتی تھی، اس کی ''ہوبا'' مہلک جو ارفع و اعلیٰ رقاصوں کی موسیقی ابھارتی تھی۔ اب ان تمام کے بارے میں شک ظاہر کیا جا رہا تھا کہ یہ انسانی جسم اور روح پر خطرناک اثرات مرتب کرتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے شبہ ظاہر کیا کہ یہ پھول دراصل گل لالہ کی ایک شکل ہے۔ اس کے ثبوت کے طور پر یہ کیس پیش کیا گیا کہ ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی نے یہ پودا خریدنے کیلئے اپنے والدین کے پیسے چرائے۔ اس کا تنا، پتے، پھول اور جڑیں جو سانس دماغ اور بولیاتی نظام کی خرابیوں کو درست کرنے کیلئے اکسیر مانی جاتی تھیں اب اس شک کی زد میں تھیں کہ اس سے معدے کی اینٹھن، اعصابی تناؤ اور قبض کی شکایات پیدا ہوتی ہیں اور اس وجہ سے لوگوں نے اب اس پودے سے نفرت کرنا شروع کر دی تھی۔ ایک میگزین نے اس ثبوت کے طور پر پودے کے کاشتکاروں کی پرانی اور حالیہ تصویریں بھی شائع کی تھیں کہ **ونڈ کرائسنتھیمم** کی مہک کے بالوں پر منفی اثرات پڑتے ہیں اور وہ جھڑ جاتے ہیں۔ یہ

افواہ پھیلی کہ محکمہ صحت اس پودے کے منفی اثرات کا پتہ چلانے کیلئے مکمل چھان بین کرے گا۔اس تحقیق سے حاصل ہونے والی معلومات پر انحصار کرتے ہوئے پھر اس پودے کا مکمل تجزیہ بھی کیا جانا تھا۔

اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ایک اخبار میں ''اے سٹڈی آف **ونڈ کرائسنتھیمم** کی اشاعت'' پر ایک مضمون شائع ہوا جو ملک کے تین نمایاں ترین ماہرین نباتات نے مشترکہ طور پر لکھا تھا اور اسکا عنوان تھا ''طویل علیحدگیوں کے بعد ایک بامعنی بازدید'' اس مضمون میں عوامی جذبے کی بہترین الفاظ میں تعریف کی گئی تھی جس نے تینوں دانشوروں کو متحرک کیا کہ وہ اپنے اختلافات پر قابو پائیں اور ایک ریسرچ پر مشترکہ طور پر دماغ لڑائیں تا کہ ان تمام نامناسب امیدوں اور فرضی قصے کہانیوں کا خاتمہ کیا جا سکے خبر نے اس پودے کو گھیر رکھا ہے۔اس مضمون میں مسٹر ایل کو یہ کہتے ہوئے نقل کیا گیا ہے:

''اس پودے کے حوالے سے عام لوگوں کی توقعات اور تفکرات اور اس سے پیدا ہونے والے مغالطے کے بارے میں ہمارے خیالات نے ہمیں اکٹھا کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مسائل پیدا کرنے والا پودا بدقسمتی سے امن قائم کرنے کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ یہی کشیدگی کے بعد ہماری مفاہمت کا بھی باعث بنا۔آخر کار مسٹر ایم کا تعلق ہمارے آبائی گاؤں سے ہے اور مسٹر کے اور میں ایک ہی استاد سے اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔

اس مضمون میں ان تینوں سکالرز کی تحقیقی حاصلات کو نصف اول حصے میں شامل کیا گیا تھا اور دوسرے حصے میں متعدد کیسز کو شامل کیا گیا جس میں بتایا گیا کہ لوگ اس پودے سے کون سی خوبصورت اور دل آویز امیدیں اور توقعات باندھے ہوئے تھے۔اس سے کوئی سائنسی ثبوت نہیں مل جاتا کہ ان کی توقعات بے بنیاد تھیں، لیکن اس کتاب اور اس مختصر سے مضمون میں لوگوں کو یہ سمجھانے اور آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ پھول بالکل نقلی تھا اور یہ کہ انہیں دھوکہ دیا جاتا رہا۔مسٹر اے نے ان تینوں کی آراء کے جواب میں ایک مضمون لکھا اور شائع بھی کرایا لیکن یہ عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرا سکا۔البتہ اس پر اس کمپنی سے پرخاش ہونے کا شک ضرور کیا گیا جس نے اس پورے تجارتی پیمانے پر استعمال کے سلسلے میں کافی پیسے صرف کر رکھے تھے۔

اس پودے سے تیار ہونے والی مختلف چیزوں کی فروخت پر پابندی عائد کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، ایسی مصنوعات جو اس کی غیر معمولی شہرت سے لطف حاصل کرنے کیلئے استعمال کی جاتی

MashalBooks.com

تھیں۔ ایک بار تو پرشوق خریداروں نے تقاضا پورا کرانے کیلئے تیار کنندہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ بہت سے مقدمات ایسے تھے جن میں نقلی لوگوں کو ملوث کیا گیا تھا جیسے دل کے مریض یا بال جھڑ جانے کے موروثی مسائل وغیرہ، جن کا **ونڈ کرانسٹتھیم** کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہ تھا چنانچہ اس مقدمات کا نتیجہ یہ پودا پیدا کرنے والوں کے جیل جانے یا ہرجانہ ادا کرنے کی صورت میں نہ نکلا البتہ اس ضلع جہاں پودوں کی کالونی قائم تھی، کے رہائشیوں نے ضلعی ہال کے سامنے ایک پرتشدد احتجاجی مظاہرہ کیا۔ احتجاج کرنے والوں کا مطالبہ تھا کہ کالونی کو ختم کیا جائے۔ ضلعی حاکم انہیں صرف اس صورت منتشر کر سکتا تھا کہ ان سے ان کا مطالبہ پورا کرنے کا وعدہ کرلے۔ اس جگہ پر ایک تفریحی ٹاؤن کا قیام یقینی صورت اختیار کر چکا تھا۔

مخالفت میں شروع ہونیوالے طوفان کے ٹھیک سات ماہ بعد ان پودوں کی کالونی ختم کر دی گئی، پودے کاٹ دیئے گئے اور پھول زمین پر بکھیر دیئے گئے۔ ان پودوں سے متعلق واحد دستیاب مواد انٹرنیشنل جرنل میں چھپنے والا مسٹر اے کا مضمون تھا، جو کبھی کسی مقامی رسالے میں دوبارہ شائع نہ ہوا۔ علاوہ ازیں مسٹر کو کی لکھی گئی کچھ تعریفی نظمیں تھیں۔ مسٹر کو وہی شخص تھا جو کم بلندی والی بیماری سے دوچار تھا اور جو اس پھول کے اگانے والوں کا دوست تھا۔ اس پھول کے بارے میں اس کی کتاب تاریخ میں نباتات کے حوالے سے رونما ہونے والے معجزانہ اور حیرت انگیز واقعات کے مفصل بیان پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب پودے کے خشک پتوں سے بنے کاغذ کی بنی ہوئی تھی اور ان کاغذوں پر پودوں کی پتوں سے کشید کئے گئے جامنی رنگ کی سیاہی سے لکھا گیا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ دھواں بن کر اڑ گیا۔ کیونکہ کسی شخص نے ایک روز یہ کتاب چرالی تھی اور وہ لوگ جن کو تا حال یقین تھا کہ اس پودے میں دماغی امراض کا علاج پوشیدہ ہے، اس پودے کی خشک پتیوں کو گیلا کر کے اس کے سگریٹ بنا کر پی گئے۔

قطب شمالی کی طرف سفر

اس روز گھپ اندھیرا تھا اور رات بڑی طوفانی تھی۔ جرمن موسیقار ویگنز کی ''ٹرسٹان اور آئیسولڈے'' دھن سمندر کے کنارے بنے ایک جھونپڑے میں ایک غیر روشن کمرے کی کھلی کھڑکی سے باہر گونج رہی تھی۔ آدمی کھلی کھڑکی کی دہلیز پر بیٹھا خلیج کے خدوخال پر نظریں گاڑے ہوئے تھا جو وقفے وقفے سے چمکنے والی آسمانی بجلی کے باعث روشن ہو جاتے تھے۔ وہ مہیب طوفان سے خوفزدہ نظر نہیں آتا

MashalBooks.com

تھا، یہ دوگانا اپنے المناک انجام کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے اس طوفان کو لوری دے رہا ہو۔ یہ ایک محبت بھرا دوگانا تھا۔

اے شام محبت، ہم پر اتر آ
اور ہمیں اپنی آغوش میں لے لے
ہم زندہ ہیں یہ ہمیں بھلا دے
اس دنیا سے ہمیں نجات دلا دے

ساحل پر ایک ٹرک ڈگمگاتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ مشرق کی طرف سے آیا تھا اور ساحل سمندر کی پٹی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی بھوت پریت کی طرح نظر آنے والی ہیڈ لائٹ طوفان میں گزر رہی تھی۔ پھر ٹرک ساحل پر رک گیا۔

''مقدس شفق کے دُگے کچھ ہونے کا فرحت انگیز احساس واہموں کے خوف کو ختم کر دیتا ہے، ہمیں دنیا کی پریشانیوں سے آزاد کرتے ہوئے'' گانا جاری تھا۔

دونوں سائے ٹرک کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں نہائے سمندر تک پہنچے، جس کی لہریں، سفید فراز اندھیرے میں لہرا رہے تھے۔ کھڑکی میں بیٹھے ہوئے شخص نے ان دونوں کو دیکھا اور یہ سوچا کہ یہ دونوں آپس میں شدید محبت کرنے والے ہیں اور سمندر کی طرف اس لئے جا رہے ہیں ان کے جسموں میں جو آگ لگی ہے اس کو ٹھنڈا کر سکیں۔

دل سے دل اور ہونٹوں سے ہونٹ
آ ؤ مل جائیں ایسے جیسے ایک ہوں ہم
یہ دنیا جو حالت نزع میں ہے
ہمارے لئے روشن ہو گئی ہے

دوگانا جاری تھا۔ ہوا کا ایک اور تیز جھونکا آیا اور ٹرک کی روشنی بجھ گئی، مکمل اندھیرا چھا گیا۔ پیار کرنے والوں کا دوگانا جاری تھا جیسے بڑھتے ہوئے طوفان کے خلاف سینہ سپر ہو۔ کیا وہ پیار کرنے والے اس دوگانے کو سن سکے؟ کیا وہ سمندر سے نکل آئے؟ اس جھونپڑے میں پڑا آدمی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ گھپ اندھیرے نے ساحل کو مکمل طور پر اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

MashalBooks.com

میں ہی تو دنیا ہوں

زندگی کی عظیم ترین مسرت کامل

مقدس ترین محبت کی حیات

آگاہ کئے جانے سے زیادہ کبھی نہیں

واہموں سے پاک بڑے پیار سے جانی گئی ایک خواہش

دور کہیں بجلی کوندی، آسمان پر لمحہ بھر کے لئے روشنی کا جو شاخسانہ سا بنا اس نے سارے ساحل کو روشن کر دیا ساحل پر ٹرک کھڑا تھا جسے اب تیاگ دیا گیا تھا اور وہ سمندر کی تیز لہروں کے سامنے تھا۔ کھڑکی میں بیٹھا ہوا آدمی واپس کمرے میں چلا گیا تا کہ ڈسک تبدیل کر سکے۔

اگلے روز وہی ٹرک ساحل پر کھڑا تھا، طوفان گزر چکا تھا اور آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ وہ ٹرک وہاں کئی روز اسی طرح کھڑا رہا اور بچے اس کے اوپر چڑھ کر کھیلتے رہے۔ پھر ساحل سمندر کے محافظوں نے ایک روز اسے وہاں سے ہٹا دیا۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.com

یادگار چوک

او چونگ ہوئی

او چونگ ہوئی 1947ء میں پیدا ہوئیں۔ وہ ایک ایسی مصنفہ ہیں جن پر یہ الزام کبھی نہیں لگایا جا سکے گا کہ انہوں نے رومانوی خواب زدگی یا جذباتیت کو اپنے شہ پاروں میں جگہ دی۔ ان کا زیادہ تر کام فرد کے اندرونی منظر کشی پر مرتکز نظر آتا ہے۔ انہوں نے جانا کہ ہر شخص کا اندرونی منظر نہایت بھیانک ہے کیونکہ ہر فرد اپنے بے مقصد بندھے ہوئے معمولات اور ناکام خواہشوں کی قید میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے کردار واضح عزائم رکھتے ہیں یا ان میں کسی چیز کو حاصل کرنے کی شدید تمنائیں ہیں جن کو ناکام بنا دیا گیا ہے۔ یہ کچھ منفی قوتیں اور زندگی کی پابندیاں اور خامیاں ہیں جو اُن کو غصے سے غضبناک اور اندر سے دل گرفتہ اور اپنی خاموشی کے اظہار کے ناقابل بنا دیتی ہیں سوائے اس کے کہ وہ اپنے ناخوش ہونے کا اظہار ایک غیر موثر مخالفہ حرکات کے ساتھ کرے۔ 'اؤ' کے افسانوں کے زیادہ تر مرکزی کردار تین سے انچاس برس کی وہ خواتین ہیں جو اپنی زندگیوں کے بے اثر اور تہی اماں ہونے کی وجہ سے اذیت سے دوچار ہوتی ہیں اور جو آخر میں ایسا عمل کر کے دکھاتی ہیں جس سے روزمرہ کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور یہ عمل اکثر خود کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بامعنی تعلقات قائم کرنے کے قابل نہیں ہوتی ہیں۔ یہ بات کافی حیرتناک ہے کہ زیادہ تر خواتین کرداروں میں یہ مشترک خواص ہونے کے باوجود ان میں سے ہر ایک

کی واضح طور پر تخصیص بھی ہے۔ان کے افسانے اور کہانیاں پڑھنے کیلئے بڑی ہمت کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ان میں مایوسی اور یاسیت اس قدر زوردار تخیل والی اور قابل محسوس ہوتی ہے کہ پڑھنے والا بہت زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔او چونگ ہوئی جدید زندگی کا خاصہ یعنی اس کے کھوکھلے پن کی ناشر ہیں اور نہ ہچکچانے والی وقائع نگار ہیں۔

''یادگار چوک''**1983**ء میں لکھا گیا اور ان کی معمول کی کہانیوں سے مختلف ہے۔اگرچہ اس میں معمول کا گاڑھا اور ٹھوس ڈھانچہ اور حقیقت اور سچ کا عنصر پایا جاتا ہے،اس میں ایک دو افراد کے داخلی احساسات کی منظر کشی کے بجائے ایک پورے دور ایک ایک پوری کمیونٹی کا ذکر کیا گیا ہے۔اس میں فوجی آزادی کے بعد کے جنوبی کوریا کا ذکر ہے اور اس میں اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کس طرح تاریخ لوگوں کی زندگیوں اور شعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔بین الاقوامی اور نفسیاتی جھگڑے کی نوعیت کا تعین کرتی ہے۔بحری جہاز کے ان پڑھ مالک کے خاندان کا ہر فرد اپنے اندر چھپے ہوئے مافوق الفطرت وجود سے نبرد آزما ہوتا ہے اور وہ کچھ کرتا ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے،'اؤ نے اس افسانے کے مرکزی کردار کیلئے ایک نو سال کا لڑکا چنا ہے جو اتنا چھوٹا ہے کہ اپنے سماج کا ایک دانشورانہ تجزیہ نہیں کرسکتا حتیٰ کہ اپنے جذبات اور احساسات کا بھی مکمل ادراک نہیں کرسکتا لیکن وہ نہایت زود فہم اور حساس ہے۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو جو بحری جہاز سمندر میں گئے تھے پندرہ روز بعد مچھلی سے بھرے ہوئے گوداموں کے ساتھ واپس آئے۔سات بڑے جہازوں پر لائی گئی مچھلی بندرگاہ کے قریب جہازوں کے مالک کے کم بلندی کے جنگلوں والے گھر منتقل کر دی گئی۔پیلے،بھورے اور سفید رنگ کی مچھلیوں کا ذخیرہ،جو محسوس ہوتا تھا کہ جال سے نجات حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہوئے جامد ہو گیا ہے،اس وقت

بڑے وحشیانہ انداز میں تڑپنے لگا جب انہیں تنکوں سے بنی چٹائی پر ڈالا گیا، جیسے آزادی کیلئے ہوا میں چھلانگ لگا رہی ہوں۔ انہوں نے اپنی موت کے ان لمحوں میں یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ ان کے پاس یہ آخری پل ہیں جن میں ایک جاندار ہونے کے ناطے وہ اپنے وقار کا مطالبہ کر رہی تھیں چنانچہ انہوں نے ان لمحات کو طویل بنانے کی ناکام جدوجہد کی۔ جلد ہی ہکوں کے ذریعے ان کے جسم کو چیر پھاڑ ڈالا جانا تھا اور ان کے چانوں کو اپنی تابنا کی کھو دینی تھی۔ تب سقوط اور خاموشی کا وقت ہوتا تھا۔ اگرچہ ان کے جبڑے کھل چکے تھے اور ان کی آنکھیں نیم شفاف تھیں، پھر بھی ان میں موہوم سی روشنی جھلکتی نظر آتی تھی۔

کھلے آسمان کے نیچے الاؤ جلا دیئے گئے تھے اور صحن کے ایک کونے میں خیمے ایستادہ کر دیئے تھے۔ سور کی آنتوں کو لوہے کی کیتلیوں میں بھاپ دے کر باورچی خانے سے باہر لایا گیا تھا اور جہازوں کے مالک کی بیوی بیل کا خون ایک چمچے میں بھر کر لا رہی تھی تاکہ اسے ابلتے ہوئے شوربے میں ڈال سکے۔

ماہی گیر نے قسم اور حجم کے لحاظ سے مچھلیوں کی چھانٹی کی۔ ڈبوں میں پیک کرتے ہوئے جب وہ صوتی توازن کے ساتھ مچھلیوں کی تعداد گنتے تو مردوں کی آواز نہایت کھردری محسوس ہوتی تھی۔ اوپر نیچے رکھے ہوئے ڈبوں کا ڈھیر چھت کی اولتی تک پہنچ رہا تھا۔ چھوٹے اور سرخی مائل چہرے والا جہازوں کا مالک ڈبوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھے جانے کا عمل دیکھ رہا تھا اور ان کی تعداد اپنی نوٹ بک میں لکھتا جا رہا تھا اور وہ چٹا ان پڑھ تھا لیکن گنتی لکھنے اور پڑھنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اکڑ بازی کے انداز میں وہ صرف خصوصی اشارے اور شکلیں ہی بناتا تھا، جو اس کی اپنی وضع کردہ تھیں اور کوئی دوسرا فرد جن کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ تصویری ابجد، جسے صرف وہی سمجھ سکتا تھا، میں اپنی جائیداد کا ریکارڈ لکھنے سے اسے اتنا اطمینان ملتا تھا اور اس کی اتنی تشفی ہوتی تھی جو بیان سے باہر ہے۔ یہ تشفی اس احساس سے ملتی جلتی تھی کہ آپ کے پاس اناج سے بھری کوٹھڑی ہو جس پر لگے تالے کی صرف ایک چابی ہو اور کوئی بھی دوسرا شخص اس چابی کو چرا نہ سکتا ہو، اس سے اسے ایک اور احساس تفاخر ملتا تھا کہ وہ ایک ایسی دنیا کا مالک ہے جو ساری کی ساری اس کی اپنی ہے۔ بلاشبہ جادوئی خفیہ اشاروں کا مالک ہونا، جسے کوئی آپ سے چھین نہ سکتا ہو، ایک سلطنت کا مالک ہونے کے مترادف ہے۔ جنہوں نے اس کی نوٹ بک پر نظر ڈالی ہے، انہیں وہاں ناقابل فہم اشارے نظر آئے جو اتنے ہی ناقابل حل تھے جتنے قدیم زمانے میں مختلف قبیلے گیلی مٹی کے بلاکوں پر تصویری ابجد کے طور پر بناتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی کافی سوچ بچار کے بعد یہ اندازہ لگا

لیتا کہ ممکن طور پر ان بے ترتیب اور مبہم اشاروں کی کچھ داخلی منطق ہو سکتی ہے اور یہ عددی شکلوں کو ظاہر کرتے ہیں تو وہ ان اشاروں کے اندر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا، ان کی حدود کو آشکار کرنے کے حوالے سے بے لچک انکار کے سبب۔ ان کے معنی دریافت کرنے کی کوئی بھی کوشش ناکامی پر منتج ہوتی تھی کیونکہ ان اشاروں نے اپنے اوپر ایک حکم لازم کر رکھا تھا اور اس کے معنی صرف خفیہ معاہدہ کے ذریعے ہی معلوم کئے جا سکتے تھے جو ان اشاروں اور ان کے تخلیق کار کے درمیان طے پایا تھا۔

سمندر نے ہندوستانی روشنائی کی طرح کالا رنگ لے لیا تھا اور غروب ہوتے ہوئے سورج کے نیچے الاؤ تیز روشنی کے ساتھ بھڑک رہے تھے۔ ماہی گیروں کی بیویاں خیموں میں بیٹھی مچھلیوں کو کاٹ رہی تھیں اور ان کے پیٹوں میں سے الائشیں نکال کر پھینک رہی تھیں اور مچھلی کے گوشت پر نمک رگڑ رہی تھیں تا کہ پکانے اور جالی پر بھوننے کیلئے نمکین مچھلی تیار کی جا سکے۔

مچھلیوں نے قسمت کے لکھے کو جان لیا تھا اور اب وہ خاکستر زرد رنگ لئے ہوئے زمین پر پڑی تھیں اور انہوں نے اپنی ذات سے منسوب اِس ذلت کے آگے سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ لیکن ان کے چانے ہر جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ مردوں کے لمبے ربڑ کے بوٹوں، مچھلیوں کو ان کے گلپھڑوں سے پکڑنے والی ہکوں، لوگوں کے کپڑوں، بالوں، چہروں اور کانوں ہر جگہ مچھلی کے چھلکے تھے اسی لئے ان میں سلور کے رنگ کی چمک پیدا ہو رہی تھی جیسے انہیں چاندی رنگ کے کسی مائع کے ساتھ بتپسمہ دیا گیا ہو۔

''محتاط رہو، گلی سڑی اور کٹی پھٹی مچھلیاں بے کار ہیں'' مالک چلایا۔ چلانا واحد ذریعہ تھا جو وہ اپنی خواہش کے اظہار کیلئے استعمال کرتا تھا۔ جہازوں کے مالک کی بیوی نے بھری ہوئی اور بھاپ پر پکی ہوئی سور کی آنتیں ٹکڑوں میں کاٹیں اور پھر کام کرنے والوں کے حوالے کر دیں، اس نے انہیں اس کے ساتھ شوربے میں تر بتر چاولوں کے پیالے بھی دیئے۔

سمندر کی طرف سے جنوری کی شدید سرد ہوا چل رہی تھی، سمندر کی طرف سے رات کی بے رحم ہوا خیمے کی ترپال کو پھڑ پھڑا رہی تھی اور شعلوں کو ہلکا اور تیز کر رہی تھی۔

''کئی برسوں سے اب تمہیں تسلسل کے ساتھ اتنا زیادہ شکار مل رہا ہے، مل رہا ہے نا؟ میرے خیال میں تمہاری بہو تمہارے لئے خوش بختی کا باعث بنی ہے''۔ ایک بوڑھی عورت نے اپنے بغیر دانتوں کے مسوڑھوں کے ساتھ سور کی بھری ہوئی آنت کو چباتے ہوئے مالک کو مبارکباد دی۔ وہ ایک پڑوسن تھی جو

ان کے گھر مچھلی کے بچے کھچے ٹکڑے اکٹھے کرنے آجاتی تھی۔ ہر بار جب مال آتا تھا تو وہ اس کام کیلئے ان کے گھر ضرور آتی تھی۔ یہ یاد کرتے ہوئے کہ اس نے اپنا پہلا موٹر والا بحری جہاز اس برس خریدا تھا جب اس نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کی تھی، اس نے سوچا کہ وہ عورت ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، پھر وہ اپنی بہو کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی بہو لوہے کی کیتلی کے ڈھکن پر چکنائی لگا کر اور اسے الٹا کر کے اس میں پین کیک بنا رہی تھی، آگ کی تپش کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہی تھا۔ پیچھے سے دیکھنے پر اس کے دھڑ کا اوپر والا حصہ موٹا اور اس کے کندھے کم گول نظر آتے تھے۔ اگرچہ گذشتہ سات برسوں کے دوران اس نے تین بیٹوں کو جنم دیا تھا پھر بھی اس کا جسم تاحال مضبوط اور ٹھوس تھا جیسے سختی سے پیک کی ہوئی چینی گوبھی۔ اگلے دو یا تین روز میں اس کی بہو نے اپنے بچوں کو لے کر ان کے قصبے کو واپس چلے جانا تھا، وہ اس وقت جائے گی جب مچھلی کا بیوپار کرنے والے صبح کے وقت مچھلی خرید کر لے جائیں گے، مچھیروں اور جہازوں کے عملے کو ان کی تنخواہیں اور منافع بانٹ دیا جائے گا اور میدان سے چٹائیاں، خیمے، خوراک اور کھانے پینے کے برتن ہٹا لئے جائیں گے۔ یہی وقت ہو گا جب مالک اپنی نوٹ بک، جس میں پورا ریکارڈ لکھا ہو گا، ایک چھوٹے سے سیف میں بڑی احتیاط کے ساتھ رکھ دے گا اور سونے کے لئے لیٹ جائے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں مچھلی پکڑنیوالے جال کی مرمت کرے گا جبکہ اس کی بیوی اور ایک نوکر لڑکا اس کام میں اس کی مدد کریں گے یا وہ لوہار کو بلائے گا اور اس کی مدد سے جہازوں کے ٹوٹے ہوئے حصوں کی مرمت کرے گا۔ جلد ہی مچھیرے پھر اکٹھے ہو جائیں گے تاکہ مچھلیاں پکڑنے اگلے دورے پر جا سکے۔ مالک کبھی کبھار قحبخانوں اور جوئے کے اڈوں کے چکر بھی لگاتا تھا تاکہ جوئے میں ہاری ہوئی رقم کے عوض یرغمال بنائے گئے آدمیوں میں سے سستی لیبر حاصل کر سکے۔

جہازوں کا مالک اسی سمندر کے کنارے پل کر بڑا ہوا تھا، اسی پیلے سمندر پر جس کا پانی گدلا اور سرمئی تھا اور جس کی لہروں اور طوفان کی پیش بینی نہیں کی جا سکتی تھی۔ سمندر کسی فاحشہ کی طرح محبت جتانے والا، کٹیلا اور تغیر پذیر تھا۔ ممکن ہے یہ کسی ایسی محبت کرنے والی کی طرح ہو جو کبھی اپنی محبت کا یقین نہ دلاتی ہو۔ کبھی کبھی جب وہ سمندر میں مچھلی کی تلاش میں بہت دور نکل جاتا تو اس طرح جہاز کی ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا جیسے فصل میں بالیاں آنے کے وقت کسان کھڑا ہو کر انہیں دیکھتا ہے اور سمندر

MashalBooks.com

کی ہزاروں ہزار لہروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا، جو نشیبوں اور فرازوں میں ڈھلتی اس کے ماضی کے نشانات کو نگل رہی ہوتی تھیں۔ ماضی میں موسم سرما کے دوران جب وہ چپٹی مچھلیاں پکڑنے کے مقابلوں میں شرکت کیلئے کشتی پر باہر کھلے سمندر میں نکلتا تو جزیرے ٹاپچ اونگ ڈو سے آگے پھیلے ہوئے سمندر سے پرے چین کے کالے ساحلوں کا دھندلا سا منظر دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس جزیرے پر ایک ہفتے تک کشتی کھینے کے بعد پہنچا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بہت پہلے ایک چینی کسی جرم کے سرزد ہونے کے بعد نمک سے بنے ایک جار میں اپنے ملک سے فرار ہو رہا تھا۔ اس نے ہیئر یونگ بندرگاہ پر قیام کیا اور پھر وہاں آباد ہو گیا، 'چن' سلسلہ نسب کا جد بننے کیلئے۔ لیکن اس کا تعلق مقبول عام روایت کے دائرے سے ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ وہ اس علاقے میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ جب اپنی بیوہ ماں کی پیٹھ پر سوار یہاں آیا تھا تو اس وقت اس کی عمر دو سال تھی۔ اس کا شوہر ایک سپاہی تھا اور وہ 1884ء کے فوجی انقلاب میں مارا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی ماں اس کا گاؤں تلاش کرتی ہوئی یہاں آئی تھی تا کہ یہاں رہائش اختیار کر سکے۔

اگر وہ سوہن خلیج کے آگے شمال کی طرف سفر کرتا تو وہ دریائے یلو دیکھ سکتا تھا جو بحر زرد میں جا گرتا تھا جہاں دریا اور سمندر آپس میں ملتے تھے وہاں سمندر کا رنگ تبدیل ہو جاتا تھا۔ زمین پر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد جب سمندر تک پہنچتا تھا تو دریا اٹک جاتا تھا اور کچھ متذبذب ہوتا تھا اور پھر کچھ دیر بعد یہ خود کو کھول دیتا تھا جیسے ہار مان رہا ہو اور ہلکی لہروں کی صورت میں سمندر میں پھیل جاتا تھا۔ سارے دریا سمندر میں ہی آ کر ملتے ہیں۔ اپنی جوانی میں جب اس نے یہ سنا کہ تمام دریا، جو پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں سے بننا شروع ہوتے ہیں یا عمودی پہاڑی چٹانوں کے درمیان سے نکلتے ہیں اور عجیب وغریب کھیتوں اور دیہات میں سے زمین کو کاٹتے ہوئے اور وہاں مٹی چھوڑتے ہوئے گزرتے ہیں، آخر کار خود کو سمندر میں گم کر دیتے ہیں تو یہ بات اس کیلئے انکشاف تھی اور حیرت کا باعث بھی۔

لیکن اپنی عمر کے ساٹھویں برس سے اس نے جہازوں میں بیٹھ کر سمندر میں جانا ترک کر دیا، گزرے برسوں میں اس نے موٹر والا جہاز خریدا اور دور دور تک جہازوں کے امیر اور خسیس مالک کے طور پر مشہور ہو گیا۔

بطور ایک آدمی، جس نے اپنی ساری زندگی ایک ماہی گیر کے طور پر گزاری اور جو بعد کے برسوں میں جہازوں کے مالک کے طور پر بندرگاہ میں بس گیا، زندگی کے بارے میں اس کا تصور بالکل

MashalBooks.com

سادہ اور صاف شفاف تھا۔ زندگی میں ایک بحرِ بے کراں پر ایک چھوٹے سے جہاز کی مانند ہے۔ اس نے ایک انچ جگہ بھی نہیں خریدی، لوگ جب روپیہ پیسہ کماتے ہیں تو دھان کی فصلیں اور کھیت خریدتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ محفوظ ترین اور یقینی سرمایہ کاری تھی لیکن سبھی مچھیرے جانتے تھے کہ اس عرصہ میں مچھلیاں پکڑنا حماقت ہے جب وہ اپنے انڈوں سے بچے نکال رہی ہوتی ہیں۔ ماہی گیروں کو اس وقت تک انتظار کرنا ہوتا تھا جب تک مچھلیاں اپنے سارے انڈے سی نہیں لیتی تھیں اور ان کے پیٹوں میں کوئی انڈا باقی نہیں بچتا تھا۔ انہیں بچوں کے بڑے ہو جانے کا بھی انتظار کرنا پڑتا تھا کہ وہ کھلے سمندر کو بھر سکیں۔ جہازوں کے بیڑے کا معمر مالک پیسے بڑھانے کیلئے قسط دینے سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اپنی نوٹ بک میں تصویری ابجد میں تحریر درج کر کے اسے جو بے پناہ مسرت حاصل ہوتی تھی اسے صرف وہی جانتا تھا۔ اپنے پورے پڑوس کے کھیت میں رقم کی فصل بو کر اسے بہت لطف آتا تھا۔ یہ سب خوب تھا اور سب اس کا پنا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ مچھلیاں پکڑنے کی کشتیاں چلانے کا کاروبار اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ اس کے پہلے بیٹے نے کمرشل ہائی سکول میں اکاؤنٹنگ اور کھاتوں کا حساب کتاب رکھنے کا کام سیکھ لیا تھا، چھوٹے نے فولاد کے کام کی فیکٹری لگائی تھی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ قصبے میں رہ رہا تھا۔ جزیرہ نما کوریا سے باہر جنگ جاری تھی لہٰذا فولاد کی فیکٹری بڑی بروقت لگائی گئی تھی۔

سمندر میں جوار بھاٹا آتا رہے گا اور اس کا گدلا پانی اسی طرح اوپر نیچے ہوتا رہے گا، ماہی گیر بھی جہازوں اور کشتیوں میں اسی طرح مچھلیوں کی تلاش کرتے رہیں گے لیکن اس کا بیٹا جو کبھی سمندر کے سفر پر نہیں گیا، اسے کبھی نہیں سمجھ سکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ خود اپنے باپ کو نہیں جانتا تھا جو اس کے بچپن میں ہی وفات پا گیا تھا۔ زندگیاں اسی طرح زیرِ زمین سما جاتی ہیں اور آخر کار زندگی کی طاقت کی غیر مرئی لہر میں مدغم ہو جاتی ہیں، ان کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ کیا آپ بحرِ زرد میں چونگ جی جھیل اور ماؤنٹ پائیک ڈو کی جھیل الگ کر سکتے ہیں؟ موسم سرما کی تند خو ہوا، جو درختوں کی شاخیں توڑ دیتی ہے، کون سی معتدل اور پھولوں والی زمین سے چلتی ہے اور یہ کتنی زمینیں اور کتنے سمندر جما دیتی ہے اور پھر انہیں پگھلا دیتی ہے؟

جب الاؤ ٹھنڈا ہو گیا تو کسی نے مچھلی پیک کرنے کیلئے بنائے گئے کریٹوں کے ٹوٹے ہوئے

ٹکڑے اس میں پھینک دیئے۔ کریٹ کے پتلے لکڑی کے تختے، جو بارش اور برف سے گیلے ہو چکے تھے، سلگنے لگے اور سفید رنگ کا دھواں دینے لگے، جب دھواں چھٹ گیا تو سرخ رنگ کے شعلے لپکنے لگے اور ہوا کو گرم کرنے لگے۔ سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا شعلوں کو بل دے رہی تھی اور لہرا رہی تھی۔ سمندر تختے کے جنگلے تک اوپر چڑھ آیا تھا۔ یہ یقیناً وہی سمندر تھا جو اس نے پہلی بار دیکھا تھا جب وہ اپنی تھکی ہوئی ماں کی پیٹھ کے ساتھ بندھا ہوا تھا اس وقت وہ اس علاقے میں نئی نئی آئی تھی۔ مد پر آیا ہوا پھیلا ہوا سمندر، اس پر معلق مہینے کی وسطی شب کا پورا چاند اور اس کے صحن میں اٹھکھیلیاں کرتی اور شعلوں سے کھیلتی ہوئی ہوا، یہ سب دیکھ کر اچانک جیسے اسے ایک نہ ختم ہونے والی تبدیلی کا اصول سمجھ میں آ گیا تھا، زندگی اور موت کا مستقل سلسلہ اور مٹی، پانی، آگ اور ہوا کا ایک دوسرے کے ساتھ مختلف صورتوں میں مرتب ہونا۔ ''یونگ میونگ'' وہ اچانک اپنے نوکر لڑکے کو آواز دیتا۔ وہ اسے بتاتا کہ سوکھی گیلیوں کا کلاوہ بھر کر لائے، اگر آگ تیز ہو گی تو یہ ہوا کو دور لے جائے گی۔

یہ سن کر کہ کوئی اسے پکار رہا ہے ہائیونڈ و نیند سے جاگ گیا۔ اب اسے ایسی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، جواب پکار رہی ہو، البتہ وہ کاغذ کی پٹیوں سے مرصع دروازے کے باہر بھڑکتی ہوئی روشنی دیکھ سکتا تھا، دروازہ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے شعلوں کے ساتھ اچھل رہا ہو پھڑ پھڑا رہا ہو۔ کبھی کبھی شعلے تیز ہو جاتے اور دروازے کی طرف لپکتے تھے اور یوں دکھائی دیتے جیسے ابھی دروازے کی جالی کو جلا کر کمرے کے اندر گھس آئیں گے۔ ''ارے یہ تو دادی جان کا گھر ہے، اور وہ دادی جان کے کپڑے ہیں'' اس نے شہتیر کے ساتھ لٹکے ہوئی سفید رنگ کے کپڑے دیکھ کر خود کلامی کے انداز میں سرگوشی کی۔ پھر الماری کے گہرے رنگ کے کواڑوں پر اس کی نظر پڑی اور اسے محسوس ہوا کہ خوف سے اس کے سارے بدن میں سنسنی پھیل گئی ہے، اس خوف سے کہ اچانک الماری کے کواڑ کھسکیں گے اور الجھے ہوئے بالوں والا کوئی بھتنا اس کے سامنے آ کھڑا ہو گا۔ وہ دروازے کے پیچھے سے آنے والی مدہم آواز کو سن سکتا تھا۔ لمبے بوٹ زمین پر لگنے سے آواز پیدا ہو رہی تھی۔ پانی گرایا جا رہا تھا اور سل پر چاقو تیز کیا جا رہا تھا۔ باہر جلنے والی آگ کے شعلے بھڑکتے اور روشنی پھیلتی تو الماری کے دروازے پر لگا ہوا نقش روشن ہو جاتا تھا جس پر ایک پرندے کی شکل بنی ہوئی تھی جس کے دو سر اور تین ٹانگیں تھیں۔ اس نے نقش کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس تصویر میں سے

پرندہ ابھی اڑ کر باہر نکلے گا اور اس پر جھپٹ پڑے گا۔ ''ممی'' اس نے خوف سے ہلکی سی آواز دی اور پھر چادر اپنے سر پر کھسکا لی۔

اس کی دادی ماں ہر سال موسم سرما میں اپنے پسندیدہ کاہن کے پاس جاتی تھی تاکہ نئے سال کے لئے پیش گوئیاں حاصل کر سکے اور اس سے طلسمی تعویذ اور نقش خرید سکے۔ اس کے دادا اور اس کے گھر میں ہر طرف ایسے نقش نظر آتے تھے، گیٹ کے ستون پر، تمام دروازوں کے اوپر اور بڑے کمرے کی دیوار پر جیسے کہ مہریں لگی ہوں۔ جب اس نے اپنی دادی ماں سے پوچھا کہ وہ ایسے نقش کیوں لگاتی ہے تو اس نے فوراً جواب دیا کہ یہ خوش بختی لاتے ہیں، وافر مقدار میں مچھلی پکڑنے میں مددگار ہوتے ہیں، کشتیاں سمندر میں ڈالتے وقت خوفناک ہوا کو پرسکون اور نرم خو بنا دیتے ہیں اور اس کے علاوہ تین قسم کی تباہیوں اور آٹھ قسم کی پریشانیوں سے بچائے رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دادا دادی کے گھر کی عمودی اور افقی ستونوں نے نہیں بلکہ مختلف قسم کے طلسمی نقشوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ طلسمی نقش ان شیطانی قوتوں کو دور بھگانے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف ہوں جو رینگتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کیا یہ ساری تباہیاں اور یہ ساری مشکلات ایک طلسمی نقش میں بند کی جا سکتی تھیں جیسے کہانی میں جن کو جادو کی بوتل میں بند کر دیا جاتا ہے؟ یا اس کے برعکس یہ ہے کہ مدہم نہ پڑنے والا قرمزی طلسمی نقش اس امر کی خبر دے رہے ہیں کہ نچلی دنیا میں رہنے والی روحیں گھر میں موجود ہر چیز کو تباہ و برباد کرنے والی ہیں؟

صرف طلسمی نقش ہی اس کی پریشانی کا باعث نہ تھے، باورچی خانے میں باورچی خانے کا دیوتا تھا، گھر کے بیرونی حصے میں بیت الخلاء کی مورتی تھی اور بارہ مختلف قسم کی کاہنی رسومات کیلئے بارہ ٹوکریاں اور اناج کی کوٹھڑی میں تنکوں سے بنا ہوا ایک پتلا تھا۔ تنکوں سے بنا ہوا پتلا جو تنکوں سے بنی ہوئی رسیوں سے ہی جوڑا گیا تھا دراصل نیولوں کے لئے گھونسلا تھا، جس کے ساتھ ہی مٹی کا بنا ہوا ایک برتن تھا اور اس میں چاول رکھے ہوئے تھے۔

ہائیونڈو نے سن رکھا تھا کہ اس کی دادی اماں کے گھر میں بہت سے نیولے رہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ مچھلی کی خوشبو سے بے تاب ہو کر یہ نیولے رات کے وقت پورے گھر میں بھاگتے پھرتے ہیں لیکن اس نے کبھی ایک بھی نہیں دیکھا۔

''آپ تقدیر کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ جب کسی کا گھر گرتا ہے تو تقدیر اسے سب سے پہلے چھوڑتی ہے۔ اگر آپ اپنے کرم (عمل) کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو یہ اچھا شگون نہیں ہوتا۔ اگر اتفاقاً کہیں نظر آ بھی جائے تو ظاہر یہی کرنا چاہیے جیسے اسے نہیں دیکھا ہے اور کسی بھی صورت میں اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہیے''۔ دادی اماں نے بتایا تھا کہ انہوں نے بھی کرم زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ یہ **20** سال پہلے کی بات ہے جب وہ اس گھر میں منتقل ہوئی تھیں۔ یہ گھر انہوں نے ایک ایسے شخص سے خریدا تھا جو دیوالیہ ہو گیا تھا اور گھر بیچ کر قصبے سے چلا گیا تھا کرم کے حوالے سے دادی ماں بہت محتاط رہتی تھیں۔ یوں محسوس ہوا تھا کہ کرم پر دادی ماں کا غیر متزلزل اعتبار اور اعتماد ہے کیونکہ یہ غیر مرئی ہوتا ہے۔ ''تمہاری دادی ماں بھی کاہن قسم کی کوئی چیز ہیں'' ایک بار اس کی ماں نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اس نے مزید کہا کہ اس کی ساس نہایت ضعیف الاعتقاد ہے اور یہ کہ جزیرے کے باسی ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ ماں، جو قصبے کے ہائی سکول تک پڑھی ہوئی تھی، نے اپنی ان پڑھ ساس کی اس کی پیٹھ پیچھے شکایت کی۔

''تم سخت محنت کرتے رہے ہو، کچھ اور لے لو'' دادی ماں نے ماہی گیروں اور گاڑی والوں سے کہا۔

اپنی دادی ماں کی بیٹھی ہوئی آواز سن کر ہائیونڈو نے چادر ہٹا دی اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ صحن میں جلنے والا الاؤ واضح طور پر ختم ہو چکا تھا لیکن ہلکے ہلکے اندھیرے میں وہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں اور اپنی آنٹی کو دیکھ سکتا تھا جس نے اپنی بچی کو چھاتی پر لٹایا ہوا تھا۔ وہ تقریباً سو رہی تھی لیکن بچی تھوری تھوڑی دیر کے بعد اس کے پستانوں کو چوستی تھی اور ہر بار جب وہ ایسا کرتی تو آنٹی جس کی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے ہمیشہ مرطوب رہتی تھیں، کپکپانے لگتیں۔ آنٹی کا چہرہ سوکھا ہوا اور مریضانہ زرد سا تھا لیکن اس کے پستان عمدہ اور موٹے تازے تھے۔ بچی پوری طرح چستی سے پستان چوس رہی تھی جبکہ اس کا سر ماں کی آغوش میں چھپا ہوا تھا۔ بدقسمتی، چھ انگلیاں'' ہائیونڈو نے اپنی دادی جان کی نقل اتارتے ہوئے سرگوشی کی۔ دادی اماں واحد فرد نہیں تھیں جو اس بچی کو بدقسمتی کی علامت سمجھتا تھا۔ اس بچی کی چھ انگلیاں تھیں، آنٹی کی شادی مختلف قسم کی چیزیں فروخت کرنے والے ایک تاجر کے ساتھ ہوئی تھی جس کا تعلق صوبہ شمالی ہام کیونگ سے تھا۔ ہائیونڈو جیسے لڑکے اسے ایریونگ ابائی کہہ کر پکارتے تھے جس کا مطلب تھا ہیریونگ

سے آنے والا لڑکا۔ جب آنٹی کی عمر انیس برس کی تھی تو اس نے ایک سال کے اندر اندر ایک بچی کو جنم دیا جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اس کو چھوڑ دیا۔ بچی کے بال غیر معمولی طور پر زیادہ اور کالے تھے۔ آنٹی جو اپنا آدھا دن پرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے والدین کے گھر بیتاتی تھی، کالے بالوں والی اس بچی کو ہمیشہ اپنی پیٹھ پر اٹھائے رکھتی تھی۔ دادی ماں نے بچی کو بڑی خوفناک نظروں سے دیکھا، اسے پکڑ کر اس کے بال جھنجھوڑے اور پھر منہ ہی منہ میں بولی ''اتنے زیادہ بال، یہ تو بدقسمتی کی علامت ہے''۔ ہائیونڈو اپنے چھوٹے بھائیوں کے اوپر سے رینگتا ہوا گزرا اور اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا، پھر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ بچی اپنی ماں کی چھاتیاں چوس رہی تھی اور چوسنے سے اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے ہاتھ کے انگوٹھے، جس سے اس نے اپنی ماں کی چھاتی کے نپل کو پکڑا ہوا تھا، کے ساتھ نرم اور لٹکتی ہوئی ایک چھٹی انگلی تھی۔ ہائیونڈو نے اس کی زائد از ضرورت انگلی کو ہاتھ لگا کر چھوا۔

اچانک اسے اپنے معدے کی تہہ میں درد کا احساس ہوا، یہ درد بالکل ویسا ہی تھا جو ایک رات پہلے ہوا تھا لیکن ٹٹی خانہ پچھلے صحن کے ایک اندھیرے کونے میں تھا اس لئے اس نے اپنی رفع حاجت کی ضرورت کو دبائے رکھا۔ کئی بار گوز مارنے اور اپنی رفع حاجت کی ضرورت اور طلب کو قابو میں رکھنے کیلئے اس نے دروازہ کھول دیا۔ یخ ہوا کا ایک جھونکا کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کام یقیناً ختم ہو گیا ہوگا۔ آگ کا الاؤ کوئلے کے سرخ ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا اور خیمے وہاں سے ہٹا لئے گئے تھے۔

''یہ لڑکا کیا کر رہا ہے؟ دروازہ بند کر دو ورنہ بچوں کو ٹھنڈ لگ جائے گی، تمہیں کچھ سنیکس چاہئیں؟'' دادی ماں نے اس کے دروازہ کھولنے پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے باہر والے دالان میں جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے''۔

''کتنی پریشان کن بات ہے، اس لڑکے کو ہر رات باہر والے دالان میں جانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے''، گھیئے کہ خشک خول میں گرم پانی لے کر باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے یونگ میونگ نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کہا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

''ارے یونگ میونگ، ہائیونڈو کو بیت الخلاء لے جاؤ'' دادی ماں نے بلند آواز سے کہا۔ اس وقت دادا ابو چپٹی مچھلی کے ٹکڑے کاٹ رہا تھا تا کہ دھوپ میں پھیلا کر انہیں خشک کیا جا سکے۔

یونگ میونگ نے بددلی سے کچھ خود کلامی کی اور ہائیونڈو کو پچھواڑے صحن کی طرف لے گیا۔

اناج کی کوٹھری، جس میں گھریلو ضرورت کے بارہ دیوتاؤں کی مورتیاں تھیں اور جہاں ایک پتلا لٹکایا گیا تھا، کے قریب سے گزرتے ہوئے ہائیونڈو نے اپنی سانس روک لی۔ پورا چاند بڑی نرمی سے آسمان پر چمک رہا تھا اور ناشپاتی کا پرانا درخت جو نمکین سمندر کی ہوا کے تھپیڑے سہہ سہہ کر بنجر ہو چکا تھا، برفیلی زمین پر ناہموار پرچھائیاں ڈال رہا تھا۔

''جلدی کرو، میں جما جا رہا ہوں، پونگ میونگ نے ہائیونڈو کے لئے بیت الخلاء کا دروازہ کھولا اور اس انداز سے اس کی ناک لپیٹی جیسے واقعی اسے بڑی سردی لگ رہی ہو اور پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ہائیونڈو لکڑی کے تختے پر بیٹھ گیا، دروازہ مکمل طور پر کھلا ہوا تھا۔ اس نے ناشپاتی کے بوڑھے درخت کی طرف دیکھا۔ درخت بیزار نہیں ہوتے؟ انہیں سردی نہیں لگتی؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ دیگر تمام پرانی چیزوں کی طرح اس درخت میں بھی کوئی مافوق البشر طاقت ہوتی ہے جو برسوں کی تند ہواؤں اور بارشوں کے ساتھ ان کے اندر پرورش پاتی ہے، جیسا کہ دادی ماں کہتی ہیں؟ ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے چاند کی روشنی میں اسے کوئی چھوٹی سی چیز صحن پار کرتے ہوئے نظر آئی۔ وہ تیر کی سی تیزی سے وہاں سے گزری تھی اور صحن پار کر کے سائے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''پونگ میونگ'' اس نے خوفزدہ آواز میں اسے پکارا۔

''کیا بات ہے؟ میں یہاں ہوں، جلدی کرو اگر تم فارغ ہو چکے ہو تو باہر آ جاؤ'' پونگ میونگ نے اناج کی کوٹھڑی کے دروازے کے ساتھ سر کو ٹکاتے ہوئے کہا۔

یادگار چوک ہائیونڈو کے گھر اور سکول کے بالکل درمیان میں تھا۔ جونہی سکول سے چھٹی ہوتی ہائیونڈو ایک ہی ہلے میں اس یادگار تک پہنچ جاتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں اس کے قدم تھم جاتے اور وہ ٹھنڈی آہ بھرتا۔ وہ کونسی خفیہ توقعات تھیں کہ وہ اپنی ماں کی اس نصیحت کو یکسر نظر انداز کر دیتا کہ وہ سڑکوں پر آوارہ گردی نہ کرتا رہا ہے اور سکول سے سیدھا گھر واپس آیا کرے۔

یہ چوراہا جہاں ٹرین کا سٹیشن، ڈاک خانے، زرعی تعاون کے دفاتر اور پولیس سٹیشن نے چاروں کونے سنبھال رکھے تھے، جاپانی دکانوں اور رہائشی گھروں سے پر علاقہ کا مرکز بھی تھا، چنانچہ بالکل واضح تھا کہ یہاں ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ، کوئی نہ کوئی سانحہ پیش آتا ہو گا۔ تھوڑی دیر اس جگہ منڈلانے سے

MashalBooks.com

ہائیونڈ وکو بہت سے دلچسپ واقعات رونما ہوتے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں کے یہاں آنے سے پہلے یہ چوراہا ایک بڑے میلے کی جگہ تھا۔ یہ ایک ایسا جنکشن تھا جہاں ہائیر یونگ، کیس یونگ، شنیوجو کو جانے والی سڑکیں اور ریلوے سٹیشن ملتے تھے۔ یادگار چوک کے گرد حفاظتی دیوار یا جنگلہ نہ تھا، پہلے پہلے گہرے خاکستری رنگ کا ہوتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شکست وریخت شروع ہوگئی، اب یہ اپنے اوپر کندہ کی گئی تحریروں کی وجہ سے سفیدی مائل نظر آتا تھا، اس پر لکھی گئی تحریریں پڑھی نہیں جاسکتی تھیں۔

بہت پہلے کی بات ہے، جنگ اور قحط نے اس ملک میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ پہلے پہل لوگوں نے درختوں کی چھالیں کھائیں اور بھوک مٹانے کیلئے گھاس کی جڑیں کھود نکالیں لیکن پھر قحط اور مایوسی اتنی بڑھی کہ لوگوں نے اپنے بچے کھانا شروع کردیئے۔ مرد باغی اور ڈاکو بن گئے اور عورتوں ملک کو تاراج کرنے والی چینیوں کے آگے جسم فروشی کرنے لگیں۔ دعاؤں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور عبادت سے ان لوگوں کی وحشت کم نہ ہوتی تھی جو آدم خور بن چکے تھے۔ آخرکار انہوں نے ایک بڑی عبادت کی اور کنواری لڑکی کے بال اور مردوں کے قدرتی بالوں کا طرہ زمین میں دفن کیا۔ ان دنوں کسی کے بال اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھے جاتے تھے۔ تب جنگ کا خاتمہ ہوا اور بارش بھی برسی۔ لوگوں نے جہاں پر عبادت کی تھی وہاں انہوں نے یہ یادگار تعمیر کردی تھی۔

لیکن یہ غالباً کوئی فرضی داستان تھی جو اس یادگار سے منسوب کردی گئی یا ممکن ہے لوگوں کو کوئی اخلاقی سبق دینے کیلئے یہ کہانی گھڑ لی گئی ہو۔ یادگار پر لکھی تحریر عرصہ ہوا پڑھنے کے قابل نہ رہی تھی اور وہ چھوٹے حروف جو یادگار پر لکھے گئے اس قدر شکستہ ہوچکے تھے کہ ان سے ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا کہ وہ دراصل کیا کہنا چاہتے ہیں۔

یہ جانے بغیر کہ یادگار کسی کفارے کے طور پر ایستادہ کی گئی یا کسی جشن کی یاد میں لوگ اسے صرف ''یادگار'' ہی کہتے تھے اور اس چوراہے کو جہاں پر بنایا گیا تھا، یادگار چوک کا نام دیا گیا تھا۔ مزید وقت گزرا تو سڑک کے کنارے لگے خستہ حال پتھر کے ٹکڑے کے ساتھ اس کا تعلق بھی ختم ہوگیا اور لوگ عادتاً ہی اس چوراہے کو ''یادگار چوک'' کے نام سے پکارنے لگے۔ اس مصروف چوراہے سے مسلسل گزرنے والے لوگوں کی زندگیوں اور اسی چوک کے ایک کونے میں لگے ہوئے پتھر کے ایک مقدس

ٹکڑے کے درمیان کیا تعلق واسطہ ہو سکتا تھا؟ کبھی کبھار وہ جب کسی فقیر کو اس یادگار کے قریب سردی کی شدت سے مرا ہو دیکھتے یا جب بچوں کو اس پر سواری کرتے اور بیٹھے رہنے کے بعد واپس گھروں کو جاتے ہوئے دیکھتے تو انہیں یاد آ جاتا کہ اپنے بچپن میں وہ بھی اسی طرح اسی یادگار پر چڑھتے تھے اور بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ پھر وہ بچپن کی سہانی یادوں میں کھو جاتے تھے۔ بچے اس پر ایسے سواری کرتے تھے جیسے یہ کوئی کاٹھ کا بنا ہوا کھیلنے والا گھوڑا ہو۔ اب وہ انہیں زیادہ خستہ حال اور چھوٹا نظر آتا تھا۔ غالباً ان کے جذبات، جو ایک بڑے نظم کو قبول کرنے کے احساسات جیسے تھے یہ محض اپنا بچپن کھو دینے سے پہنچنے والا دلی رنج نہ تھا بلکہ برہابرس سے وہاں ایستادہ رہنے کی وجہ سے اس یادگار کو علامتی اہمیت حامل ہونے کے تصور اور اس کی وہاں موجودگی کی تصویر جیسا کوئی احساس تھا۔

اس یادگار کے اردگرد کا علاقہ ہمیشہ دھوپ میں رہتا تھا اور ان دنوں بہار کا موسم بھی تھا۔ بھکاری عورت اور اس کی بیٹی جو موسم خزاں کے آخر سے اب تک نظر نہ آئی تھی اب اس یادگار کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور یہ کافی ثبوت تھا کہ یہ بہار کا موسم ہے۔ عورت اپنی بیٹی کے سر سے جوئیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر انہیں مار رہی تھی۔ اس کا سر امریکی کوے کے گھونسلے کی طرح اٹا پڑا تھا۔ ماں بیٹی نے کسی نہ کسی طرح سردیوں کا شدید موسم جھیلا تھا۔ ان کے قریب ہی کنگھیاں فروخت کرنے والا ایک شخص کارڈ بورڈ کے ایک ٹکڑے پر اپنی چیزیں بکھیرے اونگھ رہا تھا۔ جوتے مرمت کرنے والا بوڑھا روسی، جو ان کے قریب ہی جوتے مرمت کرتا تھا، وہاں موجود نہ تھا۔ گذشتہ موسم خزاں کے اختتام تک وہ آدمی وہیں موجود تھا، اس نے ہر وقت موٹی سی پوشاک پہن رکھی ہوتی تھی، جو پھٹ چکی تھی اور سیون پر سے الگ ہو چکی تھی۔ وہ آدمی جو پرانے جوتے مرمت کرتا تھا اور ان میں کیل ٹھونکتا رہتا تھا، کیا وہ موسم سرما کے دوران میں کہیں چلا گیا کہیں بہت دور؟

ہائیونڈو نے سفید روسیوں کو سب سے پہلے اس وقت دیکھا تھا جب ابھی وہ بہت چھوٹا تھا اور اپنے دادا دادی کے پاس رہتا تھا۔ ایک روز وہ قصبے میں اپنی ماں کے پیچھے چلتے ہوئے وہاں گیا تھا۔ یہ یادگار کے اردگرد کا کوئی علاقہ تھا۔ روسی ایک بوڑھے آدمی، ایک بوڑھی عورت، ایک نوجوان عورت اور دو چھوٹے بچوں پر مشتمل تھے اور یہ سب ایک ہی خاندان کے افراد نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے اتنے سفید تھے کہ یوں محسوس ہوتا انہوں نے چہروں پر پاؤڈر ملا ہوا ہے۔ انہوں نے عجیب سے کپڑے زیب تن کر

رکھے تھے۔ معمر آدمی طنبورہ بجا رہا تھا اور جوان عورت تماشائیوں میں سے ہر ایک کے سامنے جا کر کھڑی ہوتی تھی اور اپنے ہاتھ انہیں پیش کرتی تھی جن میں سے ایک میں رنگ برنگے کپڑے تھے اور دوسرے میں چہرہ سجانے کا سامان۔ تماشائی شرما جاتے تھے اور ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ دونوں لڑکے اس عورت کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑے تھے اور تماشائیوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ہائیونڈو کی ماں لجاتے ہوئے اس ٹوکری تک پہنچی اور اس میں سے ایک ڈبہ اٹھالیا۔ پھر اس نے اتنی ہی ہچکچاہٹ کے ساتھ اس عورت کو کچھ رقم دی اور تماشائیوں کے دائرے سے باہر نکل گئی، اس نے ہائیونڈو کو بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ کون ہیں؟ یہ کہاں رہتے ہیں؟ ہائیونڈو نے اس ڈبے کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھا۔ ''ان کا کوئی گھر نہیں ہے، یہ سرائے میں سوتے ہیں'' ماں نے جواب دیا تھا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے ان کا کوئی گھر نہ ہو'' ؟ اس لئے کہ انہوں نے اپنے گھر کو تیاگ دیا ہے، میرے خیال میں وہ یہاں سے بھی جلد ہی چلے جائیں گے، وہ بہت دور سے آئیں ہیں، انہوں نے اپنا وطن چھوڑ دیا اور سائبیریا اور مانچوریا سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ اپنی موت تک اس طرح بھٹکتے رہیں گے۔ ایک بار جب کوئی اپنا گھر چھوڑ دے تو کہیں بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اسے کہاں مرنا ہے؟

وہ اپنی ماں کی باتیں کس طرح سمجھ سکتا تھا؟ تاہم جب ہائیونڈو ایک اداس کر دینے والے خواب دیکھ کر نیند سے جاگا تو بڑی شدت سے سسکیاں بھرتا رہا۔ وہ اس وقت محض پانچ برس کا تھا۔ بے ٹھکانہ لوگ کس طرح بغیر کسی گھر کے ادھر ادھر بھٹکتے رہتے تھے، کسی دریا کی طرح؟

تعجب ہے کہ ان روسیوں کی شبیہیں اس کے ذہن کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں نقش ہوگئیں۔ اس نے پھر کبھی ان روسیوں کو نہیں دیکھا حالانکہ وہ کبھی کبھار اپنی ماں کے ساتھ قصبے جاتا رہتا تھا اور بعد میں تو وہ قصبے منتقل بھی ہوگیا تھا۔ اس کے بعد اس نے کبھی کسی روسی کو نہیں دیکھا۔ روسی، جو کبھی کبھی قصبے میں نظر آجاتے تھے، بالکل ہی وہاں سے غائب ہوگئے تھے جیسے دریا کا پانی انہیں ساتھ بہالے گیا ہو۔

یادگار پر اپنی پکڑ مضبوط کرتے ہوئے ہائیونڈو نے چھلانگ لگائی اور یادگار کے اوپر پاؤں دونوں طرف لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پاؤں جھٹکے تو ان سے مٹی گدا گر ماں اور بیٹی کے اوپر گری لیکن وہ اپنی بیٹی کے سر سے جوئیں نکالنے میں اس قدر منہمک تھی کہ اس نے اس حرکت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

یادگار کے اوپر بیٹھ کر ہائیونڈ وارد گرد کی سڑکوں اور جگہوں کا اچھی طرح نظارہ کر سکتا تھا۔ایک رکشہ والا وہاں سے دھول اڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ایک چینی خوانچہ فروش وہاں سے گزرا۔ایک بانس اس نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا جس کے دونوں طرف عینکوں کے فریم لٹک رہے تھے۔خوانچہ فروش اپنے کولہے کسی پینڈولم کی طرح لہراتا ہوا وہاں سے گذر گیا۔کچھ شرارتی بچوں نے اس چینی کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اس چینی کے لہراتے ہوئے کولہوں پر اس کے لمبے کوٹ کے نیچے مٹی پھینکی اور یہ چلاتے ہوئے بھاگ گئے''اوئے چینی یہ تمہارے کولہوں کو گھمانے کیلئے ہے''۔

اس علاقے میں رہنے والے چینی زیادہ تر قصبے کے بڑے دروازے کے باہر سبزیاں اگاتے اور سور پالتے تھے۔ان کی خوراک زیادہ تر آٹے کے بنے ہوئے کیک اور چھوٹی گٹھی والی کچی پیاز ہوتی تھی۔وہ اس دور دراز علاقے کی بندرگاہ میں سبزیوں کے چھکڑے کھینچتے ہوئے آئے تھے تاکہ تجارت کر سکیں۔دادی اماں نے ان کپڑوں، جو چینیوں نے پہن رکھے تھے، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ''چینی جوئیں اپنے دانتوں میں کچل کر مارتے ہیں اور انہوں نے کبھی اپنے کپڑے نہیں دھوئے۔ جب ان کے کپڑے میلے کچیلے اور خستہ حال ہو جاتے ہیں تو یہ کسی زیادہ غریب آدمی کو فروخت کر دیتے ہیں۔یہ غریب آدمی ان کپڑوں کو اس وقت تک استعمال کرتا جب تک وہ اس کے خیال میں استعمال کے قابل رہتے اور پھر اپنے سے زیادہ کسی غریب آدمی کو فروخت کر دیتا تھا۔دادی اماں نے چینیوں کے جن کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا وہ گندگی کی وجہ سے چمکدار ہو چکے تھے۔تو پیسٹری بیچنے والے نے جو پوشاک پہن رکھی تھی ممکن ہے کبھی وہ میگنیٹ وانگ پہنا کرتا ہو، جو بیجنگ کا امیر آدمی تھا اور ایک ایسے گھر میں رہتا تھا جس کے گیٹ پر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا۔

گزشتہ روز ہائیونڈ و نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر چینی کو ایک پولیس کا آدمی گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ یہ افیون کا نشہ کرتا ہے اور کسی سٹور سے کوئی چیز چوری کرتے ہوئے گرفتار ہوا ہے۔وہ اپنی ہتھیلی کی پشت سے ناک سے بہنے والا خون صاف کر رہا تھا اور جھکتے ہوئے پولیس مین سے التجائیں کر رہا تھا۔پولیس مین جو بمشکل بیس سال کا ہوگا، دھاڑا ''تم غلیظ کتے'' اور یہ کہہ کر اس نے اس بوڑھے آدمی کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔دونوں پولیس سٹیشن کی طرف جا رہے تھے اور بہت سے بچے اور جوان ان کے پیچھے تھے۔ہائیونڈ و نے دم بخود ہو کر اس بوڑھے افیونی کو پولیس سٹیشن کے دروازے پر

مزاحمت کرتے ہوئے دیکھا لیکن آخر کار وہ اسے پولیس سٹیشن کے اندر لے ہی گئے۔ ہائیونڈو نے سن رکھا تھا کہ پولیس سٹیشن کے تہہ خانے میں خوفناک معاملات چلتے ہیں۔ بچوں نے سراسیمگی میں سرگوشیاں کیں کہ پولیس ملزم کی انگلیوں کے درمیان پنسلیں رکھ کر گھماتی ہے اور ایک بڑا سا راڈ اس کی مقعد میں سے گھسیڑ کر منہ کے راستے باہر نکالتی ہے یا اسے ٹخنوں سے باندھ کر الٹا لٹکا دیتی ہے اور اس کے نتھنوں میں سرخ مرچوں والا پانی ڈالتی ہے یا ہر ملزم کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن اکھیڑ دیتی ہے۔ ہائیونڈو نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ قیدیوں کو رات کے وقت ریلوے سٹیشن لایا جاتا تھا، ان کے چہرے نقاب سے ڈھکے ہوئے ہوتے تھے۔ اس نے سنا تھا کہ ایسے ہی تشدد کی وجہ سے الموکا بڑا بھائی، جو جاپان میں کالج کا طالب علم رہا تھا اور لائق نوجوان تھا، پاگل ہو گیا تھا اور ہر روز رات کے وقت چھت پر چڑھ جاتا تھا جیسے کسی مر جانے والے شخص کی روح کو بلا رہا ہو۔ ماں روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کیلئے کہتی تھی ''چپ پولیس کا آدمی آ رہا ہے''۔ وہ یہی فقرہ ہائیونڈو سے بھی کہتی تھی جب وہ ابھی بچہ تھا۔ وہ پولیس کے آدمیوں سے اتنا ڈر گیا تھا کہ جونہی اس کی ماں یہ فقرہ بولتی وہ ڈر کے مارے خاموش ہو جاتا تھا۔

اس کے استاد نے اسے بتایا تھا کہ جاپان اور کوریا ایک ملک اور ایک قوم ہوا کرتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بات درست نہیں تھی۔ اس کی دادی ماں نے اسے جو کہانیاں سنائی تھیں ان میں جاپانیوں کا کہیں ذکر نہیں ہوتا تھا۔

جب لوگ اپنی ہی ہنسی اڑانے کے انداز میں یہ کہتے کہ کوریا کے لوگوں کا کوئی وطن نہیں ہے تو اس کے ذہن میں جلی ہوئی خاک یا تیز لہروں کی تصویر یا قدیم اساطیر کی شبیہیں دوڑ جاتی تھیں۔ ان کے خاندان کا کوئی بھی فرد قومیت یا آزادی جیسی باتیں نہیں کرتا تھا۔ جب وہ ایسی کوئی بات کرتا تو اس سے بڑی عمر کے افراد یہ کہہ کر اسے ٹوک دیتے تھے ''یہ ایسی چیزیں ہیں، جن کے بارے میں تم نہ ہی سوچو تو بہتر ہے''۔ اسے کہا جاتا تھا کہ وہ گھر سے باہر جا کر کھیلے اور جب وہ سکول میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا تو یہ سوال کبھی کبھار اس کے ذہن میں گونجتا تھا کہ وہ کون ہے اور کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کی موجودہ زندگی کوئی ایسا عبوری لمحہ ہے جس کے بعد کچھ حقیقی ہونے والا ہے اور اس کی شناخت کا سوال ایک دھندلا سا سایہ ہے جو اس کے اوپر پھڑ پھڑاتا ہے۔

ہائیونڈو چھلانگ لگا کر یادگار سے نیچے اترا۔ اس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے استاد کا یہ

حکم یاد آ گیا تھا کہ وہ دیکھے کہ شن زینگ کیا کر رہا ہے؟ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس چوک پر اب اس کے خیال میں کچھ ایسا نہیں ہونے جا رہا تھا جو اس کیلئے دلچسپی کا باعث ہو چنانچہ وہ بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔

شن زینگ کا گھر اس یادگار کے پچھلی طرف جاپانیوں کے لکڑی کے بنے ہوئے گھروں کے علاقے میں واقع تھا۔ جس رینیم اور بیگونیا کے گملوں سے سجی کھڑکیوں کے درمیان واقع تنگ سی گلی میں چلتے ہوئے وہ شن زینگ کے گھر پہنچ گیا اور اس کے دروازے پر لگی گھنٹی بجادی۔ شن زینگ جو سکول میں اس کے ساتھ بیٹھتا تھا تین دن سے سکول نہیں آ رہا تھا۔

دروازہ کھولنے کے لیے شن زینگ کی ماں آئی۔ وہ اپنے گیلے ہاتھ زنانہ جانگھیے کے اوپر بنے ہوئے ایپرن سے صاف کر رہی تھی۔ اس نے ہائیونڈو کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔

''ارے یہ تو چن سینگ ہے''۔

''ٹیچر نے کہا تھا کہ شن زینگ کا پتہ کروں'' اس نے نیچے جھکتے ہوئے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

''ارے اندر آ جاؤ، شن زینگ تو بہت بیمار ہے''۔

''بڑے دروازے کے بالکل اندر ڈیوڑھی تھی شن زینگ کی ماں نے ایک تنگ اور تاریک برآمدے کے وسط میں بنے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا۔

شن زینگ سو رہا تھا، اس کے اوپر کمبل ڈالا ہوا تھا۔

''اس نے ابھی دوا کھائی ہے اور غنودگی محسوس کر رہا تھا لیکن یہ جلد ہی جاگ جائے گا''۔ اس عورت نے اپنے پتلے ہونٹ ہلاتے ہوئے کہا اور کچھ اس انداز سے راستے میں کھڑی ہو گئی جیسے ہائیونڈو کی واپسی کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہوں۔ اپنے بالوں کو جوڑے کی شکل میں گوندھے ہوئے اور خشک اور مریضانہ زردی مائل چہرے کے ساتھ اس کے خوبصورت یا جوان ہونے کا تاثر بالکل بھی نہیں ابھرتا تھا۔ ہائیونڈو کی ماں جب بھی ان جاپانی عورتوں کو کورین گھروں کی گلیوں اور سڑکوں سے اپنی ناکوں اور ہاتھوں کو ڈھانپے ہوئے تیزی سے گزرتے دیکھتی تو کہتی ''ان آوارہ فاحشہ عورتوں کی طرف دیکھو جو بغیر شکنوں والا لباس پہنتی ہیں اور ٹائیلٹ پیپر تک استعمال نہیں کرتی ہیں لیکن خود کو کتنی مہذب اور ہمیں کتنا گندا

تصور کرتی ہیں"۔

اندر آنے کے بعد ہائیونڈ وخود کو گرم محسوس کر رہا تھا اور اسے پسینہ بھی آیا ہوا تھا کیونکہ شن زینگ کے کمرے میں ایک چولہا جل رہا تھا، اس پر رکھی ہوئی کیتلی میں پانی کھول رہا تھا اور اس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کمرے کی فضا گرم اور مرطوب تھی۔

شن زینگ کی ماں نے ایک ناشپاتی چھیلتے ہوئے کہا "شن زینگ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ چن سینگ اس کا اکلوتا دوست ہے، میرے بیٹے کا خیال رکھا کرو، ہائیونڈ و گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا، اس کو گردن میں تناؤ کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کی ماں کی ان باتوں پر کوئی ردعمل ظاہر کئے بغیر جاپانی دری کو اپنی انگلی سے کریدرہا تھا۔

شن زینگ زیادہ دیر تک نہیں سو سکتا، وہ جلد جاگ جائے گا، اس لئے یہاں موجود رہنا، وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا، وہ بہت زیادہ بوریت محسوس کر رہا تھا"۔ بیمار لڑکے کی ماں نے اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد ہائیونڈ و نے کسی قدر سکون محسوس کیا اور شن زینگ پر نگاہ ڈالی۔ تکیہ پر رکھا ہوا اس کا سر بڑا جبکہ کمبل میں لپٹا ہوا اس کا جسم بڑا چھوٹا نظر آتا تھا۔ وہ کبڑا تھا اور اپنے سر کو ایک طرف جھٹکا دے کر چلتا تھا جیسے یہ اس کیلئے بہت بھاری ہو۔ اسے دیکھ کر ہائیونڈ و کو نوجوان پلا ہوا اونٹ یاد آجاتا تھا۔

کیا شن زینگ واقعی سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا زرد ہو رہا تھا اور اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے پپوٹوں پر نیلے رنگ کی شریانیں جال بنا رہی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بڑی مشکل سے سانس لے رہا ہے۔ یہ بات درست تھی کہ ہائیونڈ و اس کا اکلوتا دوست تھا۔ اس کی جماعت میں موجود جاپانی لڑکوں نے اسے اپنے حلقے سے نکال دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کا کبڑا ہونا نہیں تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اس کا بوڑھا والد کسی جاپانی کے مرنے پر مذہبی رسومات ادا کرتا تھا اور اس کا اسے معاوضہ ملتا تھا۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا بوڑھا باپ اس کے کب کے پیچھے پھڑ پھڑاتا رہتا ہے، پچھلی طرف پہنے گئے اپنے کپڑوں کو کسی چمگادڑ کی طرح ہلاتے ہوئے۔ کورین لڑکے شن زینگ کو جاپانی کاہن کا بچہ کہہ کر بلاتے تھے۔ شن زینگ کسی لڑکی کی طرح جلد قابو میں آجانے والا لڑکا تھا۔ وہ ہمیشہ وہی کرتا تھا جو ہائیونڈ و چاہتا اور

اس کی کوشش ہوتی کہ ہائیونڈ واس سے ناراض نہ ہو۔شن زینگ کے بارے میں ہائیونڈو کے جذبات دوستی کے بجائے ایک غلبہ پا لینے والے فرد کے سے تھے۔ پہلے پہلے ہائیونڈو ایک غیر ملکی اور انوکھے باشندے کے لئے مردانہ جذبات کی وجہ سے اس طرف مائل ہوا پھر وہ اپنی غالب رہنے اور حکم چلانے کی خواہش اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی نرمی کی وجہ سے شن زینگ کا احترام کرنے لگا یا ممکن ہے یہ ایک کمزور لڑکے کی منکسرالمزاجی اور مکمل طور پر مطیع بن جانے کی کشش ہو، جو ایسا لچکیلا پن اور تابعداری پیش کرتی ہے؟

محسوس ہوتا ہے کہ شن زینگ ہائیونڈو کا احترام ایک محفوظ اور یقینی جنت کے طور پر کرتا تھا۔ جب ہائیونڈو پہلی بار اس کے گھر آیا تو اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا ''میں بہت جلد مر جانے کیلئے پیدا ہوا تھا چنانچہ انہوں نے ایک گڑیا، جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا، مندر میں رکھی اور میری لمبی زندگی کیلئے دعا کی''۔

اس کی ماں نے جو پیش گوئی کی تھی اس کے برعکس ہائیونڈو کافی دیر سویا رہا حتیٰ کہ ہائیونڈو چھلی ہوئی ناشپاتی کی پوری پلیٹ کھا گیا پھر بھی وہ نہ جاگا۔ یہ سوچ کر کہ اسے جگایا جانا چاہیے ہائیونڈو اس کے قریب گیا اور اس کا نازک ہاتھ پکڑ لیا جو کمبل سے باہر تھا۔ اس کا ہاتھ گرم اور مرطوب تھا۔ ہائیونڈو نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھے۔ اس کے سانسوں میں بسی ہوئی ناشپاتی کی خوشبو بخار سے تپے ہوئے ہاتھوں کی باس میں مدغم ہوگئی۔ اسے جگانا بھول کر ہائیونڈو اس کے ہاتھ کی گرمی کی آسودگی اور لامحدود نرمی میں کھو سا گیا۔ یا ممکن ہے یہ آرام اس کے دوست کی معصوم اور گہری نیند کی وجہ سے محسوس ہو رہا ہو۔

کمرہ مکمل طور پر خاموشی کی چادر میں لپٹا ہوا تھا، سوائے کیتلی میں سے نکلتی ہوئی بھاپ کی آواز کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ باورچی خانے سے کھٹ کھٹ کی جو آوازیں آ رہی تھیں وہ بھی اب بند ہوگئی تھیں۔ اس خاموشی سے چونک کر ہائیونڈو نے شن زینگ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ادھر ادھر دیکھا اور پھر اپنے بیمار دوست سے دور ہٹنا شروع کر دیا۔ سب دروازے بند تھے اور ہر طرف پراسرار خاموشی تھی جیسے پورا گھر خالی پڑا ہو۔

اپنے سوئے ہوئے دوست پر نظریں گاڑھے ہوئے ہائیونڈو نے اگلے کمرے میں کھلنے والا دروازہ کھولا۔ یہ وسیع کمرہ تھا، جس کی سفید پلاسٹر کی بنی ہوئی دیواریں تھیں اور جس میں جاپانی چٹائی بچھی ہوئی تھی، جو بالکل نئی اور سبز نظر آتی تھی اور اس میں سے گھاس کی بو محسوس ہوتی تھی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔

ایک کونے میں تکیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ تکیوں کو ایک دوسرے کے اوپر نیچے رکھا گیا تھا۔

کسی خاص سوچ کے بغیر کہ اسے کیا کرنا ہے ہائیونڈو نے یہ سوچ کر کانپتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اپنے دھڑکتے دل کی تیزی پر کسی قدر قابو پانے کے بعد اس نے تاریک کوٹھڑی کا دروازہ گھسیٹ کر ایک طرف کیا اور پھر اسے اسی طرح آواز پیدا کئے بغیر بڑی صفائی سے دوبارہ بند کر دیا۔ پھر کمرے میں چلتے ہوئے اس نے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھولا۔ اس نے فینائل کی گولیوں کی بو محسوس کی جو تاریک برآمدے کے آخری سرے سے آ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عبادت کا کمرہ اس برآمدے کے آخر میں ٹائلٹ کے بالکل سامنے ہے۔ جب وہ پہلی مرتبہ اس گھر میں آیا تھا تو شن زینگ نے اسے پورے گھر کی سیر کرائی تھی لیکن اس برآمدے کے آخر میں اس نے ہائیونڈو کو یہ کہتے ہوئے روک دیا تھا ''تمہیں اس طرح نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ وہاں روحوں والی گولیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ہائیونڈو کو پورا یقین تھا کہ سوئے ہوئے شن زینگ کے سوا گھر پر کوئی بھی موجود نہیں ہے اس کے باوجود وہ اتنی خاموشی اور دبے قدموں کے ساتھ مندر والی کوٹھڑی کی طرف بڑھا جتنی خاموشی اور احتیاط وہ کر سکتا تھا۔ گھسٹ کر کھلنے والا دروازہ بغیر کسی آواز کے آسانی کے ساتھ کھل گیا۔ اس نے اندر جھانکا۔ اس کے بالکل سامنے وہ لکڑی کا بنا ہوا ڈبہ پڑا تھا جس میں روح کے حوالے سے گولیاں پڑی تھیں۔ اس کے اندر سرخ پھولوں والا ایک گلدان، ایک کالے رنگ کا ڈبہ اور ایک لکڑی کی گڑیا بھی پڑی تھی۔ یہ گڑیا جامنی، سرخ اور سفید ڈیزائن والے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ عام طور پر ایسے کپڑے جاپانی مرد پہنتے ہیں اس کا چہرہ سفید رنگ سے رنگا ہوا تھا، لمبی گہری آنکھیں اور قرمزی رنگ کا منہ تھا۔ یہ کسی ہنستے ہوئے ماسک کی طرح لگ رہی تھی۔ کیا یہ شن زینگ کی گڑیا تھی؟ حیرت میں مبتلا ہائیونڈو نے اس کمرے میں قدم رکھا لیکن پھر چونکتے ہوئے اپنے پاؤں واپس کھینچ لئے۔ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی دروازے کے پاس دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھا ہے۔ بوڑھا آدمی بوڑھوں کی طرح گوٹھ مارے بیٹھا تھا۔ اس کی ڈاڑھی اور بال بالکل سفید تھے اور اس کا اوپر لباس مکمل طور پر کالا تھا۔ وہ اتنا صاف ستھرا اور غیر متحرک تھا جیسے دیوار پر ٹنگی ہوئی کوئی تصویر ہوتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہائیونڈو کی حرکات و سکنات اور اس کی وہاں موجودگی سے مکمل طور پر بے خبر ہے۔

برآمدے میں بھاگتے ہوئے ہائیونڈو نے ایمرجنسی میں بجائے جانے والے سائرنوں کی

آواز سنی۔ اس وقت تک وہ ہوائی حملے کے وقت بجائے جانے والے سائرنوں سے بخوبی آگاہ اور آشنا ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس نے خود سے سرگوشی کی جیسے غنودگی میں ہو" یہ آواز کیسی ہے؟" وہ تناؤ اور لرزش جو محض ایک لمحہ پہلے اس کی شریانیں پھاڑ دینے کی کوشش کر رہی تھی اب مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ وہ برآمدے کے آخری سرے سے لڑکھڑاسا گیا اور شن زینگ کے کمرے کے پاس سے اس طرح گزرا جیسے اس میں کوئی طاقت نہ بچی ہو۔ جب اس نے شیشے کا دروازہ کھینچ کر کھولا تو سامنے پھولوں کی کیاری تھی جس میں موسم بہار کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ کیاری ایسے ہی سامنے آ گئی تھی جیسے آئینے میں کوئی منظر سامنے آجاتا ہے۔

شیشے کے دروازے کے دوسری طرف جھکتے ہوئے اس نے نیچے پھولوں کی کیاری کی طرف دیکھا اور پھر اوپر آسمان کی طرف نظر دوڑائی آسمان پر بہت اوپر ایک ہوائی جہاز دھات کے ٹکڑے کی طرف نظر آ رہا تھا۔ وہ پرامن اور فراغت والی پرواز پر تھا اور محسوس یہ ہوتا تھا کہ اس کا ایمرجنسی سائرنوں کی مدد کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ شن زینگ کی ماں کہاں ہے؟ کیا واقعی شن زینگ کا یہ ہی گھر ہے؟ اس کے ذہن میں مبہم سے خیالات پیدا ہوئے۔ بی 29 ہوائی جہاز نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن وہ آسمان کی طرف تکے جا رہا تھا۔ پھر ایک لمبا سائرنگ بجا، اس کا مطلب تھا کہ ہوائی حملہ ختم ہو گیا ہے۔ اسے شن زینگ کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا لیکن ہائیونڈو خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔

سڑک، جو ہوائی حملے کے پیش نظر خالی کرالی گئی تھی درہم برہم تھی۔ نوجوان مردوں کا ایک گروپ جن کے سروں پر سفید کپڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ریلوے سٹیشن کی طرف مارچ کر رہا تھا۔ وہ جاپانی پرچم لہرا رہے تھے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس معمر افراد اور روتی ہوئی عورتیں بھورے چہروں والے افراد کو فاتحانہ نغمے گاتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور سرخ پرچم ہوا میں سرخ رنگ کے دائرے کے لہریئے بنا رہا تھا۔

یہ نوجوان ٹرین کے ذریعے اور بحری جہازوں کے واسطے سے جنوبی پیسفک جزیروں کو جا رہے تھے تاکہ وہاں لڑائی میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔ نوجوان عورتیں ایک غمگین گانے کے مصرعے گا رہی تھیں، میرا محبوب پام کے درخت کے نیچے لیٹا ہوا ہے اور میرے دل میں اس کے بارے میں سوچ کر گرم جوشی پیدا ہو رہی ہے۔ کورین خواتین خانہ نے اپنے کانسی اور سٹیل کے برتن زیر زمین دفن کر دیئے تھے

تاکہ انہیں جاپانی پولیس مینوں اور لوکل کونسلر کے سیکرٹری نمائندوں سے چھپا سکیں لیکن مدارینی جزیروں میں فتح کی خبر کا بچوں کے نزدیک مطلب تھا بے حساب ربڑ، مختلف چیزوں کے انبار اور سفید چینی کے پہاڑوں جیسے بڑے ڈھیر۔

ہر روز لاتعداد خواتین ہائیونڈو کی ماں کے پاس آتی تھیں اور اسے کپڑے پر ایک ٹانکا لگانے کا کہتی تھیں۔ یادگار چوک کے قریب بھی خواتین قریب سے گزرنے والوں سے ایک ٹانکا لگانے کا تقاضا کرتی تھیں اور یہ نظارا ان دنوں بڑا عام تھا۔ اس کا سبب یہ عقیدہ تھا کہ ایک ہزار ٹانکوں والا کپڑا کسی کو بھی موت سے بچا سکتا ہے شرط یہ تھی کہ یہ ٹانکے ایک ہزار مختلف لوگ لگائیں۔ البتہ غلہ فروش کا بیٹا جو ایک ہزار ٹانکوں والا کپڑا لے کر نکلا تھا جنگ میں مارا گیا تھا۔

ہائیونڈو کا ایک چچا بھی ٹرین کے ذریعے وہاں سے گیا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ جاپان میں اسلحہ سپلائی کرنے والی ایک فیکٹری میں مزدوری کرتا ہے۔ وہ تین سال پیشتر گیا تھا لیکن ہائیونڈو کو اس کا وہ چہرہ یاد تھا جو ایک البم کی ایک تصویر میں اس نے دیکھا تھا، یہ تصویر کئی سال پہلے کی تھی۔ اس کے چچا کا چہرہ گول اور ابرو گھنے تھے۔ ایک بار ہائیونڈو کے ماموں، جو ہائیونڈو کے خاندان والوں سے ملنے آئے تھے، نے کہا تھا کہ ہائیونڈو کا چھوٹا بھائی مائیونگڈو بالکل چوہوان کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ چوہوان بچوں کا چچا کا نام تھا۔ اس کی ماں اس بات پر ناراض ہوگئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ نہیں، وہ تو اپنے باپ پر گیا ہے۔ ہائیونڈو نے سن رکھا تھا کہ جونہی اس کا چچا ہسپتال سے باہر آئے گا اسے جبری طور پر بھرتی کرلیا جائے گا۔ وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا، اس لئے نہیں جانتا تھا کہ اس کے چچا کو کون سی بیماری لاحق ہے لیکن اس کے چچا کو یقیناً کوئی شدید بیماری لاحق تھی کہ اسے اتنی لمبی مدت کے لئے ہسپتال میں داخل کرنا پڑا تھا۔ اس کی دادی اماں کو سینے کی جلن کی بیماری تھی اور وہ ہر کھانے کے ساتھ شراب کا ایک گلاس پیتی تھی تاکہ درد سے کچھ تسکین مل سکے۔ لوگ کانا پھوسیاں کرتے تھے کہ اسے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی وجہ سے سینے کی جلن کی بیماری لاحق ہوئی ہے۔ یہ بات یقیناً درست تھی کیونکہ گذشتہ سال نو کے روز جب ہائیونڈو کا کا سارا خاندان دادی کے گھر کھانے کی دعوت پر جمع تھا تو دادی جان نے شراب کے نشے میں روتے ہوئے کہا تھا، ''بچے اپنی کرنی کا پھل ہوتے ہیں لیکن مجھے خود کو خوش قسمت ہی تصور کرنا چاہیے کہ وہ ہوکائینڈو کی کوئلے کی کانوں میں نہیں چلا گیا''۔ خاندان کے لوگ اس کے چچا کے بارے میں بات کرنے

سے احتراز ہی برتتے تھے چنانچہ ہائیونڈو کے نزدیک اس کے چچا کا تصور پراگندہ خیالات پر مبنی تھا اور یہ خیالات رشتے داروں کی حد سے زیادہ سنی گئی سرگوشیوں کی وجہ سے اکٹھے ہوئے تھے تاہم اُس کا ایک احساس یہ بھی تھا کہ اس کے چچا کے بارے میں خاموشی بڑوں کی مضمن سازش ہے اور اس میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔

ہائیونڈو جب کبھی اپنے چچا کو یاد کرتا اور ان کو گھیرے میں لیے ہوئے اسراروں کے بارے میں غور کرتا تو وہ تجسس کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبات بھی محسوس کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں مبہم طور پر نا قابل معافی بھی گردانتا تھا۔ اس کا تعلق یقیناً اس کی اس اضطراری سوچ کے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ ضرور تھا کہ باہر کی دنیا میں کچھ عجیب اور اچانک ہونے جا رہا ہے، کچھ ایسا جسے وہ سمجھ نہیں سکتا یا جس کے بارے میں وہ وضاحت نہیں کر سکتا لیکن اس کو وہ شعوری طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ یہ احساس تھا کہ ایک بڑی لہر آ رہی ہے جو سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور کوئی بھی اس کے سامنے مزاحم نہیں ہو سکے گا یا ہو سکتا ہے یہ کسی تاریخ ساز تبدیلی کی پیش آگاہی ہو، ایک ایسی تبدیلی کا پیشگی احساس جو کبھی کسی نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی ہو۔

وہ جنہیں فوج میں بھرتی کیا جاتا انہیں جاپانیوں کا پرچم لہرائے ہوئے میدان جنگ میں جانا پڑتا تھا اور ہر روز صبح سکول میں وہ ان کیلئے خاموشی سے دعا کرتے تھے جو مقدس فرض کی تکمیل میں مارے گئے۔ بی 29 طیارے اکثر فضا میں نمودار ہوتے اور ان کے سروں پر ایسے چکر لگاتے تھے جیسے گدھ شکار کی تلاش میں ہوں، اسی لمحے خبردار کرنے والے سائرن اپنی پوری آواز سے بجنا شروع ہو جاتے۔ البتہ اس کے باپ کا پلانٹ بڑے تسلسل کے ساتھ دھاتوں کو کاٹ کر جنگی جہازوں کے پرزے بناتا اور توپ کے گولے ڈھالتا رہا۔

موسم بہار کا سورج زوال آمادہ تھا، ہائیونڈو نے گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا، وہ بھوک محسوس کر رہا تھا اور ٹائیلٹ جانے کی حاجت بھی ہو رہی تھی تاہم اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے پاس سے کوئی چیز کم ہے۔ پھر اسے پتہ چلا کہ وہ تو اپنا بستہ ہی شن زینگ کے کمرے میں بھول آیا ہے لیکن شن زینگ کا گھر تو اس کی یادوں سے محو ہو رہا تھا اور کہیں بہت دور واقع تھا۔

اس برس موسم گرما کی چھٹیاں جلد شروع ہو گئیں۔ ہوائی جہاز زیادہ تعداد کے ساتھ ظاہر

ہوتے رہے۔ پہلے پہلے ہوائی جہاز مختصر وقفے کیلئے ظاہر ہوتے اور پھر کہیں غائب ہو جاتے تھے، کسی خبردار کرنے والے اشارے کی طرح لیکن اب وہ کافی نیچی پرواز کرتے تھے، ان کے سروں پر چکر لگاتے اور بڑی فراغت کے ساتھ رخصت ہوتے تھے۔ کبھی کبھی ہائیونڈ کو اپنے گھر کے صحن میں ایک بڑا کاغذ تہہ شدہ حالت میں ملتا تھا۔ یہ نقلیں چھاپنے والی مشین سے تیار کردہ ایک ہینڈ بل ہوتا تھا جس میں کوریا کے عوام سے کہا گیا تھا کہ وہ صبر کے ساتھ سختیاں برداشت کریں کیونکہ جاپانی جنگ ہار رہے ہیں اور جلد ہی شکست تسلیم کرلیں گے۔

ابا جان یہ کہتے ہوئے ان کاغذوں کو چولہے میں ڈالدیا کرتے تھے کہ ''جاپان اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہے''۔

جب ہوائی حملے بہت زیادہ بڑھ گئے تو ہائیونڈ و اور پانچ سالہ سنگڈ و کو بندرگاہ کے قریب دادی دادی کے گھر بھجوا دیا گیا۔ بم باری کے خوف اور اشیائے ضروریہ کی قلت کے باعث پوری دنیا بدحالی کا شکار تھی لیکن ان دنوں میں بھی بحری جہاز گودام بھر بھر کر مچھلیاں لے کر آتے تھے۔

ہائیونڈ و دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد لکڑی کے فرش والے کمرے میں سو گیا اور اس وقت اٹھا جب شام ہو رہی تھی۔ سنگڈ و برہنہ واش بیسن میں کھیل رہا تھا اور پانی کے چھینٹے اڑا رہا تھا۔ آسمان اور سمندر ڈوبتے سورج کی کرنوں کے باعث سرخ ہو رہے تھے اور سمندر میں گرتا ہوا سورج آگ کے ایک بڑے گولے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ سونے کے دوران ہائیونڈ و پسینے سے شرابور ہو گیا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ مچھلیوں کی چبھنے والی باس جو اس کے دادا، دادی کے گھر میں ہر وقت پھیلی رہتی تھی، اس کے ساتھ چمٹ گئی ہے۔ سورج غروب ہو گیا اور سمندر کی طرف سے ہوا کے جھونکے آنے لگے لیکن گرمی کی شدت کم نہ ہوئی۔ لکڑی کے فرش پر بیٹھے بیٹھے اس نے حیرت میں مبتلا ہو کر اپنے ذہن میں ایک سوال کیا ''یہ صبح ہے یا شام ہو رہی ہے'' اور پھر اندازہ لگانے کیلئے شفق کی سرخی سے لال سمندر کی طرف نظریں گاڑھ کر دیکھنے لگا۔ گھر کے پچھواڑے نوکرلڑکا یونگ میونگ بڑے جذباتی انداز میں ایک معروف گانا گا رہا تھا۔ وہ یقیناً فرش پر لیٹا ہو گا اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہوں گی اور اپنے پیروں کو گانے کے ردھم کے ساتھ ہلا رہا ہو گا۔ ہائیونڈ و جانتا تھا کہ ان دنوں جب دادا جان گھر پر نہیں ہوتے سولہ سالہ یونگ میونگ خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا تھا اور سارا دن گراموفون پر گانے سنتا رہتا یا پھر شیشہ ہاتھ میں پکڑ کر چہرے سے

کیل نکالتا رہتا۔ اگر دادی ماں اس کی سرزنش نہ کریں تو وہ ساری رات گراموفون ہی سنتا رہے۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی پھر بھی ہائیونڈ وہ کارڈ ہاتھ میں لے کر باہر آ گیا جو اس نے اس صبح کارڈ بورڈ کاٹ کر بنائے تھے اور برآمدے کے ایک کونے میں رکھ دیئے تھے۔ وہ بادشاہ اور اکے کا پتہ اپنے دوست سنجائی کو دینا چاہتا تھا۔ سنجائی اس کا ہم عمر تھا اور جب وہ اپنے دادا دادی کے گھر میں ٹھہرتا تو اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ سنجائی کا باپ ایک بوڑھا ماہی گیر تھا اور کبھی کبھی دادا جان کے بحری جہاز پر ہی مچھلیاں پکڑنے جاتا تھا لیکن اس کے عیسائی ہونے کی وجہ سے دادی جان نے اس سفر میں شامل ہونے کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ ایک ہی کواڑ پر مشتمل اس کے گھر کا بڑا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہائیونڈ و اندر کے کمرے سے چھن کر باہر آنے والی روشنی دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے بار بار پکارنے پر بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ صحن کا چکر لگا کر وہ باورچی خانے کے باغ کی طرف گیا جو گھر کے پچھلے جنگلے کے بالکل باہر واقع تھا۔ وہ کچے فرش پر جوتوں کے بہت سے جوڑے دیکھ سکتا تھا جو اندرونی کمرے کے باہر پڑے تھے، لیکن کمرے میں سے صرف ایک آدمی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دھیمی لیکن پرشوق آواز میں بولے جانے والے آزادی، قوم، خودمختاری جیسے الفاظ کا ادراک کر سکتا تھا۔ اس نے وہ رٹنا شروع کر دیا لیکن پھر وہ پیچھے مڑا اور اس نے سنجائی کا نام پکارا۔ اس نے اپنی آواز مدہم رکھی کیونکہ وہ سوچتا تھا کہ وہ کسی ممنوع علاقے میں دراندازہے۔

اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور صحن میں روشنی پھیل گئی۔ ''کون ہے؟'' ایک غیر شناسا آواز نے پوچھا۔ میں سنجائی کا دوست ہوں'' ہائیونڈ و نے متذبذب لہجے اور آواز میں جواب دیا، اسے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ روشنی کے اس سیلاب میں بالکل ننگا کھڑا ہے۔ سنجائی نے اپنا سر باہر نکالتے ہوئے کہا'' یہ میرا دوست ہائیونڈ و ہے''۔ ''یہ جہاز کے مالک کا پوتا ہے''۔ سنجائی کے والد نے بھی اس بات چیت میں حصہ لیا ''تم یہاں کتنی دیر سے کھڑے ہو''؟ پہلی آواز نے تھوڑے سے وقفے کے بعد دریافت کیا۔ ''تھوڑی دیر ہوئی ہے'' ہائیونڈ و نے جواب دیا۔ ''تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا''؟ آواز نے دریافت کیا۔ ''نہیں میں اکیلا ہوں'' ہائیونڈ و نے جواب دیا''۔ اندر آجاؤ''۔ آواز نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ جب ہائیونڈ و نے کچے فرش پر قدم آگے بڑھائے تو اس آواز کے مالک نے باہر دیکھا۔ یہ ایک نوجوان کا چہرا تھا لیکن اس کی آنکھیں تیکھی اور تیز تھیں۔ اس کے کالے کٹے ہوئے بال سیدھے کھڑے تھے۔ ''تم میرے کچھ سوالوں کے جواب دے سکتے ہو''؟ اس نوجوان آدمی نے ہائیونڈ و کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

دریافت کیا۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہائیونڈو منہ سے کوئی آواز نہ نکال سکا اور اس نے صرف ہاں میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

''تمہاری عمر کیا ہے؟''نوجوان نے اس سے پوچھا،اس کی آنکھوں کا تیکھا پن کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

''نو برس''

''کیا تم کورین ہو؟''

''ہاں''

''کیا تم واقعی کورین ہو''نوجوان نے مختصر سے وقفے کے بعد پھر دریافت کیا۔

ہائیونڈو نے محسوس کیا کہ ایک گرم گولہ اس کے سینے سے اوپر گلے کی طرف چڑھ رہا ہے،اس نے اپنی آہ کو دباتے ہوئے صرف اتنا جواب دیا''ہاں''

''ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہو جائے۔اہم چیز ہماری قومی شناخت کے بارے میں باشعور ہونا ہے۔کیا تم سمجھتے ہو؟''

''ہاں''

''اچھی بات ہے،اندر آ جاؤ،بچوں کو بھی سیکھنا چاہیے''۔

ہائیونڈو اوپر کمرے میں چلا گیا اور سنجائی کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔اس چھوٹے سے کمرے میں موجود درجن بھر لوگوں میں سے صرف سنجائی اور اس کے والدین کو جانتا تھا۔زیادہ تر نوجوان مرد تھے تاہم چند نوجوان عورتیں بھی تھیں۔ایک بائبل اور ایک حمد یہ گیتوں کی کتاب ان میں سے ہر ایک کے سامنے پڑی تھی لیکن کھلی ہوئی نہیں تھی۔ہائیونڈو کے آنے کی وجہ سے بات چیت کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گیا''......اور وہ تباہ ہو گیا۔سوڈوم اور قدیم گومورہ کی طرح۔وہ خوفناک روشنی کی دھار یہودا کی نظر کے سوا کچھ نہ تھا وہ چاندی کے اسلحہ اور ہیلمٹ زیب تن کئے دنیا کا جائزہ لینے کیلئے آیا تھا۔وہ بھی یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سزا ہے کہ جس کے باعث اتنے بڑے شہر کو ایک بڑی بھٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔وہ یہ یقین کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے کہ یہ انسانی ذریعے سے ہوا ہے۔جاپان اب تبدیل ہو چکا ہے،اسے اس کے گناہوں کی سزا مل چکی ہے وہ جاپانیوں کو مانچوریا سے

کوریا منتقل کر رہے ہیں تا کہ انہیں واپس جاپان بھیجا جا سکے''۔ لوگ اس نوجوان کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہے تھے۔ ہائیونڈو سانس لینے میں دقت محسوس کر رہا تھا اور اُس کے سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور خطرہ یہ تھا کہ وہ اس کی پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر باہر نہ نکل آئے۔ لیکن وہ اس درد کو واضح طور پر سمجھ نہیں سکتا تھا جو اس نوجوان کی گہرائی میں اتر جانے والی نظروں کے باعث شروع ہوئی تھی اور جو اس کی قومی شناخت کے سوال پر شدت اختیار کر گئی تھی۔

تھوڑی دیر کی بارش کے بعد سورج نکل آیا اور اب وہ بڑی رحمی کے ساتھ آگ برسا رہا تھا۔ صحن میں ایک انچ سایہ بھی نہ تھا۔ وہ کیچوے جو بارش کے دوران زمین سے باہر نکل آئے تھے اب دھوپ کی تپش سے بھنے جا رہے تھے۔ دادا جان صحن کے وسط میں لگے ہوئے نلکے کے قریب اپنا سر مونڈھ رہے تھے۔ اپنا استرا، جو انہوں نے سان پر رگڑ کر تیز کیا تھا، اپنی ہتھیلی پر چیک کرنے کے بعد وہ مطمئن نظر آ رہے تھے۔ پھر اپنے بائیں ہاتھ کے ساتھ کھوپڑی کو دبانے کے بعد انہوں نے دائیں ہاتھ سے سر مونڈھنا شروع کر دیا۔ پیشانی سے شروع کر کے وہ اوپر سر کی چوٹی تک چلے گئے۔ جہاں استرا چلا تھا وہاں ایک چمکدار پٹی ظاہر ہو گئی تھی اور ان کے گھنگھریالے بالوں کے کنڈل ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

ہائیونڈو نے سن رکھا تھا کہ دادا جان نے پہلی مرتبہ سر اُس وقت مونڈا تھا جب چون اُن سلسلہ کے حکمرانوں کے دور میں سر کے اوپر قدرتی بالوں کا جوڑا بنانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد کی زندگی انہوں نے سر مونڈ کر کسی بدھ راہب کی طرح گزاری تھی۔

''شیشہ لے کر آؤ'' دادا جان نے ہائیونڈو سے کہا۔ ہائیونڈو نے ایک ستون کے ساتھ لٹکا ہوا آئینہ اتارا اور پکڑ کر دادا جان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اپنے سر کے پچھلے حصے پر نظر ڈالنے کیلئے دادا جان نے گردن گھما کر دیکھنے کی کوشش کی پھر بڑی احتیاط کے ساتھ سر کے پچھلے حصے پر استرا چلاتے ہوئے خود کلامی کی ''بے وقوف چڑیل''۔ سر کے پچھلے حصے کو استرے سے مونڈنا دادی جان کا کام تھا لیکن اس وقت وہ گھر پر موجود نہ تھیں۔ ممکن ہے دادا جان نے یہ الفاظ اپنی بیوی کے لئے نہ کہے ہوں اور وہ سارا الزام اپنی بیٹی کو دے رہے ہوں۔ دادی جان اپنی بیٹی کے ہاں گئی ہوئی تھیں کیونکہ ان کا داماد جو بغیر کچھ کہے گھر سے چلا گیا تھا اب تین مہینے بعد واپس آیا تھا اور اُن کی بیٹی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ افواہ یہ تھی کہ وہ موؤنٹ پائیکڈو میں کاٹھ کباڑ کاٹنے کا کام کرتا اور ایک فاحشہ کے ساتھ رہتا تھا۔ دادی صبح سویرے ہی اپنے پانچ سالہ

پوتے کے ساتھ اپنی بیٹی کے گھر چلی گئی تھی۔

جب دادا جان نے سر مونڈنے کا کام مکمل کر لیا تو پھر پونگ میونگ نے ان کیلئے نلکے سے پانی نکالا۔ دادا جان نے ایک دم سے برتن میں اپنا سر نہیں ڈبویا اور سر کو نیچے کر کے پانی کو دیکھتے رہے۔ ''کیا وہ جھاگ کے بیٹھنے کا انتظار کر رہے تھے؟'' ہائیونڈ و نے غیر حاضر دماغی کے ساتھ سوچا۔ لیکن بوڑھا آدمی اس جھکی ہوئی حالت میں بے حس وحرکت کھڑا رہا جبکہ اس کے دونوں ہاتھوں نے برتن کے کنارے تھام رکھے تھے۔ کیا پانی میں کوئی غیر مانوس چیز تھی؟

''دادا جان، کیا میں پھر سے پانی نکالوں'' پونگ میونگ نے نلکے کا ہینڈل پکڑے ہوئے تذبذب کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں، کوئی بات نہیں'' دادا جان نے برتن میں نظریں گاڑے ہوئے ہاتھ ہلا کر اس کا جواب دیا۔ برتن میں روشنی کی کرنیں ایسے تیر رہی تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں پر سے منعکس ہو رہی ہوں۔ ارے ہاں، ہائیونڈ و نے سوچا کہ دادا جان برتن میں آسمان، بادل اور اپنے چہرے کا عکس دیکھ رہے تھے۔ ہائیونڈ و کا بھی بیسن میں اپنا چہرہ دیکھنا اچھا لگتا تھا اور اکثر تضیع اوقات کی وجہ سے ماں سے جھڑکیاں بھی پڑ جاتی تھیں۔ پانی میں اس کا چہرہ کس قدر عجیب سا نظر آتا تھا اور آسمان، گھر، درخت اور دنیا پانی کے بیس میں الٹے کھڑے ہوئے کسی دیو کی طرح کس قدر پر اسرار اور جامد نظر آتے تھے۔

''پونگ میونگ میرے لئے مچھلیاں پکڑنے والا ڈنڈا لے کر آؤ''، دادا جان نے تولیے سے اپنے سر کو پونچھتے ہوئے آواز لگائی۔

''مچھلیوں کے شکار پر جانے کیلئے، لیکن آج تو بڑی گرمی ہے'' نوکر لڑنے نے اپنی رائے دی اور ساتھ ہی اپنے مالک کے ہاتھ میں مچھلیاں پکڑنے والا ڈنڈا پکڑا دیا اور ایک بالٹی میں سرخ مچھلیوں کا پیسٹ، کچھ سبز مرچیں اور کیتلی پھر چاولوں کی شراب پیک کر دی۔

''تم میرے ساتھ چلنا چاہو گے؟'' دادا جان نے ہائیونڈ و سے پوچھا اور ہائیونڈ و نے ''ناں'' میں سر ہلا دیا۔ پونگ میونگ نے اسے ناشپاتی کے درخت سے جھینگر پکڑ کر دینے کا وعدہ کیا تھا، اس کے علاوہ وہ سمندر میں جانے سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا۔

''میں زیادہ دیر وہاں نہیں رہوں گا'' دادا جان نے کہا۔

MashalBooks.com

سمندر میں استادہ کیا گیا لکڑی کا عرشہ بالکل قریب ہی تھا۔ ہائیونڈو نے اپنے دادا کی ایک جھلک دیکھی۔ انہوں نے پٹ سن کی رسیوں سے بنی زرد رنگ کی شرٹ اور بنیان پہن رکھی تھی اور وہ اپنی شراب کی کیتلی ہاتھ میں لٹکائے سمندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دادا جان کی کشتی فراٹے بھرتی ہوئی سمندر میں غائب ہوگئی اور اپنے پیچھے پانی کی ایک واضح لکیر چھوڑ گئے۔

بارش کے بعد سمندر بالکل صاف تھا لیکن سورج اتنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا جیسے سمندر کا سارا پانی سکھا دے گا اور باقی بچے گا نمک کا ایک بہت بڑا ڈھیر۔ یونگ میونگ، جو بوڑھے آدمی کی روانگی کے سارے عمل کا نظارا کر رہا تھا، نے ان کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد خود کلامی کی ''کاش میں انہیں ان کا تنکوں والا ہیٹ دے دیتا''۔

کشتی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی، جیسے اس نے سمندر میں غوطہ لگا دیا ہو۔ کشتی کے تیزی سے گزرنے سے بننے والی نشیب و فراز والی لکیر پہلے غیر واضح اور پھر مکمل طور پر غائب ہوگئی۔

دوپہر کے بعد کا وقت تھا جب ایک فیری بوٹ کشتی کو دھکیل کر ساحل سمندر پر لائی۔ یہ فیری بوٹ بندرگاہ اور آکس جزیرے کے درمیان چلتی تھی جو دس میل کے فاصلے پر تھا۔ فیری پر کام کرنے والے آدمی نے ساری صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''میں نے یہ کشتی سو آئی جزیرے کے سامنے دیکھی، یہ جزیرہ راستے میں پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا ایک معمر آدمی اس میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے ھاپنے مسافروں کو آکس جزیرے پر چھوڑا، کھانا کھایا اور تھوڑی دیر کیلئے آرام بھی کیا، واپسی پر میرے پاس کوئی مسافر نہ تھا۔ واپسی پر بھی میں نے کشتی اسی جگہ دیکھی جہاں چند گھنٹے پہلے دیکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی کشتی کی دیوار کے ساتھ سر لگائے آرام کر رہا ہے۔ یہ سوچ کر کہ وہ آرام کر رہا ہوگا میں نے وہاں سے خاموشی سے گزر جانا ہی مناسب خیال کیا لیکن پھر ایک عجیب سی کیفیت نے مجھ پر غلبہ کر لیا چنانچہ میں نے چند بار اسے آواز دے کر بلایا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا چنانچہ میں اس کے قریب چلا گیا......''۔

کیتلی آدھی خالی ہو چکی تھی اور مچھلیاں پکڑنے والا راڈ ابھی تک استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس علاقے میں رواج یہ تھا کہ جو لوگ گھر سے باہر مر جاتے تھے، خاص طور پر وہ لوگ جو سمندر میں کسی حادثے کا شکار ہو کر ہلاک ہو جاتے تھے، انہیں گھر کے اندر نہیں لایا جاتا تھا چنانچہ بوڑھے دادا کو بھی ساحل سمندر پر ہی لٹا دیا گیا۔ اس کا جسم بھیگا ہوا نہیں تھا، کہیں کسی زخم کا بھی کوئی نشان نہ تھا البتہ اس کے چہرے پر نیلے

رنگ کے دھبے تھے جب کہ نچلا ہونٹ مسلا ہوا اور پھولا ہوا تھا جیسے اسے زور سے کاٹا گیا ہو۔

پونگ میونگ نے اپنی بائیسکل نکالی اور تذبذب کی حالت میں چند بار پمپ چلانے کے بعد تیزی سے قصبے کی طرف نکل گیا۔ سارا گاؤں اپنے گھروں سے نکل آیا اور سب بوڑھے کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ہائیونڈو نے اس جمگھٹے کو چھوڑا اور خاموشی سے گھر آ گیا۔ اس نے صحن میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ صحن میں ابھی تک کافی روشنی تھی اور دھوپ کی کرنیں کافی تیکھی تھیں اگرچہ گرمی کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ صحن میں دادا جان کی ریزر کے ساتھ سر مونڈھنے سے پیدا ہونے والی آواز گونج رہی ہیں اور وہ منظر لہرا رہا ہے جب وہ غیر حاضر دماغی کے ساتھ پانی کے بیسن میں نظریں گاڑھے ہوئے تھے۔

ہائیونڈو نے ستون کے ساتھ لٹکا ہوا آئینہ بھی دیکھا، وہ اسی طرح تھا، جس طرح دادا جان اسے استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ ایک خوفزدہ چہرے والے لڑکے کو دیکھ سکتا تھا اور اس کے پیچھے جھاگ اڑاتے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے سمندر کو بھی۔ اس نے آئینے کو چھوڑ دیا اور باورچی خانے، بڑے کمرے، دوسرے کمرے اور بیرونی کواٹروں میں جھانکا۔ حتیٰ کہ اس نے تاریک اور مرطوب اناج والے کمرے میں بھی دیکھا حالانکہ اس کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی قطبی بلا چھپا ہوگا، جسے عام طور پر خرگوش وغیرہ پکڑنے کیلئے پالا جاتا ہے۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ شام ہونے والی ہے کیونکہ ناشپاتی کے درخت سے جھینگر کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ وہ درخت پر چڑھ گیا۔ ناشپاتی کے اس درخت پر اب پھل نہیں لگتا تھا لیکن اب بھی اس پر اتنے پتے موجود تھے کہ انہوں نے اسے اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ وہ جہاں پر بیٹھا تھا وہاں درخت کا تنا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ اس نے درخت کے پتوں میں سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی سنہری کرنوں پر نظر ڈالی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے پرانے گھر، بوسیدہ پکی ہوئی اینٹوں کے چھت اور سمندر کو بھی دیکھا جو سیسے کا سا ہلاکت خیز رنگ لئے ہوئے تھا۔ اپنے گال کو شاخ کے ساتھ لگاتے ہوئے اس نے اپنا پورا وزن اس شاخ پر ڈال دیا۔ ناشپاتی کے درخت کی کھردری چھال نمکین محسوس ہوئی، برس ہا برس تک سمندر کی ہوا کے تھپیڑے سہنے کی وجہ سے اس کی چھال نمکین ہو گئی تھی۔ اپنی زبان باہر نکال کر اس نے چھال کو چاٹا تو اسے کسی وجہ سے یہ عمل آرام اور آسودگی کا باعث محسوس ہوا۔ وہ آگے کھسکنے کیلئے کسی ہموار جگہ کی تلاش میں تھا کہ اسے اپنے بالکل اوپر ایک جھینگر نظر آیا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ہاتھ پھیلائے جھینگر، جو دن آوازیں نکالنے کے

بعد آرام کر رہا تھا بغیر کسی مزاحمت کے اس کے ہاتھ پر آ گیا۔اس نے جھینگر کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور انگلی کے ساتھ اسی کے سینے کو گدگدایا، جھینگر نے اپنے پیٹ کو تھرتھراتے ہوئے اپنی پوری آواز کے ساتھ چیخنا شروع کر دیا۔ پتے ہل رہے تھے اور ان میں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اس نے جھینگر کو گدگدانا جاری رکھا اور جھینگر نے بھی آوازیں نکالنے کا کام جاری رکھا اور دونوں یہ غروب آفتاب تک کرتے رہے۔اس نے محسوس کیا جیسے عظیم الجثہ درخت اور اس کا اپنا جسم، اپنے تمام اندرونی اعضاء کے ساتھ ایک بہت بڑے ارتعاش پیدا کرنے والا صندوق بن گئے ہیں اور جھینگر کی آواز کو لرزا رہے ہیں۔ ساحل پر بہت زیادہ لوگ جمع ہو گئے تھے۔اس نے نئی بنی ہوئی شاہراہ پر ایک ٹیکسی کو بھاگتے ہوئے اور پھر سے دروازے کے پاس رکتے ہوئے دیکھا۔اس میں سے اس کی ماں اور باپ باہر نکلے تھے۔اس کا چھوٹا بھائی مایوگلڈ واس کی ماں کی پیٹھ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ہجوم نے اس کے ماں باپ کو آگے آنے کیلئے جگہ دے دی۔ باپ دادا جان کے مردہ جسم کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ماں گھر کے اندر چلی گئی، وہ زار وقطار رو رہی تھی۔ وہ باورچی خانے کے اندر گئی لیکن جلد ہی باہر نکل آئی۔ اس نے ہر کمرے میں جھانکا اور پھر باہر کی طرف بھاگی۔''ماں میں یہاں ہوں'' ہائیونڈو نے آواز دی لیکن غالباً ماں نے سنا نہیں تھا۔جھینگر کی آواز سے پریشان ہو کر ماں کے ساتھ اندر آنے والی ایک عورت نے ایک پتھر اٹھا کر درخت کی طرف اچھالا، جو درخت کی ایک شاخ کے ساتھ ٹکرا کر واپس زمین پر گر گیا۔ جب اس کی ماں کا ہیولا باہر اکٹھے ہوئے ہجوم کے حصہ بن کر اس میں غائب ہو گیا تو ہائیونڈو نے اپنی مٹھیاں اتنی سختی کے ساتھ بھینچ کر ''ماں'' پکارا، کہ کوئی چیز اس کے ہاتھ میں مسلی گئی تھی اور اس کی ہتھیلی بیروزے جیسے کسی مائع کے ساتھ چپچپی ہو گئی تھی۔ وہ آواز جس نے زمین کو مرتعش کیا ہوا تھا خاموش ہو چکی تھی اور اس سے پیدا ہونے والے خلا کو خاموشی نے گھیر لیا تھا۔تنہائی اور خوف کی وجہ سے اس نے رونا شروع کر دیا۔ کچھ حشرات اڑتے ہوئے درختوں کے پتوں کے درمیان اندر داخل ہوئے تا کہ وہاں رات بسر کر سکیں۔

لاش دو دن بعد دفن کی گئی۔ اسے گھر کے اندر نہیں لایا گیا تھا۔موسم مسلسل گرم جا رہا تھا۔ بوڑھے کے مرنے کی وجہ لوگ جانا شناخت کی گئی تھی لیکن اس کی بوڑھی بیوی کو مکمل یقین تھا کہ اس کے شوہر کی موت جنت سے آنے والے مکافات عمل کا نتیجہ ہے۔اس سارے عرصے کے دوران دادی ماں سفید چاول پکا کر سمندر میں پھینکتی رہیں تا کہ ان کی خیر سگالی حاصل کر سکے۔اس معمر خاتون کا خیال تھا کہ

بوڑھا اپنی زندگی میں ان میں سے بہت سی مچھلیوں کو پکڑ کر ان کے غضب کا شکار ہوا تھا اور اس کے اچانک مرجانے کی یہی وجہ تھی۔

بوڑھے دادا کی اچانک موت نے بہت سے سوالوں اور بہت سے اندازوں کو جنم دیا لیکن بوڑھے دادا جان محسوس ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت اپنے ہی انداز میں کرتے تھے۔ ان کی قبر پر پہلی دعا پڑھنے کے بعد سوگوار خاندان، جن میں بچے بھی شامل تھے بڑے کمرے میں جمع ہو گیا۔ دادی جان نے الماری سے حفاظتی ڈبہ اور چھوٹا سا لکڑی کے دروازے والا ایک صندوق نکالا۔ یہ وہ چیزیں تھیں، دادا جان کی زندگی میں جن کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا تا تھا۔ مذہبی رسومات ادا کرنے والے کسی راہب کی طرح ابا جان نے وہ بکس دادی جان سے لئے اور انہیں کھولا۔ سیف میں نکل کے سکوں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ کچھ ایک اور دس ون کے نوٹ بھی تھے۔ کوئی حیرت اور تعجب نہ ظاہر کرتے ہوئے ابا جان نے سیفٹی باکس ایک طرف دھکیل دیا۔ لکڑی کے بکس میں پانچ نوٹ بکس تھیں جو بہت گھسی پٹی تھیں۔

"یا خدایا، یہ کیا ہے" ابا جان نے حیرت سے آواز نکالی۔ انہوں نے جلدی سے ایک نوٹ بک کے ورق الٹے، اسے نیچے رکھا، دوسری اٹھائی اور جلدی جلدی اس کے صفحوں پر بھی نظر ڈالی، وہ اپنے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے تیز تیز ورق الٹتے جا رہے تھے۔ دادی جان، ماں اور پھوپھو جو تصنع آمیز امتیاز کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں، میں سے ہر ایک نے ایک ایک نوٹ بک اٹھائی اور اس کے صفحوں پر نظر ڈالی۔ ان کے چہروں پر وحشت اور اضطراب پھیل گیا۔ بوڑھے آدمی کی نوٹ بکس، جو دوروں نزدیک قرضے دینے کے کھاتوں کی تفصیلات پر مبنی نوٹ بکس کے طور پر جانی جاتی تھیں، عجیب و غریب قسم کے اشاروں اور نشانات سے بھری ہوئی تھیں، جن کا معنی اور مطلب کسی کو معلوم نہ تھا۔

"خبطی بوڑھا" اب ہم ان کے ذریعے کسی سے بھی رقوم کیسے واپس حاصل کریں گے؟ دادی نے یہ کہا اور نوٹ بکس فرش پر لڑھکا دیں جبکہ ابا جان نے نہایت تلخ مایوسی کے انداز میں اپنے ہونٹ مسوسے۔ ایس لمحے یونگ مایونگ دھم سے گھر کے اندر داخل ہوا اور بھاری آواز سے چلایا "جلدی سے ریڈیو آن کرو، وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم آزاد ہو گئے"۔

جاپانیوں کے ہسپتال اور دکانیں اور زیادہ تر چھوٹے سٹور، جو بڑی سڑک کے اطراف واقع تھے، بند تھے، لوگ ایک کے بعد ایک ہر دن یادگار چوک کے اطراف اکٹھے ہو رہے تھے حالانکہ انہیں وہاں

کوئی خاص کام نہ ہوتا تھا۔ وہ محتاط لوگ جو اس خوف کے ساتھ گھروں میں مقید رہے کہ جاپانی حکمرانی سے آزادی کی خبر یقیناً کسی قسم کا جال یا پھندا ہے، چند روز کے بعد گھروں سے نکل آئے۔ جب بھی غیر یقینی صورتحال پیدا ہوتی یا تبدیلی کی ہوا چلتی اس قصبے کے رہنے والے لوگوں کا ہمیشہ یہی طرز عمل ہوتا تھا کہ وہ یادگار چوک میں اکٹھے ہو جاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یادگار چوک میں وہ جو کچھ دیکھتے، سنتے یا جن کی ٹوہ لیتے تھے اس سے ان کی زندگیاں متاثر ہونے والی ہیں۔

''خدا کے لئے گھر میں بیٹھے رہو، اس کی ماں اسے روزانہ نصیحت کرتی لیکن روزانہ ہی صبح ناشتہ کرنے کے فوراً بعد ہائیونڈو اس چوراہے کی طرف دوڑ پڑتا تھا۔

رضا کار محافظ جاپانی ہتھیاروں سے مسلح تین اور پانچ کی ٹکڑیوں میں قصبے کی سڑکوں پر گشت کرتے تھے۔ ان سب نے بازوؤں پر سرخ رنگ کی پٹیاں باندھ رکھی ہوتی تھیں۔ ایک بھی جاپانی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جھاڑو لگا کر ان کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ بہت سے جاپانی خفیہ پناہ گاہوں میں جا چھپے تھے اور یہ بھی سنا گیا کہ ایسا نہیں ہے، ان میں سے کچھ نے خودکشی کر لی ہے۔ شنٹو مندروں اور پولیس سٹیشنوں، جنہیں ایک غضبناک ہجوم نے آگ لگا دی تھی، سے اٹھنے والے شعلوں نے رات کے وقت آسمان کو سرخ بنا دیا تھا۔ لوگ جاپانیوں کے خالی گھروں پر پل پڑے اور وہاں سے فرنیچر و کچن کا سامان اور ملبوسات وغیرہ لے کر باہر نکلے۔ ان کا کہنا تھا کہ لکڑی کے فرش کو کیچڑ آلود جوتوں سے پامال کرنا، کھڑکیوں کو توڑنا اور گھریلو استعمال کی چیزیں توڑنا پھوڑنا بربریت نہیں ہے بلکہ یہ محض انتقام اور مکافات کا عمل ہے۔ وہ اس عمل کو فرض سمجھ کر اور مناسب تصور کر کے احترام کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ اس دشمن کو سزا دی جانی چاہیے جس نے انہیں دبائے رکھا اور استحصال کرتا رہا۔

ہائیونڈو کا سکول رضا کار سیکورٹی گارڈز کے لئے تربیتی کیمپ بنا دیا گیا حالانکہ گیٹ پر ابھی تک ''ہائیر یونٹ کا پہلا پرائمری سکول'' کی تختی لٹک رہی تھی۔ اپنے دوست کے ساتھ دیوار پر چڑھ کر اور تھوڑی دیر رضا کاروں کو تربیت حاصل کرتے دیکھنے کے بعد ہائیونڈو یادگار چوک کی طرف چل پڑا۔ وہاں اس نے مردوں کے ایک گروپ کو چلاتے ہوئے اور اسلحہ لہراتے ہوئے دیکھا۔ جاپانی پولیس چیف، جو اپنا پاجامہ پہنے ہوئے تھا، کو اس طرح سے لے جا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سختی سے باندھے ہوئے تھے۔ پولیس چیف کو پولیس سٹیشن کے اندر لے جایا گیا اور پھر دروازے بند کر دیئے گئے، اس کے باوجود لوگ وہاں سے

منتشر نہیں ہوئے، وہ چلائے جا رہے تھے کہ اس کو یادگار چوک میں اتنا مارا جانا چاہیے کہ یہ مر جائے۔

''مجھے حیرت ہے کہ شن زینگ کے ساتھ کیا ہوا ہوگا اور اس کی ماں کے ساتھ کیا بنی ہوگی؟ کیا وہ بھی دوسرے جاپانیوں کی طرح فرش کے نیچے چھپے ہوئے ہیں یا پھر انہیں گرفتار کر کے کہیں بھیج دیا گیا ہے؟ یا ممکن ہے انہوں نے خوش کشی کر لی ہو؟'' یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات ہائیونڈو کو حیرت میں مبتلا کر رہے تھے لیکن اس نے اپنے سر کو جھٹک دیا اور یہ تصور کیا کہ وہ اس موسم بہار کے اختتام کی طرح یقینی طور پر آرام سے رہ رہے ہوں گے۔ ''میرے گھر چلو، ماں نے کہا ہے کہ اس نے ہمارے لئے میٹھی سرخ پھلیوں کی پورج بنائی ہے''۔ شن زینگ نے چھٹیوں سے پہلے آخری روز اس کی آستین کھینچتے ہوئے کہا تھا لیکن ہائیونڈو نے سختی سے انکار کر دیا۔ مایوسی اور پریشانی کے ساتھ ہائیونڈو کے اس درشت رویے کو دیکھ کر شن زینگ نے اس کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ وہ اس موسم گرما میں جاپان جا رہا ہے، وہاں ایک بڑے ہسپتال میں اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس انکشاف کے ذریعے وہ ہائیونڈو کی دوستی دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے ہائیونڈو سے کہا تھا کہ وہ آپریشن والی بات کسی کو بھی نہ بتائے۔

لیکن ہائیونڈو شن زینگ کے گھر نہیں گیا۔ شن زینگ کا کبڑا پن اسے اس سے دور کرتا اور پریشان کرتا تھا یا ممکن ہے اپنے اس نازک دوست کے گھر بتائی ہوئی موسم بہار کے آخری دنوں کی اس سہ پہر کا اثر تھا جس نے اس کے لاشعور میں بہت گہرائی میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ یہ کسی احساس کے گہرے کنوئیں کو چھونے جیسا تھا اور اس نے اسکے دل پر اثرات چھوڑے تھے اور اسے اس کی بنیاد کی حقیقت کے ساتھ تعلق جوڑنے کے حوالے سے خوفزدہ کر دیا تھا۔ یا ممکن ہے یہ وہ گرم جوش احساس ہو جو اس کے سینے میں موسم گرما کی اس رات کو پیدا ہوا تھا جب وہ اپنے ایک اور دوست کے گھر میں تھا اور اس نے اپنی کورین قومیت کی تصدیق کی تھی، ایک غیر مرئی آواز کے ردعمل میں جس نے موسم بہار کے کسی زور سہ پہر کے وقت مختصر وقفے کے لئے ایک پراسرار خاموشی سے ہم آغوش ہونے کی تردید کی تھی۔

ہائیونڈو چوراہے کے پچھوارے واقع جاپانی گھروں کی قطار کی طرف گیا اور شن زینگ کے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ گلی ٹوٹے ہوئے گملوں اور شیشوں سے اٹی پڑی تھی۔ تقریباً سبھی گھروں کے گیٹ اکھڑے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ پراسرار طور پر خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے، خالی گھروں کی مانند، ہائیونڈو دیکھ سکتا تھا کہ شن زینگ کے گھر کا گیٹ بھی گرا ہوا ہونا چاہیے لیکن وہ محض اس لئے کھڑا تھا

کہ اس کو اندر سے سہارا ملا ہوا تھا۔ ہائیونڈو نے ایک ہاتھ سے دھکیلا تو گیٹ آسانی سے کھل گیا۔ پورچ میں شن زینگ کے جوتے اور لکڑی کی کھڑاویں پڑی ہوئی تھیں، ہائیونڈو ان چیزوں کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ گیٹ کھولے جانے کا کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو ہائیونڈو نے آہستہ آواز میں شن زینگ کا نام پکارا۔ سارا گھر خالی پڑا تھا۔ کیا اس کے اندر کوئی ایسی طاقت تھی جو خوف سے زیادہ طاقتور تھی؟ ہائیونڈو جوتوں سمیت لکڑی کے فرش پر چڑھ گیا۔ فرش پر پہلے بھی خاک آلود قدموں کے نشانات موجود تھے۔ کچن کے دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کچن کے فرش پر ٹوٹی اور بکھری ہوئی پلیٹیں اور ٹوٹی ہوئی الماری دیکھ سکتا تھا۔

ہائیونڈو نے شن زینگ کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہاں کوئی نہ تھا، کپڑوں کی الماری کا دروازہ بھی توڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میز کی درازوں کو کھینچ لیا گیا تھا اور اس میں پڑے کپڑے اب فرش پر بکھرے نظر آ رہے تھے۔ اس نے کمرہ پار کیا اور گھسٹ کر کھلنے والے دروازے کو کھولا۔ شن زینگ کی ماں، گھسٹ کر کھلنے والے دروازے کے بالکل دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی، نے حیرت کے کسی آثار کے بغیر آہستہ آہستہ اوپر دیکھا۔ فرش پر پکے ہوئے چاولوں سے بھری رکابی پڑی تھی۔ شن زینگ نے سرگوشی کی ''ہائیونڈو'' اور پھر اپنے چاول کھانے والے تنکے رکھ دیئے۔

''ارے یہ تو چن سینگ ہے، آؤ یہاں بیٹھ جاؤ ہمارے پاس، شن زینگ کی ماں کے چہرے کا تناؤ یکدم خوشگوار مسکراہٹ میں تبدیل ہوگیا۔

ہائیونڈو دروازے کی چوکھٹ پر اسی طرح جھکا ہوا کھڑا رہا جیسے اس نے اس کی دعوت کی پیشکش سنی ہی نہ ہو۔

''ہم ابھی دوپہر کا کھانا کھانے والے تھے، یہ خوراک ایسی تو نہیں ہے کہ کسی مہمان کو پیش کی جا سکے لیکن پھر بھی ہم چاہیں گے کہ تم ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ''۔ شن زینگ کی ماں نے کہا۔ اس کے باوجود جب ہائیونڈو اپنی جگہ سے نہ ہلا تو شن زینگ کی ماں کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے تاہم وہ دوستانہ انداز میں مسکراتی رہی۔

جب شن زینگ کی نظر ہائیونڈو کے جوتوں پر پڑی تو سرگوشی میں بولا ''ارے میں تنگ آ گیا ہوں'' پھر اس نے اپنے جسم کا رخ پھیر لیا۔ شن زینگ کی ماں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا

''اس کی وجہ یہ ہے کہ شن زینگ حال ہی میں بڑے تکلیف دہ تجربوں سے گزرا ہے۔ وہ تم سے تنگ نہیں آیا، تم تو اس کے اکیلے دوست ہو۔ ہم جلد ہی اپنے ملک واپس جا رہے ہیں، میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہوں گی''۔

ہائیونڈو کمرے سے باہر نکلا اور تاریک برآمدے میں داخل ہو گیا، بالکل اس انداز میں جیسے کوئی نادیدہ قوت اس کو پیچھے دھکیل رہی ہو، جب اس نے مندر والا کمرہ کھولا گرم اور بوسیدہ ہوا کی بو اسے محسوس ہوئی۔ کمرہ کافی عرصے سے بند پڑا تھا۔ یہ کمرہ ویسا نہیں تھا جیسا اس نے پہلے دیکھا تھا، اس ناشناسائی پر اس نے پلکیں جھپکیں۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جو اس کے خیالوں میں نقش تھا۔

سفید بالوں والا، بوڑھا جو دیوار پر لگی کسی تصویر کی طرح وہاں بیٹھا تھا، اب وہاں نہیں تھا۔ کیا ایسا تھا کہ جس لمحے اس کے ذہن کے پردے پر اس کمرے کی تصویر بنی تھی یہ اسی وقت غائب ہو گیا۔ مندر کے گولیوں والے بکس میں چند رنگ برنگی گڑیاں موجود تھیں۔ اس بکس کے پردے جواب دے گئے تھے اور اب یہ دو تختوں سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

''شن زینگ کے والد وفات پا گئے ہیں، ہمارے پاس دینے لائق کوئی چیز نہیں ہے، ہم سب کچھ دے چکے ہیں''۔ شن زینگ کی ماں، جو اس کے پیچھے وہاں آ گئی تھی، نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے بتایا۔ ہائیونڈو نے تختے پر رکھی ہوئی ایک گڑیا اٹھائی اور شن زینگ کی ماں، جو اس کا راستہ روکے کھڑی تھی کو ہٹاتے ہوئے مندر کے کمرے سے باہر آ گیا۔

''اسے واپس دے دو، یہ محض لکڑی کی گڑیا ہے'' عورت نے التجا کی۔

پچھواڑے صحن میں موسم گرما کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

''میں جانتی ہوں تم کو گڑیا پسند ہے، میں تمہیں کوئی اور دے دوں گی، اس سے زیادہ خوبصورت''

شن زینگ کی ماں نے اپنے کمرے کی الماری کھولی اور تیزی سے چیزیں الٹنے پلٹنے لگی۔

''تم اسے نہیں لے جا سکتے، یہ روح کی شبیہہ ہے'' شن زینگ چلایا۔

''نہیں، اگر تم چاہتے ہو تو اسے لے جا سکتے ہو، ہمیں اب اس کی اور ضرورت نہیں ہے''۔ شن زینگ کی ماں نے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے ہائیونڈو کو جانے کیلئے کہا۔ جب ہائیونڈو گیٹ کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس نے شن زینگ کی آواز سنی جو آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے چلا رہا تھا ''چور''

ہائیونڈو نے لکڑی کی گڑیا اپنی جیب میں ٹکائی اور چوراہے کی طرف چل پڑا۔ ایک نوجوان یادگار کے اوپر کھڑا تھا اور وہاں جمع ہونے والے لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا۔ ''تاریکی اور مایوسی کے دن گزر گئے اور ہم آخر کار غلامی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ آگے بڑھو جمہوریہ کے لوگو ہمیں صرف آدھے ملک کے حاصل کر لینے پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے''۔

المو کا بڑا بھائی جو ایک جینئس ہونے کی وجہ سے مشہور تھا اور جو مزاحمت کاروں کا ساتھی ہونے کی وجہ سے جاپانیوں کے تشدد کا نشانہ بنا اور اسی وجہ سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے یادگار جو ایک شہ نشین بن چکا تھا، پر پیشاب کر دیا۔ وہ سب کے سامنے برہنہ کھڑا تھا۔ جب اس کی نظر ہائیونڈو پر پڑی تو اس نے دانت کٹکٹانا شروع کر دیئے۔

نوجوان کی تقریر جاری تھی لیکن گہرے غم اور تنہائی کی وجہ سے وہ جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ہائیونڈو اس کی تقریر سننے کیلیے وہاں نہیں رکا اور موسم گرما کے آخری دنوں کی تپش اور نہ سمجھ آنے والے پاگل پن کی ہوا میں اس نے گھر کی طرف سفر جاری رکھا۔

خزاں کے آنے سے پہلے وہ مارچ کرتے ہوئے آ گئے۔ چھوٹی اینٹوں سے بنے ہوئے ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک بینر آویزاں کر گیا تھا اور ایک پلیٹ فارم استادہ کر دیا گیا تھا۔ قصبہ کے لوگ ناشتہ کرنے کے بعد یادگار چوک کی طرف امڈ آئے تھے۔ سمندر بندرگاہ اور قریبی اندرونی علاقوں کے دیہات سے لوگ کئی میل کا فاصلہ طے کر کے اس قصبے میں آئے تھے تاکہ آزادی دلانے والوں کا خیر مقدم کر سکیں۔ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ روسی سپاہی جنہوں نے ٹیومن دریا ٹرین کے ذریعے پار کیا تھا ہوئیر یانگ ناجن اور ان جن جیسے پہاڑی علاقوں میں قائم شہروں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ باتیں بھی سرگوشی میں کی جاتی تھیں کہ روسی سپاہی بجلی کے کھمبے جتنے لمبے ہوتے ہیں اور ان کی آنکھیں ٹارچ لائٹ جتنی روشن ہوتی ہیں اور چہرے اتنے سرخ ہوتے ہیں جتنے ماسک پہن کر ناچ ڈراموں میں کام کرنے والی شرابی راہبوں کے ماسک ہوتے تھے۔

ریل گاڑی کے آنے میں ابھی وقت تھا۔ مجمع، جو صبح سویرے سے ہی متحرک ہو چکا تھا، اب میدان تک پھیل گیا تھا اور جھنڈے ہلا ہلا کر خود کو ان کا فین ثابت کر رہا تھا۔ ٹرین بعد دوپہر قدرے تاخیر سے پہنچی اور اس میں سے روسی سپاہی باہر نکلنا شروع ہو گئے۔

غیر ملکی سپاہی زرد رنگ کے یونیفارم پر اپنے سرخ رنگ کے تمغے سجائے ایک نہ ختم ہونے والے عمل میں مارچ کر رہے تھے۔ جب سے یہ سٹیشن کھولا گیا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ہی بار میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ سٹیشن سے باہر نکلے تھے۔ ہجوم میں حیرت اور تجسس کے ملے جلے جذبات پائے جا رہے تھے کیونکہ وہ جھنڈے لہرا رہے تھے اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ بات درست تھی کہ سپاہی طویل قامت اور رنگت میں سرخی مائل تھے لیکن جو بات زیادہ حیرت کا باعث تھی یہ تھی کہ بھوک اور امتیاز ان کے چہروں پر واضح طور پر پڑھا جا سکتا تھا۔

اخلاقی لحاظ سے درست سرخ فوج کا شکریہ کہ جاپانیوں کو شکست ہوئی اور کوریا ایک نوآبادیاتی استبداد سے آزاد ہو گیا۔ سرخ فوج کے سپاہی ہمارے کامریڈ اور ہمارے نجات دہندہ ہیں جنہوں نے ہمارے کندھوں سے غلامی کا طوق اتار پھینکا، آیئے اپنے نجات دھندوں کا استقبال کریں جو ہائیر یونگ آئے ہیں، شن اوا میجو اور پائیونگ یانگ کو چھوڑ کر ہمارے قصبے میں آئے ہیں۔

اس پوری تقریب کے دوران نجات دہندہ خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ہجوم کو بڑے امتیاز اور بے موقع حمایت کے ساتھ دیکھتے رہے۔ تقریب کے بعد وہ سٹیشن کی عمارت کے اندر رہے۔ رضا کار محافظین تپتے سورج کے نیچے پسینے سے شرابور ہونے والے سپاہیوں کے لئے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لا ئے۔ سپاہی ان بالٹیوں میں سے پانی نکال نکال کر اپنے گرم سروں کو ملتے رہے یا پھر کچھ پانی اپنے منہ میں بھر لیتے تھے تا کہ قریب کھڑے اوران کو دیکھنے والے بچوں اور عورتوں پر پھوار ڈال سکیں۔ اس حرکت پر عورتیں چلاتی ہوئی دور بھاگ جاتی تھیں اور اپنے چہروں کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ قصبے کے لوگ اپنے سروں کو شبہات کی بناء پر ہلاتے ہوئے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے ہتھوڑے اور درانتی والے جھنڈے احتیاط کے ساتھ لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لئے تا کہ اپنے خاندان والوں کو دکھا سکیں۔ ممکن ہے لوگوں کو توقع ہو کہ ان کے مربیوں کے چہرے بڑے فیاضیانہ اور وہ امتیازی تاج اور جنگ کی وجہ سے پھٹے ہوئے اور خون آلود کپڑے پہنے ہوئے ہوں یا ممکن ہے وہ اپنے آزدی دلانے والوں کے چہروں پر سنجیدگی اور ذہانت کے خواہش مند ہوں تا کہ بربادی اور بدنظمی کی جگہ نظم لایا جا سکے لیکن روسی فوجی صرف تھکے ماندے اور درشت نظر آئے۔

ایسا لگتا تھا کہ ان کے لئے عارضی بسیرے کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن کے

سامنے مویشیوں کی طرح گرد وغبار میں ہی بیٹھ گئے اور جئی کی گہرے رنگ کی کھردری روٹی نوچ نوچ کر کھانے لگے یا پھر روٹی کو تکیہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے نیچے بیٹھ گئے۔اب یادگار چوک کے اردگرد بچے اور فقیر وغیرہ ہی رہ گئے تھے اور ادھر ادھر منڈلا رہے تھے، یادگار چوک جہاں جھنڈوں کے پھٹے پرانے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔

سپاہی شام کے وقت اپنی عارضی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔شیم سینگ پرائمری سکول ان کا ہیڈ کوارٹر بنا دیا گیا اور ہر گھر سے ان کیلئے بستر اور خوراک حاصل کی جانے لگی۔وہ عورتیں جوان کے لئے چاول اور شوربہ لے کر گئیں یہ دیکھ کر سخت بے زار ہوئیں کہ وہ بہت زیادہ کھاتے تھے۔اگلے صبح شم سینگ پرائمری سکول، کی تختی اتار دی گئی اور اس کی جگہ نیا بورڈ آویزاں کر دیا گیا ''ہائیرینگ ہیڈ کوارٹرز آف دی رشین آرمی''۔

☆ ☆ ☆

ہائیونڈوا ایک آواز سے چونک کر جاگ گیا تھا۔کوئی اسے بڑی نرمی سے آواز دے رہا تھا۔ماں کمرے سے باہر کھڑے ہوکر اس کے پیروں کو ہلا رہی تھی ''ایک منٹ کیلئے باہر آجاؤ''۔

ہائیونڈو نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو رگڑا اور اپنا پاجامہ پہنا ''مجھے پلانٹ کی طرف سے کچھ آواز آئی ہے'' یہ کہنے کے بعد ماں اس سے آگے آگے ہی جست کی بنی ہوئی عمارت کی طرف چل پڑی جہاں اس کے باپ کا پلانٹ لگا ہوا تھا۔

ابا جان کا کمرہ مکمل طور پر تاریک اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔وہ دادی جان کیلئے ادویات خریدنے بندرگاہ گئے ہوئے تھے، جن کی دل کی تکلیف دادا جان کے انتقال کے بعد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔یہ پلانٹ ایک لمبی اور تنگ جگہ پر تھا جو دیوار کے ساتھ ساتھ تعمیر کی گئی تھی چنانچہ اس کی مشینوں کی آواز سارا دن پورے گھر کو پریشان کئے رکھتی تھی۔

ہائیونڈو کے آنے کا انتظار کرتے ہوئے اس کی ماں نے پلانٹ کے گیٹ کا تالا کھول دیا اور پھر گیٹ کے کواڑ کھولے۔وہ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھی۔وہ پلانٹ کے اندر داخل ہوئے لیکن گہرے اندھیرے میں کچھ بھی دیکھ نہ سکے۔''کیا بات ہے؟'' ہائیونڈو نے سرگوشی کی لیکن ماں بجلی کے بلب کا بٹن تلاش کرتی رہی، تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد اس نے کہا ''میں بٹن تلاش

نہیں کرسکی، تمہیں فلیش لائٹ لے کرآنا پڑے گی"۔

گھر سے فلیش لائٹ لے کرآنے تک وہ ایک جگہ بت بنی کھڑی رہی۔اپنے بیٹے کے ہاتھ سے فلیش لائٹ لینے کے بعد اس نے لائٹ کی روشنی ادھرادھر ڈال کر حالات کا جائزہ لیا۔لوہے کے پائپ کی مشین اور آری کے دندانوں والے پہیئے اندھیرے میں ایک لمحہ بھر کے لئے ظاہر ہوئے اور پھر دوبارہ غائب ہو گئے۔

"کون ہے؟" ماں نے زور سے آواز لگائی حالانکہ کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔اسے صرف لوہے کی تیز بوآ رہی تھی اور گہری خاموشی میں گونجتی ہوئی اپنی ماں کی کھوکھلی آواز سنائی دے رہی تھی۔

خوف سے مغلوب ہو کر ہائیونڈو نے ماں کا سکرٹ پکڑ لیا ماں نے ایک بار پھر آواز لگائی جیسے اس کے پاس اپنے خوف پر قابو پانے کا بس یہی ایک طریقہ ہو"باہر آؤ، آگے بڑھو"۔

گہرے اندھیرے میں پلانٹ نے کسی دوسرے کونے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ماں نے جلدی سے فلیش لائٹ جلائی۔جب وہ چہرہ اس کے سامنے آیا تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، ہائیونڈو سختی کے ساتھ اپنی ماں کے سکرٹ کے ساتھ چمٹ گیا۔

"یہ میں ہوں میڈم" اس آدمی نے کہا، اس کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا غالباً اس نے ماں اور اس کے بچے کے چہروں پر چھائے ہوئے خوف کے واضح آثار پڑھ لئے تھے۔ہاؤینڈو بھی اسے جانتا تھا یہ فیکٹری کا ملازم تھا جس نے گذشتہ موسم گرما کے دوران خراد کی ایک مشین پر کام کرنے کے دوران اپنا ایک ہاتھ کھو دیا تھا۔لوگ اسے گھامڑ (Dim Wit) کہہ کر بلاتے تھے کیونکہ تیس برس سے زیادہ کا ہونے کے باوجود وہ ابھی تک کنوارہ تھا اور عام طور سے کچھ بے وقوف اور سست تھا۔لیکن ایکسیڈنٹ کے بعد اسے "ہک والا آدمی" کہہ کر پکارا جانے لگا کیونکہ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کی جگہ ایک ہک لگوالی تھی۔ حادثے کی وجہ سے فیکٹری چھوڑ دینے کے بعد بھی وہ کئی بار ابا جان سے ملنے آیا تھا۔ایسے موقعوں پر وہ اکثر شراب پیئے ہوئے ہوتا تھا اور اپنے سابق مالک سے چلا چلا کر تقاضا کیا کرتا تھا" مجھے میرا ہاتھ دے دو، مجھے میرا ہاتھ دے دو"۔ابا جان نے یہ کہہ کر اسے دور کر دیا تھا،" پاگل مت بنو، جو قانونی تقاضے تھے، وہ میں نے پورے کر دیئے، یہ حادثہ اسی لئے ہوا کہ تمہارا دھیان کام کی طرف نہ تھا اور یہ تمہاری بدقسمتی ہے، میں تمہیں تمہارا ہاتھ کیسے واپس دلا سکتا ہوں۔اگر تم میرے ساتھ اس طرح کی بک بک کرنے پھر آئے تو

میں تمہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کردوں گا''۔اس دن کے بعد وہ آدمی دوبارہ ابا جان سے ملنے نہ آیا لیکن ہائیونڈو نے اسے گھر کے اردگرد منڈلاتے کئی بار دیکھا تھا۔

''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' ماں نے فلیش لائٹ اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔اس کے چہرے پر پڑنے والی روشنی کپکپا رہی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں کچھ چرانے آیا ہوں، تمہاری زندگی پر نہیں''۔اس آدمی نے اپنا دایاں بازو اوپر اٹھایا، بیٹری کی روشنی میں لوہے کی بنی ہوئی ہک چمکنے لگی۔''اب میں اپنے ہاتھ کی واپسی کا تقاضا ہرگز نہیں کروں گا۔ میں اس منحوس جگہ کو آگ لگا دوں گا اگر میں اس جگہ اور دیگر اشیاء کو آگ لگا دوں تو کوئی پولیس کے پاس نہیں جا سکتا۔ یہ نئی دنیا ہے، پہیہ الٹا گھومنا شروع ہو گیا ہے۔تم جانتی ہو؟ جو کوئی بھی جاپانیوں کی چاپلوسی کر کے نوابوں کی سی زندگی بسر کرتے رہے، اب موت تک ان کی پٹائی ہونے والی ہے۔

''چلے جاؤ، تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ''۔

''ہاں اگر تم مجھے جانے کیلئے کہو تو میرے جیسا اپاہج چلے جانے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے؟''

وہ آدمی مفاخرانہ ہنسی چہرے پر سجائے آگے بڑھا۔ وہ دیوار کی طرف گیا جیسے بیٹری کی روشنی اسے پیچھے دھکیل رہی ہو، جیسے کوئی اداکار سٹیج ڈرامے میں سٹیج سے غائب ہوتا ہے۔ پھر اس نے اپنا ہک والا ہاتھ اٹھایا اور تین بار زور سے نیچے دے مارا، شیشہ دھماکے دار چھنچھناہٹ کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ وہ آدمی شیشے کے بغیر والی کھڑکی سے کہیں غائب ہو گیا۔ ماں نے فلیش لائٹ کے ذریعے پلانٹ کا جائزہ لیا۔اس کے ساتھ والا کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ یقیناً وہ اسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز تھی جو ماں نے گھر میں سنی تھی۔ ماں نے ہائیونڈو سے کہا کہ وہ فلیش لائٹ پکڑ کر رکھے، پھر اس نے جست کی ایک شیٹ نکالی اور ٹوٹی ہوئی کھڑکی کو اس سے ڈھانپ دیا۔ ماں کا چہرہ جو بیٹری کی روشنی میں نہایا ہوا تھا خوف اور دھاتی چادر اٹھا کر لانے کی تگ ودو کی وجہ سے زرد پڑ چکا تھا۔

پلانٹ کے دروازے کو تالا لگانے اور صحن میں قدم رکھنے کے بعد ماں تھکی ہوئی آواز میں بڑبڑائی ''اُف کتنی خوفناک دنیا ہے''۔

ہائیونڈو اس چینی لڑکے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کے بارے میں اس نے اپنی نصابی

کتاب میں پڑھا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ریشم کے ایک امیر چینی تاجر کے گھر میں چور گھس آئے۔ چوروں نے خاندان کے افراد کو رسی سے باندھ دیا اور دکان کے چھوٹے نائب ملازم سے کہا کہ وہ غلے کی کوٹھڑی تک ان کی رہنمائی کرے۔ لڑکے نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور جب چور ریشم کے تھان باندھ رہے تھے اور ہیرے جواہرات وغیرہ اکٹھے کر رہے تھے تو وہ لڑکا خاموشی سے کوٹھڑی سے باہر آ گیا اور باہر آ کر اس نے کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے مالک اور اس کے خاندان والوں کو کھول دیا۔ واضح ہے کہ چور پکڑے گئے اور اس بہادر لڑکے کو بہادری کا انعام ملا۔

مجھ میں اتنی ہمت اور ہوشیار کیوں نہیں ہے کہ اپنی ماں اور اپنے گھر کا تحفظ کر سکوں؟ لیکن ہائیونڈ و نے سر کو جھٹک دیا۔ وہ آدمی چور نہیں تھا جو کچھ چرانے کیلئے آیا ہو۔ اس کے ہک والے ہاتھ کے آخری سرے پر جو چیز چمک رہی تھی وہ اس کی بدلے کی پیاس تھی اور دوسرے کو قتل کر دینے کی حد تک نفرت بھی جو صرف اس صورت میں ختم ہو سکتی تھی کہ ان سب لوگوں کو آگ میں جھونک دیا جائے جنہوں نے اسے زخمی کیا اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا۔ نفرت اور انتقام نے اس موسم گرما میں پورے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

اپنے کمرے پہنچنے کے بعد ماں نے سرگوشی کے انداز میں کہا، ''ابا جان کو مت بتانا کہ آج کیا ہوا، میرے خیال میں نفرت آمیز جذبات کے کوئی خطرناک بات نہیں ہوئی ہے۔

سکول وسط ستمبر میں دوبارہ کھل گیا۔ یہ کوئی نیا سکول محسوس ہوتا تھا کیونکہ جاپانی کی بجائے کورین زبان میں چھاپی گئیں کتابیں تقسیم کی گئیں، زیادہ تر اساتذہ بھی نئے تھے۔ بچے ہر روز جسمانی ورزش کرتے اور کھیل کے میدان میں ''آلڈ لینگساین'' کی دھن پر کوریا کا قومی نغمہ گاتے تھے۔ دوسرے بچوں کے ساتھ اپنی پوری آواز میں کوریا کا نغمہ گاتے ہوئے ہائیونڈ و محسوس کرتا کہ اس کا دل اپنے وطن کی محبت اور اس کیلئے عظیم کارنامے انجام دینے کے جذبوں سے بھر گیا ہے۔ یہ احساس اس وقت زیادہ اجاگر نظر آتا جب وہ یہ سطر پڑھتا ''آیئے اس ملک کو اپنا بنائے رکھیں، ہمیشہ کیلئے''۔

دوسرے بہت سے جاپانی بچوں کی طرح شن زینگ کبھی وہاں نظر نہ آیا لیکن ہائیونڈ و جانتا تھا کہ شن زینگ اور اسکی ماں ہائیر یونگ میں ہی موجود ہیں۔ اری گیشن کواپریٹو بلڈنگ کے ویئر ہاؤس کو جاپانیوں کیلئے عبوری دور کے کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کواپریٹو کے پیچھے کی خالی جگہ پر روزانہ رنگ

بر ننگے کپڑے لٹکائے جاتے تھے۔ یہ کہا گیا تھا کہ تمام جاپانیوں کو فوری طور پر واپس جاپان بھیج دیا جائے گا لیکن سقوط کے مکمل ہونے تک وہ وہاں موجود رہے۔ سکول سے واپسی پر اس خالی جگہ میں سے گزرتے ہوئے ہائیونڈو پانی کے نلکوں کے سامنے جاپانی عورتوں کو اپنے سرخ جمے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے دھوتے ہوئے دیکھتا تھا۔ انہوں نے اپنے منڈھے ہوئے سروں کو تولیوں میں چھپا رکھا ہوتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ تمام جاپانی عورتوں نے روسی سپاہیوں کو دھوکہ دینے کیلئے اپنے سر منڈھوا رکھے تھے۔ کبھی کبھار کچھ بچے کواپریٹو کی عمارت کے سامنے کی جگہ پر دھوپ تاپنے کیلئے آتے تھے لیکن ان کی مائیں انہیں اندر کھینچ کر لے جاتی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کیمپ کے اندر بہت سے بچے ہر روز پیچش کی بیماری سے مر جاتے تھے۔ ان کے پاخانے میں خون آتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ایک بار پیچش لگ جائے تو تمام جاپانی مر جاتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی خوراک میں لہسن کو شامل نہیں کرتے تھے۔ لوہے کے سریوں والی کھڑکیوں سے چمٹے بچے دیکھ کر ہائیونڈو حیران ہو کر سوچتا کہ آیا شن زینگ بھی یہاں موجود ہوگا۔ ہائیونڈو گذشتہ صبح کے وقت شن زینگ کی ماں کو دیکھ چکا تھا۔ ان دنوں جاپانی عورتیں تین یا چار کے گروپوں میں گاؤں میں خوراک مانگنے کیلئے جاتی تھیں۔ جاپانیوں کی خوراک کے راشن سے خارج کر دیا گیا تھا۔

جب ہائیونڈو اپنے خاندان والوں کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو کسی نے گیٹ پر دستک دی۔ جب ماں نے گیٹ کھولا تو منڈے ہوئے سر والی تین عورتیں خوراک کا برتن ہاتھ میں تھامے اندر داخل ہوئیں اور کہا ''خیرات دے دو'' وہ نرمی سے بول رہی تھیں اور انہوں نے اپنے سر کو نیچے جھکایا ہوا تھا۔ وہ مردانہ کپڑوں میں ملبوس تھیں لیکن کوئی بھی شخص آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ مرد نہیں عورتیں ہیں۔ ہائیونڈو اور سنگڈو رہائشی کمرے کی طرف لپکے تاکہ فقیروں کو دیکھ سکیں۔ ماں نے اپنے چاولوں کا پیالہ اٹھایا اور باہر صحن کی طرف جانے ہلگی۔ تینوں میں سے سب سے لمبی عورت نے اپنے برتن میں خوراک لینے سے پہلے لحہ بھر کیلئے سر اٹھایا۔ ہائیونڈو نے سوچا کہ اس نے عورت کو کہیں دیکھا ہے اور اگلے ہی لمحے اسے یاد آ گیا کہ یہ تو شن زینگ کی ماں ہے۔

لحہ بھر کے لئے ان کی نظریں ملیں، ہائیونڈو کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ایک سیکنڈ کے بھی ایک حصے میں شن زینگ، ان کی نا قابل بیان خاموشی میں ڈوبا ہوا گھر اور عبادت کا کمرہ بمعہ عبادت کے شیلف کے اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ کیا وہ اس کے گھر فقیرنی کے بھیس میں لکڑی کی گڑیا تلاش

کرنے آئی ہے تا کہ شن زینگ کی زندگی کے پل بڑھا سکے۔ جس دن وہ گڑیا لے کر آیا تھا اسی روز اس نے اسے ایک کمرے میں کاٹھ کباڑ کے نیچے دفن کر دیا تھا، اسے خوف تھا کہ گھر میں سے کوئی اس گڑیا کو دیکھ نہ لے۔ اس نے کبھی دوبارہ گڑیا کو وہاں سے نہیں نکالا تھا۔ اس عورت نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لی تھیں۔ ان کی نظر میں اتنے مختصر ترین وقفے کے لئے ملی تھی کہ اسے یقین نہیں تھا کہ اس عورت نے اسے پہچان لیا ہے۔ عورت بار بار نیچے جھک کر شکریہ ادا کر رہی تھی اور پھر وہ گیٹ کے ذریعے باہر نکلی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اریگیشن کواپریٹو جو جاپانیوں کے عارضی کیمپ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، شیم سینگ پرائمری سکول جو روسی سپاہیوں کے ہیڈ کوارٹرز کے طور پر استعمال میں لایا جا رہا تھا اور روزانہ کی عوامی اسمبلی جو یادگار چوک میں لگتی تھی، اب یہ جگہیں ہیئر یونگ میں لوگوں کی دلچسپی اور تفریح کی نئی جگہیں تھیں۔ اپنے والدین کی پریشانی کو نہ سمجھتے ہوئے بچے سکول سے سیدھا گھر جانے کو تیار نہ تھے۔ ان کے لئے سب سے زیادہ کشش کا باعث روسی فوجی دستے تھے۔ اگر آپ شیم سینگ پرائمری سکول کی دیوار، جو کافی نیچی تھی، پر چڑھ جائیں تو آپ فوجیوں کو کھیل کے میدان میں دوڑتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ موسم ٹھنڈا ہونے کے باوجود ان کے جسم کا اوپر والا حصہ بالکل ننگا ہوتا تھا۔ بچے ان کی بالوں بھری چھاتی اور بازوؤں، جن پر دو تین گھڑیاں بندھی ہوتی تھیں، کو دیکھتے تو حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ فوج بھی بڑے فخر کے ساتھ اپنی دو تین گھڑیوں والی کلائی اٹھا کر بچوں کو دکھاتے تھے۔

اور وہ ہر وقت کھاتے رہتے تھے، وہ گہرے رنگ کی روٹی اور چربی کی موٹی تہہ والا سور کا گوشت کاٹ کر کھاتے تھے۔ وہ گاڑیوں کے پہیوں کے گرد چڑھانے والے آہنی گھیرے کی چاپنگ بلاکس کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اسے کچا ہی کھا جاتے تھے۔ وہ پکتے ہوئے باجرے کے تنے چباتے تھے اور کچا غلہ کھا جاتے تھے۔ چنانچہ وہ ہر جگہ اپنے نشانات چھوڑ جاتے تھے۔ لوگ انہیں جانور، فقراء شمال سے آنے والے بربر کہتے تھے۔

لوگ سرگوشیاں کرتے کہ نو فٹ لمبے عفریت، جن کی آنکھیں ٹارچ کی طرح چمکدار ہیں، اکثر باجرے کے کھیتوں میں چکر لگاتے ہیں اور صبح سویرے اپنے کھیتوں میں جانے والے کسانوں نے کئی بار باجرہ کے کھیتوں کی شبنم آلود پگڈنڈیوں سے عورتوں کو اٹھتے ہوئے دیکھا، وہ اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں میں

خود کو اتنا ڈھانپنے کی کوشش کرتیں، جتنی وہ کر سکتی تھیں۔ خواتین دن کے وقت بھی بمشکل باہر جاتی تھیں اور جونہی سورج غروب ہوتا سارے دروازے بند کر لئے جاتے تھے۔ تاریک سڑکیں روسی فوجیوں کے بوٹوں کی دھمک سے تھرتھرانے لگتی تھیں۔ وہ عورتوں کو تقاضا کرتے اور اس کے لئے لمبا انتظار کرتے اور لوگوں کے دانتوں پر سونے کی جو پرت چڑھی ہوتی اس کے شدید تمنائی ہوتے تھے۔

ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ واحد علاقہ تھا جو رات کا اندھیرا چھانے کے بعد زندہ ہو جاتا تھا۔ جب لوگوں نے قحبہ خانے سے باہر آتے ہوئے شراب کے نشے میں دھت آدمیوں کے غمگین اور افسردہ گانے سنے تو انہوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ روسی بھی انسان ہیں جو دور دراز علاقوں میں اپنے گھروں، اپنی ماؤں اور محبوباؤں کی کمی کو محسوس کرتے ہیں، اور لوگ بے رحمی کی حد تک ٹھنڈے اس براعظم کے بارے میں سوچتے، ایک ملک جہاں لگا تار برفباری ہوتی رہتی ہے، گہرے رنگ کی زمین کا علاقہ اور کالے فر درختوں اور بھونکتے ہوئے بھیڑیوں کی سرزمین جو یخ بستہ میدانوں میں آوازیں نکالتے پھرتے تھے۔ یہ وہ شبیہیں تھیں جو ان کے سینوں میں آرزومندی کے خواب جگاتی تھیں جب وہ ابھی چھوٹے تھے۔

لوگ دور دراز کے علاقوں سے واپس آ رہے تھے۔ باپ اور بھائی جو رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے تھے جب بچے ابھی سوئے ہوئے تھے، اب واپس آ گئے تھے، وہ فاتح اور ہیرو کی حیثیت میں واپس آئے تھے اور ہائیونڈو کا چچا بھی ایک روز واپس آ گیا۔ واپس پہنچنے پر اس کا چچا گیٹ پر کافی دیر گم سم کھڑا رہا۔ وہ دہلیز کے ساتھ جسم کو ٹکائے کھڑا تھا اور ماتھے پر تیوڑیاں چڑھا رہا تھا جس پر جلنے کے ایک زخم کا نشان ابھی باقی تھا، وہ ایسے دیکھتا رہا جیسے کوئی نقصان میں رہا ہو۔

بحری جہاز باہر نہیں گئے تھے حالانکہ مد کا وقت تھا۔ ''دادی ماں کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس سات سات جہاز تھے جبکہ بہت سوں کے پاس ایک چھوٹی سی کشتی بھی نہ تھی۔ اب یہ ایک انعام یافتہ دنیا ہے جس میں ہر کوئی ایک جیسا کھاتا ہے۔ وہ جو دوسروں کے آنسوؤں پر موٹے ہوتے جا رہے تھے وہ جاپانیوں سے کسی طور بہتر نہیں ہیں''۔

دادی ماں نے حال ہی میں منظم کی گئی ماہی گیروں کی باہمی تعاون کی تنظیم کے سیکرٹری کے الفاظ کا موازنہ کر کے اپنی ہتھیلیوں سے فرش کو پیٹا ''وجہ یہ ہے کہ بوڑھا مر گیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ بوڑھی بیوہ کو آسانی سے دبا سکتے ہیں۔ یہ دنیا کتنی لاقانون ہو گئی ہے'' اور دادی اماں اپنے سابق ملازم لڑکے

پونگ میونگ کو ریڈ آرم بینڈ کے ساتھ اکڑ کر چلتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکیں، اس نے رضا کار سیکورٹی فورس میں حصہ لے لیا تھا چنانچہ وہ اپنے بیٹے کے گھر قصبے میں آ گئی۔ دادی اماں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں پھر بھی کسی بحری جہاز کو نہیں دیکھنا چاہتیں۔

ابا جان نے بڑی گلوگیر آواز میں کہا، ''یہ وقت اپنی بے عزتیوں پر غمزدہ ہونے کا نہیں ہے۔ اب دنیا بدل گئی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم جہاز ان لوگوں کو فروخت کر دیں جو اسے خریدنا چاہتے ہیں اس سے پہلے کہ ان کو ضبط کر لئے جانے کی باتیں شروع ہو جائیں''۔

پلانٹ میں مشینوں کی آواز کو بند ہوئے اب ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ورکر یہ کہہ کر جواب دے گئے تھے کہ اب وہ کہیں سے بھی کھا سکتے ہیں اگر وہ صرف اپنے چمچ اپنے پاس رکھیں۔ ماں یہ کہتی ہوئی پھٹ پڑی ''کیا اس سے پہلے محض چمچ نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ میں عوام، عوام سن کر تنگ آ گئی ہوں''۔

لیکن دادی جان کے پاس قصبے میں رہنے کی اور وجوہات تھیں۔ ان کی نظر میں ہمیشہ اس کمرے کی طرف اٹھتی تھیں جہاں اس کا چھوٹا بیٹا رہتا تھا۔ ہر بار وہ جب گھر میں داخل ہوتی، یہی کمرہ تھا جس کی طرف اس کی نگاہیں جاتی تھیں۔ گودام سے ذخیرہ کی گئی اشیاء نکالتے ہوئے یا پھر صحن میں جھاڑو دیتے ہوئے وہ اچانک جامد و ساکت ہو کر اس کمرے سے کسی آواز کے انتظار میں بیٹھ جاتی تھیں اور یہ صرف دادی اماں ہی نہیں تھی، ابا جان اور امی جان بھی چچا جان کو فکرمند اور محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی دادی اماں اپنی بہو سے کہتیں ''کیا کچھ ہوا تھا؟''

ماں یقین دلانے کے انداز میں کہتی ''آپ فکر نہ کیجئے، وہ ویسا کچھ پھر نہیں کرے گا، جاپان میں رہنے کے دوران وہ یقیناً صاف رہا تھا، وہ تین سال وہاں رہا''۔

''میں نے سیمیونگ کو کل چوراہے میں دیکھا تھا، میرا تو دل ہی ڈوب گیا تھا''۔

''آپ کا مطلب ہے وہ ہسپتال کا اسسٹنٹ جس نے انہیں مارفین دی تھی؟ اگر وہ بچوں کے چچا سے ملنے آتا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟''

چچا جان زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی بتاتے تھے اور صرف کھانے کے وقت ہی بڑے کمرے میں آتے تھے۔ اس کے باوجود کہ وہ پورے خاندان کی فکرمند نگاہوں اور کڑی نگرانی کا مرکز تھے،

MashalBooks.com

چچا جان ایسے ظاہر کرتے جیسے وہ بالکل اکیلے ہوں حتیٰ کہ کھانے کے دوران بھی وہ خاندان والوں کے ساتھ زیادہ بول چال نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ فکرمندی کا نتیجہ ہو کہ ان کی چھوٹی سی حرکت کو بھی احتیاط کے ساتھ دیکھا جاتا تھا جیسے کسی شیشے کی بوتل میں بند وہ کوئی کیڑا ہوں یا ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے خاندان کی فکرمندی کڑی نگرانی سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ لیکن بچوں کے نزدیک ان کا چچا ان کیلئے ایک انوکھی شے اور دلچسپی کا سامان تھا''۔

چچا جان اپنے دن پیٹھ کے بل لیٹ کر گزارتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا سر دکھتا ہے اور ہر وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر چیز دھندلا رہی ہو اور یہ کہ ان کے جسم کی تمام ہڈیاں درد کرتی تھیں۔ دادی جان ہر روز صبح کے وقت کوٹ کر جو ادویہ تیار کرتی تھیں ان سے چچا جان کو افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ چچا جان زیادہ تر وقت کمرے میں بند رہتے تھے اور کبھی کبھار ہی باہر نکلتے تھے۔ کبھی روشن دھوپ پر ایک نظر ڈالنے کے لئے تو کبھی اپنے زخم دھونے کے لئے۔ انہیں یہ زخم اس وقت آئے تھے جب اسلحہ سپلائی کرنے والی فیکٹری جس میں وہ کام کرتے تھے وہاں ایک بم گرا اور اس میں آگ لگ گئی تھی۔ جب فیکٹری آگ لگنے کی وجہ سے پھٹ پڑی تو چچا جان وہاں سے فرار ہو گئے، ان کے ماتھے پر ایک زخم آیا تھا۔ آگ سے جھلسنے کی وجہ سے ان کے بازوؤں اور ٹانگوں پر جلنے کے کچھ نشانات تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ زیادہ گہرے نہیں ہیں۔ لیکن ان کی توقع کے مطابق زخم ٹھیک نہیں ہوئے بلکہ وہ پکتے چلے گئے ''ہر ایک خواب کے مانند تھا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی اور دنیا ناقابل بیان حد تک سُن ہو گئی اور پھر جب کالے بادل امنڈ پڑے اور سارا شہر ایک جلتے ہوئے سمندر کی تصویر بن گیا''۔

ہائیونڈو کو بندرگاہ کے قریب سنجائی کے گھر میں سنے گئے اس نوجوان کے الفاظ یاد آ گئے۔

وہ یقیناً اس دن کی بمباری کا حوالہ دے رہا تھا، میں نے اس روز کیا کیا تھا، ہائیونڈو نے اپنا سر گھمایا اور یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ ان گرم دنوں میں کیا ہوا تھا، جو اس نے بندرگاہ کے علاقے میں گزارے تھے۔

چچا جان کبھی کبھی اسے اپنے سفر کے بارے میں بتاتے تھے جو انہوں نے کوریا جاپان آبنائے کے اس پار تک کیا۔ اس ٹرین کے سفر کا حال بھی بتاتے جو انہوں نے جنوب کی جانب پہاڑوں کے راستوں کے اوپر 38 ویں متوازی کو پار کرتے ہوئے کیا تھا۔

ابا جان نے وہ ادویات منگوائیں جو انہوں نے کوریا کے شمال اور جنوبی بارڈر کے پار کاروبار کرتے ہوئے ایک فروخت کار سے خریدی تھیں۔ فروخت کار نے بتایا تھا کہ یہ دوا امریکی سپاہی استعمال کرتے ہیں اور یہ خراش یا ہلکے زخموں کا سو فیصد علاج ہے لیکن چچا جان کے سلسلے میں یہ کارگر ثابت نہ ہوئیں۔

چچا جان ہر روز جب صبح اٹھتے تو ان کے تکیے پر رات کے وقت گرے ہوئے بالوں کا گچھا ہوتا تھا۔ اس پر چچا جان بڑے غمگین انداز میں کہتے تھے "دیکھو میں کس طرح گل سڑ رہا ہوں" یہ کہہ کر وہ بالوں کا گچھا صحن میں پھینک دیتے تھے۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کافی کمزور ہو گئے ہو تمہیں زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ پورے ملک کے نوجوان بدتمیز ہوتے جا رہے ہیں، ایسے برے حالات میں بہتر ہے کہ گھر پر ہی ٹھہرا جائے"۔ دادی جان بار بار چچا جان کو یقین دلاتی تھیں اور اس امر پر شکر ادا کرتی تھیں کہ ان کا چھوٹا بیٹا گھر پر ٹھہرا ہوا ہے۔

برفباری جو صبح کے وقت شروع ہوئی تھی دوپہر کے وقت تک رک چکی تھی لیکن کالے بادل کے ٹکڑوں کے ساتھ آسمان اب بھی نیچا دکھائی دے رہا تھا۔ چڑیاں جو برفباری کی وجہ سے خاموش ہو گئی تھیں اب صحن میں اڑ رہی تھیں اور زمین اور چھت پر جمع تھیں۔ کمرے کے اندر رہتے ہوئے اور انگیٹھی میں پکے ہوئے آلو کھاتے ہوئے ہائیونڈو چڑیاں کی چہچہاہٹ واضح طور پر سن سکتا تھا۔ ابا جان دو دن پہلے یونبا ئیک جا چکے تھے، انہیں چاول خریدنا تھے اور دادی اماں پانچ پاؤں چاولوں کے ساتھ بندرگاہ جا چکی تھیں یہ کہہ کر کہ وہ گھر اور جہازوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پروہت سے کسی چیز کی تصدیق کرنے جائیں گے۔ ماں پبلک پلازہ گئی ہوئی تھی۔ آج کل اس پلازہ میں کوئی نہ کوئی اجلاس ہو رہا تھا اور اجلاس کے بعد لوگ نعرے لگاتے ہوئے پورے قصبے کے چکر لگاتے تھے۔

ماں جنہیں ابا جان کی جگہ مسلسل تیسرے روز اجلاس میں شرکت کرنا پڑی تھی بعد دوپہر جمی ہوئی کسی چیز کی طرح آزردہ واپس آئیں۔ "کل تک وہ کہہ رہے تھے کہ ہم تولیت کے سخت خلاف ہیں لیکن آج ان کا موقف ہے کہ ہمیں ہر طریقے سے تولیت حاصل کرنا ہے"۔ آج کچھ نوجوانوں نے ایک بوڑھے آدمی کو پکڑ کر مارا جو کسی نہ کسی طرح پوڈیم تک پہنچ گیا اور چلایا کہ اگر ہم نے ٹرسٹی شپ کو قبول کیا تو ہم ایک بار پھر اپنا ملک کھو دیں گے، میرے خیال میں اسے مار مار کر قتل کر دیا گیا تھا، کوئی بھی نہیں جانتا تھا

کہ ہمیں کس سمت جانا ہے۔ اگر آپ زبان سے کوئی غلط لفظ نکالتے تو آپ کو گھسیٹ کر پولیس کے پاس لے جایا جاتا ہے اور مار مار کر موت سے ہمکنار کر دیا جاتا ہے۔ اس صورتحال نے تو میری شگفتہ مزاجی ہی ختم کر دی ہے''۔

ماں نے دادی ماں کو اس روز اجلاس کی روداد سناتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ہمارے جیسے سیدھے سادھے لوگ آزادی اور خودمختاری اور اس طرح کی دیگر چیزوں کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں۔ میں نے اپنی ساری زندگی جہازوں کے بارے میں اور مچھلیاں پکڑنے کے حوالے سے فکرمند ہوتے گزاری ہے۔ چنانچہ اگرچہ میرا ایک بیٹا میرا اکرم ہے، میں سوچتی تھی کہ اگر ہمیں اپنا وطن واپس مل جائے تو دنیا جنت بن جائے۔ میں سوچتی تھی کہ اگر ہم صرف جاپانیوں سے نجات حاصل کر لیں تو ہمارے جہاز زیادہ مچھلیاں لے کر آئیں گے اور ہم کوریا کے لوگ اس کے بعد نہایت امن کے ساتھ آسودہ زندگی بسر کریں گے۔ خواہش ہے کہ کوئی آئے اور اس زمین کا قبضہ اپنے ہاتھوں میں لے لے، امن اور نظام بحال کرے اور لوگوں کو اس کے ساتھ اپنی زندگیاں گزارنے دے اور اس بات کا خیال نہ کرے کہ کوئی روسی ہے یا چینی'' دادی ماں نے سیدھے سیدھے اپنے دل کی بات واضح کر دی۔

''دادی جان آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، ہمارے ملک پر کوئی غیر ملکی کیوں حکمرانی کرے، یہ ہمارا ملک ہے'' ہائیونڈو نے سختی کے ساتھ احتجاج کیا۔

دادی ماں بڑے غمگین انداز میں مسکرائیں ''تم ٹھیک کہتے ہو، بوڑھے بڑوں کو بچوں سے سیکھنا چاہیے''۔ چڑیاں اب صحن میں پھڑ پھڑا رہی تھیں وہ برف میں کیا تلاش کر رہی تھیں؟'' ہائیونڈو یہی دیکھنے کیلئے صحن میں نکلا۔ خوفزدہ پرندے یکدم اٹھ گئے۔ اس نے دیکھا کہ وہاں ایک ٹوکری پڑی ہے اور اس کے کنارے کے ساتھ ایک لمبی رسی بندھی ہوئی ہے۔

''یہ کس لئے ہے؟'' سنگڈو جو اس کا پیچھا کرتے ہوئے باہر آ گیا تھا، نے اس سے پوچھا۔

''آؤ میں تمہیں کچھ چڑیاں پکڑ کر دوں'' ہائیونڈو نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔

ہائیونڈو نے ٹوکری کا منہ نیچے کر کے ایک لمبے پتلے سے ڈنڈے کے اوپر اس کو متوازن بنایا اور اس جگہ کے ارگرد سے برف صاف کر دی۔ پھر وہ باورچی خانے میں گیا اور چاول رکھنے کے برتن سے مٹھی بھر چاول لے آیا۔ چاولوں کا یہ برتن کچن کے فرش کے نیچے چھپایا گیا تھا۔ اگر ماں اسے اس

طرح چاول چوری کرتے ہوئے پکڑ لیتی تو یقیناً اس کی اچھی خاصی پٹائی ہو جاتی۔ چونکہ چاولوں کی قلت تھی اس لئے ماں نے چاولوں کو کچن کے فرش کے نیچے چھپا دیا تھا اور راشن میں ملنے والے آٹے سے کھانا بناتی تھی۔

چاولوں کی ٹوکری کے نیچے بکھیرنے کے بد ہائیونڈ و نے رسی کا سرا پکڑا اور کھینچ کر پیچھے بیٹھ کر چڑیوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی چڑیاں پھر سے صحن میں اترنا شروع ہو گئیں۔ وہ ٹوکری کے نیچے اکٹھی ہو گئیں تا کہ چاول چگ سکیں۔ اس نے اپنی سانس روکی اور رسی کھینچ دی ٹوکری زمین پر گر گئی اور چڑیاں بڑی وحشت کے ساتھ پھڑ پھڑائیں۔ تب اس نے اپنے عقب میں کوئی آواز سنی، اگرچہ ہائیونڈو کو کسی کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دی تھی، ممکن ہے تازہ گرنے والی برف نے آواز کو اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔

اس آدمی نے پریس کی ہوئی ٹوپی پہن رکھی تھی اور پرانی سوٹ جیکٹ اور مفلر زیب تن کر رکھا تھا۔ اس نے ہائیونڈو کے سر پر ایک چپت لگائی اور پھر پیار بھرے انداز میں مسکرانے لگا۔ اجنبی کے ٹھنڈے ہاتھوں کی وجہ سے ناگواری محسوس کرتے ہوئے ہائیونڈو پیچھے کی جانب سمٹ گیا اور اجنبی کو دیکھنے لگا۔ اگرچہ وہ ایک نوجوان تھا لیکن اس کی رنگت بیماروں کی سی اور جلد خشک تھی، کوئی بھی پہلی نظر میں آسانی سے اسے کوئی بوڑھا آدمی سمجھ سکتا تھا۔

''تمہارے چچا اندر ہیں، اندر ہی ہیں ناں، کون سا ہے ان کا کمرہ؟''

جب ہائیونڈو نے گھر کے پچھواڑے کی طرف اشارہ کیا تو وہ آدمی سیدھا اسی کمرے کی طرف گیا۔ وہ پاؤں گھسٹ گھسٹ کر چلتا تھا اور نہایت لاغر محسوس ہوتا تھا، ہائیونڈو نے سوچا کہ یہ کوئی اپاہج ہے۔

اس نے ٹوکری کو دوبارہ راڈ پر ٹکاتے ہوئے چڑیاں پکڑنے کی کوشش کی لیکن ایک بھی نہ پکڑ سکا حالانکہ وہ روسی اسی وقت کھینچا تھا جب وہ دیکھ لیتا تھا کہ چڑیاں ٹوکری کے عین نیچے ہیں لیکن جب ٹوکری نیچے گرتی تو ہمیشہ خالی نظر آتی تھی۔ ''قیمتی چاول ضائع کئے'' وہ نہایت رنج کے ساتھ چڑیوں پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔ ان کے دادی دادا کے ملازم یونگ میونگ نے اسے بتایا تھا کہ چڑیاں خالی کنوؤں میں رات بسر کرتی ہیں۔ اگر آپ رات کے وقت کنویں کے اوپر جال لگا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ بہت

سی چڑیاں اس جال میں پھنس کر مر چکی ہیں اور ان کی آنکھیں تکلیف کی وجہ سے کھلی ہوئی ہیں۔ چڑیاں بہت صبح جاگ جاتی ہیں چنانچہ وہ صبح سویرے ہی کنویں سے اڑ جاتی ہیں۔ جب ان کی گردنیں جال میں پھنس جاتی ہیں تو وہ آزاد ہونے کے لئے جدوجہد کرتی ہیں اور پھندا ان کے گلے میں اور زیادہ سختی سے پھنس جاتا ہے، اب آپ کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ انہیں پکڑ کر جال سے نکال لیں۔

ہائیونڈ کو یہ بتاتے ہوئے یونگ میونگ نے بڑے پرجوش انداز میں دانت نکوسے جیسے وہ حقیقتاً چڑیوں کو جال میں سے نکال رہا ہو۔ لیکن وہ نوجوان اب ایک رضا کار سیکورٹی گارڈ تھا جس نے سرخ رنگ کی پٹی بازو پر باندھ رکھی ہوتی ہے اور جو قصبے کی سڑکوں پر بندوق اٹھائے مارچ کرتا رہتا تھا۔ اپنے دادا کی وفات کے بعد سے ہائیونڈ و کبھی اپنے دادا دادی کے گھر نہیں گیا تھا۔ کیا طلسمی نقش، ناشپاتی کا پرانا درخت جو دروازے کے کاغذ کے مستطیل حصے پر پراسرار سائے ڈالتا تھا اور نیولے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ تاریک راتوں میں باہر نکلتے تھے اور روپیہ پیسہ اور خوش قسمتی لاتے تھے، خالی گھر کی نگرانی کر رہے تھے۔ تب سے اب تک بڑی بڑی کون سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ پچھلے کمرے میں سرگوشی میں ہونے والی گفتگو بند ہو گئی اور اجنبی وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس آدمی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد دادی ماں واپس آ گئیں۔ برف پر نشانات دیکھ کر دادی ماں ایک دم پریشان ہو گئیں اور ہائیونڈ و سے سوال کرنے لگیں۔

''وہاں کون تھا؟''

''کوئی آدمی چچا سے ملنے آیا تھا''

''ارے بے وقوف، تم نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ چچا گھر پر نہیں ہیں''۔ دادی ماں کی آواز اتنی سخت اور کرخت تھی کہ ہائیونڈ و رونے لگا۔ دادی اماں چچا کے کمرے کی طرف بھاگیں اور تیزی سے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''وہی حرام زادہ آیا تھا، وہی نہیں تھا؟ وہ کیا چاہتا تھا، وہ تمہیں اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟''

''اس نے کہا، وہ اس لئے آیا کہ ہم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں زندہ واپس آ گیا ہوں'' دادی ماں کے لہجے کی نسبت چچا جان کی آواز نہایت بے اضطراب تھی۔

''وہ حرام زادہ شیطان ہے، وہ تمہیں تمہاری موت کی طرف کھینچ لے جائے گا، ارے وہ

اب تک زندہ کیوں ہے'' دادی جان نے جھاڑو اٹھائی اور برف پر بنے ہوئے آدمی کے قدموں کے نشانات کو صاف کر دیا۔ انہوں نے اس قدر سختی سے صفائی کی کہ نیچے سے زمین نظر آنے لگی۔ لگتا ہے کہ وہ اپنی عادت کے مطابق دوسروں کو جس چیز سے خبردار کرتی تھیں اسے خود ہی بھول چکی ہیں، ان کا کہنا تھا کہ رات ہونے کے بعد جھاڑو دینے سے خوش قسمتی بھی چلی جاتی ہے۔

چچا جان رات کے کھانے کیلئے نہیں آئے، ماں نے ایک ٹرے میں کھانا پروسا اور چچا جان کے کمرے کی طرف گئیں لیکن چچا جان نے یہ کہہ کر دروازہ نہ کھولا کہ انہیں بھوک نہیں ہے۔

''میں جانتی تھی یہی ہونے والا ہے، میں جانتی تھی، دادی جان نے بڑبڑانا جاری رکھا، دادی جان نے بھی رات کا کھانا کا کھایا اور صرف چاولوں سے بنی ہوئی شراب لی۔

اس رات سارا وقت ہائیونڈو کو اس اجنبی کے خواب آتے رہے۔ خواب میں بھی اس نے ہائیونڈو کی گردن پر اپنے یخ بستہ ہاتھ لگائے اور بڑے شناسا انداز میں دانت نکوسے۔ جس سے اس کے دانت واضح طور پر نظر آنے لگے اور اس کے زرد چہرے پر جھریاں ابھر آئیں۔ پرندے پکڑ رہے ہو؟ اس نے پوچھا اور ہائیونڈو کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی گھسٹتی ہوئی چال کے ساتھ پچھلے کوارٹروں کی کی طرف چل دیا۔ برف پر اس کے چلنے کی آواز اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے باوجود کافی دیر تک سنائی دیتی رہی۔ قدموں کے نشانات ساری رات پورے گھر میں منڈلاتے رہے تذبذب کی حالت میں، خوف کے ساتھ، نہایت آرزومندی کے ساتھ اور بڑے اضطراب کے ساتھ۔ ''صحن میں کوئی ہے؟'' ہائیونڈو نیند میں بڑبڑایا۔

صبح کے وقت ہائیونڈو نے ابا جان کی سرگوشی سنی '' یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ زمینی اصلاحات لائی جانے والی ہیں، چاول خریدنا ستارے نوچنے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے اور سرخ کرنسیاں بے قدر ہو گئی ہیں۔ زمینوں کے مالکان 38 ویں متوازی لائن پار کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، اس سے پہلے کہ ان سے زمینیں ہتھیا لی جائیں اور انہیں سائبیریا یا پھر کوئلے کی کانوں میں واپس بھیج دیا جائے''۔ تو قدموں کے وہ نشانات ابا جان کے تھے۔ ہائیونڈو نے سوچا اور سکون کی نیند سونے کیلئے پھر سے لیٹ گیا۔

اگلی صبح کافی دیر کے بعد انہیں پتہ چلا کہ چچا جان گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ماں نے ناشتہ ذرا

تاخیر سے تیار کیا تا کہ ان کا شوہر، جو سفر سے تھکا ماندہ آیا تھا، تھوڑی دیر آرام کر سکے۔ پھر ماں نے چچا جان کو آواز دی لیکن ان کا کمرہ خالی تھا۔ چچا جان نے اپنے جانے کے نشانات بھی نہیں چھوڑے تھے کیونکہ برف باری ساری رات ہوتی رہی تھی اور صبح بھی جاری تھی اور زمین پر پڑے تمام نشانات اس میں چھپ گئے تھے۔

''وہ پھر سے افیون کی کھچار میں چلا گیا ہے، وہ اس سے دور نہیں رہ سکتی، جب تک یہ فتنہ پرداز اس کے پیچھے آتے رہیں گے، اس وقت تک نہیں''۔

''مجھے تو یقین نہیں آتا آخری بار جب وہ ہسپتال سے باہر آیا تھا تو اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ صاف ستھری زندگی گزارے گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پہلے اپنے ہاتھ کاٹے گا''۔ ابا جان نے پھر سے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی لیکن ان کا چہرہ تاریک تھا۔

''یہ تیسری بار ہے، ہم کتنی محنت کرتے ہیں کہ وہ بحال ہو جائے لیکن وہ نشئی اسے پھر سے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس بار اسے معافی نہیں ملنی چاہیے۔ ہم اسے اتنی خوفناک فیکٹری میں بھیج دیں گے کہ وہ افیون سے دور رہے۔ میں چاہوں گی کہ وہ واپس نہ آئے۔ سوچو ہم نے اس کی وجہ سے کتنی تکلیفیں سہی ہیں اور کتنی بے عزتی برداشت کی ہے، آنسو دادی جان کے چہرے پر کسی ندی کی طرح بہہ رہے تھے۔

چچا جان واقعی افیون کا نشہ کرتے تھے؟ کیا چچا جان کو بھی پولیس ایک دن اسی طرح گھسیٹ کر لے جائے گی اور قصبے کے رہنے والے ان پر انگلیاں اٹھا رہی ہوں گی اور انہیں برا بھلا کہہ رہے ہوں گے؟ اپنی دادی ماں کو روتے چھوڑ کر ہائیونڈو عام بیٹھنے کے کمرے میں آ گیا اور اس نے برف سے اٹے ہوئے صحن پر ایک نظر ڈالی جیسے وہ برف کے نیچے چچا جان کی آزار دینے والی نصیحتیں یا اور اس سے پہلے کی رت ان کے اندر کی شدید کشمکش کے آثار تلاش کرنا چاہ رہا ہو۔

موسم سرما کافی طویل اور سرد تھا۔ بڑھتے ہوئے بچوں کیلئے یہ بھوک لگنے کا موسم ہوتا ہے۔ چاول قابض افواج کی خوراک کی خاطر رکھنے جا چکے تھے اور گندم کا آٹا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ماں، جو ان دنوں امید سے تھی، اپنی ناک پر کپڑا رکھ کر روٹی پکاتی تھیں تا کہ اس کی ناگوار بو سے بچی رہے۔ پھوپھی ان کے گھر اپنی بیٹی کے ساتھ جو اس کی پیٹھ کے ساتھ بندھی ہوتی تھی، ناشتے کے وقت آتی اور رات کے

کھانے کے بعد واپس جاتی تھی۔

''کسی کیلئے کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ وہ اس طرح کے وقت اور حالات میں پیدا ہو'' ماں نے اپنے آنے والے بچے کے حوالے سے شکایت کی لیکن دادی اماں خوشی سے کھلکھلا دیتی تھیں۔

''نہیں برے وقتوں میں تمہارے پاس زیادہ بچے ہونے چاہئیں''۔ بچے اپنی قسمت ساتھ لے کر آتے ہیں دعا یہ کرنی چاہیے کہ یہ ایک اور لڑکا ہو''۔ دادی اماں اس کا جواب دیتیں۔ دادی اماں جو ایک بوڑھی عورت کی نسبت زیادہ طویل قامت اور اچھے تن و توش والی تھیں، جب سے ان کا بیٹا افیون کا نشہ کرنے لگا تھا، زیادہ کمزور اور نحیف ہوگئی تھیں۔ صرف اپنے دل کے درد کی وجہ سے ہی نہیں، سینے کی جلن کے باعث بھی بدہضمی رہتی تھی۔ اب تک تو بچے بھی جان چکے تھے کہ ان کے چچا افیون کا نشہ کرتے ہیں۔ چچا جان ہر چند روز کے بعد گھر واپس آتے تھے اور کبھی کبھی تو دس دس دن تک واپس نہیں لوٹتے تھے اور جب واپس آتے تو ان کے کپڑے میلے ہو رہے ہوتے اور آنکھوں میں لیس دار مادہ بھرا ہوتا تھا۔ ماں نے بتایا تھا کہ قصبے سے باہر ایک افیون کا اڈا ہے کبھی کبھی وہ اپنے ساتھ ٹافیاں بھی لے کر آتے تھے لیکن بچے گندے ہاتھوں والے فرد سے ٹافیاں لینا پسند نہیں کرتے تھے۔

چچا جان جب بھی آتے اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی نشان چھوڑ جاتے۔ فونوگراف، ریڈیو اور وال کلاک غائب ہوتا تھا۔ ماں نے کہا ''تم ذرا دیکھتے جاؤ، یہ تو صرف آغاز ہے۔ وہ تو یہاں سے کانسی کا واش بیسن اور کانسی کے چمچ تک لے کر فرار ہو جائے گا۔ ایک بار اس نے تمہارے باپ کے ایک دوست کی بیوی کی انگوٹھی چرائی تھی اس وجہ سے مجھے اب بھی اس جوڑے کا سامنا کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے'' ماں نے کہا، اب ماں بچوں کے سامنے بھی اپنے دیور کے بارے میں شکایت کرنے سے جھجک محسوس نہیں کرتی تھی۔ ''وہ ہاسپٹل اسسٹنٹ سیم یونگ افیون کا نشئی ہے، مجھے امید ہے وہ جہنم میں سڑے گا''۔

اب تو قیمتی چیزوں کا غائب ہونا بھی اتنا عام ہوگیا تھا جیسے چوہے صابن کی ٹکیا اڑا لے جاتے ہیں۔ چچا کو پہلی بار اس وقت ہسپتال میں داخل کرایا تھا جب ابھی وہ انیس برس کے تھے اور ہسپتال اسسٹنٹ ان کا درد کم کرنے کیلئے مارفین کے انجکشن لگاتا تھا، اس سے چچا افیون کے نشہ میں مبتلا ہوگئے۔

''ہائیونڈو، یہ ٹرے چچا کے پاس لے جاؤ'' ماں نے باورچی خانے سے اسے آواز دی۔ عام طور پر دادی اماں یہ کام انجام دیتی تھیں لیکن اگر دادی اماں موجود نہ ہوں تو پھر یہ کام ہائیونڈو کو کرنا پڑتا تھا۔

جب گھر میں ہوتے تو چچا زیادہ تر وقت چت لیٹ کر گزارتے تھے۔ اب وہ بمشکل کھاتے تھے۔ خوراک والی ٹرے اکثر بغیر ہلائے جلائے پاس پڑی رہتی تھی۔

جب ہائیونڈو کھانے کی ٹرے لے کر چچا کے پاس گیا تو وہ اپنے زخم صاف کر رہا تھا، وہ اونچی آواز میں بولا ''ارے میرے سب سے بڑے بھتیجے اور میرے خاندان کے وارث خوش آمدید'' چچا جان اچھے موڈ میں تھے، جو کبھی کبھار ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ معمول کی نسبت کچھ بہتر اور مضبوط بھی لگ رہے تھے۔

''مجھے کوئی پسند نہیں کرتا، ایسا ہی ہے ناں؟'' چچا جان نے اس وقت یہ سوال کیا جب ہائیونڈو کھانے کی ٹرے رکھنے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ ہائیونڈو نے گھبراہٹ میں مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''یہ کہ آپ ایک افیون کے نشئی ہیں''۔

''یہ تو ٹھیک ہے، وہ تو میں ہوں'' چچا نے اتنا کہا اور زیرلب مسکرانے لگے۔

چچا جان جن کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور جن کے زیادہ تر بال گر چکے تھے بوڑھے آدمی کی طرح نظر آتے تھے۔ ان کے کمرے میں ایک عجیب مریضانہ بو پھیلی رہتی تھی۔ کیا یہ افیون کی بو تھی؟ یا سڑے ہوئے گوشت کی؟ یا پھر دونوں کی مشترکہ بو تھی؟ یا پھر دونوں کی ایک ہی جیسی بو ہوتی ہے، ایک بیمار کر دینے والی بو جو کسی کو مدہوش کر دیتی ہے اور پھر اسے گلاتی رہتی ہے۔

ہائیونڈو نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا ''آپ افیون کیوں استعمال کرتے ہیں؟''

''اس لئے کہ میں اس دنیا کو برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ افیون پی لیں تو آپ کے سارے غم مٹ جاتے ہیں، جسم کے بھی اور ذہن کے بھی۔ افیون آپ کو دنیاوی تکالیف سے آزاد کر دیتی ہے اور آپ کو ایک اور ہی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں ہر چیز ویسی ہوتی ہے جیسی آپ چاہتے ہیں۔ آپ وہاں سے نیچے زمین کو دیکھیں تو یہ آپ کو بدوضع و قابل نفرت اور تکلیف میں مبتلا کر دینے والی جگہ نظر آتی ہے۔ تم دیکھنا چاہو گے کہ یہ کتنی تکلیف دہ ہے'' چچا نے اتنا کہا اور اپنے گلتے سڑتے ہوئے بازو کو پھیلا دیا۔ وہاں پر دو سکوں جتنے بڑے پھوڑوں کے نشانات تھے، گوشت سڑ رہا تھا۔ ''ایسے پھوڑے میرے سارے جسم پر ابھر رہے ہیں، جلد ہی ان میں کیڑے کلبلانے لگیں گے۔ اسی طرح کے ہیں ہمارے جسم، کیا یہ سب کچھ ہمارے حقیقی گناہ کی وجہ سے ہے؟'' چچا کی آواز آہستہ اور بکھری ہوئی ہو گئی۔ ان کی آنکھیں بھی غیر مرتکز

MashalBooks.com

اور مبہم ہوگئی تھیں، جیسے کوئی شخص جس پر غنودگی طاری ہو۔ انہوں نے ایک سگریٹ سلگایا ایک کش لگایا اور پھر پیٹھ کے بل نیچے لیٹ گئے۔ ''ارے اس سے اچھا محسوس ہوتا ہے، بالکل ایسے جیسے میں مر چکا ہوں، نہیں بلکہ اس طرح جیسے میں پیدا ہونے سے پہلے، لیکن یہ آخری بار ہے، کل سے میں بالکل صاف ہو جاؤں گا'' ان کے آخری الفاظ بڑبڑاہٹ میں بدل گئے اور بمشکل ہی سنے جا سکے تھے۔ ان کی آنکھیں آدھی کھلی تھیں لیکن انہیں اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ ان کی چٹائی ان کے سگریٹ سے جل رہی ہے۔ ہائیونڈو نے اپنے چچا کے تیل آلود اور مرطوب ہاتھ سے سگریٹ پکڑ لی، اس کو ایش ٹرے میں بجھایا اور بستر کی چادر سے چچا کا جسم ڈھانپ دیا۔ باہر آتے ہوئے ہائیونڈو نے کمرے کا دروازہ دوبارہ کھولا اور نظر بھر کر چچا کے کمرے کا جائزہ لیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے پیچھے ایک چیتھڑوں میں لپٹا جسم چھوڑ کر جا رہا ہے، جس میں سے روح نکل چکی ہے اور جس کا جسم بدبو کی وجہ سے جلد ہی ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔

ابا جان نے چچا کے علاج کیلئے جس ڈاکٹر کو بلایا اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''یہ ایک بالکل نئی بیماری ہے، تم نے کہا کہ یہ ہیروشیما میں تھا، ایسا ہی کہا تھا ناں؟ یہ وہ بیماری ہے جو ایٹم بم کی تابکاری کے سامنے آنے والے کو لاحق ہوتی ہے اور ایسے جسم میں افیون کا داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے آگ کے اوپر پٹرول چھڑکنا۔

☆☆☆

تقریباً 30 جاپانی ایک گروپ کی صورت میں ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر معمر افراد اور بچے تھے اور ان میں سے ہر ایک نے ایک چھوٹا سا بنڈل اٹھا رکھا تھا۔ گروپ میں شامل تمام خواتین نے اپنے سروں کو مونڈھ رکھا تھا اور وہ ایسے اپنی نظریں زمین پر گاڑھے چل رہی تھیں جیسے مجرم چلتے ہیں۔ انہوں نے اس امید پر بھوک اور سردی برداشت کی تھی کہ وہ جلد اپنے وطن واپس چلے جائیں گے اور وہ بیس اور تیس کے گروپوں میں ہائیر یونگ کو چھوڑ رہے تھے۔ انہیں مسلح سیکورٹی گارڈز کی کڑی نگرانی میں ٹرین پر سوار کرایا گیا لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ انہیں کہاں لے جایا جائے گا۔

ہائیونڈو جو یادگار پر بیٹھا چوراہے میں چلنے والے معاملات دیکھ رہا تھا، نے اس گروپ میں جونہی شن زینگ کی ماں کو دیکھا تو کود کر نیچے آ گیا۔ اس نے شن زینگ کو اپنے پیٹھ پر اٹھایا ہوا تھا۔ ''شن

زینگ‘‘اس نے اونچی آواز میں پکارا اور پھر اس کی طرف بڑھنے لگا، اس کے ذہن میں بالکل یہ بات نہ تھی کہ اسے ان سے کیا کہنا ہے یا ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ چند لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن شن زینگ کی ماں بغیر رکے آگے بڑھتی رہی جیسے اس نے آواز سنی ہی نہیں۔

’’شن زینگ‘‘ ہائیونڈو نے دوبارہ پکارا اور اپنے ہاتھ ہلائے۔ اس بار کسی نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

لگتا تھا کہ شن زینگ اور زیادہ سمٹ گیا ہے کیونکہ اپنی ماں کے کندھوں سے اوپر اس کا صرف کپ نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے زرد چہرے کو اپنی ماں کی پیٹھ کے ساتھ ٹکائے ہوئے تھا اور یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ موسم بہار کے ابتدائی دنوں کی زرد دھوپ کو کچھ اور اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے اور اس کا چہرہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کبھی کسی کی بات کا جواب نہیں دے گا۔

ہائیونڈو نے ان کا تعاقب کرنا ترک کر دیا، اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ موسم بہار کی گرد آلود ہوا میں، جس کی ٹھنڈک ہڈیوں میں اتر جاتی ہے، ان کی پشتیں حالیہ تاریخ میں گم ہو رہی تھیں۔ اس بھری پر دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہوئے ہائیونڈو نے کئی بار سرگوشی میں شن زینگ کا نام پکارا۔

اس کے گھر میں ایک بڑا واقعہ پیش آ رہا تھا۔ چچا، جو تقریباً نو دن تک گھر سے غائب رہے تھے، گھر واپس آ گئے تھے اور اب سلائی مشین کے ساتھ باہر جانا چاہ رہے تھے لیکن ابا جان گیٹ پر کھڑے ہو گئے۔ ابا جان نے اس لمبے جھاڑو، جو گیٹ کے ساتھ پڑا رہتا تھا، کے ساتھ چچا کو اچھا خاصا زدوکوب کیا۔ چچا کسی تھکے ہوئے کوے کی طرح زمین پر گر گئے۔ ’’تم مر کیوں نہیں جاتے!‘‘ دادی جان چلائیں اور اپنے بلاوز کا کالر پھاڑ دیا۔ لمحہ بھر میں گاؤں والوں کی ایک بڑی تعداد گھر کے باہر اکٹھی ہو گئی۔ ہائیونڈو کا گھر اب نشئی کے گھر کے طور پر جانا جاتا تھا ورنہ پہلے اس کے گھر کو فیکٹری والوں کا گھر کہا جاتا تھا۔ ابا جان چچا کو گردن کی گدی سے پکڑ کر اندر کمرے میں لے گئے۔ اچانک چچا نے اپنی آستین میں سے ایک تیز باورچی خانے میں استعمال ہونے والا چاقو نکال لیا اور اسے فرش میں گاڑ کر اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھنے لگا ’’ٹھیک ہے، اس بار معاملہ نمٹا ہی لیتے ہیں، میں جانتا ہوں میری ماں، میرا بھائی اور میری بہن مجھے قابل نفرت سمجھتے ہیں حتیٰ کہ میرا چھوٹا بھتیجا مجھے ایک گندا کیڑا تصور کرتا ہے۔ لیکن تم نے سوچا نہیں کہ تم نے مجھے جاپانی جنگ میں بھیجا تھا تا کہ میں تمہاری جگہ تمہاری فیکٹری کا اسلحہ سپلائی کر سکوں؟ میں جانتا

ہوں، تم نے سوچا ہوگا میں وہاں مر چکا ہوں۔ لازمی بھرتی کا حکم تمہارے نام کا تھا لیکن تم نے اپنے بجائے اسے میرے نام کرانے کیلئے ٹاؤن ہال کے کلرک کو رشوت دی۔ کون بے وقوف ہوگا جو ایک نشہ کرنے والے کو اتنی سخت نوکری پر بھیج دے؟ تم نے کبھی سوچا کہ میں نے موت سے نظریں کیوں ملائیں اور اس پر غلبہ کیوں پایا اور 38 ویں پہاڑی سلسلے کو کیوں عبور کیا، اس لئے کہ میں آپ سب کی کمی محسوس کرتا تھا؟ بالکل بھی نہیں، میں تم سے یہ معاملے طے کرنے کیلئے آیا تھا۔ لیکن اب اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ میری جوانی تو واپس نہیں آوے گی، نہ ہی میری صحت بحال ہو سکے گی، اس لئے ان معاملات کو تو بھول ہی جانا چاہیے۔ بس مجھے والد کی جائیداد میں سے میرا حصے دے دو، وہ ایک امیر آدمی تھا، اس لئے میرا حصہ بھی ہوگا س، بس مجھے میرے والد کی جائیداد میں سے میرا حصے دے دو، وہ ایک امیر آدمی تھا، اس لئے میرا حصہ بھی ہو گا، بس مجھے وہ دے دو اور میں یہاں سے ہمیشہ کیلئے چلا جاؤں گا''۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، اس عادت بد سے تمہیں نجات دلانے کے لئے میں نے تمہیں جنگ کا سامان تیار کرنے والی فیکٹری میں بھیجا تھا۔ اگر تم یہاں رہتے تو کسی پاگل خانے میں مر چکے ہوتے۔ تم جانتے ھو کہ افیون کا نشہ کرنے والوں کے ساتھ جاپانی کیا سلوک کرتے ہیں اور جہاں تک ابا جان کے ترکے کا سوال ہے تو صرف وہی جانتے ہیں کہ سارا روپیہ کہاں چلا گیا''۔ ابا جان نے دادا جان کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی نوٹس بکس فرش پر چچا کے سامنے پھینک دیں۔ چچا جان نے تیزی سے سسکنا شروع کر دیا۔

''دیکھو بھائی، میں کس قدر تکلیف میں ہوں، میں کھڑا نہیں ہو سکتا، میرا سارا جسم گل سڑ رہا ہے، مجھے ایک بار افیون لے لینے دو، ورنہ میں درد سے چیختا چلاتا ہوا مر جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں نشہ کرنے کی وجہ سے میں نے اپنے خاندان کو تکلیف پہنچائی لیکن مجھ پر رحم کرو، آج مجھے کر لینے دو، اس کے بعد میں کبھی ایسا نہیں کروں گا، میں وعدہ کرتا ہوں، تم مجھے گھر میں شہتیر یا تھم کے ساتھ باندھ سکتے ہو، ایمانداری سے کہتا ہوں میں آئندہ کبھی نشہ نہیں کروں گا''۔ چچا نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر ابا جان سے التجا کی۔

دادی جان نے اپنا چاندی کا بنا ہوا کلپ بالوں سے نکالا اور اسے چچا کی طرف اچھال دیا'' یہ لو اور اتنے دن اس اڈے پر رہنا جتنے دن اس کے عوض وہ تمہیں رکھ سکیں۔ قابل رحم نکما آدمی''۔

چچا جان کے جانے کے بعد دادی ماں نے اپنا نکل کا بنا ہوا کلپ تلاش کیا اور بالوں پر لگا لیا۔

پھر انہوں نے دادا جان کی نوٹ بکس ایک کپڑے میں باندھیں۔ ابا جان نے انہیں منع کرنے کی کوشش کی اور کہا "یہ کسی کام کی نہیں ہیں کون ایک مرے ہوئے شخص کو قرض واپس کرے گا؟" دادی جان یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں "میں جانتی ہوں بندرگاہ پر کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ہے جس نے تمہارے باپ سے قرضے کے طور پر رقم نہ لی ہو۔ میں انہیں وہ رقوم واپس کرنے پر رضامند کرلوں گی"۔

لیکن دادی جان کبھی واپس نہیں آئیں۔ ایک قرض دار سے بک بک جھک جھک کرنے کے بعد انہوں نے بہت زیادہ شراب پی لی اور پھر ایک سڑک پر گر گئیں۔ چچا، جوان کا چاندی کا کلپ ساتھ لے گیا تھا، اس کی آخری رسومات کیلئے بھی گھر نہیں آیا۔

دادی جان کی آخری رسومات کے بعد ابا جان کو ٹاؤن ہال میں پیپلز کمیٹی آفس میں بلایا گیا۔ واپس آنے پر انہوں نے آہستہ آواز میں امی جان سے گفتگو کرتے ہوئے کہا، "بندرگاہ پر موجود گھر اور جہاز ہمیں فروخت کرنے پڑیں گے، میرے خیال میں اگر ہم ان کی قیمت کم کردیں تو ہم انہیں فروخت کر سکتے ہیں۔ چیزیں خوفناک حد تک خراب ہوتی جارہی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ شراب کی بھٹی کے مالک کو کوئلے کی کان بھیج دیا گیا ہے اور دندان ساز اپنے خاندان کے ساتھ جنوب کی طرف چلا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ 38 ویں متوازی لائن کے آس پاس گشت بڑھا دیا گیا ہے۔ اب جبکہ ماں بھی مرگئی ہے تو ہمارے پاس یہاں بندھے رہنے کیلئے کچھ بھی نہیں ہے، یا تمہارے خیال میں کچھ ہے؟"

راتوں رات گھر خالی ہوگیا۔ ہر روز کلاس روم میں خالی سیٹوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ وہ لڑکے جو دوسرے لڑکوں کے ساتھ ایک دن پہلے گئے تھے، اگلے روز انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ ہائیونڈو کو اس وقت بڑی خفت اٹھانا پڑی جب سکول جاتے ہوئے اس نے بار بار اپنے دوست کا نام پکارا لیکن وہاں خاموشی رہی اور صرف اس کی آواز کی بازگشت باہر آتی رہی یا اس وقت جب ان کے پڑوسی، جن کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات تھے، ان کو خدا حافظ کہے بغیر ہی راتوں رات کہیں چلے گئے۔

یہ کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا کہ المو کا خاندان، جو اپنے سب سے بڑے مخبوط الحواس بیٹے اور وفادار کتے کو یہیں چھوڑ کر جنوب کی طرف چلا گیا ہے، قتل کردیا گیا اور اب ان کا بیٹا گلیوں اور بازاروں میں کھانے کی بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔ اب بھی ان تمام خطرات کے باوجود لوگ اپنے گھروں اور زمینوں کو چھوڑ کر جنوب کی طرف فرار ہورہے تھے۔

''ہمیں ایک کشتی کرائے پر حاصل کرنا پڑے گی''ابا جان نوٹوں کی ایک گڈی لے کر باہر چلے گئے ۔ یہ رقم انہوں نے اپنی الماری میں بہت گہری دبا رکھی تھی ۔ یہ وہ رقم تھی جو انہوں نے دادی ماں کی موت کے بعد عجلت میں جہاز فروخت کر کے حاصل کی تھی ۔ اس کے باوجود کہ انہیں بتا دیا گیا تھا وہ استحصال کرنے والوں اور قوم کے غداروں کی فہرست میں شامل ہیں ابا جان اپنا ذہن نہ بنا سکے ۔ ان کا کہنا تھا، میں نے اپنی روزی روٹی یہاں رہتے ہوئے کمائی ہے، اس لئے مجھے فکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے، دوسرے، بہت سے افراد کی طرح وہ بھی 38 ویں متوازی لائن کو وقتی تقسیمی لائن قرار دیتے تھے جو ان کے خیال میں جاپانی فوج کو غیر مسلح کرنے کیلئے کھینچی گئی تھی ۔

ماں بھی اپنا آبائی قصبہ چھوڑنے کے حوالے سے فیصلہ نہ کر سکی تھی ۔ وہ ہیئر یونگ میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی ۔ جنوب کی طرف ہجرت کرنا اسے کسی غیر ملک میں جا کر آباد ہونے جیسا محسوس ہوتا تھا ۔ ایک اجنبی جگہ پر مختلف نسلوں اور رسموں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان ایک نئی زندگی شروع کرنا اس کے نزدیک کوئی خوشگوار تجربہ نہ تھا وہ بھی ان حالت میں کہ ان کے ساتھ تین بچے تھے اور چوتھا پیٹ میں تھا، اس کے علاوہ اسے اپنی ناخوش اور پریشان نند اور ایک نشہ کرنے والے دیوار کا بھی خیال رکھنا تھا جو ایٹم بم کا شکار تھا ۔ اس بارے میں سوچ کر ہی اس کے جسم میں سنسنی پھیل جاتی تھی لیکن کوئی بھی جگہ اجنبی جگہ ہی ہوتی ہے جب آپ اپنا آبائی گاؤں چھوڑ دیتے ہیں ۔

ابا جان رات کے وقت واپس آئے ۔

''ہم اس مہینے کی آخری تاریخ کو رات کے وقت یہاں سے چلے جائیں گے ۔ بندرگاہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ سنتری تعینات ہیں چنانچہ ہمیں پیانگ سونگ میں خلیج ڈریگن جانا پڑے گا اور ہمیں رات گیارہ بجے تک وہاں پہنچ جانا ہوگا ۔ وہ کل بڑے سمندر میں کشتی ڈالنے والے ہیں'' ۔ انہوں نے ہی بتایا لوگ جوار بھاٹا کی رینج سے باہر والے سمندر کو بڑا سمندر قرار دیتے تھے ۔ ماں نے آنکھوں سے پچھلے کمرے کی طرف اشارہ کیا، ''اس کی مدد نہیں کی جا سکتی، وہ اگر نشہ چھوڑ بھی دے، ایٹم بم سے ہونے والی بیماری ناقابل علاج ہے اور ہم نہیں جانتے کہ ہمیں جنوب میں کس طرح حالات کا سامنا کرنا ہے ۔ چنانچہ ہمیں یقینی طور پر جا کر معاملات طے کر لینے چاہئیں یہی ایک راستہ ہو سکتا ہے'' ۔

پایوک سونگ ایک مچھلیاں پکڑنے والے افراد کا گاؤں تھا جو خلیج کے اسی پار ہائیر یونگ سے

کافی دور واقع ہے۔ ابا جان نے بتایا کہ وہ ایک لمبی سپاٹ پیندے والی کشتی لے لیں گے جو ہماری چیزیں لے جائے گی اور بوٹ پر لوڈ بھی کرا دے گی۔ تب وہ ایک اماوس کی رات کا انتظار کریں گے۔ اس کے ایک روز بعد انہوں نے کچھ ضروری سامان لیا اور بائیونگ سونگ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے سمندر پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ موسم کافی سرد تھا لیکن بچے پر جوش اور خوش نظر آ رہے تھے، وہ اسے پکنک سمجھ کر منا رہے تھے۔

موسم بہار کی یخ بستہ ہوا ان کے کپڑوں کے اندر تک گھسی جا رہی تھی۔ وہ کافی فاصلے پر سمندر اور ایک خم کی شکل میں خلیج کا نظارہ کر سکتے تھے۔ ابا جان نے کوئیڈو جزیرے سے آگے سمندر میں ایک اشارہ کیا۔ وہ سمندر کے افق پر ایک کشتی کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ کشتی آٹھ کشتی بان کھیلتے تھے، انہوں نے ہی انہیں اجنبی جزیرے میں لے جانا تھا، ان کی اشیاء پہلے ہی لوڈ کی جا چکی تھیں۔ وہ کافی دیر تک آنکھیں مچکا کر کشتی کی طرف دیکھتے رہے۔

☆ ☆ ☆

''کون ہے؟'' ماں چلائی، صحن میں قدموں کی چاپ سن کر اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ ''میں ہوں، آپ کی بہن'' آنٹی کی آواز آئی۔ ''اندر آ جاؤ'' جب ماں نے دروازہ کھولا، آنٹی، جنہوں نے حسب معمول اپنی پیٹھ پر اپنی بیٹی کو باندھ رکھا تھا، جلدی سے اندر داخل ہو گئیں۔ انہوں نے بیٹی کے تسمے کھولے اور پھر اسے فرش کے قدرے گرم حصے میں لٹا دیا۔ یہ بچی جس کے وافر گھنگھریالے کالے بال تھے۔ سوئی ہوئی تھی۔ ماں نے اس کے بالوں کی تعریف کی ''کتنے شاندار ہیں'' آنٹی نے ایک ویران سی ہنسی ہنسی ''ماں مجھے بچی کے بالوں کی وجہ سے ہمیشہ بدقسمت ہونے کا طعنہ دیا کرتی تھیں اور اس کے بالوں کو پکڑ کر جھنجھوڑتی تھی۔ جب انہوں نے فرش پر کپڑوں کا ڈھیر پڑے دیکھا تو پوچھا ''کیا تم جنوب جا رہی ہو؟''

''ایسی بات کس نے کی؟'' ابا جان نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے جوابی سوال۔ انہوں نے اس بارے میں کسی کو اشارہ تک نہیں دیا تھا۔

''آپ ہمیں اس طرح اکیلا چھوڑ کر نہیں جا رہے، کیا آپ ایسا کر رہے ہیں؟''

''ہمیں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''دوسرا بھائی اور میں، مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ، جب سے ہمارے والدین کی وفات

کے بعد سب سے بڑا بھائی ہی باپ ہوتا ہے، آپ کب جا رہے ہیں؟''

''ابھی تک ہم نے فیصلہ نہیں کیا، ہم اس بارے میں صرف سوچ رہے ہیں، یہ بات درست ہے لیکن جنوب میں ہم کسی کو بالکل نہیں جانتے، اس لئے ہم اپنے ذہنوں کو اس کام کیلئے آسانی سے کیسے تیار کر سکتے ہیں؟'' ابا جان نے اپنی بہن سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ، میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گی، میں وعدہ کرتی ہوں میں اپنی روزی روٹی خود کما لوں گی''۔

''پہلے ہم جائیں گے اور پھر آپ لوگوں کیلئے واپس آئیں، نگران کافی سخت ہے لیکن بہت سے لوگ آ جا رہے ہیں''۔

آنٹی کا جسم کپکپایا اور خون اس کے چہرے پر اتر آیا۔''نہیں آپ کو ہمیں پیچھے چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ دوسرا بھائی مر جائے گا، میں نے سنا ہے وہ نشہ کرنے والوں کو گرفتار کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ انہیں بھوکوں مار دیں گے یا پھر انہیں کوئلے کی کانوں میں بھیج دیں گے۔ ہم تمہارے واحد خونی رشتے دار ہیں، کیا نہیں ہیں؟''

''تمہارے خاوند کا کیا کریں، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں نے سنا ہے کہ اس نے سرخ گارڈ میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ اب وہ کسی طور میرا شوہر نہیں ہے۔ ہم اپنی پہلی زندگیوں میں ایک دوسرے کے جانی دشمن رہے ہوں گے۔ میں چاہتی ہوں اسے موت آ جائے، جن لوگوں کی مجھے کمی محسوس ہوتی ہے، وہ واحد میرے والدین ہیں'' آنٹی نے اتنا کہا اور رونا شروع کر دیا۔ ان کے ہونٹ بے اختیار کپکپا رہے تھے۔

''جہاز پرسوں ڈریگن خلیج سے جانے والا ہے، تم سیدھی وہیں آ جانا''۔

ماں نے صورتحال کو نہ سمجھتے ہوئے ابا جان کی طرف دیکھا۔ چاند کی آخری تاریخ پرسوں نہیں کل تھی۔

آنٹی کا چہرہ یکدم روشن ہو گیا۔ اس نے اپنے ہونٹ تر کئے اور کہا ''شکریہ، بہت بہت شکریہ'' اس نے اپنی سوئی ہوئی بیٹی اٹھائی اور اسے اپنی پیٹھ کے ساتھ باندھ لیا۔''ٹھیک ہے میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے اور تیاری شروع کر دینی چاہیے میں پرسوں وہاں موجود ہوں گی''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ جانے کیلئے

MashalBooks.com

اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر گیٹ تک جانے کے بعد اس نے گھر پر نظر ڈالی اور کہا ''لیکن میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ مجھے آج ہی اس گھر کو خدا حافظ کہہ دینا چاہئے''۔ بچوں کو لپیٹنے والا زردی مائل سبز کپڑا جس پر سرخ رنگ کے دھبے تھے موسم سرما کی یخ بستہ ہوا میں بھی اچھا اور شاندار دکھائی دے رہا تھا۔

''بہت ٹھنڈ ہے اس سرد ہوا میں سوجی کو ضرور ٹھنڈ لگ جائے گی، یہاں، اس کا سر اس سے لپیٹ دو'' ماں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی فر کی لائنوں کی جیکٹ بچی کی پیٹھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ بچی کے خوبصورت کالے بال دیکھ کر اس کا دل بھر آیا چنانچہ ہائیونڈو کی ماں نے محسوس کیا کہ اسے کچھ دیئے بغیر وہ اس کا غم کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکتی۔

''لیکن مایونگڈو کو اس کی ضرورت ہوگی'' آنٹی نے شرمندگی کے ساتھ کہا لیکن اس کپڑے سے اپنی بیٹی کو لپیٹ لیا، اس کے چہرے پر خوشی کی مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

ماں نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ سکول نہ جائے بلکہ گھر میں رہ کر اس کی مدد کرے، سکول نہ جانا یقیناً خوشی کی بات تھی۔ ناشتے کے بعد پلیٹیں دھوتے ہی ماں نے گھر کی صفائی شروع کر دی، اس نے اپنے سر کے گرد تولیہ باندھ رکھا تھا۔ ابا جان دادا اور دادی کی قبر پر دعا کیلئے چل پڑے۔

ماں نے سب سے پہلے وہ ڈبہ نکالا جس میں دادی ماں کی یادگاری گولیاں تھیں جن سے وہ صبح اور شام کے کھاتے وقت دعا کیا کرتی تھیں۔ ہائیونڈو نے اپنی ماں سے پوچھا ''کیا دادی اماں اب ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے؟'' ماں نے اسے بتایا تھا کہ یادگاری گولیوں والا گھر اس جگہ واقعہ ہے جہاں دادی اماں کی روح منڈلاتی رہتی ہے اور چونکہ ان کی روح ان کے آس پاس ہی ہوتی ہے اس لئے وہ اسی طرح گھر اور خاندان کی حفاظت کرتی ہیں، جیسے وہ اپنی زندگی میں کیا کرتی تھیں۔ اب جبکہ ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے تو وہ یہاں کیسے موجود رہیں گی؟'' ماں نے اس ڈبے میں سے اگربتی اور دیگر خوشبوئیں جلانے والا اسٹینڈ بڑے ماہرانہ انداز میں نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ہائیونڈو نے محسوس کیا کچھ سنگین قسم کا واقعہ ہونے والا ہے۔ اس کے والدین نے کچھ غیر معمولی کام نہیں کیا تھا، وہ ویسے ہی کام اور بات چیت کر رہے تھے جیسے عام دنوں میں کرتے تھے لیکن وہ ایک خاموش لہر سے بخوبی آگاہ تھے، پچھلے چند دنوں سے گھر میں کچھ خفیہ جلد بازی جاری تھی۔

صحن صاف کرنے کے بعد جیسے ہی ماں نے اجازت دی، ہائیونڈو دبے پاؤں باہر نکل آیا۔

''باہر زیادہ دیر مت رہنا'' ماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

ہائیونڈو یادگار چوک کی طرف بھاگا، کیونکہ اس روز ہایئر یونگ میں کچھ خاص متوقع تھا، ایک خاص شخص یہاں آنے والا تھا جس نے اپنی ساری زندگی وطن کی آزادی، حب الوطنی اور اپنے ماتحت کام کرنے والے آزادی کے متوالوں کی شجاعت بڑھانے کیلئے وقف کئے رکھی اور جو مانچوریا کے پورے علاقے کے علاوہ پوری روس میں بھی معروف اور مشہور تھا۔ یقیناً اس نے جاپانیوں کو اپنے مادر وطن سے نکال باہر کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ طویل عرصے سے خواہش مند تھا کہ آزاد وطن کی مٹی پر قدم رکھے۔ ہائیونڈو کے ٹیچر نے بتایا تھا، یہ ایسا آدمی ہے جو ہماری تاریک اور سیاہ تاریخ کو سورج کی طرح روشن اجالوں میں بدل سکتا ہے۔ ایک شخصیت جو ہماری تاریخ کو سورج کی طرح اجال سکتی تھی، اچھا، اس کی نشانی کیا ہوگی اور جب وہ ہایئر یونگ میں داخلہو گا تو اس کے گرد کس قسم کا نور کا ہالہ ہوگا؟ کیا وہ اپنے ماتھے پر سورج اٹھائے ہوئے ہوگا؟ ٹیچر کی ان باتوں نے ہائیونڈو کے دل کو اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کی بصارت چکا چوند ہو رہی تھی۔

دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ لوگ جھنڈے اٹھا کر یادگار چوک پہنچنا شروع ہو چکے تھے۔ ہائیونڈو نے سوچا اگر وہ یادگار کے اوپر کھڑا ہوگا تو وہ پورے مجمعے کا اچھا جائزہ لے سکے گا اور پھر ہجوم اسے دھکیل کر پیچھے بھی نہیں کر سکے گا۔ خوش قسمتی سے یادگار کے اوپر ابھی تک کوئی بھی نہیں چڑھا تھا۔ چند بچے اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ ہائیونڈو نے ان کا دائرہ کاٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اسے روک دیا گیا اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کا چچا یادگار سے ٹیک لگائے جھکا ہوا تھا۔ اس کے بال گچھا ہو رہے تھے اور داڑھی بڑھ گئی تھی اور تھکے ہوئے بوڑھے سپاہی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ بچے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے، ''کیا یہ پاگل ہے؟'' ''کیا یہ مر چکا ہے؟ اور پھر انہوں نے ایک ڈنڈے سے اسے ٹھوکا دیا۔ چچا نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور وہ بچوں کے سروں کے اوپر روشن نیلے آسمان کو اپنی نیم وا آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔ ہائیونڈو جانتا تھا کہ اس کا چچا پاگل ہے اور نہ ہی مرا ہوا ہے بلکہ اس نے نشہ کر رکھا ہے اور وہ اپنی ہی دنیا میں گم ہے۔ اس کی جیکٹ میں سے باہر آتی ہوئی اس کی کلائیاں ایسے تھیں جیسے سوکھی ہوئی لکڑی۔ اس کی کلائی پر کوئی چپچپا مواد لگا ہوا تھا اور ایک چیونٹی اس

کے گرد چکر کاٹ رہی تھی۔ ماں نے اسے بتایا تھا کہ جب نشیئوں کے جسم پر اتنا ماس بھی باقی نہیں رہتا کہ اس میں سوئی چبھوئی جا سکے تو ان کی گردن ڈھلک جاتی ہے اور وہ کسی بیمار مرغی کی طرح دھوپ میں بیٹھے اپنی جان دے دیتے ہیں۔

ہائیونڈو نے چچا کو اپنی دادی ماں کے مرنے کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔ چچا جب سے دادی ماں کا چاندی کا بنا ہوا کلپ لے کر گیا تھا، واپس گھر نہیں لوٹا تھا، چچا کو دیکھ کر ہائیونڈو کی یہ شدید خواہش ایک دم کمہلا سی گئی کہ وہ اپنی سوچ پر شدت کے ساتھ چھائے ہوئے نوری ہالے کو پکڑ سکے۔ کیا ہم میں سے ہر کسی کے سر پر ایک یا پھر دوسری طرح کا نورانی ہالہ نہیں ہے؟ کیا سورج ہم سب پر ایک ہی طرح سے نہیں چمکتا ہے؟

یادگار کے گرد زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو رہے تھے لیکن ہائیونڈو وہ جگہ چھوڑ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے چچا کی آنکھیں اسے روکنے اور واپس بلانے کی کوشش کر رہی ہیں اور اپنے چچا کی طرف نہ دیکھنے کی ہمت اور جرأت کر کے وہ اس کا تمسخر اڑا رہا ہے۔

گھر میں ماں رات کے کھانے کیلئے چاول تیار کر رہی تھی حالانکہ ابھی کافی دن باقی تھا۔ گھر پہلے ہی مکمل طور پر صاف کیا جا چکا تھا۔ ''تم اتنی دیر کہاں تھے، آج کے دن تم گھر پر کیوں نہیں ٹھہرتے''؟ ابا جان، جو پہاڑ سے واپس آ چکے تھے، نے اسے جھڑکا۔

اوپر والی منزل کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ کمرہ جس میں کبھی کبھار استعمال میں آنے والی چیزیں اور دیگر کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا اب مکمل طور پر صاف ستھرا بنا دیا گیا تھا۔ ہائیونڈو اوپر چڑھ گیا۔ اس نے الگ کی گئی چیزوں کے ڈھیر میں سے بچوں کی گڑیا تلاش کی، لیکن وہ وہاں موجود نہ تھی۔ اس کی ماں نے یقیناً وہ پھینک دی ہو گی۔ ہائیونڈو نیچے آ گیا اور پرانی کتابوں، اخبارات اور دوسرے کاٹھ کباڑ میں تلاش کرنے لگا۔

''تم کیا چیز تلاش کر رہے ہو''؟ باپ نے پوچھا۔

''میری ایک چیز تھی'' ہائیونڈو نے بدمزاجی سے جواب دیا۔

کاٹھ کباڑ کے ڈھیر سے اسے گڑیا مل گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' باپ نے اس سے اس وقت پوچھا جب وہ لکڑی کی بنی ہوئی گڑیا کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ میرے ایک دوست کی ہے، میں کل اسے واپس کر دوں گا'' پھر اس نے سوچا ''لیکن شن زینگ تو وہاں سے جا چکا ہے'' اس نے گڑیا پر سے گرد صاف کی اور اسے ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کیا تو اس کا خوبصورت چہرہ، لمبی کالی آنکھیں اور مسکراتا ہوا سرخ چہرہ واضح ہو گیا۔ ابا جان نے کہا، ''ارے یہ تو جاپانی چیز ہے، اسے پھینک دو، تم اسے واپس نہیں کر سکتے''۔ لیکن ہائیونڈو نے گڑیا اپنی جیب میں رکھ لی۔

رات کا کھانا جلد کھانے کے بعد ماں نے چاولوں کے لڈو پکائے اور ان میں سے پانچ کو ایک ٹرے میں رکھا، کپڑے سے اس کو ڈھانپا اور ہائیونڈو سے کہا کہ وہ اسے چچا کے کمرے میں چھوڑ آئے۔

''لیکن چچا تو گھر پر نہیں ہیں'' ہائیونڈو نے کہا۔ اس نے سوچا کہ ماں کو بتا دے، اس نے چچا کو یادگار کے پاس دیکھا تھا لیکن پھر ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''ہاں اگر وہ گھر آ جائے تو اسے کھانے کی ضرورت پڑے گی'' ماں نے جواب دیا۔

ٹرے میں ایک چھوٹی سی پانی والی کیتلی بھی تھی۔ پھر ماں نے روئی اور اون سے بنی ہوئی کچھ پٹیاں اور کاٹن آ ؤٹ فٹ ایک دراز سے نکالا اور ہائیونڈو کو دوبارہ بلا کر کہا کہ وہ یہ چیزیں بھی چچا کے کمرے میں رکھ دے۔ چچا کا کمرہ صاف کر دیا گیا تھا بستر کی نئی چادریں فرش پر رکھ دی گئی تھیں لیکن کمرہ سرد تھا کیونکہ چچا دادی ماں کا کلپ لے کر جانے کے بعد سے وہ کبھی گھر واپس نہیں آئے تھے۔

شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ ''وقت کیا ہوا ہے''۔ ماں نے ابا جان سے پوچھا۔ ''ابھی صرف پانچ بجے ہیں'' ابان جان نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''ارے فرش ٹھنڈا ہو رہا ہے'' اتنا کہہ کر ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اب نیا ایندھن جھونکنے کا کیا فائدہ'' ابا جان نے ماں کو جھڑکا۔ ''کل جب بہن آئے گی تو سب سے پہلے وہ اپنی بیٹی کو فرش پر لٹائے گی''۔ ماں کے اس جواب پر ابا جان خاموش رہے اور اندھیرے میں ڈوبتی کھڑکیوں کو گھورنے لگے۔

اندر والے کمرے کے آتش دان کو لکڑیوں سے بھرنے کے بعد ماں نے آواز دے کر ہائیونڈو سے کہا کہ وہ کچھ کاغذ لے آئے تا کہ اس سے آگ جلائی جا سکے، ماں پچھلے کمرے میں چلی گئی اور ہائیونڈو نے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر سے ماں کو کچھ پرانی کتابیں لا کر دے دیں۔ جب اس نے جلتے ہوئے کاغذ کا ٹکڑا چولہے میں رکھا تو وہ جھینگر اور ٹڈے جو اندھیرے اور مرطوب آتش دان میں رہ رہے تھے ایک دم چھلانگیں لگا کر باہر نکلنے لگے۔ ماں نے جلتی ہوئی لکڑی کو آتش دان میں اور آگے کر دیا۔

''آپ خالی کمرے کو کیوں روشن کر رہی ہیں' ہائیونڈو نے پوچھا۔

''جب تمہارے چچا آئیں گے تو یہاں سردی ہوگی اس لئے آگ جلا دی ہے''۔ پھر لکڑیوں کا ایک نیا بنڈل کھولتے ہوئے وہ اپنے بیٹے سے زیادہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بڑبڑائی ''اس کی گرمی کب تک قائم رہے گی؟ کل سہ پہر تک؟ کل شام تک؟

دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ خلیج کے اس پار بندرگاہ کی روشنیاں بہت مدہم نظر آ رہی تھیں۔ وہ خلیج ڈریگن کی طرف پیدل چل رہے تھے، وہ کوشش کر رہے تھے کہ ان کے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے۔ ایک چھوٹی لمبی سپاٹ پینیدے کی کشتی ان کی منتظر تھی، کشتی پتھروں اور چٹانوں میں چھپائی گئی تھی۔ دو سال کا مایونگکڈ وا اپنی ماں کی پیٹھ پر بندھا ہوا سو رہا تھا جبکہ پانچ سال کا سنگڈ وا ابا جان کی پیٹھ پر سو رہا تھا۔ صرف دس سال کے ہائیونڈو کو رات کے وقت تین میل کا پیدل سفر طے کرنا تھا۔ اس نے اپنی پیٹھ پر ایک چھوٹا سا رک سیک باندھ رکھا تھا۔

جب وہ چٹان کا چکر کاٹ کر آگے بڑھے تو کشتی میں بیٹھا ملاح ان کا استقبال کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا ''جلدی سے اندر آ جاؤ'' اگرچہ ملاح نے کشتی کا ایک حصہ تختی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا پھر بھی جب کوئی کشتی میں سوار ہوتا تو وہ خطرناک حد تک ڈول جاتی تھی، جب پورا خاندان اس میں سوار ہوا تو یہ مکمل طور پر بھر گئی۔ چاند کے بغیر رات بہت گہری اور کالی تھی۔ وہ کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہ تھے، صرف پانی میں چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

جب کشتی ساحل سے چند میٹر ہی دور گئی تھی تو انہیں کنارے پر کچھ لوگوں کے تیزی سے چلنے کی آواز آئی۔ یہ دو یا تین لوگوں کے قدموں کی آواز تھی۔ ملاح نے ایک لمحے کیلئے کشتی کھینے کا کام روک دیا اور کچھ سننے کی کوشش کی پھر جلد ہی دوبارہ کشتی کھینا شروع کر دیا۔ جو کنارہ چھوڑ کر وہ سمندر میں آئے تھے وہاں دو افراد کے سائے نظر آ رہے تھے ''بھائی جان، بہن جی' یہ آنٹی کی آواز تھی۔

''کیا ہم انہیں کشتی پر سوار کر سکتے ہیں؟'' ابا جان نے ملاح سے پوچھا۔ ملاح نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ جلد ہی کنارے پر گشت شروع ہو جائے گا'' ہم سمندر میں کافی آگے آ گئے ہیں۔

''میں دوسرے بھائی کو بھی ساتھ لائی ہوں، تم ہمیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟''

ماں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کشتی کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی ''پیچھے مڑ کر مت

دیکھو۔ ابا جان نے ناراضی سے کہا، ملاح زیادہ تیزی سے کشتی کھینے لگا۔

''ہمیں اس طرح چھوڑ کر چلے جانے پر ماں کیا سوچے گی'' آنٹی چلائی لیکن اس کی آواز جلد ہی لہروں کے شور میں گم ہو کر رہ گئی۔

''کیا ہونے والا ہے'' ہائیونڈو نے آہستہ آواز میں ماں سے پوچھا لیکن ماں نے اس کے کندھے پر ایک چپت رسید کرتے ہوئے کہا کہ خاموش بیٹھے رہو۔ وہ ان خیالات کی وجہ سے پریشان تھی جو بچوں کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے تھے۔

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ دھند اتنی گہری ہے'' ملاح نے اپنی بھاری آواز میں بتایا۔

''ہمیں اور کتنی دور جانا ہے'' ابا جان نے کشتی والے سے پوچھا۔

''ہم آدھے گھنٹے میں بڑی کشتی تک پہنچ جائیں گے۔ ہمیں خاموش رہنا ہو گا۔ آکس آئی لینڈ پر روسی سپاہی ہوتے ہیں اور وہاں سیکورٹی گارڈ کی نگران چوکی بھی ہے۔ ہم ایک اس جزیرے کو پار کر گئے تو پھر سمجھو ہم محفوظ ہو جائیں گے'' کشتی والے نے تفصیلی جواب دیا۔

دو سالہ مایونگلڈ وجو سویا ہوا تھا، اٹھ گیا اور رونے لگا۔

''بچے کو خاموش کرائیے میڈم، یہاں بڑا خطرہ ہے'' کشتی والے نے ماں کو مدہم آواز میں تنبیہہ کی۔

بچے نے اپنی پینٹ گیلی کر دی ہو گی۔ ماں نے اسے رسیوں سے آزاد کیا اور بہلانے کی کوشش کی لیکن اس نے رونا بند نہ کیا۔ ماں نے اپنا بلاؤز کھولا اور اپنے پستان اس کے منہ میں ڈال دیئے، ان میں اب دودھ نہیں آتا تھا لیکن بچے نے اپنی زبان سے نپلز کو چوسنے کی کوشش کی اور پھر زیادہ زور سے رونے لگا۔

''میڈم آپ کو اسے چپ کرانا ہو گا۔ یا پھر ہم سب مارے جائیں گے'' کشتی والے نے دوسری بار خبردار کیا۔

یوں محسوس ہوا کہ دور سے کوئی چلا رہا ہے اور پھر دور سے ہی بندوق چلنے کی آواز آئی۔ باپ نے بچوں سے کہا کہ وہ کشتی کے فرش پر لیٹ جائیں۔ اس نے اپنا سر بھی نیچے کر لیا اور ماں کو حکم دیا کہ اس کا منہ بند کرو۔ ماں نے بچے کا منہ اپنی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ بچے کی سانس گرم تھیں، جیسے اسے بخار تھا۔ بچا

اب ہاتھ پاؤں مارنے لگا تھا۔ ''ارے مایونگڈو...... میرے بچے'' ماں نے چمکارنے کی کوشش کی۔ بچے کی مزاحمت اس قدر سخت اور تیز تھی کہ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے اسی خوف میں بچے کا چہرہ اپنے ہاتھ سے دبایا۔ اس عجیب صورتحال میں اسے بچے کو رونے سے روکنے کا کوئی اور طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''اب ٹھیک ہے، ہم خطرے سے باہر نکل آئے ہیں۔ آپ اب آسانی سے سانس لے سکتے ہیں'' کشتی والے نے زیادہ تیزی سے کشتی چلاتے ہوئے کہا۔ گہری دھند کی وجہ سے وہ کشتی والے کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے حالانکہ وہ اسی کشتی میں موجود تھا۔ مایونگڈو اب چلا نہیں رہا تھا اور اپنی ماں کی بانہوں میں ڈھیلا ڈھالا پڑا تھا۔

''اس بچے نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا، یقیناً اسے بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا حالانکہ یہ ابھی بہت چھوٹا ہے'' باپ نے مدہم آواز میں کہا۔

''اس مہینے میں چوتھی مرتبہ یہ کام کر رہا ہوں اور نگرانی روز بروز سخت سے سخت ہوتی جا رہی ہے۔ بہرحال جب حالات بہتر ہو جائیں تو واپس آ جایئے گا۔ دنیا میں اپنے گھر سے بہتر اور کوئی جگہ ہو سکتی ہے؟'' یہ سال کا وہ وقت ہے جب بندرگاہ پر کھڑے تمام جہاز مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں اور ماہی گیر گیت گاتے ہیں۔

لیکن بچوں کی ماں واضح طور پر جانتی تھی کہ وہ کبھی واپس نہیں آ سکیں گے۔ سمندر میں جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے وہ زیادہ بے رحم ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں ان کے آبائی گھر سے دور اور دور دھکیل رہا تھا۔ اندھیرے اور دھند نے اس کے بچے کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا حالانکہ وہ اب اس کی گود میں بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ جب اس نے اپنی حسرت آمیز نظروں سے اس طرف دیکھا جہاں سے ان کی کشتی چلی تھی تو اسے ہیولا سا نظر آیا جیسے اس کی نند کالی چٹان کے اوپر کھڑے ہو کر انہیں پکار رہی ہو۔ یا ممکن ہے اس کی آنکھوں میں اس بچی کے بالوں کا چندھیا دینے والا تصور ہو، جو اپنی ماں کی پشت پر رسی سے بندے ہوئی تھی۔ بچی کے بال کتنے شاندار تھے نیلے پائن کی سوئی جیسے پتوں سے بھی زیادہ۔

اسی لمحے اس نے ایک آہ بھری اور اپنے پیٹ کو دبایا، اس کی کوکھ میں پل رہا بچہ اپنے پاؤں چلا رہا تھا۔ یہ بچہ اس موسم گرما کے آغاز میں بڑی عجیب سی جگہ پر پیدا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.com

MashalBooks.com

بارش کی جھڑی

یوہیونگ گل

1942ء میں پیدا ہونے والے یو ہیونگ گل ایسے مصنف ہیں جنہیں کسی خاص زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر نمایاں اور غالب ادبی رجحانات کو مسترد کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے ایسے موضوعات کو اپنی تحریروں کا ذریعہ بنایا معاصر مصنفین بھی جنہیں پسند کرتے تھے۔ معاشرتی ناانصافیوں کے مسائل، معاشی عدم مساوات، انسانی حقوق کا غلط استعمال اور تقسیم کے اثرات و نتائج لیکن اُن کی تحریروں میں اوسط درجے کے تحریر نگاروں سے زیادہ لطف اور ذائقہ ملتا ہے اور یہ فرق اس وقت بھی واضح محسوس ہوتا ہے جب دونوں ایک ہی موضوع پر لکھ رہے ہوں۔ دوسرے مصنفین کی تحریروں میں غصہ اور اشتعال واضح طور پر غالب نظر آتا ہے لیکن جل کی کہانیوں میں رحم کا جذبہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور ان کے کردار ہمیشہ آہن گری کے کھانچے دار اوزار ہوتے ہیں۔ اپنے بچپن اور جوانی میں جسمانی اور ذہنی اذیت دینے والے جذباتی اور نفسیاتی جھگڑوں کا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے یون کو انسانی سائیکی کی جڑوں میں کلبلانے والے کیڑوں اور انسان کے شمار سے باہر تعدیلی فنی طریق کار کی گہری سمجھ ہے۔ اس طرح اس کے ولن کرداروں میں کچھ قابل بازیابی خصوصیات اور ہیروز میں انسانی کمزوریاں موجود ہوتی ہیں۔ یہ عنصر اور اس کے ساتھ ان کی لفظی بزلہ سنجی، زبان کا ذومعنی استعمال اور ان کی قدرتی Cholla- do dialect کو ہینڈل کرنے کی ناقابل نقل

مہارت ان کی دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔ پڑھنے والے کو متعدد خرابیوں، خامیوں اور امتحانات، جو انسانیت کے لئے گھات لگائے چھپے رہتے ہیں، میں سے گزارنے کے بعد وہ ہمیں ایک بامعنی بقاء کی امکانی صورت پیش کرتے ہیں۔

''بارش کی جھڑی'' پہلی بار 1978ء میں شائع ہوا۔ یہ آج بھی کوریا کے جنگ کے تجربات کے حوالے سے بہترین افسانہ قرار دیا جاتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں ایک ہی نسل اور قوم کے لوگوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹے۔ کوریا کی جنگ نے کورین سائیکی پر ایسا زخم چھوڑا ہے جو آدھی صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود مندمل ہونے میں ہی نہیں آ رہا۔ دادی ماں اور نانی ماں کے درمیان اپنے بیٹوں کے ساتھ جنگ کے کیمپوں کی مخالفت میں یادگار مقابلے کا حاصل بڑے معصومانہ انداز میں ایک بچے نے بیان کیا ہے جو بڑوں کے نفرت کے کھیلوں کی زد میں آ گیا تھا۔ دونوں خواتین کے درمیان حتمی سمجھوتہ ماورائیت اور مندمل ہونے کے حوالے سے ایک امید کو ظاہر کرتا ہے۔

(1)

بارش، جو اسی دن شروع ہوگئی تھی جب ہم نے مٹر کی آخری پھلی تک کاٹ لی، کے رکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے حالانکہ کافی دن گزر چکے تھے۔ کبھی تو پھوار پڑنے لگتی اور کبھی موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی اور یوں لگتا تھا بارش کے موٹے موٹے قطرے چھت کو چیرتے ہوئے نیچے چلے آئیں گے۔ آج کی رات بارش نے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے گیلے صفائی کے پوچے کی طرح اپنے اندر سمو لیا تھا۔

وہ یقیناً گاؤں کے بالکل باہر کہیں ہوگا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ دریا کے کنارے کے ایک طرف بنے خالی گھر، جو جنازے لے جانے والی ڈولیاں سٹور کرنے کے کام آتا ہے، کے آس پاس سے

MashalBooks.com

کہیں آیا تھا۔ وہ گھر مجھے ہمیشہ بڑا پراسرار محسوس ہوتا تھا، حتیٰ کہ کتے بھی جب اس کے قریب جاتے تو نہایت بھیانک انداز میں بھونکتے اور لومڑی کی طرح طویل کراہتی ہوئی آواز نکالتے تھے۔ لیکن یقینی طور پر وہ اس خالی گھر سے بھی پرے سے کہیں آیا تھا۔ دور کہیں کتوں کے بین کرنے کی آواز کم ہوتی ہوئی بارش سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کہیں دور سے آنے والی کتوں کے ''ہو ہو'' کرنے کی آواز کوئی فوجی اشارہ تھا کہ گاؤں کے تمام کتوں نے اس جنگ سے زندہ بچ جانے کیلئے باری باری بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کا بھونکنا اس رات غیر معمولی طور پر شدید اور تیز تھا۔

اس رات ہم سب مہمان خانے میں جمع ہو گئے جو نانی اماں کے زیر استعمال تھا کیونکہ وہ کسی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھیں اور ہم انہیں آرام پہنچانے اور اعتماد بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ماں اور خالہ نے باہر کتوں کے بھونکنا شروع کرنے کے بعد انہیں آرام پہنچانے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ چور نظروں سے نانی اماں کی طرف دیکھنے کے بعد وہ بار بار سامنے پھیلی ہوئی تاریکی پر اپنی نظر گاڑ دیتی تھیں، جو کمرے سے صرف ایک دروازے کی دوری پر تھی جبکہ دروازے پر مہین تاروں کا بنا ہوا مچھروں کو پکڑنے والا جال تنا ہوا تھا، ایک گول مول سا بھنورا، جس کے بڑے بڑے پر تھے، کافی دیر سے دروازے کی چوکھٹ پر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر چکر پہ چکر لگا رہا تھا۔

''صرف انتظار کرو اور دیکھو، زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ ہم جان جائیں گے اور ہمیں یقین آ جائے گا۔ صرف انتظار کرو اور دیکھو کہ میں کبھی غلطی پر تھی''۔ نانی اماں نے ڈوبی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ وہ پھلیوں سے مٹر نکال رہی تھیں۔ یہ مٹر اگلی صبح ناشتے کیلئے چاولوں کے ساتھ پکائے جانے تھے۔ وہ بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی گود مٹر کی پھلیوں کے چھلکوں سے بھری ہوئی تھی، وہ بڑے ماہر ہاتھوں سے مٹر کے دانے نکال رہی تھیں۔ پہلے وہ مٹر کی پھلی کا ایک سرا چیرتیں اور پھر اپنی ایک انگلی اس میں پھیرتیں جب مٹر کے سبز دانے چیری ہوئی پھلی کے ایک حصے میں آ جاتے تو نانی اماں انہیں اپنے ہاتھوں میں بھر لیتیں اور پھر بانس سے بنی ہوئی ٹوکری میں ڈال دیتیں، جو ان کے گھٹنے پر رکھی ہوئی تھی، وہ خالی پھلی اپنی گود میں ڈال دیتی تھیں۔

ماں اور خالہ، جو جواب الجواب کا موقع ضائع کر چکی تھیں، نے بڑے بھونڈے انداز میں نظروں کا تبادلہ کیا۔ باہر بارش ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی اور کتوں نے بھی بھونکنے کا عمل تیز کر دیا تھا، جیسے

ایک دوسرے کے مقابلے پر ہوں۔ رات زیادہ طوفانی ہوتی جا رہی تھی اور گودام کے پلیٹ فارم کی جانب سے دھات کے سیمنٹ کے فرش کے ساتھ ٹکرانے کی آواز آئی تھی۔ جست کا بنا ہوا برتن، جو دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا تھا، یقینی طور پر نیچے گر گیا ہوگا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بارش کی بوچھاڑ کمرے کے اندر داخل ہوگئی، دروازے کے کواڑ بجے اور ٹمٹماتا ہوا مٹی کے تیل کا لیمپ بجھ گیا۔ کمرہ اچانک تاریکی کے سیلاب میں ڈوب گیا اور چپچپاتی مرطوبیت محسوس کی جانے لگی۔ بھنورے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ بھی بند ہوگئی۔ ایک ہی قطار میں بنے ہوئے ہمارے گھر سے تیسرے یا چوتھے گھر میں ایک کتا بھونکنا شروع ہو گیا۔ ہمارا کتا وولی، جواب تک خاموش بیٹھا تھا، وہ بھی غرایا، کتوں کی جنگی شورش جو گاؤں کے کسی داخلی راستے پر شروع ہوئی تھی اب ہمارے گھر کے قریب، اور قریب آتی جا رہی تھی۔

''لیمپ جلاؤ، میں نے کہا لیمپ جلاؤ، تم نے میری آواز نہیں سنی، کتنا شیطانی موسم ہے'' یہ محسوس کر کے کہ کمرہ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے، نانی اماں نے سرسراتی ہوئی آواز نکالی۔

میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ چلائے، ماچس تلاش کی اور مٹی کے تیل والا لیمپ جلا دیا۔ ماں نے فیتہ کاٹا۔ کالے دھوئیں کی ایک پٹی بل دار اوپر کو اٹھی اور اس نے چھت پر ایک گول سا سایہ بنا دیا۔

''سال کے اس عرصے میں موسم ہمیشہ بارش والا ہی ہوتا ہے'' ماں نے موسم کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے آرامی اور بے زاری کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''یہ سب موسم کی وجہ سے ہے، یہ اسی کی وجہ سے ہے کہ آپ بغیر کسی وجہ کے فکر مند ہو رہی ہیں''، خالہ نے بھی بات چیت میں حصہ لینا شروع کر دیا، خالہ نے سیول کے ایک ہائی سکول سے گریجوایشن کی تھی یہ جنگ شروع ہونے سے پہلے کی بات ہے جب میری ماں کا خاندان سیول میں رہتا تھا۔

''نہیں یہ بلا سبب نہیں ہے، تم نہیں جانتی، میرا خواب کب غلط ثابت ہوا ہے؟'' نانی اماں نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا، اُن کا سر تو ہل رہا تھا لیکن ان کے ہاتھ اسی تیزی سے کام کر رہے تھے۔

''میں خوابوں پر یقین نہیں رکھتی، ابھی پرسوں ہی تو ہمیں کل جن کا خط ملا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اچھا اور بھلا چنگا ہے''۔

MashalBooks.com

''ہاں بالکل ٹھیک، تم نے خود ہی تو وہ حصہ پڑھا تھا جس میں کل جن نے لکھا ہے کہ وہ ان دنوں بیزاری محسوس کر رہا ہے کیونکہ جھڑپیں نہیں ہو رہی ہیں''۔

''اس سب کا کچھ فائدہ نہیں، جب تمہارا باپ مرا تھا تو میں تین چار دن پہلے سے جانتی تھی، فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت دانت کی جگہ انگوٹھا تھا۔ اس وقت میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میرا انگوٹھا الگ ہوا اور پھر غائب ہو گیا''۔

اوہ اسی خواب کا ایک بار پھر قابل نفرت بیان، نانی جان اس خواب کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کبھی تھکتی نہیں ہیں؟ صبح جب وہ اٹھ جاتیں تو پھر اپنے خواب کے بارے میں ان کی باتیں شروع ہو جاتی تھیں، ان کی آنکھیں ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں سکتی تھیں، انہیں دھندلا نظر آتا تھا۔ وہ اپنا دانتوں سے تقریباً خالی، پچکا ہوا منہ ہر وقت ہلاتی رہتی تھیں اور اس امر کی طرف اشارہ کرتی رہتی تھیں کہ کوئی منحوس قوت ان کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔ ان کے منہ میں صرف سات دانت باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے خواب دیکھا تھا کہ ایک بہت بڑا زنبور، جو پتہ نہیں کہاں سے آیا تھا، خود بخود زبردستی ان کے منہ میں چلا گیا اور اس نے ان ساتوں میں سے سب سے مضبوط دانت کو کھینچا اور پھر غائب ہو گیا۔ صبح نیند سے جاگنے کے بعد نانی اماں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ منہ میں اپنے دانتوں کو پہلے محسوس کیا اور پھر ان کی گنتی کی۔ پھر انہوں نے خالہ سے کہا کہ وہ آئینہ لے کر آئے، اس طرح انہوں نے اپنی آنکھوں سے ساتوں دانت دیکھے۔ اس پر بھی ان کا اطمینان نہ ہوا تو مجھے بلایا گیا کہ ان کے منہ میں جھانکوں اور پھر بار بار مجھ سے یقین دہانی حاصل کی گئی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی کتنی ہی بار ان کے منہ میں جھانک لے، ان کے منہ میں سات دانت تھے، بالکل پہلے کی طرح۔ علاوہ ازیں سامنے کے دانتوں اور داڑھوں کے درمیان کا نوکیلا دانت، جسے وہ غذا پینے والے دانتوں کا متبادل قرار دیتی تھیں، وہ بھی ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ پر بحفاظت موجود تھا۔ لیکن نانی جان کسی شخص کی گواہی پر یقین کرنے والی نہ تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک یہ خارج از بحث تھا کہ نوکیلا دانت وہاں قائم رہ سکتا ہے اگر اسے کچھ نہ ہوا ہو۔ ان کی سوچیں حقیقت سے دور تھیں اور ان کے خوابوں میں ہی بسی رہتی تھیں۔ انہوں نے اس بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کی بیٹیاں اور نواسا سچ بول رہے ہیں حتیٰ کہ انہوں نے اپنے نواسے کی نظروں پر بھی شک تھا جس کی وہ ہر وقت تعریف کرتی رہتی تھیں کہ وہ سوئی میں دھاگہ ڈالنے کے حوالے سے بہت اچھا

ہے۔انہوں نے صرف آئینے پر ہی عدم اعتماد نہیں کیا تھا،انہیں اپنی انگلیوں پر بھی اعتبار نہیں تھا،جنھوں نے منہ کے اندر دانتوں کو محسوس کر کے ان کا سروے کیا تھا۔

نانی جان طویل موسم گرما کے اُس پورے دن اپنے خواب کے بارے میں بدبداتی رہیں۔ اس سے ہم سب کے اعصاب انتشار کا شکار ہو گئے۔ یہ خاموشی توڑنے والی اور میرے ماموں کا نام ظاہر کرنیوالی میری ماں تھی۔ جب میری ماں نے بے توجہی سے اپنے بھائی کا نام لیا، جوری پبلک آرمی کی ایک پلاٹون میں میجر اور کمانڈوز کے طور پر محاذ پر خدمات انجام دے رہا تھا، تو نانی جان کے ڈھیلے ڈھالے گالوں میں اچانک ہلچل پیدا ہوگئی۔خالہ نے اپنی بڑی بہن کی طرف پر مذمت نظروں سے دیکھا ۔نانی جان نے البتہ ماں کے الفاظ نظر انداز کر دیئے۔ یہ اندازہ لگا کر کہ اس معمر خاتون کے ذہن کو آسودہ کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے خالہ نے بھی جلد ہی ماموں کے حوالے سے باتیں شروع کر دیں۔لیکن نانی اماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام ایک بار بھی نہیں لیا۔ وہ صرف اس قابل نفرت خواب کے بارے میں بولتی رہیں۔

جب اندھیرا چھانے لگا تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ کون آسودہ ہو رہا ہے اور کون آسودگی فراہم کر رہا ہے۔ جوں جوں رات گہری ہوتی گئی نانی اماں کے الفاظ زیادہ سے زیادہ غیر واضح طور پر ترغیب دینے والے ہو گئے جیسے وہ کسی سحر میں مبتلا ہوں حتیٰ کہ ان کا چہرہ ایک فتح یاب شادمانی کا اعتماد لئے ہوئے تھا۔اس کے برعکس ماں اور خالہ فکر مند اور بے آرام تھیں اور خالی نظروں سے ان مٹر کی پھلیوں کی طرف دیکھے جا رہی تھیں جن سے مٹر کے دانے نکالنے کیلئے وہ اندر لے کر آئی تھیں۔آخر میں سارا کام بوڑھی خاتون کے حوالے کر دیا گیا اور خالہ اور ماں کچھ بھی نہیں کر رہی تھیں،سوائے معمر خاتون کی باتیں سننے کے۔

بارش کسی کیلے پوچے کی طرح پورے گاؤں پر برس رہی تھی۔ تین یا چار کتے جو اس جنگ میں خوش قسمتی سے بچ گئے تھے اب بے رحمی سے تاریکی کا سینہ چیر رہے تھے اور ہر خالی جگہ کو اپنی ''ہو ہو'' کی آواز سے پر کر رہے تھے۔نانی اماں مشاق ہاتھوں سے مٹر چھیل رہی تھیں، چمکدار سبز مٹر کے دانے بانس کے تنکوں سے بنی ٹوکری میں ڈال رہی تھیں اور خالی چھلکے اپنی گود میں پھینکتی جا رہی تھیں۔ ہمارا کتا ''وولی'' جسے ان مشکل غمگین دنوں میں کسی طرف سے کوئی توجہ حاصل نہیں ہو رہی تھی حیران کن حد تک غضبناک تھا

اور گھنٹی بجنے کی سی آواز میں بھونکنے لگا۔ اسی لمحے ہم نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی، یہ کسی ایک شخص کے قدموں کی آواز نہ تھی۔ وہ تین محسوس ہوتے تھے یا کم از کم دو تو ضرور تھے۔ کسی نے بارش کے پانی سے بھرے کسی چھوٹے سے گڑھے میں پاؤں رکھ دیا تھا کیونکہ چھینٹے اڑنے کی آواز آئی تھی اور اس سے بھی بھاری آواز اس خوفناک موسم کے بارے میں شکایت کی تھی۔

یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ کون اتنی رات گئے اتنی زیادہ بارش میں گاؤں کی گلیوں میں پیدل چلنے کی ہمت کر سکتا ہے؟ اگرچہ محاذ جنگ جنوب کی طرف سمٹ چکا تھا، پھر بھی ابھی خطرہ باقی تھا، کمیونسٹ گوریلے اب بھی کبھی کبھی حملے کرتے تھے اور قصبے کے پولیس اسٹیشن پر گولیاں برساتے تھے۔ کوئی بھی جو معقولیت کا احساس رکھتا ہو، رات ہو جانے پر کسی دوسرے کے گھر میں نہیں جاتا تھا جب تک اسے کوئی ایمرجنسی نہ ہو۔ تب پھر رات کے اس لمحے یہ لوگ کس کے گھر جا رہے تھے؟ یہ کون سے فساد کی تیاریاں کر رہے تھے کہ گروپ کی صورت میں رات کے وقت گلیوں میں چل پھر رہے تھے؟

ماں نے خالہ کا ہاتھ تھام لیا، اپنا ہاتھ اپنی بہن کی نگرانی میں دے کر خالہ نے دروازے کی چوکھٹ سے آگے اندھیرے میں جھانکا۔ لکڑی سے بنی ہوئی ڈیوڑھی جو اندرونی کمرے سے ملتی تھی، میں دولی بڑی شدت سے بھونک رہا تھا۔ حتیٰ کہ نانی ماں، جن کی سماعت اب بہت زیادہ اچھی نہیں رہ گئی تھی، نے بھی محسوس کیا کہ آدمیوں کا یہ جتھہ درختوں کی شاخوں سے بنے ہمارے گیٹ پر رک گیا تھا اور وہاں تذبذب کا شکار تھا۔

''آخر کار وہ آگئے، وہ آگئے'' نانی ماں نے خشک آواز میں سرگوشی کی۔

''سن کو، سن کو، تم اندر ہو'' کسی نے گیٹ کے پیچھے سے ابا جان کا نام پکارا۔

اندرونی کمرے سے دادی اماں عجیب سی آواز میں کھانسیں۔ ہم سن سکتے تھے کہ ابا جان باہر جانے کیلئے تیار ہو رہے تھے۔ یہ آوازیں سن کر ماں نے خوفزدہ آواز میں اندرونی کمرے کی طرف منہ کر کے سرگوشی کی ''باہر جاتی ہوں اور دیکھتی ہوں کیا ہو رہا ہے، تم یہیں موجود رہنا اور یوں ظاہر کرو جیسے تم مر چکے ہو''۔ لیکن ابا جان پہلے ہی بڑے کمرے میں تھے۔ اپنے جوتے پہنتے ہوئے ابا جان نے ہمیں حکم دیا کہ ماں کی بات سنیں۔ دولی جو دیوانہ وار باریک آواز نکال رہا تھا یکدم ایک تیز غراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ یقیناً ابا جان نے اسے کچھ کیا ہوگا۔ صحن عبور کرتے ہوئے ابا جان نے مخصوص لہجے میں

پوچھا ”کون ہے؟“

”میں ہوں گاؤں کا سربراہ“

”کیوں، اتنی رات گئے کیسے آنا ہوا؟“

”گیٹ کے ساتھ لگی گھنٹی بجی۔ ہم سن سکتے تھے کہ ان آدمیوں نے کچھ الفاظ کا تبادلہ کیا، اس کے بعد باہر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی اور ہمارے کان صرف بارش کے برسنے کی آواز سننے لگے۔ ماں، جو کمرے میں متذبذب کھڑی تھی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور اس نے دھکا مار کر دروازہ کھول دیا۔ وہ باہر کی طرف دوڑی اور خالہ جان نے ماں کا پیچھا کیا۔ اندرونی کمرے سے دادی اماں بیٹھی ہوئی آواز میں کھانسیں۔ میرے قریب نانی اماں مٹر کی پھلیاں چھیل رہی تھیں اور وہ اپنے کام میں پوری طرح منہمک تھیں، مٹر کی ایک پھلی میں انگلی چلاتے ہوئے وہ بڑبڑائیں ”مجھے اس کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا، میں جانتی تھی کہ آج یا آنے والے کل میں کوئی اونچ نیچ ہونے والی ہے، مجھے کافی عرصے سے اس بات کا پتہ تھا، میں بالکل تیار تھی“۔

میں چپکا بیٹھا نہ رہ سکا، تھوڑی سی اندرونی کشمکش کے بعد میں نے نانی ماں کو اکیلا چھوڑا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ حتیٰ کہ برآمدے میں آ کر بھی میں نے ان کی بیٹھی ہوئی آواز سنی ”میں اس سے بالکل متاثر نہیں ہوئی بالکل بھی نہیں“۔

باہر میری توقع سے زیادہ اندھیرا تھا۔ ہر بار جب میں اپنی ٹانگوں کو حرکت دیتا، وولی کا فردار، گیلا اور بو والا جسم اندرونی رانوں سے ٹکراتا۔ کتا آواز نکالتے ہوئے میرے ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ بارش بھی میری توقع سے زیادہ تیز تھی۔ بارش نے میری پٹ سن سے بنی ہوئی شرٹ بھگو دی اور میرا چہرا دھو ڈالا۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں ایسے بھیگ گیا جیسے پانی کے جار میں گر کر کوئی چوہا گیلا ہو جاتا ہے۔ وولی نے میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیا اور خوف سے غراتا ہوا واپس چلا گیا۔ بڑوں کے خاکے میرے سامنے اس وقت ظاہر ہوئے جب میں گیٹ کے کچھ نزدیک پہنچا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ وہ جو معلومات لے کر آئے تھے وہ آگے پہنچا دی گئی ہے، برستی بارش کے باوجود بڑے ساکت و جامد کھڑے تھے۔ میں غیر واضح طور پر یہی دیکھ سکا کہ دو آدمیوں کے سر فوج کے واٹر پروف کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے، گاؤں کے سربراہ کا جانا پہچانا چہرہ بھی میرے سامنے تھا، وہ ہماری طرف منہ کر کے کھڑا تھا۔ ابا جان اور خالہ جان نے ماں کا کپکپاتا ہوا اور

MashalBooks.com

ڈوبتا ہوا جسم تھاما ہوا تھا۔ کافی لمحوں کی خاموشی کے بعد گاؤں کا سربراہ گویا ہوا۔

''براہ مہربانی اپنی ساس کو میری طرف سے تعزیتی جذبات پہنچا دیجئے''۔

پھر واٹر پروف کپڑوں میں ملبوس دو آدمیوں میں سے ایک بولا، وہ کافی حد تک متذبذب تھا جیسے بولنے میں اسے دشواری پیش آ رہی ہو، اسی وجہ سے اس کی آواز بڑی شرمیلی محسوس ہو رہی تھی۔ ''میں یقیناً نہیں جانتا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے، ہمیں بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا اس کے خاندان میں سے کسی کو ہو سکتا ہے، یہی ایک پیغام آپ کو دینا تھا، اب ہمیں اجازت دیجئے، تو خدا حافظ، ہمیں اب واپس جانا ہے''۔

''شکریہ، اندھیرے سے خبردار رہیے گا''۔ ابا جان نے کہا۔ وہ گیٹ میں سے گزرے اور فلیش لائٹیوں کی روشنی میں اپنے راستے پر ہو لئے۔ ماں کے منہ سے ایک سسکی نکلی اور خالہ نے اسے ڈانٹا۔ پھر ماں قدرے اونچی آواز میں رونا شروع ہوگئی۔ کوئی لفظ بولے بغیر ابا جان گھر کی طرف چل دیئے۔ خالہ بھی ان کے پیچھے چل پڑی، اس نے ماں کو تھاما ہوا تھا اور وہ سرگوشی میں اس کے ساتھ بات کر رہی تھی ''اپنے آپ پر کنٹرول رکھو، ماں کیا کرے گی اگر تم اسی طرح چلاؤ گی تو، ماں کا خیال کرو ماں کے بارے میں سوچو''۔

ماں نے جب کمرے میں قدم رکھا تو اس نے اپنے ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپا ہوا تھا، اس طرح وہ اپنی سسکیاں کنٹرول کر رہی تھی۔ ابا جان، جو ہم میں سب سے پہلے کمرے میں پہنچ چکے تھے بڑے عجیب انداز سے نانی ماں کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے، جیسے کوئی قصوروار کوئی خطا کار بیٹھتا ہے اور اپنے ہاتھ میں پکڑی کوئی چیز گھما رہے تھے۔ یہ کاغذ کا ایک گیلا ٹکڑا تھا جو یقینی طور پر گاؤں کے سربراہ نے انہیں تھمایا ہوگا۔ ابا جان کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا، جیسے دھوئے گئے کپڑے خشک ہونے کے لئے ابھی لٹکائے گئے ہوں۔ لیکن صرف ابا جان ہی کیا، ہم سب، جو باہر گئے تھے بشمول میرے فرش پر پانی کی چھپڑیاں بنا رہے تھے، ہم سب کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ماں اور خالہ کے گرمیوں میں پہنے والے پتلے سوٹ بارش میں بھیگ کر ان کے جسموں کے ساتھ چمٹ گئے تھے اور ان کے جسم اندر سے عیاں ہو رہے تھے جیسے وہ بالکل برہنہ کھڑی ہوں۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا'' نانی اماں نے دوبارہ سرگوشی کی، جیسے ہم کلامی کر رہی ہوں۔

''دیکھا''؟

اب کچھ دیر سے میں نانی ماں کی حرکتیں بڑی اکتاہٹ اور بیزاری کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ میں اب ان کے پچکے ہوئے منہ کی بے کنٹرول حرکتوں سے زیادہ ان کے ہاتھوں کے ذریعے ہوتے کام پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ میں نے ان کے ہاتھوں کی حرکت میں ایک تبدیلی محسوس کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ تبدیلی میرے سوا کسی نے محسوس نہیں کی تھی۔ پہلے کی طرح وہ نظریں نیچے کئے کام کر رہی تھیں لیکن جب ہم باہر سے اندر کمرے میں آئے تھے نانی ماں کے دبلے بازو ہلکے ہلکے لرز رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ لاشعوری طور پر تازہ نکالے گئے مٹر کے دانے اپنے سکرٹ میں ڈال رہی تھیں جو خالی چھلکوں سے بھر چکا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ اسی طرح غلطیاں کرتی جائیں گی اور میں نے بار بار باہر دیکھا تا کہ مجھے موقع ملے اور میں انہیں اشارہ دے سکوں لیکن ہر بار جب میں نے کوشش کی تو میں نے پایا کہ میں اپنا منہ نہیں کھول سکا، کیونکہ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں بے بسی سے انہیں جھریوں والی انگلیوں کے پوروں کو جھٹکتے ہوئے دیکھتا رہا اگرچہ میں جانتا تھا کہ وہ خالی پھلیاں، جو ایندھن کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں، بانس سے بنی ٹوکری میں گراتی جا رہی ہوں گی حالانکہ اس میں چھیلے ہوئے مٹر کے دانے تھے۔

''کیا میں آپ لوگوں کو بتاتی نہیں رہی تھی کہ آج کچھ ہونے والا ہے تا کہ آپ میری بات کا یقین کر لیں'' نانی ماں، جن کا تا ایں دم زرد چہرہ لمحہ بھر کے لئے تمتما اٹھا تھا اور دس سال پہلے کا چہرہ لگ رہا تھا، دوبارہ بڑبڑائیں، لیکن جونہی انہوں نے ایک اور پھلی کا سرا توڑا اور اس میں ایک انگلی پھیری، وہ فوری طور پر خاکستری زرد پڑ گئیں، کسی فوجی لہ؛ اش کی طرح اور اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے دس سال زیادہ عمر کی نظر آنے لگیں۔ نانی ماں جوش اور اشتعال کی عجیب سی حالت سے دوچار تھیں۔ ہم نے اس چیز کو اس طرح محسوس کیا جس انداز سے انہوں نے اپنے اندر کا جذبہ دبائے رکھا حتیٰ کہ ان کا پورا گلا لرزنے لگا۔

''جب تمہارے والد کا انتقال ہوا تو میں کئی دن پہلے سے جانتی تھی۔ میرا خیال ہے تم مجھ سے ناراض ہوئے تھے یہ سوچ کر کہ یہ بوڑھی عورت وقت گزاری کے لئے منحوس الفاظ بکتی رہتی ہے اور اسے سوائے کھانے کے اور کوئی کام نہیں ہے لیکن اب تم لوگ کیا کہتے ہو؟ میں جاننا چاہوں گی کہ تم لوگ میری پیش آگاہی کے بارے میں کیا سوچتے ہو۔ کیا یہ تمہیں اب بھی ایک بوڑھی عورت کی فضول باتیں لگتی ہیں؟ تمہیں میرے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے، تمہیں نہیں سوچنا چاہیے تھے، اگرچہ میں اس جیسا دیکھ اور سن نہیں سکتی جیسا آپ دیکھ اور سن سکتے ہو لیکن میں خالی خولی الفاظ نہیں بڑبڑاتی رہتی ہوں۔ تم بہت بڑی

MashalBooks.com

غلطی پر تھے اگر تم یہ سوچتے تھے کہ یہ بوڑھی عورت بک بک کرنے اور قیمتی خوراک ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ آج تک میرے خواب کبھی غلط ثابت نہیں ہوئے۔ جب کبھی ہم پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہوتی ہے تو میرے خواب اس کی پیش گوئی کر دیتے رہے ہیں''۔

اکڑ واں بیٹھ کر، سر کو اونچا کر کے، نانی نے اپنی بیٹیوں کو سرزنش کی کہ انہوں نے کبھی ان کی اس خوبی کا اعتراف نہیں کیا۔ ان کا چہرہ ایک بار پھر روشن ہو گیا تھا۔ جب نانی اماں نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا تو یوں لگتا تھا کہ ان کی سوجی ہوئی آنکھیں فتح مندی کے جذبات سے چمک رہی ہیں۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی پیش گوئی کے بالکل درست ثابت ہونے کے بارے میں ڈینگ مارنے کی ناقابل مزاحمت خواہش سے مغلوب ہو چکی تھیں۔ میں نے ان کے مبالغے کی حد تک فتح مندی کے تاثرات پر نظر ڈالی تو جادو جیسی کسی چیز نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا، اپنی نانی ماں مجھے کوئی خوفناک مخلوق نظر آنے لگیں۔ مجھے ان کے اس اعتماد کہ وہ کسی خطرے یا سانحے کی آمد کی ہمیشہ صحیح پیش گوئی کرتی ہیں کا یقین کرنا ہی پڑا۔ نانی جان نے اس جنگ میں فتح حاصل کر لی تھی جس کا اعلان انہوں نے خود کیا تھا اور اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی تھی، ان میں ابھی کافی توانائی باقی تھی کہ وہ ان کی اتھارٹی کے بارے میں کسی قسم کی لاپروائی پر ہمیں آڑے ہاتھوں لے سکیں۔ نانی جان کی شخصیت کے اس پہلو نے مجھ پر انمٹ اثرات چھوڑے کہ وہ ایک ناقابل رسائی قوت کی مالک انسان ہیں۔

ماں کی سسکیاں غیر محسوس درجوں سے شروع ہو کر بڑھ رہی تھیں۔ یہ ایسے شروع ہوئیں جیسے کوئی پتلا سا دھاگا ہوا ہے اسی لئے کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کو اس کا مشکل سے پتہ چل سکا۔ لیکن جب کسی نے انہیں اسی وقت بھی دلاسا دینے کی کوشش نہیں کی جب ان کی سسکیوں کی اچھی خاصی آواز آ رہی تھی تو آخر کار وہ پھٹ پڑیں اور انہوں نے پوری آواز کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ ایک مچھر خالہ کی زرد رنگت کی گردن پر بیٹھا ہوا خون چوس رہا تھا۔ خالہ نے اسے نہیں اڑایا، وہ بے اوسان وہاں بیٹھی رہیں حتیٰ کہ مچھر کا پیٹ پکی ہوئی چیری کی طرح سرخ ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کھلے دروازے سے مچھر اندر آ رہے تھے لیکن کسی نے بھی اسے بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی''۔

کتوں کے بھونکنے کی بدلتی ہوئی سمت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ فوج کے واٹر پروف لباس میں ملبوس لوگ کہاں تک پہنچے تھے۔ ان لوگوں کے یہاں سے رخصت ہونے کے وقت سے لے کر

کتوں کے بھونکنے کا سلسلہ آہستہ آہستہ دور اور دور گاؤں کے آخری سرے تک چلتا چلا گیا اور آخر کار مکمل طور پر بند ہو گیا۔ ایک کالے رنگ کا اڑنے والا کیڑا کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور کمرے کی فضا میں اڑتے ہوئے پریشان کرنے لگا۔ اس کے متعدد بار کمرے کے چکر لگانے کے بعد آخر کار میں نے اسے پکڑ لیا۔ یہ ایک جھینگر تھا۔ وہ میری پہلی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان پھنسا ہوا تھا اور آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی اگلی ٹانگوں، جو وہ زمین کھودنے کیلئے استعمال کرتا ہے، کو کھینچ کر وہ میری گرفت توڑنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن یہ سب کوشش کس کام کی جبکہ اس کی زندگی اور موت اس وقت میرے رحم و کرم پر تھی۔ میں اسے چھوڑ بھی سکتا تھا اور مار بھی سکتا تھا، یہ میری مرضی پر تھا۔ میں ان دونوں انگلیوں پر زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا جنہوں نے کیڑے کو تھام رکھا تھا۔ اسی وقت میں نے نانی اماں کی بڑبڑاہٹ پھر سنی

''میں کمزور نہیں ہوئی، میں جانتی ہوں ساری دنیا کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے، میں ٹھیک ہوں''۔

تب ماں کی آہ و زاری اپنے عروج کو پہنچ گئی اور ماحول رنج اور غم میں ڈوب گیا اور محسوس ہوتا تھا کہ یہ غم ہماری ہڈیوں میں اتر جائے گا۔

''بے چارے جون، تم کتنے بے وقوف تھے کہ اس وقت خود کو رضا کارانہ بھرتی کیلئے پیش کر دیا جب سب لوگ چھپتے پھر رہے تھے۔ بے چارہ جون! جون تم نے اس وقت بات کیوں نہیں سنی جب میں نے تم سے کہا تھا کہ آفیسر نہ بنو؟ اب ہم کیا کریں؟ ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' جب بھی وہ مرنے والے کا نام لیتی تو اس کی آواز لمبی ہو جاتی۔

ماں کے بین کی آواز، جو جلد ہی پورے کمرے میں بھر گئی اب صحن تک پھیل رہی تھی جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کی سسکیوں اور آہ و زاری کی پتلی تہہ پر ڈھیروں کے حساب سے لمبے موسم برسات کی بارش پڑ رہی تھی۔

(2)

گون جی سان بڑا پر شکوہ نظر آتا تھا، اونچا استادہ اور چھوٹی پہاڑیوں اور پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ اس کی چوٹی آسمان سے اونچی تھی البتہ ایک وقت تھا کہ اس پر شکوہ پہاڑ نے ایک مضحکہ خیز پہلو اختیار کر لیا تھا۔ کچھ وقت کیلئے گون جی سان ایسی جگہ بن گیا تھا جہاں رات کے وقت بالغ افراد اکٹھے ہوتے اور آگ سے کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی ہم دن کی روشنی میں بھی ان پہاڑوں کی چوٹی سے دھند اٹھتی دیکھ سکتے تھے۔

یہ جوان لوگ رات کے وقت کتنی بڑی مقدار میں پانی چھوڑ دیتے تھے۔ بستر گیلا کر دینے کی سزا کے طور پر چاولوں کو چھڑنے کیلئے استعمال ہونے والی ٹوکری سر پر پہن کر پورے گاؤں کا چکر لگانے کی ذلت اٹھانے کے تجربے کے دوران میں بہتی ہوئی ندی کی طرف شک بھری نظروں کے ساتھ دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا تھا جو پہاڑ سے شروع ہوتی تھی۔ ناتراشیدہ پتھروں پر مشتمل، الگ تھلگ اور باوقار پہاڑ نامعقول نظر آتا تھا جو آگ اور دھواں اوپر بھیجتا رہتا تھا۔ بڑوں کے کھیل کیلئے یہ بچگانہ اور بے وقوفانہ لیکن پرامن اور بے اضطراب تھا۔ تب میں نے محسوس نہیں کیا تھا کہ اشارے کے طور پر کیے جانے والے فائر اور قتل عام میں کیا تعلق ہوتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ کیوں بار بار پہاڑ سے شعلے اٹھنے کے فوراً بعد قصبے کی گلیوں میں ایک جنگ ہوتی تھی اور دیہات میں سے ایک کو ضائع کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اگر میں حتمی اشارے سمجھ لیتا تو بھی نتیجہ یہی نکلتا۔ پہلی بار سگنل فائر دیکھنے پر میری لغو سوچوں کے باوجود گون جی سان نے جلد ہی میری نظروں میں اپنا وقار بحال کر لیا اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا۔

ایک روز جب میں صبح اٹھا تو دیکھا کہ پہاڑ کے گرد گہرے کالے بادلوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ بارش رک چکی تھی لیکن گون جی سان کے گرد مشرقی افق پر مکمل طور پر چھائے ہوئے گہرے بادلوں کو دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ بارش کی ایک اس سے بڑی لہر، جو کسی نے بھی آج تک دیکھی ہو گی، حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ کبھی کبھی آسمان کے اس سیاہ حصے سے بجلی چمکتی اور اتنی تیزی سے گون جی سان میں گھس جاتی جتنی تیزی سے بانس سے بنا ہوا نیزہ ایک آدمی نے سیلاب کی رکاوٹ کیلئے بنے پشتے کے پاس ایک دوسرے آدمی کے سینے میں بھونکا تھا اور ہر بار بجلی چمکنے کی آواز زمین اور آسمان کو دہلا دیتی جیسے گھونپا گیا پہاڑ کوئی چیخ بلند کرتا ہو۔ میں اس درد کا بہت اچھی طرح تصور کر سکتا تھا جو اس کھبنے والی بجلی کی لہر سے پیدا ہوتا ہو گا اور میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ پہاڑ اتنی بزدلی سے اتنی قابل رحم فریاد بلند کرتا ہو گا۔ یہ بات واضح تھی کہ بہت صبح سے ہی گان جی سان آسمان کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

میں بتا سکتا تھا۔ نانی اماں میری طرف آ رہی تھیں، حالانکہ میری آنکھیں بند تھیں۔ جب وہ چلتی تھیں تو ان کے قدموں سے چاپ بالکل پیدا نہیں ہوتی تھی صرف ان کے سکرٹ کے کپڑے کے آپس میں رگڑ کھانے سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ کم وزن والے افراد کی طرح ان کی چال بھی ہلکی اور محتاط تھی۔ اتنی احتیاط کے ساتھ آگے آنے کے بعد انہوں نے عجیب سی بو چھوڑی۔ یہ بو بڑی عجیب تھی جیسے کسی بہت پرانی

MashalBooks.com

الماری کسی نادر شے یا آلودہ پانی کے بہت گہرے تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر سانس لیا جائے۔ میں اپنی نانی ماں کے محتاط انداز سے قریب آنے کو محسوس کر سکتا تھا، ایک تو اس بو کی وجہ سے جو پرانی گرد کی طرح ہوتی تھی اور دوسرے ان کے سکرٹ سے اٹھنے والی آواز سے ان کے آنے کا پتہ چلتا تھا۔

میں ملحقہ کمرے میں لیٹا ہوا تھا اور یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے سویا ہوا ہوں۔ جب سے میں نے اپنی نانی ماں کا ایک پر جلال شخصیت کے طور پر احترام کرنا شروع کیا تھا تب سے میں اس وقت سونے کا دکھاوا کرتا جب وہ قریب آتی تھیں۔ لگتا تھا کہ نانی اماں دوہری احتیاط کر رہی تھیں تاکہ ان کا نواسا نیند سے وہ جاگ نہ جائے۔ لیکن میں اُن کی بدمزہ بو کو اپنی سانسوں میں محسوس کر رہا تھا اور میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہیں اور میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ ان کا جھریوں بھرا ہاتھ میری پینٹ کے اندر گھس گیا ''اب مجھے اپنے ہیرے محسوس کر لینے دو'' کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یہی کہتیں۔ وہ یہ بھی کہتیں ''یہ تو سیب کی طرح گول جیسے اس کے ماموؤں کے ہوتے تھے'' لیکن اس روز انہوں نے کوئی بات نہ کی، وہ ایک لفظ بھی نہ بولیں۔ انہوں نے خاموشی کے ساتھ اپنی انگلیوں کو حرکت دی اور میرے جانگھ کو محسوس کیا۔ (اس عمل کو جنسی تصور نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ کوریا میں صرف مرد ہی خاندان کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں چنانچہ دادیوں اور نانیوں کا اپنے چھوٹے پوتوں اور نواسوں کے جنسی اعضاء کو اس طرح محسوس کرنا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ وہ ایسا یہ محسوس کرنے کیلئے کرتی ہیں کہ ان کی نسل محفوظ ہے۔ نواسے یا پوتے کے جنسی اعضاء مضبوط ہوں تو وہ اس پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ اس افسانے کے کردار کا اپنے سات سالہ نواسے کے جنسی اعضاء کو محسوس کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی نسل کے بارے میں کتنی فکر مند ہے: مترجم) یہ بے نام سا عمل، جو اس وقت سے شروع ہوا جب ماں کا خاندان بطور پناہ گزیں ہمارے ساتھ رہنے کیلئے آیا، میرے لئے بڑا امتحان اور بڑا بے عزتی والا معاملہ تھا۔ میں کسی سے بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا کہ میں سچ نہیں بول رہا ہوں گا جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے اپنی نانی ماں کے آگے بڑھتے ہوئے اور میرے پاجامے میں داخل ہونے والے ہاتھوں کو بغیر خفگی کے ایسا کرنے کی اجازت دی۔ میں نہیں جانتا کہ کوئی ایسا سات سال کا لڑکا ہوگا جو اپنی رضامندی سے اپنے ساتھ کسی بچے کا سا سلوک ہونے دے گا، مجھے اس بات پر فخر تھا کہ میں ایک بڑا لڑکا ہوں اور میری تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی اچھی خاصی ہے، جوانوں کے برابر اور نانی اماں کا اس طرح کا طرز عمل میری عزت نفس کو بڑا دھچکا لگاتا تھا لیکن انہیں روکنے والا کوئی نہ تھا

MashalBooks.com

جیسا کہ میں جانتا ہوں کہ اس سلسلے میں انکار انہیں گہرے غم میں مبتلا کر سکتا تھا لہٰذا میرے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا کہ میں اس ہتک کو برداشت کروں۔

میری جانگھ سے ہاتھ ہٹانے کے بعد نانی اماں نے گہری سانس لی، میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرے جسم سے ہاتھ ہٹانے کے بعد ان کی نظریں کافی دیر تک میرے چہرے پر ٹکی رہیں۔

''کمزور چیز''

بڑبڑائے گئے دو الفاظ اپنے پیچھے چھوڑنے کے بعد وہ وہاں سے چلی گئیں۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے نانی اماں کو جاتے ہوئے دیکھا، وہ اسی طرح بغیر آواز پیدا کئے جا رہی تھیں۔ ان کی شکن آلود کاٹن کی سکرٹ پیچھے زمین پر نشان چھوڑ رہی تھی، میں نہیں جانتا کہ انہوں نے ابھی ابھی جو آہ زاری کی اس کا کیا مطلب تھا۔ میرے اردگرد کئی چیزیں بے چاری تھیں۔ ان میں یقیناً میرے ماموں بھی تھے جو حال ہی میں ایک محاذ جنگ پر قتل ہو گئے تھے اور سچی بات کی جائے تو میں خود بھی ایک بے چاری چیز تھا۔ ایک پولیس جاسوس سے ایک مغربی طرز کی ٹائی بطور رشوت وصول کرنے کے واقعہ کے بعد سے میں ایک مہینے سے زیادہ عرصے سے کفارے کے طور پر گھر میں بند تھا اور بڑی فکر مندی سے ابا جان کے موڈ کا جائزہ لے رہا تھا جنہوں نے گھر میں بند رکھے جانے کی سزا سنائی تھی اور دادی اماں کے موڈ کا بھی کیونکہ صرف وہی تھیں جن کے پاس معاف کر دینے کا اختیار تھا، لیکن ممکن ہے کہ نانی اماں بذات خود بے چاری ترین چیز ہوں۔ جب وہ رہنے سہنے کے کمرے کے فرش کے کنارے پر بیٹھتیں تو مکمل طور پر تھکی ماندی لگتی تھیں۔ ان میں خودسری کا شائبہ تک نہ تھا حالانکہ جس رات محاذ جنگ سے نوٹیفکیشن آیا تھا ہم سب غمگین نظر آتے تھے۔ آج وہ سیدھا سادا ابتر حالت میں ایک بکھری ہوئی خاتون تھیں اور خالی نظروں سے دور کے پہاڑ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ ان کے ناپسندیدہ ہاتھ سے آزاد ہونے کی میری خوشی ان کی قابل رحم شخصیت کو دیکھ کر ایک دم غم میں بدل گئی۔

جب ہم نے اپنے ماموں کے مرنے کی خبر سنی تو کچھ دن ہمارے گھر میں افراتفری رہی۔ سبھی اظہار غم کر رہے تھے لیکن میری ماں کا غم تو ضبط سے باہر ہو رہا تھا۔ ماں نے اپنے ماتھے پر سفید کپڑے کی پٹی باندھ لی تھی، جیسے بچے سکول میں کھیلوں والے دن باندھتے ہیں، اور وہ غم سے نڈھال رہیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لمحہ بھر کے لئے اٹھتی، آہ وزاری کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے فرش کو پیٹتی اور پھر

نڈھال ہوکر بستر پر گر جاتی تھی۔ البتہ کھانے کے وقت وہ اٹھ بیٹھتی تھی تا کہ جلدی سے ایک پیالہ جو کھا سکے، جو خالہ اس کے لئے اندر لے کر آتی تھی۔ جونہی وہ کھانا ختم کرتی وہ کھانے کی ٹرے دور پھینک دیتی اور پھر بلند آواز میں آہ وزاری شروع کر دیتی اور پھر تھوڑی دیر بعد بستر پر گر جاتی تھی۔ کمر کے بل لیٹ کر وہ بار بار بڑبڑاتی کہ اس کے خاندان کو کوئی بچہ گود لے لینا چاہیے تا کہ ان کے خاندان کی نسل جاری رہ سکے۔

خالہ کا طرز عمل ماں سے قطعی مختلف تھا۔ شروع سے آخر تک، انہوں نے ایک بھی آنسو نہیں بہایا نہ ہی انہوں نے کسی کے ساتھ ایک لفظ کا تبادلہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے کوئی شے کھائی بھی نہیں تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے ماں کا تمام کام بھی اپنے ذمے لے لیا اور کھانا بنایا، برتن صاف کئے اور کپڑے دھوئے۔ جب تک میں نے تیسرے دن گھر کے پچھواڑے میں کنوئیں کے قریب خالہ جان کو پانی کا برتن اٹھانے کی کوشش میں پیچھے کی جانب لڑھکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس وقت تک میں یہی تصور کرتا تھا کہ خالہ جان تاریک کچن میں یا گھر کے پیچھے بانسوں کے جھنڈ میں چھپ کر ضرور کچھ نہ کچھ کھاتی ہوں گی۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا تھا کہ خالہ، جو ناقابل یقین قوت ادراری کی مالک ہیں اور کبھی کبھی وہ ہماری امیدوں کو پیچھے چھوڑ جاتی تھیں، ایک ٹکڑا بھی کھائے بغیر تین دن نہیں رہ سکتیں۔

لیکن ہماری سب سے بڑی فکر ماں اور خالہ نہیں تھیں۔ جو معاملہ ہمیں سب سے زیادہ بے آرام کر رہا تھا نانی اماں اور دادی اماں کے درمیان جھگڑا تھا۔ جب میرے ننھیال والے، جو میری خالہ اور ماموں کو تعلیم دلانے کیلئے سیول چلے گئے تھے، اچانک گٹھڑ پکڑے ہوئے بطور پناہ گزیں ہمارے سامنے ظاہر ہوئے تو یہ میری دادی جان ہی تھیں جنہوں نے کھلے بازوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا اور ان کے رہنے کیلئے مہمانوں والا کمرہ فراہم کیا تھا۔ ہم اکثر اپنی دادی اماں کو سنتے جو اپنی یہ خواہش ظاہر کرتی تھیں کہ ان سخت وقتوں میں دونوں بوڑھی عورتیں ساتھی بن سکتی ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کر سکتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس برے دن سے پہلے دونوں معمر خواتین بالکل ٹھیک جا رہی تھیں حتیٰ کہ ان کے درمیان معمولی سا جھگڑا بھی نہیں تھا حتیٰ کہ ری پبلک کی فوج کے جنوب اور میرے چچا پر غلبہ بحال کر لینے کے بعد بھی وہ ٹھیک چلتی رہیں۔ میرے چچا اس وقت تک ادھر ادھر پھر کر بطور پیپلز آدمی کے ایک آفیسر کے طور پر پھرتے تھے۔ اس پیش رفت پر وہ پسپا ہوتے ہوئے کمیونسٹوں کے ساتھ فرار ہو گئے اور میرے ماموں، جو بانس کے جھنڈ میں چھپے ہوئے تھے، نے ری پبلک فوج اختیار کر لی۔ جنگ میں شکست یا فتح کا معاملہ دو معمر

خواتین کے لئے جھگڑا پیدا کرنے والے جذبات کا باعث بن گیا۔

دونوں معمر خواتین کے درمیان اصل جھگڑا اس واقعہ کے ساتھ شروع ہوا جس میں میں نے ایک اجنبی سے مغربی نوعیت کی ٹائی حاصل کر لی تھی۔ اس سے دادی ماں غضب ناک ہو گئیں۔ انہوں نے مجھے انسانوں کا سفاک قاتل قرار دیا جس نے اپنے چچا کو ایک ٹائی کے بدلے بیچ دیا اور جو اس قابل نہ تھا کہ اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیا جائے۔ نانی اماں نے میری طرف داری کر کے دادی ماں کی مخالفت مول لے لی۔ دونوں کے درمیان فیصلہ کن اختلاف ماموں کی موت کا نوٹس ملنے کے دوسرے روز پیدا ہوا۔ نانی ماں نے اشتعال پیدا کیا تھا۔ اس کے بعد دوپہر بھی موسم کافی مفسدانہ تھا۔ بادلوں سے لہریئے دار بجلی بار بار نکل رہی تھی اور گون جی سان کے تاج میں پیوست ہو رہی تھی۔ نانی ماں جو رہنے سہنے کے کمرے کے فرش کے کنارے پر کھڑی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اچانک خوفناک کوسنے دینا شروع ہو گئیں۔

''برسو، برسو، برسو اور چٹانوں کے درمیان چھپے تمام سرخوں کو یہاں لے جاؤ، گرجتے جاؤ اور درختوں کے ساتھ چمٹے ہوئے سرخوں کو جلا کر بھسم کر ڈالو، برستے جاؤ، گرجتے جاؤ، یہ بالکل ٹھیک ہے، خدا تمہارا شکریہ''۔

سارا خاندان رہنے سہنے کے کمرے کی طرف دوڑ پڑا لیکن سبھی اسی قدر چکرا گئے تھے کہ کوئی بھی نانی جان کے ان کوسنوں کو روکنے کیلئے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔ وہ گون جی سان سے مخاطب ہو کر پوری شدت کے ساتھ کوسنے دیئے جا رہی تھیں جیسے وہ بجلی کے گرنے سے ایک کے بعد ایک سرخ کو مرتے ہوئے واضح طور پر دیکھ رہی ہوں۔

''کیا یہ بوڑھی چڑیل صریحاً پاگل ہو گئی ہے یا بدروح بن گئی ہے؟''

اندرونی کمرے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور دادی ماں وہاں سے نکلیں، ان کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہوا جا رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس گھر میں کم از کم ایک شخص نانی اماں کے برابر کی ٹکر کا موجود ہے اور یہ سوچ کر میں پریشان ہو گیا۔

''اس نے یہ کس کا گھر سمجھ رکھا ہے کہ وہ اس طرح ہلڑ بازی کا مظاہرہ کر رہی ہے؟''

نانی ماں نے شک کی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا جیسے کسی کو جھنجھوڑ کر نیند سے جگا دیا ہو۔

”یہ بھی اچھا ہے کہ یہ تماشا صرف ایک خاندان تک محدود ہے، کیا یہ اچھا نہیں ہے؟ میں نے سنا ہے کہ اچھے اعمال کا نتیجہ زہر کے ساتھ دیا جاتا ہے لیکن جو کچھ میں نے آج دیکھا ہے اس پر میں یقین نہیں کر سکتی۔ یہ ان لوگوں کی ممنونیت کا کتنا عمدہ اظہار ہے جس نے تمہیں بموں سے پناہ دی۔ اگر تمہارا مطلب جوشیلا بننا ہے تو اسے کم از کم صاف دل کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ اگر تم اس طرح کا کمینہ ناشکرا پن اپنے دل میں رکھتی ہو تو بجلی تم پر گرے گی“۔

دوسرے کو اس طرح تحکم آمیز اعتراض کے ساتھ مطیع کرنے کے لئے دادی اماں نے اپنی ڈانٹ ڈپٹ جاری رکھی۔

”تمہارا خیال ہے کہ تمہاری اس طرح کے کوسنوں سے تمہارا مرا ہوا بیٹا واپس آجائے گا اور زندہ لوگوں کو مار دے گا؟ تم اس طرح کی چیز کا تصور کر سکتی ہو۔ زندگی اور موت کا تعین صرف اور صرف عالم بالا میں ہوتا ہے۔ کوئی اتنی ہی زندگی بسر کرتا ہے جتنی عالم بالا میں اس کی لکھی ہوتی ہے اور کسی کے گناہوں کا ثمر ہوتا ہے کہ اس کا بچہ اس سے پہلے مر جاتا ہے۔ یہ پہلی زندگی میں گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے کہ ماں یا باپ کو اپنا مرا ہوا بچہ دیکھنا پڑتا ہے اور غموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ آپ کی اپنی قسمت ہوتی ہے کہ آپکا بیٹا مر جاتا ہے۔ کسی اور کو اس کیلئے ذمے دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تمہیں اب تک پتہ چل جانا چاہیے کہ شرم کیا ہوتی ہے، تم ساٹھ سال سے زیادہ کی نہیں ہو چکی ہو؟“

”ٹھیک ہے مانا کہ یہ میرے گناہوں کی وجہ سے ہے کہ میں نے اپنا بیٹا کھو دیا اور یہ تمہارے ایک خوش قسمت ہونے کی وجہ سے ہے کہ تمہارے پاس اس طرح کا بیٹا موجود ہے؟“

”اس کی بات سنو، کیا یہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا نہیں ہے؟ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے کہ اس طرح کا بیٹا، میرے بیٹے میں کیا خرابی ہے؟“

”سوچو، تم جانتی ہو گی اگر تم بے وقوف نہیں ہو تو“۔

”چونکہ تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے کہ جو تمہارے مرنے کے بعد تمہارے لئے نذر نیاز کرے، تم چاہتی ہو کہ سب کے ساتھ یہی ہو“۔

”تم دونوں خاموش ہو جاؤ“ ابا جان چلائے۔

”انتظار کرو اور دیکھو، میرا میرا اسن چال، ایسا بے وقوف نہیں ہے، تم اس وقت تک چین سے

MashalBooks.com

نہیں بیٹھوگی جب تک اس کے ساتھ کچھ ہونہیں جاتا لیکن سن چال گیلا ہوئے بغیر برستی بارش میں سے گزر سکتا ہے۔

''یہ باتیں بند کرو''ابا جان دوبارہ چلائے۔

ماں مسلسل نانی ماں کے زانو پر چٹکیاں کاٹ رہی تھی۔

''تم نے سنا تمہاری ساس نے کیا کہا، وہ جو آخر کار قانون کے مطابق کچھ لگتی ہے۔ یہ مجھے ایسی عورت کہتی ہے جس کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو میرے مرنے کے بعد میری نذر نیاز دے سکے۔ کیا یہ بد قسمتی نہیں ہے کہ میں نے اس ملک پر صرف ایک بیٹا نثار کیا ہے اور وہ بھی کسی قانونی رشتے دار کو نفرت کے قابل سمجھے بغیر؟ ایک عورت کون سے الفاظ اپنے منہ سے ادا نہیں کر سکتی، ایک عورت جس نے ابھی ابھی اپنا ایک بیٹا کھویا ہو؟ کیا اسے اس طرح بے وقوفانہ انداز میں کہے گئے الفاظ، جو میں نے غم کے پاگل پن میں ادا کئے، پر مذمت کرنی چاہیے تھی اور میرے سامنے اس طرح بہت سے بیٹوں کی ماں ہونے کی ڈینگ مارنی چاہیے تھے؟ مجھے جواب دو اگر تمہارے پاس بولنے کیلئے منہ ہو''۔

نانی اماں نے ماں سے درخواست کی اور ماں آنسوؤں بھرے چہرے کے ساتھ آنکھیں جھپکاتے ہوئے نانی اماں سے عاجزانہ درخواست کر رہی تھیں اور ان کی ٹانگ پر چٹکیاں کاٹ رہی تھی۔

دادی اماں نے اپنی طرف سے ابا جان سے درخواست کی۔

''محتاط رہنا، تم کیسے معاملے کو جج کرتے ہو، کیا میری طرف سے ایک عورت کو تنبیہہ کرنا غلط ہے جو تمہارے بھائی کی موت کے لئے دعا کر رہی ہے؟ کیا تم بھی مجھے ہی اس کا ذمہ دار ٹھہراؤ گے، وہ تمہاری ساس ہوگی لیکن وہ میری دشمن بھی ہے اور میں اس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے نہیں رہ سکتی۔ اگر تم نے اسے فوراً گھر سے نکال نہ دیا تو میں یہ گھر چھوڑ جاؤں گی''۔

''ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں، میں اس گھر میں اب ایک لمحہ کے لئے بھی رہنا پسند نہیں کروں گے، میں ایک کمیونسٹ گھر میں رہنے کی بجائے سڑکوں پر مرجانا بہتر سمجھتی ہوں''۔

نانی اماں کی کھردری آواز خاموش ہوگئی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اپنا سر گھمایا اور خالی نظروں سے ابا جان کی طرف دیکھا لفظ ''گھر'' کو آہستہ سے اور لمبا ختم کرتے ہوئے اس مرتبہ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر انہوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور اپنا سر دائیں بائیں ہلایا۔ پھر انہوں نے اچانک

اپنا سر نیچے گرا دیا۔ان کی نیچے جھکی ہوئی نظریں بانس سے بنی ہوئی ایک ٹوکری پر گڑی ہوئی تھیں۔ بانس کی بنی ہوئی اس ٹوکری کو انہوں نے اپنے گھٹنوں کی طرف کھینچا، انہوں نے اس میں سے مٹر کی ایک پھلی اس طرح جسم کو خاموش حرکت دیتے ہوئے اٹھائی جیسے وہ کوئی سایہ ہوں۔ ان کا چہرہ خاکستری تھا جیسے کسی سیاہی اور اس کے بعد ویسا ہی رہا۔

نانی کے کہے ہوئے لفظ سے پیدا ہونے والے ارتعاش نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ جب نانی ماں کے منہ سے ''کمیونسٹ'' کا لفظ نکلا تو گھر کے تمام افراد کو اپنے کانوں پر شبہ ہوا اور سبھی حیرت میں مبتلا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ بمشکل سانس لے پا رہے تھے اور صرف انہیں آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتے دیکھ رہے تھے۔ جب سے پولیس نے میرے چچا کی وجہ سے ہمارے گھر کی نگرانی شروع کی تھی اور گاؤں میں ہمارا گھر نشان زدہ ہو گیا تھا، ہم میں ''کمیونسٹ'' ایک ممنوعہ لفظ تھا۔ یہ ممانعت سختی سے لاگو تھی جس طرح مرض خنازیر میں نمک والے جھینگے کھانے کی ممانعت پر پورا پورا عمل کیا جاتا تھا۔اس واحد ممانعت کی خلاف ورزی یہ نانی اماں کی ایسی غلطی تھی جسے قابل معافی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ خاندان کے افراد کی حیرت بیان سے باہر تھی لیکن جس فرد کو اس الفاظ کے کہے جانے سے سب سے زیادہ صدمہ ہوا وہ کوئی اور نہیں خود نانی اماں تھیں، جنہوں نے یہ لفظ بولا تھا۔ نانی اماں نے کسی قسم کی کوئی معافی طلب نہ کی۔اس کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ اس سلسلے میں تمام تر معذرتیں بے سود تھیں لیکن غالب امکان یہ تھا کہ اس طرح سے کہ انہوں نے خاموشی کے ساتھ اپنی اس ہم پلہ کی تمام تر کڑی تنقید کو برداشت کر کے اپنی غلطی کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری دادی اماں کے غصے کو کسی بھی الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا اور وہ غصے سے کانپ رہی تھیں، ان کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھی اور وہ تقریباً بے ہوش ہو گئی تھیں۔ پھر انہوں نے ابا جان سے یہ یقین دہانی حاصل کرنے کی کوشش کی کہ وہ نانی امی اور خالہ کو گھر سے نکال دیں گے اور اگر ماں ان کے ساتھ ہمدردی جتانے کی کوشش کرے تو اس کیساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔

''تم نے ضرور ان کو آج ہی چلتا کرنا ہے اور ان کے گیٹ سے باہر نکلنے سے پہلے ان کے بیگ بھی کھول کر دیکھنے ہیں میری چاندی کی ہیئر سلائیڈ نہیں مل رہی ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ یہ کس نے لی ہوگی''۔

خالہ خاموشی سے مہمانوں والے کمرے میں چلی گئیں اور دادی اماں اپنے اندر کا غصہ

اتارنے کے بعد تھک کر لیٹ گئیں۔اس کے بعد خاموشی کی جو فضا پیدا ہوئی تھی وہ ماں کے کھل کر رونے کی آواز سے ٹوٹ گئی۔اسی لمحے ابا جان کا حکم کڑکتی بجلی کی طرح نازل ہوا۔"یہ بکواس بند کرو"۔

خاموشی شور سے پیدا ہونے والی بے چینی سے زیادہ ناقابل برداشت تشدد تھی۔ابا جان گھر سے باہر چلے گئے نانی اماں رہنے سہنے کے کمرے میں موجود رہیں اور اپنے کپکپاتے جھریوں بھرے ہاتھوں سے مٹر کی پھلیاں چھیلتی رہیں۔ابا جان پو پھٹنے پر گھر واپس آئے۔وہ شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

تیزی سے روشن ہونے والی بجلی گون جی سان کے تاج میں گھستی رہی، جو بادلوں کی گہری چادر میں چھپا ہوا تھا۔اشاروں کیلئے کی جانے والی فائرنگ جو ہر رات پہاڑ سے نظر آتی تھی آج دکھائی نہیں دے رہی تھی کیونکہ بارش کا موسم شروع ہو گیا تھا۔نانی ماں، جو وقتاً فوقتاً پہاڑ کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتی تھیں اب قابل رحم حد تک تنہا نظر آتی تھیں، وہ رہنے سہنے کے کمرے میں فرش پر بیٹھی تھیں۔انہوں نے آج ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا حالانکہ آج بھی بجلی اسی طرح چمک رہی تھی جیسے باقی دنوں میں چمکتی تھی حتیٰ کہ اپنی ہم منصب کے ساتھ ناخوشگوار جھگڑے کے بعد انہوں نے بمشکل ہی کچھ بولا ہوگا۔وہ اپنے ہاتھوں کو مسلسل اور تیزی سے حرکت دے رہی تھیں جیسے مٹر کی پھلیاں چھیلنا ہی واحد ہدف رہ گیا ہو جو انہیں پورا کرنا ہے۔

(3)

ایک لڑکا جو ہمارے گاؤں میں رہنے کے لئے شمال سے حال ہی میں آیا تھا، اس جگہ آیا جہاں ہم کھیل رہے تھے، اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس نے تنکوں والا ہیٹ پہن رکھا تھا۔لڑکے کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے جن پر کھرنڈ بن چکے تھے۔لڑکے نے اپنے اس ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا جو کچھ دیر پہلے اس کے گرد آلود ننگے پیٹ پر خارش میں مصروف تھا اور اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمی سے کچھ کہا۔اس آدمی نے اپنے بڑے چھجے والے ہیٹ کے نیچے سے میرا جائزہ لیا جس نے اس کے چہرے کا زیادہ تر حصہ چھپا رکھا تھا۔شمال سے آنے والے لڑکے نے وہ چیز لے لی جو اجنبی آدمی نے اسے دی اور پھر خرگوش کی سی تیزی سے وہاں سے بھاگ گیا۔تنکوں والا ہیٹ پہنے ہوئے آدمی سیدھا میری طرف آیا۔اس کی گہری بھوری رنگت، اس کی تیز، اندر اتر جانے والی نظر میں اور اس کی بے جھجک چال

نے مجھ پر کسی قدر غلبہ اختیار کر لیا۔

''کتنا عمدہ لڑکا ہے''۔

اجنبی کی آنکھیں چھوٹی محسوس ہوتی تھیں اور حیرت انگیز طور پر میری توقع کے برعکس اس کے چہرے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ در آئی۔ اس نے میرے سر پر چند بار ہاتھ مارا، ''اگر تم میرے سوالوں کا سیدھا سیدھا جواب دو گے تو تم یقیناً ایک اچھا لڑکا ہونے کا ثبوت دو گے''۔

اس آدمی کے رویے نے مجھے بہت زیادہ بے چین کر دیا، میں اس کی آنکھوں میں نہیں جھانک سکتا تھا اسی لئے میں نے بغیر کسی وجہ کے کئی بار اپنی مٹھیاں کھولیں اور بند کیں اور سر جھکائے وہاں کھڑا رہا۔ میری مٹھی میں دادی اماں کا چاندی کا بنا ہوا بالوں میں باندھنے والا چھلا تھا جو میں نے ایک پتھر پر رگڑ کر ایک بڑے ناخن کی شکل میں تبدیل کر لیا تھا اور جو ناخنوں کی لڑائی میں مجھے پڑوسی کے تمام لڑکوں پر فتح دلاتا تھا۔

''تمہارے والد کا نام سن کو ہے، یہی ہے ناں''؟ اس آدمی نے اپنی بغیر ٹائی کے شرٹ کھول دی۔

''تب پھر کم سن چول یقیناً تمہارے چچا کا نام ہوگا، ایسا ہی ہے ناں؟''

اس آدمی نے اپنا تنکوں والا ہیٹ اتار دیا۔ اس وقت تک میں نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا تھا لیکن اس آدمی نے اپنے سوال کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ''یہ اچھی بات ہے، میرے سوالوں کا جواب دو جیسے کہ تم ایک ہوشیار لڑکے ہو'' اس آدمی نے اپنا ہیٹ اس طرح ہلایا جیسے یہ کوئی دستی پنکھا ہو اور اپنی شرٹ کا گریبان کھول دیا تا کہ جسم کو ہوا دے سکے۔

''میں تمہارے چچا کا دوست ہوں، ہم بہت گہرے دوست تھے لیکن ہمیں آپس میں ملے ہوئے طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ مجھے تمہارے چچا کے ساتھ کچھ بہت سی اہم باتیں کرنی ہیں، کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟''

آدمی، جسے میں ابھی اپنی زندگی میں پہلی بار ملا تھا، خالہ کی طرح سیول میں بولی جانے والی زبان بڑی مہارت سے بول رہا تھا۔

''آج گرمی زیادہ نہیں ہے؟ آج گرمی بہت زیادہ ہے، کیا ہم وہاں چل سکتے ہیں جہاں ہوا

چل رہی ہے اور کچھ باتیں بھی کریں گے''۔

اس نے دوسرے بچوں کو اپنے پیچھے آنے سے روک دیا۔ جب ہم گاؤں کے پیچھے واقع پہاڑی کے اوپر ایک درخت کے سائے میں آ گئے، جہاں دوسرے بچے ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے تو وہ آدمی رک گیا اور اپنی جیب میں سے کچھ تلاش کرنے لگا اور بولا ''میرے پاس تمہارے چچا کو پہچانے کے لئے ایک بہت اہم پیغام ہے اگر تم مجھے بتا دو کہ وہ کہاں ہے تو میں تمہیں یہ چیزیں دے دوں گا''۔ اتنا کہنے کے بعد اس آدمی نے اپنا ہاتھ آگے کیا، جس میں چاندی کی رنگت والے کاغذ میں لپٹی ہوئی پانچ چیزیں تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کو کور سے نکالا اور میرے سامنے کر دی۔

''کیا تم نے کبھی یہ چیز کھائی ہے؟'' گہرے بھوری رنگت والی اس چیز سے مزیدار قسم کی خوشبو آ رہی تھی۔

''یہ چاکلیٹ ہیں، اگر تم میرے سوالوں کے سیدھے جواب دو تو میں یہ تمہیں دے دوں گا''۔

میں نے بہت احتیاط کی کہ اس عجیب سی چیز پر میری نظر نہ ٹکی رہے لیکن میں خود پر قابو نہ پا سکا اور میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

''اس میں شرمانے والی کوئی بات نہیں، یہ قدرتی بات ہے کہ اچھے لڑکے انعام حاصل کرتے ہیں۔ اب کیا تم مجھے بتاؤ گے نہیں؟ اگر تم مجھے یہ بتا دو جو میں نے پوچھا ہے تو مجھے یہ مزیدار چاکلیٹ تمہیں دیتے ہوئے خوشی محسوس ہوگی''۔

میں نہیں جانتا تھا کہ کون سی چیز میرے اندر تذبذب کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ کیا یہ اس وجہ سے تھا کہ میں اس طرح کا تحفہ قبول کرنے کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں واضح نہیں تھا یا یہ اس ملک کے ایک لڑکے کا ایک اجنبی کے سامنے شرمیلا پن تھا، ایسا شرمیلا پن جو میری عمر کے اس ملک میں رہنے والے زیادہ تر لڑکوں میں پایا جاتا ہے؟ مجھے واضح طور پر یاد نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ میں وہاں کافی دیر خاموش کھڑا رہا تھا۔

''کیا تم یہ نہیں چاہتے، تمہیں یقین ہے کہ تم انہیں نہیں چاہتے''۔ اب اس آدمی نے اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اپنی سی کوشش کی کہ تمہیں ایک اچھے لڑکے کی طرح عمل کرتے دیکھوں اور تمہیں یہ مزیدار چیزیں دوں۔ مجھے خود ان ٹافیوں کی کوئی

ضرورت نہیں ہے، ادھر دیکھو، میں انہیں پھینکنے لگا ہوں حالانکہ میں ایسا نہیں کرنا چاہ رہا ہوں''۔

نا قابل یقین بات یہ ہوئی کہ اس آدمی نے ان میں سے ایک چاکلیٹ بڑی بے غرضی سے زمین پر پھینک دی۔ اس نے صرف اسے نیچے ہی نہیں پھینکا بلکہ اس پر پاؤں رکھ کر اسے کچل بھی دیا۔ مجھ پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے ایک اور ٹافی نیچے پھینک دی۔

''میرا خیال تھا کہ تم ایک ذہن لڑکے ہو گے، مجھے افسوس ہے''۔

اس نے تیسری ٹافی بھی اپنے پاؤں کے نیچے مسل دی۔ اس کے پاس صرف دو ٹافیاں باقی بچی تھیں۔ واضح تھا کہ وہ باقی دو ٹافیوں کو بھی زمین پر مسل سکتا تھا۔ پھر اچانک وہ زور سے بولا۔ ''تم رو رہے ہو، بے چارہ لڑکا، ارے بچے اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے، ذرا احتاط ہو کر سوچو، کیا تمہارے چچا گھر پر نہیں رہتے تھے، یہ کب کی بات ہے؟''

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے محسوس کیا کہ میں اس آدمی کے نفیس ہتھکنڈوں کے آگے سر تسلیم ختم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تب، جیسا کہ میں نے سوچا کہ یہ شخص واقعی میرے چچا کا دوست ہے، میرے دل نے ایک اچھی ڈیل کو زیادہ مناسب تصور کیا۔

بولے جانے والے پہلے کچھ الفاظ بڑے مشکل تھے، لیکن جب ایک بار میں شروع ہو گیا تو پھر میں آسانی کے ساتھ سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

میری پھوپھی، جو تقریباً آٹھ میل دور رہتی تھیں، ہم سے ملنے آئیں۔ وہ سارا راستہ چلچلاتی دھوپ میں پیدل چل کر آئی تھیں۔ میرے پاس کوئی وجہ نہ تھی کہ میں پھوپھی کے اس دورے کو کوئی خاص نام دے سکتا کیونکہ وہ کبھی کبھی بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ہمارے گھر ایک دو روز قیام کے لئے آتی رہتی تھیں اور یہ سلسلہ ہنگامی صورتحال کے دوران بھی جاری رہا تھا۔ لیکن اس وقت حالات بہت دگرگوں ہو گئے جب امی جان، جو خالہ کے ساتھ اندرونی کمرے میں چلی گئی تھیں، زرد چہرے کے ساتھ سب سے پہلے کمرے سے باہر آئیں۔ مجھے بھیجنے کی بجائے، جیسا کہ روز کا معمول تھا وہ خود ابا جان کو لینے دروازے کی طرف دوڑیں۔ ابا جان، جو دھان کے کھیت سے جڑی بوٹیاں اکھاڑتے رہے، اپنے گندے کپڑوں اور پیروں کے ساتھ ہی اندرونی کمرے کی طرف بھاگے۔ وہ کنویں پر اپنے ہاتھ پیر دھونے کیلئے نہیں رکے۔ امی نے لکڑیوں سے بنا ہوا گیٹ بند کرنے میں تیزی دکھائی حالانکہ ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ ہر فرد

پریشان دکھائی دیتا تھا اور حواس باختہ تھا۔ نانی ماں، خالہ اور میرے سوا سبھی لوگ اندرونی کمرے میں جمع ہو گئے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ فوری نوعیت کے کسی معاملے پر بات چیت کر رہے ہیں۔ شام ہو جانے پر، ہم تینوں، جو علیحدہ کر دیئے گئے تھے، کو ایک ایک پیالہ ٹھنڈے چاولوں کا دیا گیا۔ جب میں نے اپنا کھانا ختم کیا تو میں نے دیکھا کہ ابا جان صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ہو چکے ہیں۔ جب ابا جان لکڑیوں سے بنے ہوئے گیٹ سے باہر جا رہے تھے، میں نے شک کی نظروں سے ان کی پیٹھ پر نظر ڈالی۔ وہ گلی میں نکلے اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

جب ماں نے میرا بستر وہاں بچھایا جہاں قریب ہی دادی اماں بیٹھی تھیں تو کہا، ''تم جلدی سو جاؤ''۔ یوں لگتا تھا کہ سبھی میرے جلدی سو جانے پر بضد ہیں حالانکہ رات کی ابھی شروعات ہی تھی۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اسے دوسرے کمرے میں سلا دیا جائے''۔ پھوپھی نے اپنے ٹھوڑی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

''میرے خیال میں سب ٹھیک رہے گا، ایک بار یہ سو گیا تو پھر آرام سے سویا رہے گا''۔ دادی اماں نے جواب دیا۔

''تم دن بھر کھیلنے کی وجہ سے بہت زیادہ تھک گئے ہو گے، تمہیں کل صبح تک گہری نیند سو جانا چاہیے اور ساری رات ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھیں نہیں کھولنی چاہئیں۔ تم سمجھ گئے ناں'' ماں نے مجھے ہدایات دیں۔

میں جانتا تھا کہ ابا جان کسی خیر سگالی دورے پر باہر نہیں گئے تھے۔ واضح تھا کہ وہ کسی اہم کام کے سلسلے میں باہر گئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ابا جان کے واپس آنے تک جاگتا رہوں۔ میں بڑوں کے ان معاملات کے بارے میں جاننے کا عزم کئے ہوئے تھا جس میں سے مجھے خارج کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں ضروری تھا کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ بڑوں کا حکم مانا جا رہا ہے کہ میں جلدی سو جاؤں۔ جونہی میں بستر پر لیٹا نیند کا مجھ پر غلبہ ہو گیا لیکن میں جاگنے کی کوشش کرتا رہا اور کمرے سے ابھرنے والی چھوٹی چھوٹی آواز کو بڑے دھیان سے سنتا رہا، لیکن کسی نے بھی کوئی ایسی بات نہ کی جو اہمیت کی حامل ہو اور ابا جان کے واپس آنے کے اہم واقعہ تک میں گہری نیند سو چکا تھا۔

کمرے کے فرش پر کسی چیز کے ٹکرانے کی ہلکی سی آواز سے میں جاگ گیا۔

''میرے خدایا، یہ بم نہیں تھا؟'' میں نے دادی جان کی خوف میں ڈوبی ہوئی آواز سنی، دو رکاوٹیں جو میری نظروں کے سامنے حائل تھیں، ابا جان اور امی جان کے اجسام تھے، وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہلکی سی روشنی ان کے درمیان سے چھن کر آ رہی تھی۔

''اپنی پیٹی بھی کھول دو'' ابا جان نے کسی کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ شخص کسی قدر تذبذب کا شکار نظر آتا تھا لیکن پیچھے سے سرسراتی ہوئی آواز آئی ''دو پستول''

''میرے خدایا'' ماں اور دادی ماں نے ہلکے سے یکے بعد دیگرے حیرت کا اظہار کیا۔ نیند میری آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی اور سنسنی کی ایک لہر کسی سانپ کی طرح میری کمر میں اترتی جا رہی تھی۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ کسی کی توجہ بھی میری طرف نہیں ہے پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ بڑوں کا یہ جاننا کہ میں جاگ رہا ہوں مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے اپنی نظروں کو ایک ایک انچ حرکت دینے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ میری تمام تر کوششوں کا ارتکاز یہ جاننے پر تھا کہ میرے سامنے جو چھوٹی سی جگہ نظر آ رہی تھی، وہاں کیا ہو رہا تھا۔

''کیا چھوٹا یہ جانے بغیر سو گیا تھا کہ میں آ رہا ہوں''۔

اب جیسا کہ توقع تھی کہ ابا جان مڑ کر میری طرف دیکھیں گے، میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سایہ جو میری آنکھوں کے اوپر چھایا ہوا تھا پیچھے ہٹا اور لیمپ کی روشنی نے میری آنکھوں کے پپوٹوں کو چھیدنا شروع کر دیا۔

''ہم نے اسے اندھیرے میں رکھا ہے'' ماں نے بڑے فخر سے کہا جیسے یہ کوئی قابل فخر بات ہو۔

''فکر کی کوئی بات نہیں، ایک بار یہ سو جائے تو پھر گھوڑوں کا پورا جتھہ بھی اسے نہیں جگا سکتا'' دادی ماں نے اصرار کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے بعد کمرے میں تھوڑی دیر کیلئے خاموشی چھا گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کمرے میں موجود کوئی بھی شخص زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہے۔ لیکن میرے کان اس گہری آواز والے شخص کی طرف لگے ہوئے تھے، جو اندھیرے میں چپکے سے گھر میں آ گیا تھا اور جس نے پستول اور گرینیڈ اٹھا رکھے تھے۔ اگر یہی شخص میرا چچا تھا تو پھر پورا خاندان کس کے بارے میں جاننے کیلئے اتنا بے تاب تھا۔ اُن کی آواز

MashalBooks.com

اتنی کھردری ہو چکی تھی کہ میرے لئے پہلے پہل قابل شناخت نہ رہی تھی۔ چچا کی آواز اتنی کھردری نہیں ہوتی تھی جیسے کوئی مٹی کا برتن جسے کنکریوں پر بڑی بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہا ہو نہ ہی وہ اتنی مغموم آواز تھی کہ کوئی بھی اسے خوش نہ کر سکے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ماضی میں چچا جان ہلکے سے لطیفے پر بھی دل کھول کر ہنستے تھے اگرچہ ان کے بڑے اس طرح کے اطوار پر ماتھے پر بل ڈال لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ جھگڑوں سے علیحدہ رہے ہوں بلکہ وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ دوسروں کو ان میں ملوث کیا جائے۔ ان کو آسانی سے مشتعل کر کے حرکت کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ پتہ نہیں میں نے اس کا اندازہ کیسے لگا لیا لیکن میرے چچا کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا جو اس آواز کا مالک ہو جو میں نے ابھی سنی تھی۔ میں نے اپنے چچا کے چہرے اور ہیئت کا خیالی خاکہ کھینچا جو یقینی طور پر اتنا ہی بے ترتیب ہو گیا تھا جتنی کہ آواز۔ پھر اچانک میں نے اپنے گھٹنے میں ناقابل برداشت درد محسوس کیا۔ یہ درد فوراً ہی میرے پورے وجود میں پھیل گیا جیسے میں چیونٹیوں سے بھرے کسی میدان میں لیٹا ہوں۔ مجھے شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اپنی پیٹھ کے وسط میں، یا بغلوں میں یا پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خارش کروں۔ یہ ایسی جگہیں تھیں جہاں پیٹھ کے بل لیٹے ہوئے ہاتھ نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے کھانسی کی شدید حاجت ہو رہی تھی اور میرا منہ پانی سے بھر گیا تھا۔

دادی جان یہ جاننے کے بارے میں سب سے زیادہ تشویش میں مبتلا تھیں کہ پہاڑ پر چچا کی زندگی کس طرح بسر ہوئی۔ ان کے تمام سوالات کا چچا نے ایک یا دو الفاظ میں جواب دیا اور وہ اتنا بھی کہنے کی ضرورت سے بیزار نظر آتے تھے۔ لیکن دادی اماں چچا کے موڈ کو بھانپ نہیں رہی تھیں اور ان سے لاتعداد سوالات کرتی جا رہی تھیں۔

''تم نے کہا کہ وہاں تمہارے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے، وہ سارے مرد ہی ہوں گے تو پھر کھانا وغیرہ کون پکاتا تھا''۔

''ہم خود ہی کرتے تھے''۔

''تم لوگ محفوظ کی گئی اور موسمی سبزیاں بھی پکاتے ہو گے؟''

''ہاں''

''زمین پر کیسے، اگر میں وہاں ہوتی تو میں تمہاری خوراک زیادہ بہتر طریقے سے تیار کرتی''۔

چچا نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

’’کیا ان کا ذائقہ ٹھیک ہوتا؟‘‘

’’ہاں‘‘

’’میں جانتی ہوں ان کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا ہوگا لیکن اگر تم ایسا کہہ رہے ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں‘‘۔

’’وہ ٹھیک ہوتا تھا‘‘۔

’’کیا تم اکثر کھانا چھوڑ دیتے تھے کیونکہ تمہیں تو ادھر ادھر جانا ہوتا ہوگا؟‘‘

’’نہیں‘‘

’’میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم اب کچے چاول نہیں کھاؤ گے چاہے تم جتنے بھی بھوکے ہوگے۔ تمہیں پیچش لگ گئی تھی۔ اگر تم ایسا کرو گے تو پہاڑ کی گہرائیوں میں تم کیا کر سکو گے؟ تم کسی ڈاکٹر کو نہیں بلا سکتے، نہ تم کوئی دوا لے سکتے ہو۔ لہٰذا دھیان کرو، کرو گے ناں؟‘‘

’’فکر نہ کرو‘‘

’’اور چونکہ وہ پہاڑ کی گہرائیوں والا علاقہ ہے، اس لئے وہاں اس کے طرح کے موسم گرما میں جنوری کی راتوں جیسی سردی ہوتی ہوگی، کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس رات کو خود کو ڈھانپنے کیلئے رضائی وغیرہ ہے۔

’’یقیناً‘‘

’’روئی کی تہوں والی‘‘

کوئی ردعمل نہیں۔

’’سردی میں زیادہ دیر تک نہ رہا کرو اور سرمازدگی کے علاج کے لئے بینگن کی جڑیں بہترین ہوتی ہیں۔ اس پودے کی جڑوں کو ابال لیں اور ہاتھ اور پاؤں اس پانی میں بھگوئے رکھیں تو اس سے سرمازدگی کا اثر فوراً ختم ہو جائے گا۔ اگر میں تمہارے ساتھ ہوتی ....‘‘۔

’’براہ مہربانی آپ فکر نہ کریں‘‘۔

’’میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہوں، تمہارے برف سے جمے ہوئے پاؤں اور ہاتھ دیکھ کر

میرا دل چھلنی ہو جاتا ہے، حالات کافی خراب ہیں اس طرح کے اور زیادہ سرمازدگیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، میرے سب سے آخر میں پیدا ہونے والے بچے''۔

''براہ مہربانی ماں اب یہ باتیں بند کر دو''۔ چچا نے بے صبری کے ساتھ آہ بھری۔

''ٹھیک کہتا ہے ماں، کافی ہو گیا''۔ ابا جان نے بھی سخت لہجے میں چچا کی تائید کی۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے، مجھے فکر نہیں کرنی چاہیے، اس وقت بھی جب میرے بچے کے ہاتھ برف سے جم گئے ہوں'' دادی جان نے ناراضی کے ساتھ اپنی آواز بلند کی۔ ایسی چیزیں ان کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت کی تھیں۔ لیکن ابا جان نے بھی اپنی آواز بلند کر لی۔ ''جلد ہی پو پھٹنے والی ہے اور آپ بے مقصد سوالوں میں وقت ضائع کر رہی ہیں۔ آپ محفوظ کی گئی چیزوں اور رضائیوں کے بارے میں کیسے فکر مند ہو سکتی ہیں جب کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑی ہوئی ہے''؟

دادی ماں کو خاموش کرا دیا گیا۔ یقیناً ان کے پاس اور بہت زیادہ سوالات ہوں گے لیکن ابا جان کے لہجے میں کھردرے پن نے انہیں خاموش کرا دیا۔ وہ پہلے کی طرح ہی بے لچک تھیں۔

''اب تم کیا کرنے جا رہے ہو'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد ابا جان نے سوال کیا۔ یہ سوال چچا سے کیا گیا تھا۔

''کس بارے میں؟''

''کیا تم واپس پہاڑ پر جا رہے ہو اور وہاں پر قیام کرو گے؟''

جب چچا خاموش تھے تو ابا جان نے پوچھا کہ آیا وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ ابا جان نے آہستہ آہستہ ترغیب دینا شروع کی جیسے یہ کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں وہ کافی دیر سے محتاط انداز میں غور کر رہے ہوں۔ ابا جان بار بار اس بات پر زور دے رہے تھے کہ پکڑے گئے مجرم کی کتنی بری حالت کی جاتی ہے۔ انہوں نے ایک نوجوان کی مثال بھی پیش کی جس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا اور اب وہ بڑے سکون کے ساتھ اپنے فارم میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ ابا جان نے جلدی سے یہ تجویز بھی پیش کی کہ چچا کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے وہ بار بار ایک ہی بات دھرا رہے تھے کہ بصورت دیگر چچا جان کتے کی موت مارے جائیں گے۔

''آپ بار بار یہ کیوں کہے جا رہے ہیں کہ یہ کتے کی موت مرنا ہے''۔ چچا نے بھی چبھتا ہوا

برجستہ جواب دیا۔

چچا نے قسم اٹھائی کہ جلد ہی پیپلز آرمی جنوب کا اپنا علاقہ واپس حاصل کر لے گی۔ یہ عہد کرتے ہوئے کہ وہ صرف اسی دن تک زندہ رہنا چاہتے ہیں انہوں نے تجویز پیش کی کہ جب حکومت تبدیل ہو گی تو ابا جان کو بھی یہی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے تاکہ انہیں نقصان نہ پہنچے۔ ان کی باتیں سن کر میں ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گیا کہ چچا جان اتنے زیادہ تبدیل ہو چکے ہیں۔ ان کی باتوں میں بڑی روانی تھی۔ ماضی میں وہ کبھی اس طرح منطقی انداز میں بات کرنے کے قابل نہیں ہوئے تھے اور چنانچہ وہ منطقی دلائل کے ساتھ اپنی بات دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے تھے اس لئے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اپنے مکوں سے مدد لیتے تھے۔

چچا جان نے یہ کہہ کر چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں کہ انہیں سورج طلوع ہونے سے پہلے پہاڑ پر واپس چلے جانا چاہیے۔ یقیناً یہ ہینڈ گرینیڈ اور پستول ہی تھے جو وہ اکٹھے کر رہے تھے۔ کمرے میں موجود سبھی افراد ایک دم حرکت میں آ گئے تھے۔

''میں تمہیں کبھی جانے نہیں دینا چاہتا، اب جبکہ تم میرے گھر میں ہو''۔

آخر کار میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس اچانک افراتفری میں کسی نے بھی میری طرف توجہ نہ دی، اس لئے میں آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چچا کا چہرہ گھنی داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ ابا جان اور پھوپھو چچا جان کے دونوں اطراف تھے اور تقریباً چچا سے بغلگیر تھے جو فرش کے قدرے گرم حصے پر دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ دادی جان نے پھوپھو جان کے ہاتھ سے چچا کا ہاتھ چھین لیا اور اسے ادھر ادھر ہلاتے ہوئے استدعا کی ''چونکہ تمہارا بھائی مجھ سے جھوٹ بولتا تھا، میرے خیال تھا تم کہیں بڑے آرام سے رہتے رہے ہو۔ میرا خیال تھا تم نے کسی ٹاؤن آفس میں کسی کرسی پر بیٹھ کر اپنے دن بتائے اور تم ضدی سپاہیوں کو حکم دینے جیسا کوئی کام کرتے رہے ہو لیکن اب جبکہ میں سچ جانتی ہوں تو میں تمہیں اتنی خوفناک جگہ پر پھر نہیں جانے دوں گی، تمہیں جانے دینے سے پہلے میں مرجانا چاہوں گی''۔

دادی جان چچا کے گال اپنے ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے رونے لگیں۔ ''میں تمہیں جانے کی اجازت دے سکتی ہوں اگر تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ میں دن رات تمہاری دیکھ بھال کر سکوں لیکن مجھے لگتا ہے میں ایسا نہیں کر سکوں گی تو میں تمہیں کمرے میں باندھ دوں گی اور دن رات تمہیں اپنی نظروں

سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ تم گھر پر کیوں نہیں ٹھہرتے، فارم اور زمینوں پر، شادی کرو اور مجھے مرنے سے پہلے اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے دو''۔

اس رات پھوپھی جان کو میں نے پہلی بار بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ چچا جان کو شادی شدہ زندگی کی خوشیوں کے بارے میں بتا رہی تھیں اور ماں اپنی نند کی حمایت کر رہی تھی۔ ابا جان نے پھر بات کی۔ انہوں نے جنگ کے مقصد کے بارے میں چھوٹی چھوٹی تفاصیل بتائیں اور چچا جان کو یہ محسوس کرانے کی کوشش کی کہ ان کو کیمونسٹوں کے خالی خولی وعدوں کے ذریعے دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔ ابا جان نے مزید کہا کہ وہ پولیس میں کچھ لوگوں جانتے ہیں اور ایسے راستے موجود ہیں کہ چچا جان کو بغیر کسی جسمانی نقصان کے رہا کروایا جا سکے گا لیکن چچا جان نے آخرکار اپنا منہ یہ کہنے کیلئے کھولا، ''کیا تم بھی مجھے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو''۔ یہ کہہ کر انہوں نے ابا جان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تمہارا یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ دام میں پھنسا رہے ہو؟''

''میں نے اس بارے میں تمام باتیں سن رکھی ہیں'' چچا نے بتایا کہ ان تمام لوگوں کو پولیس نے ذبح کر دیا جنہوں نے پرنٹ شدہ پمفلٹوں میں معاف کر دینے کے وعدوں کے دل فریبی میں پھنس کر پہاڑوں سے نیچے اتر کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ چچا نے کہا کہ غیر مشروط معافی اور آزادی کے وعدے چیختے ہوئے جھوٹ اور ہتھکنڈے ہیں۔

''اور تم بھی مجھے اس جال میں پھنس جانے کیلئے آگے دھکیل رہے ہو''۔

''کیا؟'' ابا جان کا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور اگلے ہی لمحے چچا کے گال پر تھپڑ پڑنے کی آواز سنائی دی۔

ابا جان غصے میں اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے تھے اور چچا جان کو گھور رہے تھے جیسے وہ انہیں چیر پھاڑ ہی ڈالیں گے۔

''تم نے اس غریب پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کیسے کی؟'' دادی جان نے چچا جان کے سامنے اپنے جسم کی ڈھال بناتے ہوئے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ابا جان نے اس کی طرف تمبا کو والا ڈبہ بڑھایا۔ جب وہ سبز تمبا کو کاغذ میں لپیٹ رہے تھے تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چچا جان نے اپنا سر نیچے جھکا دیا۔

مرغے کے بانگ دینے کی آواز آئی۔اس آواز پر چچا جان نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ارد گرد کھڑے خاندان کے افراد پر نظر ڈالی۔گرمیوں کی چھوٹی رات ختم ہونے کو تھی۔

''میں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا ہے''اس نے پھنسی پھنسی آواز میں سرگوشی کی،ایسے جیسے کسی نے بہت بھاری پتھر نیچے اتار دیا ہو، جو اس نے لمبے عرصے سے اٹھا رکھا تھا''بہت، بہت زیادہ لوگوں کو''۔

اس طرح چچا ڈانواں ڈول ہونا شروع ہوئے۔یہ خود کو مغلوب کر دینے کی طرف پہلا قدم تھا۔ان کو آمادہ کرنے کا ایک طویل عمل تھا، ابا جان اس رات جس حالت سے گزرے اور اس کو جس طرح سے انہوں نے آگے بڑھایا وہ حقیقتاً قابل قدر تھا۔آخر کار سارے معاملے کا انجام ابا جان کی منصوبہ بندی کے عین مطابق ہوا تھا۔اور اس بات پر اتفاق کر لیا گیا کہ چچا جان چند روز چھپے رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک ابا جان پولیس سے چچا کی حفاظت کے حوالے سے یقین دہانی حاصل نہیں کر لیتے۔ چچا کو اسی پناہ گاہ میں جانا تھا جو بانس کے ایک جھنڈ میں تھی اور کمیونسٹوں کے قبضے کے دوران جہاں ماموں چھپا کرتے تھے۔

سارے معاملات طے پا گئے اور جو کام کرنے کیلئے رہ گیا یہ تھا کہ دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے سب کو نیند کی جھپکی لینا تھی۔لیکن اسی لمحے چچا، جو اپنی شرٹ اتارنے والے تھے، اچانک آگے جھکے اور انہوں نے اپنے کان فرش کے ساتھ لگا دیئے۔دادی جان نے تو ڈر کے مارے چھلانگ لگا دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''شش!''

چچا نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر سب کو خاموش رہنے کیلئے کہا اور پھر کمرے کے دروازے کے ساتھ آنکھ لگا دی سب کے چہرے تناؤ زدہ ہو گئے اور سبھی بڑے دھیان سے باہر سے آنے والی کوئی آواز سننے لگے۔

''کوئی باہر ہے''

میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔دور سے جھینگروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن مجھے کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔لیکن چچا جان نے اپنے کان اب بھی فرش کے

ساتھ لگائے ہوئے تھے اور وہ وہاں سے اٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس گھٹن بھرے تناؤ کے ماحول میں ایک لمحہ کیلئے مجھے صرف اپنے تیزی سے دھڑکتے دل کی آواز آتی رہی لیکن پھر میں نے وہ آواز بھی سن لی جو یقیناً چچا سن چکے تھے۔ آواز، جو یقیناً کسی دھڑکتے دل کی آواز نہ تھی۔ یہ قدموں کی چاپ تھی جو لمبے لمبے وقفوں کے بعد ابھر رہی تھی۔ قدم اتنے نرمی اور محتاط انداز سے اٹھائے جا رہے تھے کہ یہ تک بتانا مشکل تھا کہ وہ قریب آ رہے ہیں یا دور جا رہے ہیں۔

''باہر کون ہے؟'' ابا جان کی آواز کافی آہستہ تھی لیکن اس میں سرزنش کا عنصر کافی سخت تھا۔ پھر حرکت کی آواز بند ہوگئی۔ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ قدموں کی یہ چاپ تو بڑی جانی پہچانی ہے، کسی ایسے فرد کی جسے میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا تاکہ یہ شناخت کر سکوں کہ یہ کون ہو سکتا تھا۔ قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔ لگتا تھا کہ وہ اس بار قدرے تیزی سے قدم اٹھا رہے ہیں۔ چچا کا جسم ایک دم سیدھا ہو گیا۔ چشم زدن میں ایک کالے رنگ کا جسم میرے اوپر سے چھلانگ لگا کر گزرا۔ پچھلا دروازہ آواز کے ساتھ نیچے گر گیا اور چچا کا بھاری جسم اندھیرے میں دوڑتا چلا گیا۔ وہ پہلے ہی بانسوں کا جھنڈ پار کر چکے تھے۔ ان کی حرکت اتنی تیز تھی کہ کوئی بھی ان کے ساتھ ایک بات تک نہ کر سکا۔

میں پچھلے دروازے کے چوکھٹے کے ذریعے باہر آیا، جو چچا نے زمین پر گرا دیا تھا۔ میں کچن کے قریب سے گزرتا ہوا اندرونی صحن کی طرف دوڑا۔ میں اکیلا تھا پھر بھی مجھے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے درختوں کی شاخوں سے بنے ہوئے جنگلے کے اندر ہر جگہ کا جائزہ لیا، صحن اور کچن کے باغ سے لے کر گیٹ تک ہر ایک چیز دیکھی لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ جب میری نظر غیر روشن مہمانوں کے کمرے پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اس کا آدھا کھلا ہوا دروازہ بغیر کوئی آواز پیدا کئے بند کیا جا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی صبح کی روشنی میں یہ سب میں نے واضح طور پر دیکھا۔ میں نے سرمستی سے اس شناخت کو دریافت کر لیا تھا۔ یہ قدموں کی یقیناً ایک جانی پہچانی چاپ تھی۔ کسی ایسے فرد کی جسے میں بخوبی جانتا تھا۔

''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ وہ اس طرح آئے گا تو میں اس کیلئے مختلف اشیاء پیک کر لیتی، میں نے اسے ایک نوالہ تک نہیں کھلایا، نہ ہی اسے صاف کپڑوں کا جوڑا دیا ہے۔ اگر میں یہ جانتی تو کیسے ممکن تھا کہ میں اسے گرم چاولوں کا ایک پیالہ نہ کھلا دیتی، اگر صرف مجھے پتہ چل جاتا'' دادی ماں اپنے سینے پر ہاتھ

مارتے ہوئے آہ وزاری کرنے لگیں۔ پھوپھی جان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور مجھے کھینچ کر ایک کونے میں لے گئیں۔ پھر انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی ''تمہیں کسی کو نہیں بتانا چاہیے کہ تمہارے چچا گھر آئے تھے۔ تم نے بات سمجھ لی؟ اگر تم نے اس سلسلے میں کسی سے بھی بات کی تو ہم سب جیل چلے جائیں گے، کیا تم برداشت کرلو گے کہ ہم سب جیل چلے جائیں''۔

گاؤں کے لوگوں نے میرے گھر کو گھیر رکھا تھا اور ہمارے گیٹ کے سامنے مختلف گروپوں میں بٹے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور گیٹ کے اوپر سے گھر کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عورتوں کے بین کرنے کی آواز گاؤں کے پیچھے والی پہاڑی پر بھی سنی جا سکتی تھی۔ یہ آوازیں میرے گھر سے آ رہی تھیں۔ جب میں وہاں پہنچا تو سبھی میری طرف دیکھنے لگے۔ گاؤں والوں نے آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا، تھوڑی سے میری طرف اشارے کئے اور ایک بار پھر سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے۔ لوگوں کا جمگھٹا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جیسے راستہ بنایا گیا ہو۔ ایک اجنبی پہلے باہر نکلا اور اس کے پیچھے ابا جان تھے اس سے ایک قدم پیچھے میں تنکوں کے ہیٹ والے آدمی کو دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کے گرد وہ رسی لپیٹ رکھی تھی جس کے ذریعے میرے ابا جان کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے دانت نکوسے اور آنکھ ماری۔ ابا جان میرے قریب آ کر ایک ثانیہ کیلئے رکے، ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن پھر انہوں نے آگے قدم بڑھانے کا عمل جاری رکھا۔ گیٹ پر میری ماں، دادی جان اور پھوپھی جان آہ وزاری کر رہی تھی اور چلا رہی تھیں، بار بار نیچے گر رہی تھیں اور زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ میرے اندر درد جاگنے لگا۔ پورا دن جب میں شمال سے آنے والے لڑکے کو، جس نے تنکوں کے ہیٹ والے آدمی کو مجھ تک پہنچایا تھا، کو تلاش کرتا رہا یہ درد مجھ پر ذلت کے احساس کے ساتھ کبھی کبھی حملہ آور ہوتا رہا یا ایک خوفناک غصہ یا ایک ناقابل برداشت غم جو میری آنکھوں میں چبھتا رہا اور میرے دل کو کچوکے لگاتا رہا۔ تنکوں والا ہیٹ پہنے ہوئے آدمی نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ جو باتیں میں اسے بتاؤں گا وہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔ یہ پہلا مہلک دھوکہ تھا جو میں نے ایک بڑے کے ہاتھوں کھایا۔

اس رات سے نانی اماں میری واحد نگہبان اور دوست بن گئیں۔ ہمارے درمیان گنہگار اور قصوروار ہونے کا مشترکہ راز تھا۔ یہی راز ہو سکتا ہے جس نے ہم دونوں کو ستائے جانے کی بہت سی

کیفیتوں کے دوران ایک دوسرے کو سہارا دینے کا حوصلہ عطا کیا۔ دادی اماں بہت مضبوط اعصاب اور غصے والی خاتون تھیں۔ اگر وہ میری شکل بھی دیکھ لیتیں تو واپس مڑ جاتی تھیں جیسے ان کا پاؤں کسی سانپ پر آ گیا ہو اور یہی نہیں انہوں نے نہ صرف میرے ساتھ بات چیت کرنے سے انکار کر دیا بلکہ مجھے اندرونی کمرے میں باقی خاندان والوں کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

سات روز پولیس سٹیشن میں گزارنے کے بعد ابا جان گھر واپس آ گئے۔ ماں، جو کئی بار قصبے کے چکر لگاتی تا کہ ابا جان کو کھانا پہنچا سکیں، جب گیٹ کے اندر قدم رکھتیں تو بار بار سونگھتیں، بے اختیار سانس بھرتیں اور اپنے سر پر بار بار نمک چھڑکتی تھیں۔ ان سات دنوں میں ابا جان کا اچھا نظر آنے والا چہرہ کافی حد تک تبدیل ہو گیا۔ ان کی آنکھیں اندر کو دھنس گئیں اور جبڑوں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں اور ان کا چہرہ جو بالکل نئی دھلی ہوئی روئی کی طرح زردی مائل نیلا ہو گیا تھا نا قابل بیان حد تک ابتر حالت میں لگتا تھا، لیکن جو چیز مجھے سب سے زیادہ تکلیف پہنچاتی تھی درد کا وہ احساس تھا جو ابا جان کے چہرے پر اس وقت ظاہر ہوتا جب وہ اپنی دائنی ٹانگ کسی قدر لنگراہٹ کے ساتھ حرکت میں لاتے تھے۔ جس رات وہ پولیس سٹیشن سے لوٹے انہوں نے کچھ پھلیوں کے پیسٹ سے بنے ہوئے تین کیک کھائے، جو چھڑکے گئے نمک کے ساتھ پولیس سٹیشن دوسرے دفعہ جانے سے بچنے کے لئے بہترین احتیاطی تدبیر تصور کئے جاتے تھے۔ ابا جان چپ اور الگ تھلگ رہنے والے آدمی ہیں لیکن انہوں نے اس روز تو اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ کبھی کبھی وہ نظریں اٹھا کر میری طرف خالی نظروں سے دیکھتے اور یوں محسوس ہوتا وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں لیکن پھر وہ خاموشی سے نظریں دوسری طرف کر لیا کرتے تھے۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ کبھی نہیں بھاگوں گا حتیٰ کہ اگر ابا جان مجھے چابک رسید کریں اور میں ان کی مار سے مر بھی جاؤں، تب بھی نہیں اور وہاں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ میں نے ان کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر نہایت عاجزی سے انتظار کیا لیکن جو کچھ ہو چکا تھا انہوں نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ انہوں نے بس رات کو سونے کے لئے لیٹنے سے پہلے یہ حکم جاری کیا ”ٹونگ مین، اگر تم نے کل سے ایک انچ قدم بھی گھر سے باہر نکالا تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا“۔

آہ، اگر ابا جان اس رات مجھے کسی پاگل کی طرح ہلاک بھی کر دیتے تو میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور میرے آخری الفاظ یہ ہوتے ”ابا جان میں اسی قابل تھا کہ مر جاتا“۔

(4)

برسات کی جھڑی جاری تھی۔ آسمان کبھی کبھی بہروپ بھر کر بڑی فیاضی کا مظاہرہ کرتا اور بارش صبح یا پھر بعد دوپہر رک جاتی لیکن اس کی ناموافقت کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ ہوتا یہ کہ لوہے کے سے خاکستری بادلوں کا دباؤ بڑھ جاتا اور اس کے پرعناد دھارے پھر سے زور دکھانے لگتے، جیسے اچانک کسی کو کچھ یاد آ جاتا ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان موجود ہر چیز اس قدر بھیگ چکی تھی کہ آپ انگلی کی پور سے کسی دیوار یا فرش کو دبائیں تو ردعمل میں اس میں سے پانی پھوٹ پڑے۔ ساری دنیا پانی کے گڑھوں میں بدل گئی تھی یا پھر دھنسواں ہو چکی تھی۔ بارش سے بھیگی ہوئی زمین کی وجہ سے کنوئیں کا پانی ڈھلوانوں سے گرنے والے پانی سے کسی طور بہتر نہ تھا اور آپ کافی عرصہ اس پانی کا ایک قطرہ بھی ابالے بغیر استعمال نہیں کر سکتے تھے۔

بارش کے اس مستقل سلسلے میں بھی کمیونسٹ گوریلا سپاہیوں نے رات کے اندھیرے کی آڑ میں ایک حملہ کیا۔ اگرچہ قصبے اور ہمارے گاؤں کے درمیان پانچ میل کا اچھا خاصا فاصلہ ہے پھر بھی ہم گولیوں کی تڑتڑ کی آواز واضح طور پر سن سکتے تھے جیسے مکئی کے دانے بھٹی میں بھونے جا رہے ہوں۔ ابا جان، جو بارش کے باوجود گاؤں کی پچھلی پہاڑی کے اوپر تھے، کا کہنا تھا کہ اتنے فاصلے سے بھی وہ رات کے وقت آسمان پر سرخ رنگ کے شعلوں کو اوپر اٹھتا دیکھ سکتے تھے۔ ایک دن سے کم وقت میں اس تعجب خیز حملے کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

ایک دیہاتی، جو اپنے بھائی کے خاندان کی حفاظت کو یقینی بنانے کیلئے قصبے کی طرف آ رہا تھا، ہمارے پڑوسی چنکو کے باپ کے ساتھ آیا تا کہ ابا جان کو کچھ ضروری صلاح دے سکے۔ جونہی وہ رہنے سہنے کے کمرے کے فرش کے کنارے پر بیٹھا، اس نے قصبے کے سروے کے حوالے سے ایک شورانگیز رپورٹ پیش کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ دادی اماں اندر والے کمرے میں دروازے کے پیچھے یہ سب کچھ سن رہی ہیں۔ اس نے بتایا کہ پولیس سٹیشن کے اردگرد کے مکانات کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اور یہ کہ ان سرخ سپاہیوں، جنہوں نے حملہ کیا تھا، کو بری طرح پیٹا گیا۔ اس کے مطابق صرف چند ہی گوریلا سپاہی زندہ واپس پہاڑ کی طرف فرار ہو سکے تھے۔ اس کی رپورٹ میں سب سے زیادہ صدمے والی بات یہ تھی کہ اس کے مطابق گوریلا سپاہیوں کی لاشیں قصبے بھر میں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ اس نے تنکوں کی چٹائیوں سے

ڈھانپی گئی کئی بدوضع لاشوں کا حال پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ مثال کے طور پر ایک لاش کے بازو اکھاڑ دیئے گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ ایک اور لاش کے جسم پر گولیوں کے سولہ یا سترہ چھید تھے۔ جس بیان نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی اس لاش کے بارے میں تھا جس کو پیچھے کی طرف موڑ کر خندق میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ جان کر میں حیران ہوا کہ کسی انسان کے جسم کو پیچھے کی طرف موڑ کر دوہرا کر دیا گیا جیسے جیب میں رکھے جانے والے کسی چاقو کو پیچھے کی طرف موڑ کر بند کیا جاتا ہے۔ میں یقین نہ کر سکا کہ ایسا ممکن ہے۔ آخر میں اس نے یہ خبر نشر کی کہ پولیس سٹیشن کے پچھواڑے صحن میں ان لاشوں کو رکھا گیا ہے تا کہ ان کے دوستوں اور رشتے داروں کی استدعا پر ان کے حوالے کی جا سکیں۔ یہی وہ نکتہ تھا جس نے اس کو ابا جان کے پاس آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں ابا جان کو اشارے دیئے کہ انہیں فوری طور پر پولیس سٹیشن کا دورہ کرنا چاہیے۔ چنکو کے باپ، جو اس کے ساتھ اندر آیا تھا، نے بھی اس بات کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کے وہاں قیام کے سارے وقت کے دوران ابا جان مایوس دکھائی دیتے رہے اور وہ ان دونوں آدمیوں کے مشوروں پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لیکن جب گاؤں کا سربراہ، جو ابا جان کا بچپن کا دوست تھا، بعد ازاں ان کے پاس آیا اور یہ پیشکش کی کہ وہ ان کے ساتھ قصبے تک جا سکتا ہے تو ابا جان آخر کار ایسا کرنے پر رضامند ہو گئے۔

دادی جان نے ابا جان کیلئے اپنی نفرت کو چھپانے کی ذرہ برابر کوشش نہ کی جو بارش میں قصبے کی طرف جا رہے تھے۔ ابا نے اپنے بانس کے بنے ہوئے بارش میں پہنے جانے والے ہیٹ کے اوپر آئل پیپر سے بنا ہوا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ دادی جان اپنے بیٹے پر بھی سخت ناراض ہوئی تھیں جو ابھی تک آسمانوں کے فیصلے پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ دادی جان جس چیز پر قائم رہیں وہ سادہ ترین الفاظ میں یہ تھا: قصبے میں جو کچھ بھی ہوا، اس کا چچا کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ آسمان کا فیصلہ ہے کہ چچا جان بغیر کوئی نقصان اٹھائے وہاں سے فرار ہو گئے ہوں گے، قطع نظر اس کے کہ وہ کتنے بڑے خطرے میں گھر گئے تھے۔ آسمانوں پر یہ لکھا جا چکا ہے کہ حتیٰ کہ تاریخ اور وقت کا تعین بھی کیا جا چکا ہے کہ چچا جان کو کب زندہ اور بغیر کوئی نقصان اٹھائے دادی جان کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل بے وقوفانہ سی حرکت ہے کہ ابا جان قصبے کا اتنا لمبا سفر کریں اور پھر اپنے بھائی کی تلاش میں لاشوں کو ٹٹولتے پھریں۔ کسی اور کو نہیں تو دادی جان کو اس بات پر پورا یقین تھا۔ انہیں صرف کامل یقین ہی نہیں تھا بلکہ انہوں نے ایک خوش بھرے موقع

کی پوری تیاریاں بھی کر لی تھیں اور بڑی بے تابی سے اس لمحے کے انتظار میں تھیں۔ ان باتوں پر دادی جان کے کامل یقین کی ایک وجہ تھی۔ اپنے چھوٹے بیٹے کے بدقسمت فرار کے بعد سے دادی جان کے دن نا قابل برداشت رنج والم کی داستان بن گئے تھے۔ وہ سو نہیں سکتی تھیں، وہ کھا نہیں سکتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں کسی خبر کے انتظار میں سارا سارا دن پریشان پڑی رہتی تھیں پھر ایک روز میری پھوپھی جان، جو اپنے مائیکے ماں اور بھائی سے ملنے آئی ہوئی تھیں، نے صلاح دی کہ دادی جان کو اس قسمت کا حال بتانے والے سے ملنا چاہیے جو اس کے گاؤں سے اگلے دیہہ میں رہتا ہے۔ اپنے سر پر چاولوں کا بھاری بنڈل اٹھا کر دادی جان اس قسمت کا حال بتانے والے سے ملیں۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بڑا دور اندیش ہے۔ چاولوں کی یہ بوری جو دادی اماں اٹھا کر لے گئی تھیں، اس کی فیس تھی۔ دادی اماں شام کو دیر سے گھر لوٹیں۔ ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ انہوں نے پورے خاندان کو اکٹھا کر لیا تا کہ اس نابینا آدمی کی مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت کی تعریف کر سکیں اور اس کی کہی گئی باتوں سے اپنی نسبت قائم کر سکیں۔ وہ دن جس کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا، وہ جس کے کسی خاص وقت میں چچا کو گھر لایا جانا نصیبوں میں لکھا جا چکا تھا، وہ وقت چند روز کے فاصلے پر تھا۔

ابا جان اور گاؤں کا سربراہ قصبے سے خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ ابا جان کا یہ سفر بے مقصد رہا البتہ یہ اس حوالے سے ایک اچھی پیش رفت تھی کہ اب توقع کی جا سکتی تھی چچا جان زندہ گھر واپس آئیں گے۔ لیکن یہ بات بڑی عجیب تھی کہ ابا جان پہلے کی طرح کم سخن ہی رہے۔ ابا جان کے چہرے سے دو مختلف نوعیت کے جذبات اکٹھے ہویدا ہوئے تھے اور آپس میں گڈ مڈ تھے۔ ان کے چہرے پر تیز اور باقاعدہ وقفوں سے ریلیف اور آسودگی کا اظہار ملتا تھا یا پھر وہ شدید مایوس دکھائی دیتے تھے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ابا جان، اگر پولیس سٹیشن کے صحن میں چچا کی لاش کے موجود نہ ہونے کو ان کے زندہ ہونے کا اشارہ سمجھتے ہیں تو یہ سوچ کر آرام سے نہیں بیٹھ سکتے کہ چچا کو مستقبل میں کس قسم کی مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن دادی جان ایسی سوچوں کے حوالے سے پریشان دکھائی نہیں دیتی تھیں، وہ ایک دم فتح یاب دکھائی دیتی تھیں اور تقریباً چلاتے ہوئے اعلان کرتی تھیں جیسا کہ وہ شروع سے کہتی رہی تھیں کہ ان کا بیٹا 'سن چول' کوئی عام سا انسان نہیں ہے۔ پھر وہ زور زور سے رونے لگ جاتیں اور سرگرمی کے ساتھ دعا کرتے ہوئے بڑے پرجوش طریقے سے ہاتھوں کو ملتیں اور پھر اپنے عمر رسیدہ چہرے، جو آنسو بہتے رہنے کی وجہ

سے گندا ہو چکا ہوتا، کے ساتھ وہ تمام اطراف میں سجدے کرتی تھیں جو عقیدت کا اظہار ہوتا اس زمین اور آسمان کے ساتھ، بدھ کے ساتھ پہاڑوں پر بسنے والی روحوں کے ساتھ، اباؤ اجداد کے ساتھ اور گھریلو دیوتاؤں کے ساتھ۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی مخبوط الحواس ہو چکا ہوتا ہے لیکن ان کا معصوم سا اعتقاد اور بے حد وحساب مادرانہ شفقت ہم سب کے دلوں میں بھی موجزن رہتی تھی۔ ہم سب نے بھی اعتماد اور اعتقاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم ان باتوں پر اعتقاد کئے بغیر جن پر وہ یقین رکھتی تھیں، کیسے انہی پرسکون کر سکتے تھے؟ گھر کا ہر فرد بار بار بڑے اہتمام کے ساتھ اور مذہبی وقار کے ساتھ اس دن اور اس وقت کے بارے میں بات کرتا تھا جو چچا کی واپسی کے لئے مقرر تھا۔ پھر ہمیں احساس ہوا کہ دن چڑھ گیا ہے اور دھوپ کافی پھیل چکی ہے۔ ہم بستر پر چلے گئے تاکہ خوابوں میں اس دن کی خوشی کا پیشگی مشاہدہ کر سکیں۔ یہ ایک طویل بہت طویل دن تھا، جو ہم نے بسر کیا۔

میرے پیچھے مہمانوں کا کمرہ تھا جس میں نانی اماں رہتی تھیں۔ میں دھندلا سا باہر گرنے والے بارش کے قطرے کی آواز سے اس کی شدت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ آواز، جو کبھی تھم جاتی تھی، کبھی پھر شروع ہو جاتی تھی، کبھی گہری ہو جاتی تھی اور کبھی ہلکی، میرے کان کے پردوں کے ساتھ روئی کی پھریری کے نرم کونے کی طرف لگ رہی تھی۔ گذشتہ رات کی تھکن کی وجہ سے میں گہری غنودگی سے لڑ رہا تھا چنانچہ بارش کے برسنے کی آواز مجھے خوابوں کی دنیا میں دور دراز سے آنے والی کسی سرگوشی کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ ابا جان کے حکم کے تحت میں اب تک گھر کی چار دیواری میں قید تھا چنانچہ بارش کی اس طویل جھڑی کو میں اپنے لئے رحمت تصور کرتا تھا اگر باہر فضا صاف ہوتی، سورج چمک رہا ہوتا اور کھیتوں اور پہاڑوں کو جھلسا رہا ہوتا، ہوا پہاڑیوں پر درختوں کو جھنجھوڑ رہی ہوتی اور جھینگر کی نرم آواز، کسی بھی تفریح سے محروم گھر میں بند شخص کو روشنی اور دنیا کی آوازیں کسی عذاب سے کم محسوس نہیں ہوتی ہوں گی۔ کبھی کبھار آنے والی ان سہ پہروں کو جب بارش کسی قدر کم ہوتی تھی میں کمرے میں بیٹھا واضح طور پر لڑکوں کو گاؤں کی گلیوں میں شور مچاتے سن سکتا تھا۔ جب بھی میں ذہن میں تصویر کشی کرتا کہ بچے دریا کے اطراف خودرو پودوں سے اٹے ہوئے تالابوں میں یا آبپاشی کے لئے مخصوص جوہڑوں میں خوشی خوشی بانس کی شاخوں سے بنے مچھلی پکڑنے کے پھندے چلا رہے ہیں اور سلور کلر کے چانوں والی موٹی تازی مچھلیاں پکڑ پکڑ کر باہر نکال رہے ہیں تو میں قید تنہائی کی ذہنی پریشانی میں ڈوبنے سے خود کو نہیں بچا سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ہم

عصروں میں بھی بھلا دیا گیا ہوں۔ میرے دوست اب ہمارے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھے آواز نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ سامنے آنے کا بھی تقاضا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ میں دوسروں کی حالت پر رشک کرنے اور حسد میں مبتلا ہونے کے اس زمانے میں جب ساری دنیا میرے دوستوں کی ہوتی تھی مایوسی کے ساتھ خرمالو کے درخت سے ہوا کے تھپیڑوں اور بارش کے باعث گرنے والے شگوفے اکٹھے کیا کرتا تھا۔ اس طرح میں نے اپنے طور پر حالات سے سمجھوتے کرنے کا عمل اپنے بچپن میں ہی سیکھ لیا تھا۔ سکول کا کھلنا میری واحد امید تھی، جس کا مجھے سہارا تھا اور جس کے ساتھ میں چمٹا ہوا تھا۔ سکول، جو جنگ کی وجہ سے بند ہو گئے تھے، جلد دوبارہ کھلنے والے تھے اور پھر ابا جان کا گھر کے اندر محدود رہنے کا حکم خود بخود اپنا اثر کھو دے گا اور میری خوفناک خواب جیسی گھر کی قید ختم ہو جانے کی توقع تھی۔

نانی ماں نے مٹر کی پھلیاں چھیلنے کا سلسلہ لمحہ بھر کے لئے روکا اور انگڑائی لی۔ نانی جان کا شکریہ جو سارا دن بغیر کوئی لفظ منہ سے نکالے خاموشی سے اپنی انگلیاں چلاتی رہتی تھیں کہ پودوں سے کاٹی گئی مٹروں کی پھلیوں کے زیادہ تر حصے کے دانے نکالے جا چکے تھے۔ لیکن وہ پھلیاں جو ابھی تک سٹور میں پڑی تھیں ان میں اگنے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ نمی سے بھری ہوئی پھلیوں میں سے پیلے رنگ کی کونپلیں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ مٹروں کے کھانے کے قابل نہ رہنے سے پہلے ان کو چھیلنا اور دانے نکالنا نانی اماں کی ذمہ داری تھی۔ کسی وجہ سے غالباً پورے خاندان نے یہ تصور کر لیا تھا کہ مٹر چھیلنا صرف اور صرف نانی اماں کا کام ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے خود بخود اس کام کو اپنے ذمے لے لیا تھا۔ جتنا وقت وہ جاگ کر گزارتی تھیں، ہر وقت کوئی نہ کوئی رطوبت والی چیز چھیلتی رہتی تھیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ چونکہ وہ مٹر چھیلنے کو اپنا مقرر کیا گیا ہدف تصور کرتی تھیں اور اس کام میں بری طرح مصروف رہتی تھیں تا کہ کوئی ان سے یہ کام چھین کر نہ لے جائے لہٰذا باقی سارے ان کی مدد کرنے سے گریزاں رہتے تھے۔ جب وہ ایک بار مٹروں کی پھلیوں سے بھری ٹوکری لے کر بیٹھ جاتیں تو پھر کسی بھی قیمت پر وہ ہاتھ چلاتی رہتیں اور وقت سے بے نیاز ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ بانس سے بنی ٹوکری میں سبز مٹروں کے ساتھ ساتھ اپنی حسرتیں بھی ڈالتی جاتی تھیں۔

اگرچہ ان کا تحمل اور دلجمعی حقیقتاً غیر معمولی تھی، پھر بھی اس طرح ایک ہی زاویے سے غیر متحرک ہو کر بیٹھے رہنا انہیں کبھی کبھی کمر کے درد میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس وقت وہ بانس کی ٹوکری کو ایک

MashalBooks.com

طرف رکھ دیتیں۔ اپنا سکرٹ جھاڑتیں، اپنے ہاتھوں کو سکرٹ پر رگڑتیں اور میرے قریب ہو جاتیں۔ میں ان کی حرارت سے عاری سانسوں میں وہی مخصوص بو محسوس کرتا جو میری پیشانی پر اترتی تھیں۔ میں محسوس کر لیتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور خدشے کے عین مطابق ایک یخ بستہ ہاتھ، جو میرے جسم پر کپکپی طاری کر دیتا تھا، میری پینٹ میں داخل ہوتا۔ میں نے نانی اماں کے جھریوں بھرے ہاتھوں کے آنے میں کبھی سہولت اور آسودگی محسوس نہیں کی۔

''یہ گول ہیں بالکل سیبوں کی مانند اپنے ماموں کی طرح''۔

میں دیکھے بغیر جانتا تھا کہ خالہ نے اپنی گرمیوں میں اوڑھنے والی رضائی اپنے جوڑے سے اوپر تک کھینچ لی ہے۔ خالہ پچھلے کچھ دنوں سے فرش کے قدرے گرم حصے پر مسلسل لیٹی ہوئی تھیں کیونکہ ان کے نظام تنفس میں کچھ بڑی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ خالہ ایسے ہی رضائی اوڑھ لیتی تھیں، جب بھی نانی جان ماموں جان کا نام لیتی تھیں۔

''تم کس کو زیادہ پسند کرتے ہو ماموں کو یا پھر چچا کو؟'' یہ ایک نامناسب سوال تھا جو نانی جان نے میرے سامنے اٹھانا اپنی عادت بنا لیا تھا۔ پہلی بار جب انہوں نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا تو میں اچھا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ سوال ایک ہی جواب حاصل کرنے کیلئے مسلسل مطالبے کی صورت میں کیا جاتا تھا۔ یہ سوال کرتے ہوئے وہ ہمیشہ ماموں ماموں کا نام پہلے لیتی تھیں۔ لیکن میری صورتحال ایسی تھی کہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنا پسندیدہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔

''تم اپنے ماموں کو زیادہ پسند کرتے ہو یا اپنے چچا کو؟''

لیکن میں جانتا تھا کہ اہم چیز نہ تو سوال ہے اور نہ ہی میرا جواب ہے۔ میں نے بہت پہلے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ تھا یہ سوال، جو بغیر کسی جذبے یا دباؤ کے کیا گیا ہے، ان کے راہ سے بھٹکنے کا محض ایک تعارفی تبصرہ یا رائے زنی تھی۔ چنانچہ پہلے پہل ایک دو بار ایسا ہوا کہ اس سوال نے مجھے تذبذب کر دیا چنانچہ میں وہاں خاموش پڑا رہا اور یہ ظاہر کیا جیسے میں نے سوال سنا ہی نہیں ہے۔ تب نانی جان غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہتیں ''میں جانتی ہوں بازو ہمیشہ اندر کی طرف مڑتے ہیں'' لیکن یہ مختصر وقفے کیلئے ہوتا کہ غم اور غصے کی لہر ان کے چہرے پر چھا جاتی۔ وہ بہت جلد اپنی ذہنی طمانیت دوبارہ حاصل کر لیتیں اور راستے سے بھٹکانے کا عمل پھر شروع کر دیتیں۔

''اگر تم کو آن کل جن کا بھانجا بننے کے قابل بننا ہے تو تمہیں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ وہ کس طرح کا آدمی تھا۔ جب تک تم یہ نہیں جانو گے کہ تمہارا ماموں کس نوعیت کا آدمی تھا تو تم خود کو اس کا وارث قرار دینے کیلئے قابل نہیں ہوسکو گے، بالکل بھی نہیں''۔

نانی اماں کے بیان کے مطابق میرا ماموں ہر وقت فٹ بال کے کھلاڑیوں جیسی یونیفارم پہنا کرتا تھا اور وہ ایک بہت وسیع وعریض میدان، جو تیزی سے میرے تصورات میں بن جاتا تھا، میں اصیل گھوڑے کی تیزی سے دوڑ پڑتے تھے۔ وہ ایک مکمل طور پر شاندار حرکت کے ساتھ گیند کو آسمان کی بلندیوں تک اوپر ٹھوکر مارتے تھے۔ پڑھائی میں بھی بہت اچھے تھے لیکن یقین کرنا پڑتا کہ وہ کھیلوں میں بھی جینئس تھے اور کھیلوں میں فٹ بال کے تو وہ ماہر تھے۔ وہ مڈل سے کالج تک اپنے ٹیم کے سربراہ رہے۔

پہلی بار جب نانی اماں نے اپنے بیٹے پر بطور ایک فٹ بال پلیئر فخر محسوس کیا، وہ دن تھا جب انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار فٹ بال میچ دیکھا تھا۔ اس وقت ماموں کا شمار ہائی سکول کے سینئر طالب علموں میں ہوتا تھا۔ نانی جان جو کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا واحد بیٹا ایک پروفیشنل ایتھلیٹ کے طور پر بڑا ہو اس وقت مبہوت ہو کر رہ گئیں جب کھیل ختم ہونے کے بعد سکول کی لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ انہیں ''ماں'' پکار کر ان کی طرف دوڑ پڑیں جیسے وہ ان کی ساس ہو اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز طور پر وہ لڑکیاں ان کے بیٹے کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرنے لگیں جیسے وہ ان کا شوہر ہو۔

شادی کے قابل لڑکیوں کی یہ بے باکی نانی اماں کیلئے قابل برداشت تھی اور وہ انہیں لیکچر دینے کیلئے ان کے پیچھے گئیں لیکن یہ واقعہ بالکل بھی ناخوشگوار نہ تھا، اس کے بعد سے یہ ان کا اہم ہدف بن گیا کہ سکول کی ان لڑکیوں کو سخت لیکچر دے کر بھگا دیا جائے جو انہیں اور ان کے بیٹے کو گھیر لیتی تھیں۔

''تم اس وقت اپنے ماموں کو دیکھتے، جب مخالف ٹیم کا گول کیپر اس گیند کے ٹکرانے سے پیچھے کی طرف گر گیا تھا، جسے تمہارے ماموں نے ٹھوکر لگائی تھی۔ اس سے تمہارے لئے آسانی ہوگئی ہوگی کہ سوال کا جواب دے سکو، کہ تم اپنے ماموں کو اپنا چچا کی نسبت زیادہ پسند کرتے ہو''۔

نانی ماں کم بولنے والی عورت تھیں لیکن ایک بار جب وہ اپنے بیٹے کے بارے میں بولنا شروع ہوتی تھیں تو پھر انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ اپنے لائق بیٹے کا امیج میرے دل میں گہرائی تک بٹھانے کی کوششوں میں وہ اپنے الفاظ پر پوری طاقت صرف کر دیا کرتی تھیں۔ بعض اوقات وہ مجھ سے تقاضا کرتیں

کہ میں اپنے ماموں کے خدوخال بتاؤں جیسے انہیں یہ ڈر ہو کہ میں یقیناً ان کا چہرہ بھول چکا ہوں۔

یہ بات درست ہے کہ ماموں ایک باوقار نوجوان تھا، کسی بھی ماں کے فخر کے قابل۔ اگر چہ نانی اماں کی یادداشتوں میں کچھ مبالغہ آرائی اور حاشیہ آرائی بھی شامل تھی تاہم وہ فٹ بال کا ایک اچھا کھلاڑی تھا اور یہ کہ ان کی بہت زیادہ تعریف کی جاتی تھی اور انہیں بہت زیادہ پسند کیا جاتا تھا، قابل بیان سچ تھے۔

وہ ایک لائق اور خوبصورت آدمی تھا۔ ان کا رنگ چینی مٹی کی مانند سفید تھا اور ان کی ستواں ناک اور کالی بھنویں تھیں اور ان کا متوازن جسم اعلیٰ نسل اور متعدد ذہنی خوبیوں کو ظاہر کرتا تھا۔ کئی بار ہم نے ان کی اور ان کے دوستوں کی چند دنوں کے لئے مہمانداری کی تھی۔ ایک بار وہ آئے تو ان کے ساتھ کافی دوست تھے اور ان سب کے پاس رک سیک تھے۔ وہ نوجوان، جنہوں نے بتایا کہ وہ چری سان پہاڑ پر جا رہے ہیں، ساری رات مہمان خانے میں گٹار اور موسیقی کے دیگر آلات بجاتے رہے۔ اس رات ان کے ایک دوست نے کہا کہ انہوں نے یعنی میرے ماموں نے اسے ہدایات دی ہیں کہ لڑکیوں کا بوسا کیسے لیا جاتا ہے۔ پھر اُس نے اپنا کھردرا جبڑا میرے جبڑے کے اوپر رگڑا جس سے میں چیخ اٹھا اور کمرے سے بھاگ گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ابھی پانچ برس کا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب ان کے گروپ میں ایک خوبصورت نوجوان عورت بھی تھی۔ یہ جنگ چھڑ جانے سے پہلے کا سال تھا اور اس بار وہ پورے پانچ دن ہلا گلا کرتے رہے اور میری دادی اماں کی خاموشی ناراضی کا الزام اپنے سر لیتے رہے اور ماں کو بڑے خفت والی صورتحال سے دوچار کرتے رہے۔

لگتا تھا کہ ماموں کے دوست انہیں اور اس نوجوان عورت کے ساتھ کسی شاہی جوڑے جیسا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اس گروپ نے ایک موقع پر خود کو کئی گھنٹوں کیلئے کمرے میں بند کر لیا اور لگتا تھا کہ وہ کسی معاملے پر بحث کر رہے ہیں۔ بعد میں ماں نے وضاحت کی کہ وہ اس وقت لڑائی کر رہے تھے کیونکہ ان کا بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا، بائیں بازو کے طالب علموں کے ساتھ ان کی پرانی مخالفت چلی آ رہی تھی۔ جنگ چھڑنے کے بعد کے ایک مہینے، جب ماموں ہمارے گھر کے پچھواڑے میں بانسوں کے جھنڈ میں چھپے ہوئے تھے، کے سوا یہی میرے ان کے ساتھ رابطوں کی تفصیل ہے۔

اپنے ماموں کے بارے میں میرے جذبات، ایسی ہی چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں کے ذریعے بنے تھے اور ایک خاندانی رشتے کے ساتھ پیار کی نسبت ادب اور تعظیم پر زیادہ مبنی تھے۔ اس کے حوالے سے بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو میری اس تعظیم کو متاثر کر سکتی تھیں۔ اس کے نسوانی خدوخال، مہذب اطوار اور بات چیت اپنے اندر نسوانی مظاہر لئے ہوئے تھی لیکن ان کی تیز تیز حرکت، واضح فیصلہ سازی جوان کی لامحدود توانائی کی وجہ سے تھے، انکی مردانگی کا ثبوت تھا۔ یہ حقیقت کہ وہ ایک تنظیم کا رہنما تھا اور وہ بھی اتنی کم عمر میں، ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت تھا اور انہیں میری نظروں میں اور زیادہ ممتاز بنا دیتا تھا۔ میرے نزدیک اتنی متنوع قابلیتوں کا ایک انسان کے اندر اتنا شاندار اور حیرت انگیز امتزاج غیر متعبدل چسیتان تھا۔

میرے چچا میرے ماموں سے تین سال بڑے تھے۔ بڑے ہونے کے باوجود وہ عمل کے حوالے سے میرے ماموں کی نسبت بہت زیادہ ناپختہ تھے۔ خصوصی ایجنٹوں کے مزدوروں، گھروں کے اندر شراب تیار کرنے اور خفیہ مذبحوں کے غیر قانونی کاموں کا پتہ چلانے کیلئے جن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، کو ''صلہ'' دینے کے طریق کار نے کچھ عرصہ کیلئے ان کو پورے علاقے میں معروف بنا دیا تھا۔ بے رحمانہ چوکسی کی وجہ سے ان ایجنٹوں نے گاؤں والوں کی ناراضی مول لے لی تھی۔ گاؤں کے دارے میں دیہاتی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے درمیان میرے چچا نے ہر ایجنٹ کو ایک بالٹی پانی فراہم کیا تاکہ وہ اسے پئیں۔ انہوں نے اپنے اس عمل کو خفیہ طور پر شراب کشید کرنے کے کاروبار کا پتہ چلانے والے محنتی مزدوروں کو انعام دینے کا ایک طریقہ قرار دیا۔ ایجنٹوں میں سے ہر ایک کو یہ کافی مقدار میں پانی گھٹنوں کے بل نیچے جھک کر پینا تھا جبکہ ان میں سے ہر ایک کی گدی پر بندوق تانی گئی تھی۔ پھر انہیں مقررہ وقت میں اپنی ضرورت سے زیادہ پھیلی ہوئی توندوں پر ہاتھ مار مار کر سو دفعہ لہک لہک کر گانا تھا۔ ''میں پھپھوندی کا پوتا ہوں، میں گائے کا بچہ ہوں، میرا باپ ایک بھینسا ہے'' پھر انہیں کہا گیا کہ وہ کوئی سا بھی گانا گا کر اہل دیہہ کا دل بہلائیں۔ کھردری آواز میں ان کا گانا، جو بچھڑوں کا ذکر انا زیادہ سنائی دیتا تھا، اس وقت اذیت ناک محسوس ہوا کہ اہل علاقہ جو اس سے پہلے کھلکھلاتے رہے، آخر میں قہقہے لگانا بھول گئے۔

ان کی تمام حرکتیں مزاحیہ اور ناقابل یقین ہوتی تھیں۔ قریبی دیہہ میں ایک چھوٹے سے زمیندار کی بیٹی کی شادی کا قصہ بھی بڑا مشہور رہا۔ انہوں نے ایک بدنام زمانہ چوروں کے گینگ کے ایک

MashalBooks.com

رکن کی شادی ایک جعلی تقریب میں مسٹر چوای کی بیٹی کے ساتھ کردی تھی۔ تقریب گاؤں کے دارے میں منعقد ہوئی تھی اور وہ ایک مکمل طور جدید طرز کی مغربی سٹائل کی تقریب تھی۔ اس تقریب میں مسٹر چوای اور دلہن کے شوہر کو بطور مہمان دعوت دی گئی تھی یا آپ یہ کہہ لیں کہ طلب کیا گیا تھا۔ جونہی تقریب ختم ہوئی چچا جان نے دلہن کا ہاتھ تو اس رکن کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر براہ راست مسٹر چوای کے پاس چلے گئے۔ اس روز مسٹر چوای کو اُس بدمعاش، جو انہیں ابا جان بھی کہہ کر پکار رہا تھا، نے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ یہ اس زیادتی کا بدلہ تھا جو مسٹر چوای نے اس کے ساتھ ایک بار کی تھی۔ ایک رات جب آسمان پر چاند چمک رہا تھا تو وہ شراب پی کی مسٹر چوای کے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا اس پر مسٹر چوای کے نوکروں نے اس کی سخت پٹائی کی تھی حالانکہ یہ حرکت اس نے مسٹر چوی کی بیٹی کی محبت میں کی تھی۔

میرے دونوں انکل یعنی چچا اور ماموں ایک دوسرے کے متضاد تھے۔ جہاں میرے چچا کی سرخ فوج میں شمولیت حالت و واقعات کے طوفان میں ایک اندھا اور جبراً اختیار کیا گیا فیصلہ تھا جیسے شراب پی کر مسٹر چوای کے گھر کی دیوار پہر چڑھنا ایک بے اختیارانہ عمل تھا، جبکہ میرے ماموں کی دائیں بازو کی تحریک میں سرگرمیاں اور پھر رضا کارانہ طور پر ری پبلک میں آفیسر کے طور پر خدمات پیش کرنا ایسے فیصلے تھے جو بڑی مضبوطی کے ساتھ اصول کی بنیاد پر اور معانی اور نتائج کا جائزہ لینے اور ان کے بعد بڑے محتاط انداز میں کئے گئے تھے۔ اگرچہ ان کے درمیان بہت زیادہ ملاقات نہیں رہی پھر بھی میرے چچا اور ماموں ایک دوسرے کو کافی پسند کرتے تھے۔ اگر ان کے درمیان یہ تعلق نہ ہوتا تو میرے ماموں کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کیمونسٹ حکمرانوں کے دوران ایک مہینے سے زیادہ عرصے تک حفاظت کے ساتھ چھپے رہتے۔ یہ کہہ کر کہ ان کی طرح کے غریب اور لاعلم آدمی ہی بازوؤں پر سرخ پٹیاں باندھ سکتے تھے، میرے چچا میرے ماموں کی باعزت استحقاق دیتے تھے۔ ممکن ہے یہ اس کیلئے حسد یا پھر تعریف کا اظہار ہو جس نے ان سے زیادہ تعلیم حاصل کی تھی۔ کسی بھی وجہ سے چچا اپنے اس قانونی رشتے دار پر وافر مہربانی کا مظاہرہ کرتے تھے جس کو ایک غار میں چھپے رہنا پڑ رہا تھا۔ اپنی اس مہربان توجہ کی وہ ماں کو یہ کہہ کر وضاحت کرتے تھے کہ یہ ہم دونوں مشترکہ بھتیجے یا بھانجے اور ابا جان اور ماں کی حیثیت کی وجہ سے ہے۔

لیکن میرے ماموں مختلف تھے اگرچہ اندرونی طور پر وہ میرے چچا کے بارے میں گرم جوشی محسوس کرتے تھے، جو اتنے ہنس مکھ اور دوستانہ تھے تاہم ظاہری طور پر وہ اپنے ہم منصب پر سرد نگاہیں

ڈالتے تھے جو کسی کھیلنے والے بچے کی طرح ادھر ادھر بھاگتے پھرتے تھے۔ ان نکا یہ وجدان درست ثابت ہوا۔ میرے چچا، محسوس ہوتا تھا کہ جو میرے ماموں کے لئے بہت محبت رکھتے تھے، نے کیمونسٹوں کی شکست کے بعد کی اس افسوسناک صبح کو اپنے آدمی بانسوں کے جھنڈ میں غار کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔ یہ سب کچھ ماموں کے جانے کے چند گھنٹے بعد ہوا تھا۔ ماموں، جنہوں نے جی بھر کر رات کا کھانا کھایا تھا، خاندان کے کسی بھی فرد کو بتائے بغیر کہیں چلے گئے تھے۔

میں خالہ کو کھانستے ہوئے سن سکتا تھا۔ اپنی رضائی کو سر کے اوپر اوڑھے، فرش کے قدرے گرم حصے پر پیٹھ کے بل لیٹے وہ کھانسے جا رہی تھیں، جس نے ان کے نظام تنفس کو نقصان پہنچایا تھا۔ میں نانی اماں کو سرگوشیاں کرتے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا اور میں کم اور پھر تیز ہوتی ہوئی بارش کی آواز میں سن سکتا تھا۔

''وہ ہمیشہ ڈھلوانوں کو ناپسند کرتا تھا۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں وہ اتنی ہی صفائی سے مارا گیا ہوگا جتنی صفائی سے کام کرنا اس کا معمول تھا۔ مجھے یقین ہے کہ گولی اس کے دل و دماغ میں لگی ہوگی تاکہ وہ بغیر تڑپے اور تکلیف برداشت کئے فوری طور پر مر جائے''۔

ایسا لگتا تھا کہ چند روز پہلے ایک دیہاتی نے جو باتیں بیان کی تھیں، اس نے نانی اماں کو صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ ممکن ہے ہمارے گھر کے مہمانوں والے کوارٹروں میں ساری رات مسخ شدہ لاشوں کی جو تصویریں آتی اور جاتی رہیں، انہوں نے ایک ناخوش بوڑھی عورت کے خوابوں میں ہلچل پیدا کر دی ہو۔ یہ ممکن تھا کہ انہوں نے ایسا کیا ہو۔ نانی جان دعا کر رہی تھیں کہ ان کا اکلوتا بیٹا جنگ میں ایک بالکل صاف اور پرامن ظاہری جسمانی کیفیت میں ہلاک ہوا جیسے کوئی پرامن نیند سویا ہوا ہو۔ انہوں نیس رگرمی سے دعا کی کہ شیطان کی گولی ان کے کسی نازک حصے پر لگی ہو جس کی وجہ سے وہ اس دنیا اور اگلی وقتی جگہ کے درمیان کی سرحد پار کر گیا، نہ صرف جسمانی اذیت کے بغیر بلکہ یہ سوچے بناء اور اظہار افسوس کئے بغیر بھی کہ وہ اس دکھوں سے بھری دنیا میں اپنی بیوہ ماں کو بغیر کسی بیٹے کے چھوڑے جا رہا ہے۔ انہوں نے بے لچک انداز میں سرگوشی کی کہ ان کا بیٹا اس طرح مرا کہ اس کے جسم کے سارے اعضا ٹھیک ٹھاک اور اکٹھے تھے اور قدیم زمانے کی کہانیوں کی طرح انہیں ان بھوتوں کی طرح کے حالات سے دوچار نہیں ہونا پڑے جو اپنے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جسم کے اعضاء کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔

لیکن ان کی آواز واضح طور پر کمزور ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف خالہ کے کھانسنے کی آواز بلند

MashalBooks.com

ہوتی گئی۔ بارش کی تسلسل کے ساتھ آتی ہوئی آواز میں ان کی آواز کمزور اور معدوم ہوتی چلی گئی۔

(5)

اس مستقبل کا حال بتانے والے نابینا شخص کا بتایا ہوا وقت تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ بارش مسلسل جاری تھی اور ہر کوئی تھک چکا تھا، اکتا چکا تھا۔ دادی اماں کے سوا سبھی مکمل طور پر تکان کا شکار تھے، مسلسل انتظار اور بارش کی وجہ سے پریشان تھے۔

دریا میں چلنے کیلئے جو قدمچے بنے ہوئے تھے، جو ہمارے گاؤں کو اگلے گاؤں کے ساتھ ملاتے تھے، بارش کی وجہ سے بڑھتے ہوئے پانی کے باعث کبھی کے ڈوب چکے تھے۔ اس کے بعد دریا کے آر پار ایک رسی باندھ دی گئی تا کہ بڑے لوگ اسے تھام کر دریا کے گھاٹ میں سے گزر سکیں، اس وقت دریا کی لہریں کمر تک آتی تھیں۔ بچوں کو بڑے اپنے کندھوں پر سوار کر کے دریا کے پار لے جاتے تھے لیکن اب جبکہ دریا کا پانی قد آدم ہو چکا تھا تو دریا کو پار کرنا بھی ناممکن تھا۔ اس طرح قصبے کی طرف آنے والی ٹریف تقریباً بند ہو چکی تھی۔ ایسے لوگ بھی تھے جن کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اوپر سے سوؤروں، بیلوں اور جڑوں سے اکھڑے ہوئے صنوبر کے درختوں کو دریا میں بہہ کر آتے دیکھا لیکن ابا جان ایسی افواہوں بکواس تصور کرتے تھے۔ ابا جان کے مطابق ہمارا گاؤں دریائے سوم جن بہاؤ کے مخالف ساحل پر واقع ہے چنانچہ ایا کچھ نہیں ہوسکتا، جب تک کوئی بڑا اسیلاب نہ آ جائے۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس سال کا موسم برسات غیر معمولی طور پر، بہت طویل اور بہت بھاری تھا۔ اس کے نتیجے میں گاؤں میں آمدورفت بند ہوگئی تھی جس نے دادی جان کو گہری فکر میں ڈال دیا تھا۔

''وہ قصبے سے یقینی طور پر سڑک کے ذریعے آ رہا ہوگا، یہ بات کس قدر خوفناک اور تکلیف دہ ہے کہ دریا اس قدر پھول گیا ہے''۔

ایک مینڈک نے ہمارے گھر کے برآمدے کے ایک حصے میں پناہ لے رکھی تھی۔ وہ کافی دنوں سے موجود تھا اور میری طرف سے ستائے جانے کے باوجود وہاں سے نہیں گیا تھا۔ بارش نے اس کی سرنگ ڈھادی ہوگی اور یہ پناہ گاہ ملنے پر وہ خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوگا۔ اس حوالے سے یہ قابل رحم تھا۔ اس نے جو اوٹ پٹانگ نظارا پیش کیا اس سے میری رنگارنگی عود کر آئی۔ اس نے اپنا بے ڈھنگا جسم لکڑی کے فرش کے نیچے گھسیٹ لیا تھا۔ تیسرے دن میں نے اس کا جسم کو الٹا کیا یعنی اس کی ٹانگوں والا حصہ اوپر کر دیا

اور جو کا ایک تنکا اس کے مقعد میں گھسیڑ دیا اور پھر اس تنکے کے ذریعے اس کے جسم میں اتنی ہوا بھر یکھوہ ربڑ کی گیند کی طرح پھول گیا۔اس کے بعد وہ بعد دو پہر ایک پہر کے لئے کہیں غائب ہو گیا،لیکن اگلی صبح وہ پھر وہیں موجود تھا اور رہائش پر حق جمار ہا تھا۔قدمچوں پر آلتی پالتی مارے وہ بارش کے گرتے ہوئے قطروں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

انہی دنوں کی بات ہے،اناج کی کوٹھڑی میں بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا۔یہ مسئلہ کوئی ایسا نہ تھا جیسے کوئی کسی صبح یکا یک پیدا ہو جاتا ہے بلکہ یہ مسئلہ کئی دنوں میں بتدریج پیدا ہوا تھا۔البتہ چونکہ کسی نے بھی اس کا نوٹس نہیں لیا تھا اس لیے پتہ چلنے پر سبھی ششدر رہ گئے۔کاٹنے کے فوراًبعد اناج کی کوٹھڑی میں رکھے گئے جو کی بوریوں میں سے بخارات اٹھنے شروع ہو گئے تھے۔جیسا کچھ عرصہ پہلے مٹر کی پھلیوں کے ساتھ ہوا تھا،اب اناج میں سے پیلے رنگ کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔خوش قسمتی یہ رہی کہ اباجان نے ان کو اس وقت دریافت کر لیا جب وہ وہاں چوہے دان سیٹ کرنے گئے تھے،بصورت دیگر خزاں میں اگلی فصل کے کٹنے تک سب کو فاقے کرنے پڑتے۔اچانک ہی پورا خاندان مصروف ہو گیا جیسے کاشت کے موسم کے عروج پر ہوتا ہے۔جو سے بھری بوریوں کو اس طرح محفوظ کرنا کہ ان کا مزید نقصان نہ ہو،ایک بڑا مسئلہ تھا۔ہم نے اناج کی کوٹھڑی میں لکڑی کے ڈنڈوں سے ایک سٹروبیج پلیٹ فارم بنایا جس کا مقصد فرش اور جو سے بھری بوریوں کے درمیان ہوا کی آمدورفت کیلئے جگہ چھوڑنا تھا اور بھاپ چھوڑتے جوؤں کو گھر کے اندر تمام ہموار سطحوں پر بکھیر دیا تا کہ وہ خشک ہو جائیں۔میں جہاں بھی جاتا،سونے کے کمروں میں،کچن میں،ہر جگہ مجھے جو ہی نظر آتے تھے۔مجھے جو سے سخت نفرت تھی اور اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ یہ منہ میں بڑے کھردرے اور سخت محسوس ہوتے تھے اور پیٹ درد کا باعث بنتے تھے۔میں نے جو کے دانے میں ایک لکیر سی بنی ہوئی دیکھی تو مجھے ایک پرانی کہانی یاد آ گئی جو دادی اماں نے مجھے کبھی سنائی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کہیں پر کوئی لڑکا رہتا تھا جس کے باپ کو بڑی مہلک بیماری لگی ہوئی تھی۔لڑکے نے ڈاکٹر سے مشورہ طلب کیا تو اس نے تجویز دی کہ اس کو انسانوں کے جگروں کے ملاپ سے بنی ہوئی دوا دی جائے تو یہ ٹھیک ہو جائے گا چنانچہ لڑکے نے راستے میں آنے والے تین افراد کو قتل کر دیا،ان میں سے ایک دانشور تھا،دوسرا ایک پروہت تھا اور تیسرا ایک پاگل آدمی تھا۔اس نے تینوں کے جگر اکٹھے کر کے ان کی یخنی تیار کی جسے پینے کے بعد اس کے باپ کی بیماری مکمل طور پر ختم ہو گئی۔لڑکے نے

تینوں کی لاشیں ایک دھوپ والی جگہ پر دفن کر دیں۔ اگلے سال اس مقرے پر ایک عجیب قسم کا پودا اگتا نظر آیا اور اس کے دانوں کو آج ہم جو پکارے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو کے دانے میں جو گہری سی لکیر ہے وہ وہی ہے جو اس لڑکے نے ان کے جگر نکالنے کیلئے ان کے جسموں پر چیرے لگائے تھے۔

جب گھر کے تمام فرش اس طرح کے ناخوشگوار اناج سے بھرے پڑے ہوں تو گھر میں ٹکنا غیر آرام محسوس ہوتا ہے۔ میں نے خود کو پابند اور محبوس کیا گیا محسوس کیا۔ لیکن دادی جان حقیقتاً بڑے عجیب مزاج اور دھن کی تھیں۔ اس سارے بکھیڑے میں بھی وہ اپنے ہی منصوبوں کے تانے بانے بن رہی تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے امی جان کو حکم دیا کہ وہ الماری میں بیش قیمت ریسم کا کپڑا نکالے اور پھر چچا کے لئے کورین طرز کا لباس تیار کرے۔ ان کا خیال تھا کہ گھر میں پہننے کیلئے کورین لباس بڑا باوقار، شاندار اور آرام دہ ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے ماں سے کہا کہ وہ چچا کا پسندیدہ کھانا یعنی فرائیڈ سکوائش سلائس کافی مقدار میں تیار کرے۔ ماں نے احتجاج کیا کہ دو دن میں تو یہ کھانا خراب ہو جائے گا اور کھانے کے قابل نہیں رہے گا لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہیں، پھر انہوں نے فرن کے پتوں کو مسالہ ڈال کر ذائقے دار بنایا اور اس امر کی شکایت کی کہ پودے اس تیزی سے نہیں بڑھ رہے جتنی تیزی سے انہیں اگنا چاہیے کیونکہ حالات کافی سخت ہیں۔ وہ تمام کھانے جو تیزی سے خراب ہو جاتے ہیں ان میں زیادہ نمک ڈال کر دیا گیا یا پھر انہیں جما دیا گیا تا کہ وہ خراب نہ ہو جائیں۔ آخر کار ساری تیاریاں تقریباً مکمل کر لی گئیں۔ کافی کھانا تیار کر لیا گیا تھا، اتنا کہ ہم جیسے لوگوں والے پورے گاؤں کی دعوت کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے کچن کا جائزہ لیا تو ایک ایسے فرد پر فخر سے ان کا چہرہ دمک اٹھا، جس نے یہ ہدف پورا کیا تھا۔ اب صرف ایک چیز اور تھی جس کی انہیں فکر کرنی تھی۔

''یقیناً وہ قصبے سے سڑک کے راستے آ رہا ہوگا، کتنی بدقسمتی کی بات تھی کہ دریا اس قدر بپھرا ہوا تھا''۔

''اس میں پریشان والی کیا بات تھی، اگر دریا کچھ بپھرا ہوا بھی تھا تو یہ چچا کی راہ میں رکاوٹ کیسے بن سکتا تھا، اگر وہ آنے کا پکا ارادہ رکھتے تھے؟ وہ جانتے تھے کہ بارش کے موسم میں ٹریفک اکثر معطل ہو جاتی ہے چنانچہ وہ پتھر سے بنا ہوا پل استعمال کر سکتے تھے اور سرکلر روڈ کی طرف سے آ سکتے تھے''۔ ابا جان نے دادی اماں کی فکر کو یکسر مسترد کر دیا تا کہ ان کا ذہن فکرمندی کا شکار نہ ہو اور آسودہ رہے لیکن دادی اماں

نے اپنا سر ہلا دیا اور کہا ''یقیناً وہ سرکلر روڈ کا راستہ اختیار کر سکتا ہے لیکن وہ تو چار میل زیادہ طویل ہے۔ چار میل بظاہر چھوٹے محسوس ہوتے ہیں لیکن اس بارش میں چار میل چلنے کے بارے میں سوچو اور اس کے تو پاؤں بھی سرما زدہ ہوتے ہیں''۔

پھوپھی جان مقررہ دن سے ایک دن پہلے پہنچ گئیں۔ گھر پہنچنے کے فوراً بعد انہوں نے کچن میں الماریوں اور شیلفوں کا جائزہ لیا اور سارے کام کی تکمیل پر دادی جان اور ماں کی تعریف کی۔ وہ کی گئی تیاریوں پر بڑی مطمئن نظر آتی تھیں۔ دادی اماں کی طرح پھوپھی کو بھی میرے چچا کے گھر واپس آنے کا پورا یقین تھا۔ انہوں نے ھی دادی اماں کو اس اندھے مستقبل کا حال بتانے والے سے متعارف کرایا تھا۔ چونکہ انہوں نے ہی مستقبل کا حال بتانے والے پر دادی اماں کا مکمل یقین قائم کرایا تھا چنانچہ یہ بات سمجھی جا سکتی تھی کہ چچا کے گھر واپس آنے کے بارے میں ان کا یقین بھی اتنا ہی پختہ تھا جتنا کہ دادی جان کا حتیٰ کہ ان کا واپس آتے ہوئے چچا جان کو مناسب طور پر خوش آمدید کہنے کا پروگرام بھی دادی اماں کے پروگرام سے اتنا ملتا جلتا تھا کہ ماں، جو اپنے ان رشتے داروں کے بارے میں ہمیشہ شکوے کرتے رہتی تھی، بھی خفیہ طور پر اپنی ساس اور نند کو ایک جیسا ذوق رکھنے پر تحسین پیش کر چکی تھی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امی کو چچا جان کی واپسی کی امید نہیں تھی حتیٰ کہ خالہ، جو ان دنوں مشکل سے ہی بولتی تھیں اور نانی جان جنہوں نے ایک بار کمیونسٹ سپاہیوں کو برا بھلا کہا تھا، نے بھی جب ان کی واپسی کی اتنی گرم جوشی سے تیاریاں ہوتے دیکھیں تو خاموشی کے ساتھ ان رشتے داروں کے پھر سے مل جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن خواہش رکھنا اور اعتقاد کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں خود بھی دل کی گہرائیوں سے چچا جان کی واپسی کا خواہش مند تھا لیکن میرے بچگانہ سے تجزیے کے مطابق ایسا کم ہی ممکن نظر آتا تھا کہ اس طرح کا کوئی واقعہ اتنی آسانی سے وقوع پذیر ہو جائے جتنی آسانی سے اس کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اگر چچا کو واپس آنا تھا تو کسی حیثیت میں اور کون سی سڑک سے وہ واپس آئیں گے؟

میں نے ابا جان کو کچن میں امی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے اس طرح کی باتیں ممکن ہوتی ہیں۔ اگر کوئی دادی جان کے عقیدے، جو بہت ٹھوس اور مکمل تھا، سے الگ ہو کر مقدصیت کو سامنے رکھ کر اس معاملے کا جائزہ لے تو اس پیش گوئی کے درست ثابت ہونے کے ناممکنات بالکل واضح تھے، اتنے واضح کہ اس سے ہمارا دل دکھنے لگتا تھا۔ آخری تدبیر کے طور پر ابا جان نے اس امکان کا جائزہ

بھی لیا کہ چچا جان نے پولیس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں گے لیکن پھر جلد ہی انہوں نے اس تصور کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو ہمیں پولیس کی جانب سے تفتیش کے حوالے سے کوئی نوٹس ضرور مل چکا ہوتا۔ ابا جان باقی افراد سے کہیں بہتر جانتے تھے کہ ہمارا خاندان کری نگرانی میں ہے۔ کبھی کبھی ایک شخص ہمارے گھر میں جھانکتا نظر بھی آتا تھا، وہ بڑی شک بھری نظروں سے جائزہ لے رہا ہوتا تھا۔ اگرچہ ظاہری طور پر ہم ادھر ادھر آنے جانے کے حوالے سے آزاد تھے لیکن ہم ایسی مچھلیوں کی طرح تھے جنہیں جال میں پھانس لیا گیا ہو۔ میں کافی پہلے سے جانتا ہوں کہ وہ شخص کبھی کبھی ہمارے پڑوس میں گھستا ہے یعنی چنکو کے گھر میں اور وہاں سے معلومات حاصل کرتا ہے اور ایک دو بار تو وہ شخص ابا جان کو ایک شراب خانے میں بھی لے جا چکا ہے تا کہ ان سے ملاقات کر سکے۔

جب وہ نظر آتا تھا تو وہ ہل کر رہ جاتا۔ اس کا نظر آنا میرے لئے خوفناک احساس کا حامل تھا۔ یہ میرے اندر احساس ندامت کو پھر سے جگا دیتا تھا۔ جسے میں لوریاں دے دے کر سلاتا تھا۔ اس کی ایک جھلک مجھے دادی جان کے یہ الفاظ یاد دلا دیتی تھی کہ میں ایک قضائی ہوں جس نے اپنے چچا کو ایک ٹافی کے عوض بیچ ڈالا۔ ابا جان کو اس روز لکڑی کے ڈنڈے سے مجھے مار دینا چاہیے تھے۔ ابا جان اس آدمی سے بات چیت کر کے واپس آئے تھے تو ان کا چہرہ دیکھ کر میں سخت اذیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

اپنی دادی اماں کی نفرت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا میرے نزدیک ایک ہی طریقہ جو میرے ذہن میں گھومتا رہتا تھا یہ تصور تھا کہ میں بڑے ہی قابل رحم طریقے سے مر جاؤں۔ ضمیر کی ملامت سے بچنے کا بھی میرے نزدیک یہی طریقہ تھا، چاہے یہ بچاؤ وقتی طور پر ہوتا۔ میں چشم تصور سے وہ منظر دیکھتا جس میں پورا خاندان، خاص طور پر دادی اماں نوجوان لاش کے سامنے بیٹھ کر مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ دادی اماں کو جس قدر زیادہ غم اور پچھتاوا ہوتا میں اتنا ہی زیادہ طمانیت محسوس کرتا۔ لیکن جب میں جاگتی آنکھوں کے اس خواب سے بیدار ہوتا تو خود کو ہمیشہ کی طرح زندہ پاتا۔ میں چچا جان سے آمنا سامنا کرنے سے خوفزدہ تھا۔ اسی احساس جرم کی وجہ سے جہاں میں عاجزی سے دعا کرتا کہ چچا جان واپس آ جائیں وہیں میں در پردہ یہ خوفناک خواہش بھی پال رہا تھا کہ مجھے آئندہ کبھی چچا کا سامنا نہ کرنا پڑے، یہ کہ چچا جان کسی سنگلاخ، بیابان وادی میں ہلاک ہو چکے ہوں اور ان کی لاش بھی تلاش نہ کی جا سکے۔ وہ دن، جس کی پیش بینی کی گئی تھی اب صرف ایک روز آ گے تھا اور اس نے میرے اندر موت کی طرح کا خوف بھر

دیا تھا۔ میں اس قدر خوفزدہ تھا کہ میں نے دعا کی، یہ دن کبھی ختم نہ ہو۔

لیکن میرا خیال ہے کہ میرے ابا جان جس فکر اور دہشت میں مبتلا تھے، میرے تکلیف اس کے مقابلے میں کبھی بھی نہیں تھی۔ میں نے ابا جان کو کچن میں ماں کے ساتھ باتیں کرتے سنا تھا۔ ماں دادی جان کی ضرورت سے زیادہ احتیاط کے شکوہ کر رہی تھی۔ ابا جان نے کہا تھا" میں بھی وہی محسوس کرتا ہوں جو تم محسوس کرتی ہو، مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ نہیں آئے گا اور فرض محال کسی غیر معمولی موقع کے تحت وہ آ بھی جاتا ہے تو ایسا واقعہ نہیں ہوگا جس طرح کی صورتحال کی ماں توقع کر رہی ہے۔ یہ بات میں تم سے بہتر جانتا ہوں لیکن میں ماں سے کیا کہہ سکتا ہوں؟ یہی بہترین ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہیں ہم کرتے جائیں۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ ہم اُن سے اُن کی خوشیاں چھیننا چاہتے ہیں اور انہیں غم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم ایسا نہیں سوچتی ہو"؟

دادی جان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ابا جان کو جس قدر شدید آزار کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، وہ اس کا اظہار میری ماں سے کر رہے تھے حتیٰ کہ ان کے مطابق وہ ایسا کرتے ہوئے مستقل بہانے بازیاں کر رہے تھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ جس واقعہ کے رونما ہونے کا انتظار کیا جا رہا ہے اس کا رونما ہونا ناممکن ہے۔ اس کے باوجود دادی ماں کا اعتقاد ان کی لامحدود مادرانہ شفقت کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا۔ یہی پیار ہمارے دلوں میں بھی در آتا اور ہمیں مجبور کرتا کہ ہم بھی ان کی خواہشات اور توقعات پوری ہونے کی دعا کریں۔ اپنے طور پر ہم ایسا اعتقاد رکھنے سے کوسوں دور تھے۔ ہم اس عمر رسیدہ خاتون کے ساتھ صرف امید اور انتظار ہی کر سکتے ہیں ہم کسی بھی طور اس بوڑھی خاتون کو ناامید نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ابا جان نے اس مایوسی کی پیش بینی بھی کر لی تھی دادی کی توقع کے پورا نہ ہونے سے جو پھیلنی تھی اور اسی مایوسی کا نتیجہ کیا نکلنا تھا لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ دادی جان کے حکم سے سرتابی نہ کی جائے۔ یہ بدقسمتی تھی کہ اس مستقبل کا حال بتانے والے نابینا شخص، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ غیب کا علم بھی جانتا ہے اور اوپر والے کی اس پر خاص عنایت ہے، نے دادی اماں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ چچا جان کس سڑک کے ذریعے واپس گھر آئیں گے۔

رات ہو چکی تھی، بارش جو جھٹپٹے کے وقت کم ہو گئی تھی اب صرف پھوار کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ کھمبے کے ساتھ لٹکے ہوئے لیمپ کی مدہم روشنی میں بارش باریک قطروں کی صورت میں برس رہی تھی جیسے

وہ بھی کافی زیادہ تھک گئی ہو۔ اگرچہ اس حوالے سے خصوصی احکامات جاری نہیں کئے گئے تھے پھر بھی جنگ شروع ہونے کے بعد سے گاؤں کے لوگوں نے اسے عادت بنالیا تھا کہ وہ رات کے کھانے کے بعد ساری روشنیا بجھا دیتے تھے۔ البتہ ہم نے آج کی رات ایک لیمپ لٹکایا ہوا تھا تاکہ یہ ساری رات کو اجالا پھیلائے رکھے جیسے کوئی اکیلا پہرے دار ساری رات جاگتا رہتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب دادی اماں کے اصرار پر کیا گیا تھا۔ کون جانتا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ چچا جان کو صبح آٹھ سے دس بجے کے دوران واپس آنا ہے لیکن وہ آدھی رات کے وقت بھی آسکتے ہیں کہ ان کے پروگرام میں اچانک کوئی تبدیلی آگئی ہو۔ دادی جان یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھیں کہ چچا کا خاندان ان کی واپسی کے حوالے سے تیار نہیں ہے۔

''ایسے ہی موقع کیلئے ہم نے قیمتی مٹی کا تیل بچا کر رکھا ہوا تھا''۔

انہوں نے حکم دیا کہ دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ایک اور لیمپ لٹکا دیا جائے اور انہوں نے خبردار کیا کہ کسی بھی کمرے میں سے لیمپ بجھنا نہیں چاہیے۔ انہوں نے اس کی وجہ بھی بتائی کہ ہمیں اپنے گھر کو دن کی طرح روشن کیوں رکھنا ہے؟

''گھر کو اس لئے روشن رکھنا ہے کہ وہ دور بہت دور سے ہی اپنے گھر کو پہچان لے اور پھر دوڑتا ہوا ہمارے پاس آئے یہ جانتے ہوئے کہ اس کی ماں ساری رات جاگ کر کھلی آنکھوں کے ساتھ اس کی منتظر ہے''۔

رات گہری ہوگئی تھی اس کے باوجود گھر کا کوئی بھی فرد بستر پر جانے کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ خاندان کے کسی رکن میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس وقت سو جائے جبکہ دادی اماں ابھی جاگ کر پورے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ موسم بھی لگتا تھا کہ میری دادی اماں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ موسلا دھار بارش شام کے وقت بوندا باندی میں تبدیل ہوگئی تھی پھر پھوار پڑنے لگی اور اس وقت آسمان سے ایک قطرہ بھی نہیں گر رہا تھا اور نمی کو اپنے ساتھ لے جانے والی ہوا بھی چل پڑی تھی۔ برسات کی یہ جھڑی کافی دن چلتی رہی اور بارش کی اس محاذ آرائی کے ختم ہونے کا وقت آگیا تھا۔ لیکن دادی اماں نے اپنے دل کے اطمینان کے لئے موسم کی اس تبدیلی کو آنے والے اچھے وقت اور واقعے سے منسلک کرلیا۔

آدھی رات گزرے کافی وقت ہو چکا تھا۔ میں اندرونی کمرہ چھوڑ کر مہمانوں والے کمرے میں آچکا تھا تاکہ نانی اماں کے ساتھ لیٹ جاؤں۔ خالہ اور نانی اماں بھی ابھی تک نہیں سوئی تھیں۔ خالہ

MashalBooks.com

چت لیٹی ہوئی تھیں اور ان کا چہرہ چھت کی طرف تھا۔ نانی جان دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔ میری آنکھیں تھیں اور میں دروازے کے باہر اندھیرے میں دور کسی گھاس کے میدان میں گائے جانے والے رات کے نغمے سن رہا تھا۔

ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھر اس سے زیادہ خاموش نہیں ہو سکتا تھا حتیٰ کہ سارے سو گئے ہوں تب بھی۔ اتنی مکمل خاموشی تھی کہ یہ تاریکی آوازوں کی راہ میں حائل ہو رہی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے میرے سمعی اعضا خاموشی اور سکون کے دباؤ، جو ہر طرف پھیلا ہوا تھا، کی وجہ سے مفلوج ہو گئے ہوں۔ یہ تاثر اتنا زیادہ تھا کہ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ یہ آوازیں جو میرے کان میں سنائی دے رہی ہیں وہ آوازیں نہیں ہیں جو دراصل اس دنیا پر موجود ہیں بلکہ یہ میرے سحر زدہ دماغ کا تخلیق کردہ کوئی خیال ہے۔ لیکن خود کو مجتمع کر کے اور غور سے سننے پر مجھے یوں لگا جیسے میں راتوں کو جاگنے والے کسی ذی روح کی آواز بھی سن رہا ہوں جو اس اندھیرے میں گھسٹتا ہوا چل رہا تھا۔ کافی دیر میں ہوا کی سرسراہٹ کے درمیان جھینگروں اور ٹڈوں کی آوازوں میں فرق محسوس کرنے پر توجہ مرکوز کرتا اور ان آوازوں کے میٹھے اور کھٹے سروں کا لطف لیتا رہا۔ حشرات کی سرسراہٹوں کے درمیان اچانک ایک غیر مانوس آواز در آئی اور اس کی اجنبیت نے مجھے پریشان کر دیا۔ لیکن یہ آواز جس طرح غیر متوقع طور پر پیدا ہوئی تھی اسی طرح ختم بھی ہو گئی۔ یہ غائب ہو گئی بالکل ایسے ہی جیسے میں اس کی دم کا آخری سرا پکڑنے لگا تھا اور میں نے ایک بار پھر محسوس کیا جیسے میں کسی چیز کی وجہ سے سحر زدہ ہو گیا ہوں۔ آواز تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر سنائی دی۔ اس بار یہ بڑی واضح تھی۔ یہ آواز بہت زیادہ بلند نہیں تھی بلکہ رات کو آنے والی آوازوں سے بہت زیادہ مختلف تھی۔ یہ آواز ایسی تھی جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی بچہ کسی خالی بوتل میں پھونک مارتا ہے یا یہ کہہ لیں کہ سمندر میں کہیں دور بجنے والے جہاز کے سائرن کی طرح تھی۔ کسی بھی طرح یہ ایک مدہم لیکن بھری ہوئی آواز تھی۔ یہ ایک مدہم آواز تھی اور جس سمت سے یہ آ رہی تھی اس کے بارے میں مجھے بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اب محسوس ہوتا تھا کہ یہ گاؤں کے باہر کے کنارے کے آس پاس سے کہیں آ رہی تھی یا ممکن ہے کہ کچن گارڈن سے آ رہی ہو جو کہ دروازے کے بالکل باہر سے شروع ہو جاتا تھا۔ میں رات کی خاموشی توڑ کر بڑے رازدانہ انداز میں آنے والی اس عجیب سی آواز سے سحر زدہ پڑا رہا۔

''یہ بادشاہ سانپ ہے جو دوسرے سانپوں کو بلا رہا ہے'' نانی جان کی آواز کسی بڑے سانپ کی

طرح میرے جسم کے گرد لپٹ گئی جو اپنی دوشاخہ زبان کو بار بار منہ سے باہر نکال رہا تھا'' میں بمشکل سانس لے رہا تھا۔ یہ میری پیاری خالہ جان تھیں جنہوں نے میرا یہ خوف دور کر دیا۔ میں شکر گزار تھا کہ صرف میں اکیلا نہیں تھا جس نے وہ آواز سنی تھی۔ میرے پاس ایک محافظ تھا۔ خالہ پہلے ہی میرے ساتھ بیٹھی تھیں اور دروازے کی طرف گھور رہی تھیں۔ نانی ماں نے ہونٹوں کو ہلایا، یہ کچھ کہنے سے پہلے کا عمل تھا، خالہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''نہیں'' لیکن نانی اماں نے بات کرنے سے پہلے اپنے ہونٹوں کو تیار کرنے کا عمل جاری رکھا۔ خالہ جان اگر انہیں دوسری بار روک نہ دیتیں تو نانی اماں نے کچھ نہ کچھ کہہ دینا تھا۔ ''برائے مہربانی، مت بولئے گا'' خالہ بولیں۔

خالہ نے مجھے اپنی رضائی کے اندر کھینچ لیا۔ خالہ کی بغلوں کے نیچے دبے ہوئے میں نے وہی آواز دوبارہ سنی اور کسی سمندر میں بجنے والے جہاز کے سائرن کی طرح کی آواز نے ایک بار پھر پورے کمرے میں سنسنی دوڑا دی۔ اس بار بھی واضح اندازہ نہیں ہو سکا کہ آواز باورچی خانے کے باغ سے آ رہی تھی یا دریا کے کنارے کے آس پاس سے کہیں سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد ایک لمبا وقفہ تھا، پھر سانپ کے بلانے کی آواز تیسری بار سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی لیکن اس آواز کے اثرات کافی دیر تک کمرے میں موجود رہے اور اس نے ہمارے منہ بند رکھے۔ نانی جان ابھی تک بڑے عجیب سے انداز میں بیٹھی ہوئی تھیں اور آگے دروازے کی جانب جھکی ہوئی تھیں۔ جذبات کا رنگ ان کے چہرے پر آ اور جا رہا تھا۔ وہ کبھی خالی نظروں سے خلا میں گھورتیں جیسے کسی شخص کو سر پر سخت چھوٹ لگائی گئی ہو لیکن اگلے ہی لمحے وہ تنگ آنکھوں کے ساتھ دروازے کے باہر دیکھ رہی ہوتیں جیسے کوئی شخص بڑا مشکل اور پیچیدہ سوال حل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آخر کار وہ میری اور خالہ کی طرف مڑیں اور کہا ''ٹونگ مان...... میرے پیارے ٹونگ مان''۔

لیکن جب میری آنکھیں ان سے چار ہوئیں تو انہوں نے چہرے کا رخ دوسری طرف کر لیا۔ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ دوبارہ اپنا منہ کھولا اور بات کی۔

''تم بھی ایسا ہی سوچتے ہو'' لیکن کیسا، یہ انہوں نے نہیں بتایا، پھر کافی دیر کے لئے ہچکچائیں اور آخر کار بولیں۔

''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے چچا کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میری وجہ سے ہوا تھا؟''

میں نے جواب دینے کا فیصلہ کیا۔سوال کرتے ہوئے ان کی آواز میں اتنی جلدی تھی کہ میں نے سوچا کہ مجھے اس کے ردعمل میں کچھ کہنا چاہیے لیکن اگلے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھیں، نہ ہی وہ میرے طرف توجہ دے رہی تھیں۔ وہ کلی طور پر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ اگر میں نے ان سے کچھ کہا ہوتا تو انہوں نے یقیناً کچھ بھی نہیں سنا تھا۔

''اس رات جو کچھ ہوا اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی، میں نے کسی کی جاسوسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میں تو گھر کے باہر والے حصے میں تھی اور میں نے اندر والے کمرے میں سرگوشیوں کی آواز سنی تھی چنانچہ صرف اس کمرے کے نزدیک گئی تھی تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ وہاں کیا ہو رہا تھا، کون جانتا تھا کہ اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوگا۔ اگر میں یہ جانتی ہوتی کہ یہ کچھ ہو جائے گا تو گھوڑوں کی ایک ٹیم بھی مجھے گھسیٹ کر وہاں نہیں لے جا سکتی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ میں نے کچھ تجسس کا اظہار کر کے اچھا کیا، میں جانتی ہوں مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میری وجہ سے حالات اس موڑ پر آ کر ختم ہو نہیں ہوئے تھے۔ اگر یہ میری وجہ سے ہوا بھی تھا تو تمہارے چچا کو وہاں واپس چلا جانا چاہیے تھا جہاں سے وہ آئے تھے''۔

خالہ نے مجھے سختی سے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ میرا سر خالہ کے پستانوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا اور میں نے نانی اماں کی یہ سرگوشیاں خواب آمیز غنودگی میں سنیں۔ میرا سارا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ حتیٰ کہ اپنی خواب آمیز تھکن میں بھی میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو بلاشبہ اپنی خالہ سے ہی شادی کروں گا اور میں نے نانی جان کی بڑبڑاہٹ پر دھیان دینا ترک کر دیا۔

(6)

دادی اماں کی غضبناک ڈانٹ ڈپٹ، جو وہ گیٹ کے اندر کھڑی ہو کر کر رہی تھیں، سے میری آنکھ کھل گئی، اگرچہ آسمان پر روشنی پھیل رہی تھی لیکن ابھی صبح کی شروعات ہی تھی۔ گرمیوں کی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور جیسا کہ میں آدھی رات کے کافی بعد سویا تھا تو صبح سویرے اٹھنے کا مطلب تھا کہ میں کم وبیش سویا ہی نہیں تھا۔ میرے سر میں بے حس کر دینا والا درد ہو رہا تھا اور میری پلکیں بند ہو رہی تھیں۔ لیکن میری نیند پھر بھی خاندان کے دوسرے افراد کی نسبت بہتر تھی۔ کئی دنوں کے کام کاج اور تناؤ کی وجہ سے ابا جان کا چہرہ سوجا ہوا اور زرد ہو رہا تھا جیسے انہیں یرقان ہو چکا ہو اور ماں ایسے سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی جیسے مصر کی ممیاں

ہوتی ہیں، نانی ماں اور خالہ جان کی حالت بھی اتنی اچھی نہ تھی لیکن دادی جان توانائی سے بھر پور تحکمانہ انداز اپنائے ہوئے تھیں۔ وہ فکر مند خاندان کو صبح سویرے سے ہی ڈانٹ رہی تھیں۔ وہ ابا جان اور امی جان کی خوفناک حد تک سرزنش کر رہی تھیں۔

گیٹ کے تم کے ساتھ لٹکا ہوا لیمپ بجھ چکا تھا۔ یقیناً ہوا نے شعلے کو بجھا دیا تھا، تیل آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا اور شیشے کا شیڈ پانی کے قطروں سے بھیگا ہوا تھا۔ بجھے ہوئے لیمپ نے دادی ماں کو غضبناک کر دیا تھا۔ وہ اسے ابا جان اور امی جان کی طرف سے لگاؤ کی کمی کے ثبوت کے طور پر لے رہی تھیں۔ دادی جان کا غصہ ابا جان اور امی جان کی ملامت کرنے کے باوجود کم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اس سے انہیں ثبوت مل گیا ہے کہ ابا جان اور امی جان چچا کے مفادات کے حوالے سے قابل اعتبار نہیں رہے اور یہ قرار دیا کہ اس رویے میں بہتری کے آثار پیا ہونے تک وہ ان سے اناج کی کوٹھڑی اور حفاظتی الماری کی چابیاں لے لیں گی۔

''اس صبح میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ خوشی کی اس صبح کسی عورت کو اپنی آواز بلند نہیں کرنی چاہیے۔ میں باقی تم پر چھوڑ رہی ہوں، میں اب ایک انگلی بھی نہیں ہلاؤں گی بس یہ دیکھ کر لطف اندوز ہوں گی کہ تم کیا کرتے ہو''۔ پھر انہوں نے اندر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے زبان سے ہلکی سی آواز نکالی ''میں بڑی خوش قسمت عورت ہوں کہ میرا بیٹا بڑا عقلمند ہے''۔ وہ صحن میں اندرونی کمرے کی طرف چلنا شروع ہوئیں۔ مجھ سے کونسا گناہ سرزد ہو گیا کہ اس طرح کا بیٹا اور بہو ملی ہے''۔ مہمانوں والے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں لیکن ان کی آواز اتنی اونچی تھی کہ پڑوسی بھی سن سکتے تھے۔

دادی اماں بلا شبہ اپنی زبان کی پکی تھیں۔ انہوں نے حقیقتاً انگلی تک نہیں ہلائی۔ کمرے میں جانے اور زور سے دروازے بند کرنے کے بعد انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں بولا اور کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بجائے وہ چھوٹی کھڑکی کے شیشوں سے صحن میں دیکھتی رہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور عدم اطمینان اور عدم قبولیت کا تاثر ان سے چہرے سے ختم نہ ہوا۔ خاندان میں موجود ہر فرد جھاڑو، برش، ڈسٹر لے کر باہر آ گیا اور صحن صاف کیا، فرش دھوئے، جالے ختم کئے اور گھر کو ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ سب کو اس بات کا احساس تھا کہ دادی اماں ان کے کام کی نگرانی کر رہی ہیں۔ خالہ اور پھوپھی ہمارے ساتھ کام

MashalBooks.com

میں شامل ہوگئیں کچھ ہی دیر میں گھر صاف نظر آنے لگا، جیسا کہ وہ برسات کی جھڑی شروع ہونے سے پہلے تھا۔ خالہ اور پھوپھی جان امی کے ساتھ کچن میں چلی گئیں تا کہ ناشتہ تیار کر سکیں۔ ابا جان اور میں نے گیٹ سے صحن تک اور وہاں سے باورچی خانے کے باغ تک چلنے کے راستے کے درمیان میں ایک نالی کھودی تا کہ صحن سے پانی کی نکاسی کی جاسکے۔ یہ کام کرتے ہوئے ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔

آسمان پر ابھی تک بادل تیر رہے تھے۔ ہمیں امید تھی کہ کافی عرصے کے بعد سورج اپنا چہرہ دکھائے گا لیکن آسمان مکمل طور پر صاف نہ ہو پھر بھی مغرب میں آسمان کے ایک حصے سے بادل چھٹ گئے۔ اس کے علاوہ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو بادلوں کو اڑا لے جاتی ہے۔ آسمان پر بارش کے دوبارہ شروع ہونے کے آثار نہ تھے۔ ہمارے لئے اتنا بھی بہت تھا، یہ کسی کرم سے کم نہ تھا۔ صرف میرے خاندان والے ہی نہیں، سبھی لوگوں کے یہی جذبات تھے۔ گاؤں کے لوگ جو صبح سویرے سے ہی آنا شروع ہو گئے تھے موسم کی بات کرتے ہوئے مبارکبادیں دینے لگے۔ خواتین کچن کے اندر اور باہر آ جا رہی تھیں۔ میرا گھر گاؤں کے لوگوں سے بھر گیا تھا، جیسے عام طور پر کسی تہوار کے روز ہوتا ہے اور گھر کے افراد کو ٹوہ لگانے کے شوقین پڑوسیوں کے سوالات کے ذریعے مصروف رکھا جا رہا تھا۔ پڑسی جس بات میں زیادہ دلچسپی دکھا رہے تھے یہ تھی کہ خاندان کے لوگ پیش گوئیوں پر کس قدر ایمان اور اعتقاد رکھتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ انہوں نے ''مافوق الفطرت'' کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ اگر چہ وہ اس حقیقت پر متعجب تھے کہ قسم کا حال بتانے والے شخص کے ادا کئے گئے ایک لفظ کے نتیجے میں اسی قدر وسیع پیمانے پر تیاری کی گئی تھیں۔ وہ اتنے مہذب تھے کہ اس سارے عمل کو پاگل پن اور احمقانہ حرکت قرار نہیں دے رہے تھے، کم از کم ہمارے سامنے تو انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ ہمدردی کا مظاہرہ کر رہے تھے، ہمت بندھانے والے تاثرت ظاہر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی اور چیز نہیں تو خاندان بھر کی محنت اور محبت ہی چچا کو واپس لے آئے گی، اس پر ابا جان محض مسکرا دیتے تھے۔ ابا جان نے ایسی باتیں کرنے والوں کے رویے سے محسوس کیا جیسے گھر میں کچھ چل رہا تھا، لوگ اس پر من ہی من میں لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ بالکل ایک ڈاکٹر کے لہجے میں بات کر رہے تھے، جو اپنے مرتے ہوئے مریض کو بتاتا ہے کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ جوں جوں مقررہ وقت قریب آ رہا تھا زیادہ لوگ ہمارے گھر میں جمع ہو رہے تھے، ہمارا گھر لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا، جیسے گاؤں کے میلے والے دن ہوتا ہے۔ ایسا

MashalBooks.com

لگتا تھا کہ گاؤں میں جو کوئی بھی چل پھر سکتا تھا وہ ہمارے گھر چلا آیا تھا۔ میں چنکو کے گھر کی ڈیوڑھی میں اجنبی کو دیکھ سکتا تھا جو وہاں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میرا گھر کسی منڈی کی طرف لوگوں سے بھر چکا تھا اور میرے گھر والوں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ دادی جان نے ہمیں کچھ کھانے سے منع کر دیا کیونکہ ہم سب کو چچا جان کے آنے پر اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ہم فاقہ کر رہے تھے، اس لئے میں نے تحمل کا مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن میرے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے تھے۔

آخر کار آٹھ بج گئے، یہ اس وقت کا آغاز تھا جو پیش گوئی کرنے والے نے بتایا تھا۔ سب لوگوں کی تناؤ بھری خوشی و مسرت کے دوران وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ جلد ہی نو بج گئے اور پھر دس بجنے والے بھی ہو گئے۔ لیکن چچا جان، جن کا بڑے دنوں سے انتظار کیا جا رہا تھا، کہیں ظاہر نہ ہوئے۔

جب سارے گاؤں والے منتشر ہو گئے تو ہم سب بہت تاخیر سے ناشتے کیلئے بیٹھے۔ صرف گاؤں کا سربراہ اور چنکو کے گھر والے وہاں رہ گئے تاکہ ہماری دلجوئی کر سکیں۔ دادی جان اندرونی کمرے میں ہی تھیں اور ہم سب سائیڈ والے کمرے میں لگی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میز طرح طرح کے رنگ رنگیلے کھانوں سے سجی ہوئی تھی لیکن سب کے چمچ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دادی جان نے باقی گھر والوں کو کھانے کی اجازت دے دی لیکن خود کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ قسمت کا حال بتانے والے نے جو وقت بتایا وہ گزر چکا تھا پھر بھی دادی جان کا حوصلہ اور عزم ابھی تک ماند نہیں پڑا تھا۔ وہ ابھی تک با حوصلہ نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ پہلے دن سے ہی انہوں نے نہیں سوچا کہ وقت اس قدر اہم ہے۔ ان کے نزدیک جو چیز اہم تھی وہ مخصوص وقت نہیں بلکہ دن تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حادثاتی غلطیاں کہیں بھی ہو سکتی تھیں اور انسان جو ہے وہ ہمیشہ شیڈول کے مطابق نہیں چل سکتا۔ ان کا اصرار تھا کہ کسی کو بھی چھوٹی موٹی غلطیوں کی معافی ہونی چاہیے چاہے وہ مستقبل کا حال بتانے کے حوالے سے ہی پیش گوئی کیوں نہ ہو۔ دادی اماں کے نزدیک دن ابھی صرف شروع ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ چچا جان اس روز نہ آئیں اس لئے وہ کچھ زیادہ دیر انتظار کریں گی اور ان دن کا پہلا کھانا اپنے بیٹے کے ساتھ ہی کھائیں گی۔ وہ کسی قسم کی تھکن محسوس نہیں کر رہی تھیں۔

ہمارا کتا وولی، جو کمرے میں جھانکتا رہتا تھا اور اپنے اگلے پاؤں رہنے سہنے کے فرش کے آ کری سرے پر رکھ کر اپنے ہونٹ پر زبان پھر رہا تھا اچانک برآمدے میں چلا گیا۔ پھر وہ گیٹ کی طرف

منہ کر کے بھونکنے لگا۔اس کے بعد بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ابا جان کا چمچ ہوا میں آدھے راستے میں معلق ہو گیا اور ہماری تمام حرکات فوری طور پر رک گئیں۔بچوں کا شور ہمارے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔چمچ میز پر گراتے ہوئے میں باہر کی طرف بھاگا۔آواز فوری طور پر ہمارے گیٹ تک پہنچ گئی تھی۔صحن کے آدھے راستے میں ہی بچوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔پہلا منظر جو مجھے نظر آیا یہ تھا کہ بچوں کا ایک گروہ ہاتھوں میں پتھر اور لکڑی کی چھڑیاں لئے کھڑا تھا۔لڑکے گیٹ کے سامنے کچھ متذبذب کھڑے تھے۔وہ گیٹ کے اندر آنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہے تھے اور اپنے ہتھیار اس طرح ہوا میں بلند کر رہے تھے جیسے کسی کو ڈرا دھمکا رہے ہوں۔ان بچوں میں سے ایک نے اپنا پتھر زور سے پھینکا۔جہاں پتھر گرا وہاں میں نے ایک چیز دیکھی۔

وہاں ایک لمبا سا کوئی جسم تھا جو پھسلتا ہوا گھر کے اندر آ رہا تھا۔یہ ایک بڑا سانپ تھا،انسانی قد سے زیادہ لمبا۔جب میں نے اس کا خوفناک جسم دیکھا جو اس کے زردی مائل چھلکوں،جو تیزی سے دمک رہے تھے،کی مدد سے آڑا ترچھا چل رہا تھا تو میرا جسم بھنچ گیا اور مجھے گذشتہ رات کی وہ پراسرار سرگوشی یاد آ گئی۔لیکن میں ایک لڑکا تھا اور سانپ کا مطلب تھا کچھ ہلا گلا،خوف کا غلبہ مجھ پر محض لمحہ بھر کے لئے تھا اور اگلے ہی لمحے میں بھی وہاں ہر لڑکے کی طرح خوش نظر آ رہا تھا جو شور مچا رہے تھے اور اس پر پتھر پھینک رہے تھے۔میں اس جارحانہ تخریب کارانہ خواہش کو کنٹرول نہ کر سکا جو زمین پر رینگنے والے جانوروں کو دیکھ کر خاص طور پر لڑکوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔میں دوڑ کر اناج والی کوٹھڑی میں گیا اور وہ ڈنڈا اٹھا لایا جو ابا جان بھاری چیزیں اٹھانے کیلئے استعمال کرتے تھے۔میں نے سانپ کو مارنے کیلئے ڈنڈا ہوا میں لہرا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے مارتا کسی نے میرے ہاتھ پکڑ لئے،میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا،یہ نانی اماں تھیں،اسی لمحے پیچھے سے کسی کی چیخ سنائی دی ''آ آ ک''

اس چیخ کے ساتھ ہی دادی اماں نیچے فرش پر گر گئیں۔نانی جان نے ڈنڈا میرے ہاتھ سے پکڑ لیا اور سرزنش کے انداز میں آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا۔اتنے بڑے سانپ کے اچانک نمودار ہونے نے پورے گھر کو تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔سب سے زیادہ ضروری مسئلہ دادی اماں تھیں جو بے ہوش ہو چکی تھیں۔پورا خاندان اندرونی کمرے میں جمع تھا تا کہ ان کے پیر اور ٹانگیں اور بازو سہلائے جا سکیں اور ان کے چہرے پر ٹھنڈا پانی چھڑکا جا سکے تا کہ ان کو ہوش میں لایا جائے۔گاؤں کے لوگ جو منتشر ہو گئے تھے

MashalBooks.com

اب ایک بار پھر جمع ہو چکے تھے اور اتنی زور زور سے باتیں کر رہے تھے کہ محسوس ہوتا تھا ہم کسی گرداب کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ صرف نانی اماں تھیں جنہوں نے اس شور اور افراتفری کے ماحول میں بھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ ایسے جیسے وہ پہلے سے انتظار شدہ طریق کار کے مطابق کام کر رہی ہوں، وہ چیزوں کو ایک ایک کر کے ٹھیک کرتی جا رہی تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے لوگوں کو باہر نکال کر گیٹ کو تالا لگا دیا۔ جن بڑوں اور بچوں کو گھر سے نکالا گیا تھا وہ خرمالو کے درخت کے پاس لکڑیوں سے بنائی گئی باڑ کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ افراتفری سے فائدہ اٹھا کر سانپ باورچی خانے کے باغ میں کہیں نکل گیا اور خرمالو کے درخت پر چڑھ کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور اپنی دوشاخہ زبان ہوا میں لہرانے لگا۔ اسے گھرا گھاؤ لگا تھا اور اس کی دم آدھی سے زیادہ کٹ کر اس کے جسم کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ نہ تھکنے والے بچوں نے اس کا درخت تک پیچھا کیا تھا اور اب بھی اس پر پتھر پھینک رہے تھے اور چھڑیاں لہرا رہے تھے۔

''کون پتھر پھینک رہا ہے'' نانی جان کی سرزنش میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ پتھر پھینکے جانے بند ہو گئے۔ پھر نانی جان نے درخت کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ جب وہ درخت پر کنڈلی مارے ہوئے سانپ کے نیچے کھڑی تھیں تو کچھ غیر متوقع نہیں ہوا تھا اور سانس روکے انہیں دیکھنے والے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ ذرا بھی متزلزل نہ ہوئیں حالانکہ سانپ کی شعلہ بار آنکھیں تمام اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں اور اس کا سر جارحانہ انداز میں اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ نانی اماں نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور انہیں اپنے سینے پر ہتھیلی سے ہتھیلی ملا کر باندھا۔

''بے چارے بچے تم اس طرف اس لئے آئے تھے کہ یہ دیکھ سکو اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟'' نانی اماں نے مدھم آواز میں سرگوشی کی جیسے کسی خوفزدہ بچے کو لوری دی جاتی ہے۔ کوئی دبی دبی ہنسی ہنسا۔ نانی ماں کی آنکھیں سکڑ کر فوری طور پر تکونی ہو گئیں۔ ''نامعلوم نسل کا کون وہاں ہنسا؟ فوراً یہاں آ جائے تا کہ میں اس کی گردن مروڑوں'' نانی ماں کی اس ڈانٹ پھٹکار سے وہاں موجود ہر فرد خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ دوبارہ سانپ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو تمہاری ماں ابھی تک اچھی صحت سے ہے اور سبھی اپنے کام ٹھیک ٹھاک انداز سے کر رہے ہیں اس لئے اپنے ذہن کو آسودہ کر لو اور جلدی سے اپنے راستے پر واپس چلے جاؤ''۔

سانپ نے ذراسی حرکت بھی نہ کی، وہ صرف اپنی دوشاخہ زبان منہ کے اندراور باہر کرتا رہااور دوچار باراس نے اپناسر اٹھایا۔

"تمہیں اس طرح اکڑوں نہیں بیٹھے رہنا چاہیے بلکہ تمہیں ابھی ایک لمبا فاصلہ طے کرنا ہے، بالکل نہیں، تم جانتے ہو، اگر تم اپنے خاندان والوں کو بہت زیادہ غمگین نہیں کرنا چاہتے، میں جانتی ہوں کہ تم کیا محسوس کر رہے ہو لیکن تمہیں دوسروں کے جذبات کا بھی خیال رکھنا چاہیے، تمہاری ماں کیسا محسوس کرے گی اگر وہ یہ دیکھے کہ تم اس طرح ادھرادھر بھٹک رہے ہو؟"

نانی اماں اس کے ساتھ اس طرح پیش آرہی تھیں جیسے سانپ کوئی حقیقی زندہ انسان ہو لیکن انہوں نے جس خوبی کے ساتھ بھی یہ معاملہ اس کے سامنے پیش کیا ہو سانپ نے وہاں سے جانے کے حوالے سے کسی قسم کی آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔ پڑوس کی کسی عورت نے تب نانی اماں کو سانپوں کو بھگانے کا طریقہ بتایا۔ اس عورت، جس کا جسم نظر نہیں آرہا تھا اور صرف آواز سنائی دے رہی تھی، نے کہا کہ آپ صرف جلتے ہوئے بالوں کی بو سے ہی سانپوں کو بھگا سکتی ہیں۔ نانی اماں کے اشارے پر میں جلدی سے اندرونی کمرے کی طرف بھاگا تاکہ دادی اماں کے کچھ بال لاسکوں۔

دادی جان ایک چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں، ویسے ہی اکڑوں جیسے کوئی لاش ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ سانس لے رہی تھیں لیکن وہ تا حال بے ہوش تھیں۔ وہاں بیٹھے خاکستری بھورے چہرہ والے گھر کے افراد، جوانکے گرد بیٹھے ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے، سے میں نے دادی اماں کے کچھ بال طلب کئے۔ میرا یہ تقاضا انہیں خلاف عقل محسوس ہوا اور یہ وضاحت کرنے میں کہ کس مقصد کیلئے بالوں کی ضرورت ہے کچھ وقت لگ گیا۔ پھر پھوپھو جانکو نفیس دندانوں والی بانس کی کنگھی کے ذریعے بے ہوش معمر خاتون کے کچھ بال اکٹھے کرنے میں بھی کچھ وقت صرف ہو گیا۔ بالوں میں بار بار کنگھی پھیرنے سے جو بال حاصل ہوئے وہ آخر کار مجھے دے دیئے گئے۔ میں جب بال لے کر باہر صحن میں آیا تو اس وقت تک نانی جان نے ایک چھوٹی سی ٹرے تیار کر لی تھی جس میں کچھ کھانے رکھے ہوئے تھے۔ اس گول ٹرے میں چچا کے پسندیدہ کھانے تلے ہوئے سکوائش سلائسز، بھنے ہوئے فرن اور ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا سا پیالہ بھی تھا۔ مجھ سے بال لے کر زمین پر رکھنے کے بعد نانی جان نے آہستہ سے اپنا سر اٹھایا اور خرمالو کے درخت پر نظر ڈالی۔

"یہ وہ چیزیں ہیں جو تمہاری ماں نے کافی دنوں سے تمہارے لئے پکا کر رکھی تھیں، اگر چہ تم

ان کو چکھ کر ان کا ذائقہ نہیں محسوس کر سکتے پھر بھی ان کو ایک نظر دیکھ ہی لو۔ یہ سب تمہاری ماں کی تمہارے ساتھ وابستگی اور خود کو تمہارے لئے وقف کرنے کا ثبوت ہے، ایسا نہیں ہے کہ میں تم سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، اس بات کو تمہیں سمجھنا چاہیے۔ میں تمہیں جلدی سے اس لمبے سفر پر روانہ کرنا چاہتی ہوں جہاں تمہیں جانا ہے۔ اپنے خاندان والوں کے بارے میں فکر کرنا چھوڑ دو اور تمہارے آگے جو لمبا سفر ہے اس میں تم اپنے آپ کا خیال رکھنا''۔

باتیں ختم کرنے کے بعد انہوں نے جلتا ہوا کوئلہ اٹھایا اور جب انہوں نے یہ کوئلہ بالوں کے گچھے پر رکھا تو وہ شوں شوں کی آواز کے ساتھ جلنے لگے۔ جلتے ہوئے پروٹین کی بو چشم زدن میں چار سو پھیل گئی۔ اگلے لمحے جو کچھ ہوا اس کی وہاں موجود سب افراد نے تعریف کی۔ وہ بڑا سا سانپ جو نانی جان کی تمام تر باتوں کے باوجود پتھر کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا، آہستہ سے ہلنے لگا۔ اس کا جسم جس نے خرمالو کے درخت کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا، آہستہ آہستہ درخت کی شاخ کو آزاد کرنے لگا اور پھر وہ پھسلتا ہوا نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر وہ تذبذب میں رہا اور پھر نرمی سے لہریئے دار حرکت کے ساتھ نانی جان کی طرف چلنے لگا۔ اسے راستے دینے کیلئے نانی جان ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلیں، وہ گھسٹتا ہوا چل رہا تھا اور نانی جان اپنے ہونٹوں سے آواز نکالتے ہوئے اس کے پیچھے چل رہی تھیں۔ گھر کے سارے افراد بھی رہنے سہنے کے کمرے کے فرش تک آ گئے اور خوفزدہ ہو کر اس کو صحن کے پار جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ وولی جس کی دم اس کے پچھلے زانوؤں کے درمیان چمٹی ہوئی تھی۔ رہنے رہنے کے کمرے کے فرش کے نیچے سے خوف سے بھری آواز کے ساتھ بڑے فرض شناسانہ انداز میں بھونکا۔ سانپ اناج کی کھوٹری اور کچن کے درمیان خالی جگہ سے اپنا راستہ بناتے ہوئے اپنے راستے پر چلا گیا۔

''سویش سویش، نانی جان نے اپنی کھردری آواز میں اسے آگے چلتے رہنے کو کہا، سانپ پہلے ہی کنویں کے پاس سے گزر کر آگے جا چکا تھا اور اس نے پچھواڑے کا صحن بھی پار کر لیا تھا۔ اس کے سامنے اب بانس کے پودوں کا جھنڈ تھا۔

''پیارے بہت شکریہ، گھر کا خیال رکھنے کیلئے تم اپنے بھائی پر بھروسہ کرو اور اپنی پوری توجہ اپنا جسم پورا کرنے پر دو، اپنے طویل سفر کے لئے، تم یہاں جو کچھ چھوڑ کے جا رہے ہو اس کے بارے میں فکر مند نہ ہونا، تم اچھے بچے ہو، شکریہ پیارے''۔

کنویں کے پاس کھڑے ہو کر سانپ کو محبت کے تمام تر جذبات کے ساتھ اس وقت تک دیکھتی رہیں جب تلک وہ سانپ کے درختوں اور بارش کے دوران نئی پھوٹنے والی کونپلوں کے درمیان غائب نہ ہو گیا۔

چنکو کا باپ قریبی گاؤں سے ایک ڈاکٹر کو لے آیا تھا۔ بے ہوش ہونے کے کئی گھنٹے بعد دادی جان دوبارہ ہوش میں آ گئیں۔ گم سم ہونے کی کیفیت سے باہر آنے کے بعد انہوں نے کمرے کا اس طرح جائزہ لیا جیسے کوئی کئی مہینوں کی غیر حاضری کے بعد واپس آیا ہو۔

''کیا وہ چلا گیا'' ہوش میں آنے کے بعد دادی جان نے جو پہلے الفاظ ادا کیئے یہی تھے۔ پھوپھی جان فوراً سمجھ گئیں اور انہوں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ دادی جان نے اپنی پلکیں نیچی کر لیں جیسے کہہ رہی ہوں یہی تو سارا معاملہ تھا۔ پھوپھی جان نے جلدی سے وہ سارے واقعات بیان کر دیئے جو دادی جان کے بے ہوش ہو جانے کے بعد رونما ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح نانی جان نے پڑوسیوں کو وہاں سے بگایا اور درخت کے نیچے کھڑے ہو کر سانپ کو دلائل پیش کیئے، دادی جان کے بال جلا کر کس طرح اسے درخت کے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا اور ہر قدم پر اسے جاتے ہوئے دیکھا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا حتیٰ کہ وہ بانس کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ ماں پھوپھی جان کی باتوں کی وضاحت کرتی جاتی تھی اور کبھی کبھی بات کی تفصیل بیان کر دیتی تھی۔ دادی جان خاموشی سے اور چپکے سے رو رہی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے رواں دواں تھے ان کے جھریوں بھرے گالوں کے اوپر سے نیچے بہہ رہے تھے اور تکیے کے غلاف کو بھگو رہے تھے۔ جب انہوں نے ساری باتیں سن لیں تو انہوں نے ابا جان کو بھیجا کہ وہ نانی جان کو اندر لے کر آئیں۔ نانی جان، جو مہمانوں والے کمرے میں آرام کر رہی تھیں، ابا جان کے پیچھے پیچھے اندر والے کمرے میں آ گئیں۔ دونوں کے درمیان جھگڑے کے بعد یہ پہلا دن تھا کہ نانی جان اس کمرے میں قدم رکھ رہی تھیں۔

''بہت شکریہ'' دادی جان نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا اور آنکھیں اٹھا کر نانی جان کی طرف دیکھا۔

''خوش آمدید'' نانی جان کی آواز بھی خشک اور رلانے والی تھی۔

''میں نے اپنی بیٹی سے سب کچھ سن لیا ہے، تم نے میرے لیئے وہ کام کیا ہے جو دراصل مجھے

تمہارے لئے کرنا چاہیے تھا۔ تم نے میرے لئے کتنا مشکل اور لرزہ خیز کام کیا ہے''۔

''یہ سب کچھ اب گزر چکا ہے، باتیں کر کے تم خود کو مزید نہ تھکاؤ اور اپنی طاقت بحال کرنے کی کوشش کرو''۔

شکریہ، بہت بہت شکریہ'' دادی جان نے ہاتھ آگے بڑھایا جو نانی جان نے تھام لیا، دونوں نے تھوڑی دیر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رکھے، وہ بولنے کے قابل نہ تھیں۔ پھر دادی جان نے اپنی باقی ماندہ فکر کا اظہار کر دیا۔

''مجھے حیرت ہوگی اگر وہ ٹھیک طریقے سے اپنے راستے پر چلا گیا ہو''۔

''فکر نہ کرو، اب تک تو اس نے کوئی آرام دہ جگہ بھی تلاش کر لی ہوگی اور وہ اپنے گھر پر ایک نگران کی سی نظر رکھے ہوئے ہوگا''۔

اس مختصر سی گفتگو نے بھی دادی اماں کے اندر سے رہی سہی طاقت نچوڑ لی اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔ سبھی اُن کے گرد اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک وہ مشکل سے ہی سہی لیکن سو نہ گئیں۔ اس کے بعد سب وہاں سے چلے گئے اور صرف پھوپھی جان کو ان کی دیکھ بھال کے لئے وہاں چھوڑ آئے۔ ہم سب کچھ آرام کرنے کیلئے کمرے سے باہر آ گئے۔

اس رات دادی جان پھر بے ہوش ہو گئیں۔ انہوں نے تھوڑی سی قے کی ہمارے پاس جو بھی کوئی جڑی بوٹیوں والی ادویات تھیں وہ چمچ میں ڈال کر ان کے منہ میں ڈالی گئیں۔ اگلے دن سے یوں لگتا تھا کہ ہوش اور بے ہوشی ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے، جیسے کوئی کھیلتا ہوا لڑکا بالا، اس طرح گھر میں کوئی بھی سکون سے نہ تھا۔

دادی ماں ایک ہفتے تک بیماری سے لڑتی رہیں اگرچہ اپنے جسم پر سے ان کا کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔ ساتویں دن کی آخری رات کو اس معمر خاتون، جو گھر سے دور رہنے والے بیٹے کے بارے میں گھر مین رہنے والے بیٹے کی نسبت زیادہ سوچتی تھین، نے خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں، جیسے کوئی ختم ہو چکی موم بتی خاموشی سے بجھ رہی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دادی جان کی طویل زندگی میں سب سے زیادہ خوشی اور فخر کے وہی چند دن ہوں جو انہوں نے بڑی پر لطف جسمانی قوت کے ساتھ سارے گھر والوں پر حکم چلاتے اور انہیں سرزنش کرتے ہوئے گزارے جبکہ وہ بغیر کھائے اور بغیر سوئے اپنے چھوٹے بیٹے کی واپسی کے

بارے میں بہت زیادہ پرامید تھیں، جیسے شمع بجھنے سے پہلے ایک بار پوری روشنی کے ساتھ چمکتی ہے۔ بستر مرگ پر دادی اماں نے میرا ہاتھ تھام کر میری تمام غلطیاں اور برے اعمال معاف کر دیئے۔ میں نے بھی اپنے دل میں انہیں ہر چیز معاف کر دی۔

یہ یقیناً ایک بیزار کن اور طویل برسات کی جھڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.com